جلد پنجم
جواھر الفقہ
فقہی رسائل و مقالات
کا نادر مجموعہ
مفتی اعظم پاکستان
حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب
مکتبہ دار العلوم کراچی

جواہر الفقہ

فقہی رسائل و مقالات
کا نادر مجموعہ

مفتی اعظم پاکستان
حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ

جلد پنجم

مکتبہ دارالعلوم کراچی

باہتمام : محمد قاسم گلگتی
طبع جدید : ذی الحجہ ۱۴۳۱ھ (مطابق نومبر ۲۰۱۰ء)

ملنے کے پتے

● مکتبہ دارالعلوم کراچی
احاطۂ جامعہ دارالعلوم کراچی
فون نمبر: 021-35042280
021-35049774-6
ای میل
mdukhi@gmail.com

○ ادارۃ المعارف احاطہ جامعہ دارالعلوم کراچی
○ مکتبہ معارف القرآن احاطہ جامعہ دارالعلوم کراچی
○ ادارہ اسلامیات ۱۹۰ انارکلی لاہور
○ ادارہ اسلامیات اردو بازار کراچی
○ دارالاشاعت اردو بازار کراچی
○ بیت الکتب گلشن اقبال نزد اشرف المدارس کراچی

مضمون صفحہ

تفصیلی فہرستِ مضامین

جواہر الفقہ جلد پنجم

کتاب الاجارۃ

مضمون صفحہ

کتاب الاقتصاد و المعیشة

مضمون صفحہ

مضمون صفحہ

مضمون	صفحہ

مضمون صفحہ

کتاب السیاسة

(۷۵) فیصلة الاعلام فی دار الحرب و دار الاسلام

مضمون صفحہ

مضمون صفحہ

(۷۸) وقاية المسلمين عن ولاية المشركين

ملکی سیاست میں غیر مسلموں کے ساتھ اشتراک عمل کی شرعی حدود

مضمون — صفحہ

مضمون صفحہ

(۷۹) اربابِ اقتدار کے فرائض

---

(۸۰) مسلمانوں کے قائدین اور جائز امور میں ان کی اطاعت

مضمون　　صفحہ

٦٧

قانون اسلامی

بابت پٹہ دوامی

تاریخ تالیف ——— ربیع الثانی ۱۳۶۲ھ (مطابق ۱۹۴۳ء)
مقامِ تالیف ——— دارالعلوم کراچی

یہ موروثی کاشتکاروں سے متعلق ایک استفتاء کا مفصل جواب ہے جو جواہر الفقہ کی قدیم طباعت میں شامل اشاعت رہا ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

قانونِ اسلامی بابت پٹہ دوامی

سوال...... کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ زید نے ایک جنگل کا ٹکڑا ۱۵۰ بیگہ مسلم یا کافر زمیندار سے یا بینک سے نذرانہ دے کر بہ لگان مبلغ ۴۵۰ روپیہ حاصل کیا زمیندار و زید دونوں قانون گورنمنٹ نافذ الوقت کے اثر سے خوب واقف ہیں کہ زمیندار، زید یا ورثاء زید سے اس قطعۂ زمین کو کسی وقت بلا رضامندی زید واپس نہیں لے سکتا، زید نے بصرفِ زر کثیر جنگل مذکور کو آباد کر کے قابل زراعت بنایا، اور آلاتِ جدیدہ ترقیٔ زراعت کے واسطے لگائے، باغ نصب کیا و مکان و چاہ ہائے پختہ تعمیر کئے، یعنی ایک چھوٹا فارم کھولدیا، جس کے متعلق احکام شرعیہ کی تحقیق مطلوب ہے، لہٰذا سوالات ذیل کا جوابِ شرعی مدلل مرحمت فرمایا جاوے۔

۱:...... متعاقدین میں سے کسی ایک کی وفات پر شرعاً معاہدہ باطل ہو جاتا ہے، تو پھر شرعاً کیا حکم ہے؟

۲:...... آیا یہ معاہدہ شرعاً تعریفِ کاشتکاری موروثی میں داخل ہوتا ہے، یا نہیں، اگر ہوتا ہو، تو وہی احکام کاشتکاری جاری ہوں گے، یا اور کوئی صورتِ جواز بھی ہے؟

۳:...... بصورتِ ابطال معاہدہ زید اگر قابض رہے، تو شرعاً جواز قبضہ یا انتفاع منفعت کی صورت کیا ہوگی، نیز دوسرے شخص کو اجارہ پر دے سکتا ہے یا نہیں؟

۴:......بصورتِ عدم جواز زید نے جو زر کثیر صرف کر کے زمین آباد کی ہے، آیا اس کا یا مکان، باغ وغیرہ کا کوئی معاوضہ بصورتِ تخلیہ زمین زمیندار سے پانے کا مستحق ہے، اگر مستحق ہے اور زمیندار یا اس کے وارث دینے سے انکار کریں، تو کن کن صورتوں سے وصول کر سکتا ہے؟

۵:......کیا زید جنگل مذکور پر بصورت پٹہ دوامی اپنا قبضہ ہمیشہ نسلاً بعد نسل بلا تجدید معاہدہ رکھ سکتا ہے؟

۶:...... پٹہ دوامی کاشتکاری موروثی کا حکم واحد ہے، یا مختلف؟

بینوا توجروا۔

الجواب

اصل ضابطہ شرعیہ اس بارہ میں یہ ہے کہ ہر ایک اجارہ مدتِ اجارہ ختم ہونے پر یا احد المتعاقدین (کرایہ دار یا زمیندار) کی موت سے ختم ہو جاتا ہے، پھر کرایہ دار کو قبضہ باقی رکھنے کا کوئی حق نہیں رہتا۔ (کما ھو مصرح فی عامۃ المتون والشروح و الفتاویٰ) اور اسی بناء پر موروثی کاشتکاری اور دخیل کاری کا جو عام قانون اس وقت رائج ہے، وہ اپنے عموم کی حیثیت سے بلاشبہ ظلم اور ناجائز ہے، لیکن فقہائے متاخرین کے کلام سے بعض صورتیں ایسی بھی معلوم ہوتی ہیں، کہ جس میں مستاجر (کاشتکار یا کرایہ دار) کا قبضہ چند شرائط کے ساتھ دائمی نسلاً بعد نسل قرار دیا جاتا ہے، اور جب تک وہ شرائط کا پابند رہے، اس کا قبضہ زمیندار کو اٹھانے کا حق نہیں ہوتا، کرایہ دار یا زمیندار میں سے کسی کا انتقال بھی اس معاملہ میں اجارہ کو فسخ نہیں کرتا، بلکہ نسلاً بعد نسل یہ معاملہ جاری رہتا ہے، اور وہ صورت یہ ہے کہ جو زمین یا مکان اجارہ پر دیا گیا ہے، وہ

ابتدائے معاملہ ہی سے بطور پٹہ دوامی دیا گیا ہو، اور کاشتکار یا کرایہ دار کو یہ یقین دلایا گیا ہو کہ یہ جائداد اس کے قبضہ سے نکالی نہ جائے گی، جس کی بناء پر کاشتکار نے اپنا روپیہ اور محنت صرف کر کے زمین کو ہموار کیا، اور کنواں وغیرہ بنایا یا کرایہ دار نے اس میں کوئی تعمیر وغیرہ قائم کر لی، ایسی جائداد کو فقہاء کی اصطلاح میں ارض محتکرہ اور کردار یا جدک کہتے ہیں، اور اس دائمی حق کو مشد مسکہ یا حق قرار سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ (کمافی ردالمحتار) اور یہ صورت یا اوقاف کی زمین میں ہو سکتی ہے، یا بیت المال کی یا ایسی زمین میں جس کو مالک نے کرایہ ہی کی جائداد قرار دے کر پٹہ دوامی لکھ دیا ہے، یا کرایہ دار کو عدم انتقال کا یقین دلایا ہے، جس کی بناء پر اس نے اس زمین کو اپنا روپیہ اور محنت صرف کر کے درست کیا ہے، اس صورت میں شرعاً بھی کاشتکار یا کرایہ دار کا قبضہ اس وقت تک نہ اٹھایا جائے گا، جب تک کہ وہ شرائطِ ذیل کی پابندی کرے۔

اول یہ کہ جائداد کا مقررہ لگان یا حصہ بٹائی برابر ادا کرتا رہے، دوسرے یہ کہ اگر کسی وقت جائداد کی شرح لگان یا کرایہ عرف ورواج کے اعتبار سے زائد ہو جاوے، تو کاشتکار و کرایہ دار اسی شرحِ سے کرایہ دینا منظور کرے، جو اس وقت ہو گیا ہے، جس کا حاصل باصطلاح فقہاء یہ ہے کہ کاشتکار و کرایہ دار کو اجرتِ مثل کی پابندی لازم ہو گی۔ ابتدائے معاملہ میں طے شدہ لگان دائمی قرار نہ دیا جائے گا، البتہ اجرت مثل میں زمین کی موجودہ حالت جو کاشتکار یا کرایہ دار کے عمل سے پیدا ہوئی ہے۔ مثلاً زمین کو ہموار کر لیا گیا، اور کنویں وغیرہ سے پانی کا انتظام کر لیا، یا افتادہ زمین پر مکان یا دکان تعمیر کر لی گئی، اس حالت کا اعتبار اجرتِ مثل میں نہ کیا جائے گا، بلکہ زمین کی اصل حالت جس پر کاشتکاری یا کرایہ دار کے حوالہ کی گئی تھی، اس کا اعتبار ہو گا، مثلاً جس افتادہ زمین کا لگان بوقت معاملہ دس روپیہ تھا، اگر ویسی حالت وصفت کی زمین کا کرایہ آج پندرہ روپیہ ہو گیا ہے تو کاشتکار و کرایہ دار کو اس کی پابندی لازمی ہو گی اور دس کے بجائے

پندرہ روپے دینے ہوں گے، تیسرے یہ کہ کاشتکار یا کرایہ دار اس زمین کو تین سال تک معطل نہ چھوڑے۔ (کما فی الخیریۃ اذا ثبت انھم معطلوھا ثلث سنین تنزع من ایدیھم) اگر شرائط مذکورہ میں سے کسی شرط کی خلاف ورزی کاشتکار یا کرایہ دار کرے گا، تو اس کا حق اس زمین سے ساقط ہو جائے گا، اور اگر اس نے شرائط کی پابندی کی تو اس کا حق دائمی قرار دیا جائے گا، اور اس کے انتقال کے بعد اس کے کے وارثوں کی طرف منتقل ہوگا، مگر یہ انتقال بحیثیت ملک نہیں، بلکہ بحیثیت استحقاق ہے، اس لئے قواعد وفرائضِ میراث کی اس میں رعایت نہیں کی گئی، اولاد میں اگر لڑکے اور لڑکیاں دونوں ہیں، تو یہ استحقاق صرف لڑکوں کو ملے گا، اولاد نرینہ نہ ہو، تو بعض فقہاءؒ کے نزدیک یہ حق ساقط ہو جائے گا۔ (کما فی خراج الدر المنتقٰی للعلائی) اور بعض فقہاء کے نزدیک اولاد نرینہ نہ ہونے کی صورت میں دختر کو اور اگر وہ نہ ہو، تو حقیقی یا علاتی بھائی کو اور وہ بھی نہ ہو، تو حقیقی ہمشیرہ کو اور اگر وہ بھی نہ ہو، تو پھر ماں کو حق دیا جائے گا۔ (کما فی الحامدیة و سیأتی نقلھا) لیکن چونکہ صورت مذکورہ اصل ضابطہ اجارہ اور تصریحات متون وشروح کے بظاہر خلاف ہے، اس لئے فقہاء کا کلام اس بارہ میں مضطرب نظر آتا ہے، علامہ ابن عابدین شامی نے ردالمحتار کے مختلف مواضع وقف، اجارہ، بیع وغیرہ میں ان صورتوں پر کلام کیا ہے، پھر ایک مستقل رسالہ، رسائل ابن عابدین میں اس موضوع پر بنام ''تحریر العبارۃ فیمن ھو احق بالاجارۃ'' تحریر فرمایا ہے، اس رسالہ میں اس قسم کے معاملہ اور اس کے نسلاً بعد نسلٍ باقی رہنے کو متونِ فقہ کی تصریحات کے مطابق ناجائز نقل کرنے کے بعد جواز پر قنیہ کا فتویٰ، پھر خصاف سے اس کی تائید نقل فرمائی ہے، اور ذکر کیا ہے کہ فتاویٰ خیریہ وغیرہ میں علامہ رملی کا فتویٰ اس بارہ میں مضطرب اور متضاد ہے، بعض جگہ قنیہ وخصاف کے مطابق فتویٰ دیا ہے، بعض جگہ ظواہر متون کے مطابق، پھر قنیہ وخصاف اور عامۂ متون کے اقوال میں

اس طرح تطبیق دی ہے کہ قنیہ و خصاف میں عام اجارات کا یہ حکم نہیں لکھا بلکہ مخصوص ضرورتوں میں اور خاص صورتوں میں اجازت دی ہے، اور متون میں عام قاعدہ مذکور ہے، جس سے ان مخصوص صورتوں کو مستثنیٰ کہا جا سکتا ہے، جن میں قنیہ وغیرہ نے ایسا معاملہ جائز رکھا ہے، اور وہ وہی صورتیں ہیں، جو اسی تحریر میں اوپر ذکر کی گئی ہیں، لیکن خود علامہ شامی کا کلام بھی اس بارہ میں بظاہر مضطرب معلوم ہوتا ہے، اس رسالہ میں تو مذکورہ صورت پر تطبیق دے کر قنیہ و خصاف کے موافق فتویٰ کی گنجائش دی ہے، مگر ردالمحتار کتاب الاجارہ کے اوائل میں اس پر شدید نکیر فرمائی، اور درمختار میں جو قنیہ کا قول نقل کر دیا ہے۔ اس کے متعلق لکھا ہے:

واقول حيثما كان مخالفاً للمتون فكيف يسوغ الافتاء به مع انه من كلام القنية ولا يعمل بما فيها اذا خالف غيرهٗ كما صرح به ابن حبانؒ وغيره و ما في المتون قدرده الشراح و اصحاب الفتاویٰ فما اتفق على الكل اولیٰ بالتقديم فليت المصنف لم يذكر في متنه .اهـ (شامی ص:۲۶، ج:۵)

لیکن اسی کتاب میں چند ورق پہلے ''مطلب مرصد و شد مسکہ'' کے تحت میں ایک کلام سے جواز کی تائید معلوم ہوتی ہے۔ وہذا لفظہ:

و في فتاویٰ العلامة المحقق عبد الرحمن افندی مفتي دمشق جواباً لسوال عن الخلو المتعارف بما حاصله ان الحكم قد يثبت بالعرف الخاص عند بعض العلماء كالنسفي ومنه الاحكار التي جرت بها العادة في هذه الديار و ذالک بأن تمسح الارض و تعرف

لكبر و يفرض على قدر من الاذرع مبلغ معين من الدراهم و يبقى الذى يبنى فيها يؤدى ذالك القدر فى كل سنة من غير اجارة كما ذكره فى انفع الوسائل فاذا كان بحيث لو رفعت عمارته لاتستاجر باكثر تترك فى يده بأجر المثل ولكن لاينبغى أن يفتى باعتبار العرف مطلقا خوفا من ان ينفتح باب القياس عليه فى كثير من المنكرات و البدع نعم يفتى فيما دعت اليه الحاجة و جرت به فى المدة المديدة العادة و تعارفه الاعيان بلانكير كالخلو المتعارف فى الحوانيت و هو ان يجعل الواقف او المتولى او المالك على الحانوت قدراً معينا يوخذ من الساكن و يعطيه به تمسكاً شرعياً فلايملك صاحب الحانوت بعد ذالك اخراج الساكن الذى ثبت له الخلو و لا اجارتها لغيره مالم يدفع له المبلغ المرقوم فيفتى بجواز ذالك قياسا على بيع الوفاء الذى تعارفه المتاخرون احتيالاً عن الربا. اه (شامى ص: ۲۱، ۲۲، ج: ۵)

اور رسالہ ''تحریر العبارۃ فیمن ھواحق بالاجارۃ'' میں علامہ شامی کی تحقیق حسب ذیل ہے:

ذكر فى البحر عن القنية ما نصه استاجر ارضاً وقفاً و غرس فيها و بنىٰ ثم مضت مدة الاجارة فللمستاجر ان يستبقيها بأجر المثل اذا لم يكن فى ذالك ضرر و

لو ابی الموقوف علیهم الا القلع لیس لهم ذالک انتهیٰ
قال فی البحر و بهذا یعلم مسئلة الارض المحتکرة و
هی منقولة ایضاً فی اوقاف الخصاف انتهیٰ. قال
الشامیؒ قلت و حاصله ان کلام المتون و الشروح و ان
کان شاملاً للوقف و الملک لکن کلام القنیة حیث
اعتضد بما ذکره الخصاف صار مخصصا لکلام
المتون و الشروح بالملک و یکون الوقف خارجاً عن
ذالک فللمستاجر الاستبقاء بأجر المثل بشرط عدم
الضرر علی الوقف اصلا و لکن اضطرب کلام الخیر
الرملی فی فتاواه فتارة افتیٰ بهذا و تارة افتیٰ باطلاق
المتون و الشروح حیث (سئل) فی ارض سلطانیة او
وقف معدة لغراس (الی قوله) احباب نعم له الاستبقاء
حیث لا ضرر علی الجهة و لزوم الضرر علی الغارس
ثم نقل ما مر عن القنیة و البحر ثم قال و انت علی علم
ان الشرع یأبی الضرر خصوصاً و الناس علی هذا و فی
القلع ضرر علیهم و فی الحدیث الشریف عن النبی
المختار لاضرر ولاضرار. و اللّٰه تعالیٰ اعلم (ثم ذکر
الشامی عدة فتاویٰ منه علی خلاف ذالک ثم قال) و
یمکن الجواب عما افتیٰ به اولاً بابداء الفارق و هو ان
الارض فی السوال الاول معدة للغرس و لان تبقی فی
ایدی غارسها بأجرة المثل کما هو مصرح به فی صدر
السوال فاذا کانت العادة فیها جاریة علی ذالک فتصیر

كأن الواقف شرط فيها ذالك فيتبع شرطه كالاراضى السلطانية المعدة لذالك ايضاً و يكون المستاجر احق بها لان له فيها حق القرار و هو المعبر عنه بالكردار (ثم اورد الشامىؒ فتاوىٰ عديدة فى جواز الاستبقاء فى ارض الوقف و الاراضى السلطانية ثم قال) :

تنبيه

قد يثبت حق القرار بغير البناء و الغرس بأن تكون الارض معطلة فيستاجرها من المتكلم عليها ليصلحها للزراعة و يحرثها ويكبسها و هو المسمىٰ بمشد المسكة فلاتنزع من يده مادام يدفع ما عليها من القسم المتعارف كالعشر و نحوه و اذا مات من ابن توجد لابنه (الى قوله) ثم نقل عن مجموعة عبدالله افندى انها عند عدم الابن تعطىٰ لبنته فان لم توجد فلأخيه لاب فان لم يوجد فلاخته الساكنة فيها فان لم توجد فلامه (و ذكر العلائى) فى خراج الدر المنتقى تنتقل للابن و لاتعطىٰ البنت حصة و ان لم يترك ابناً بل بنتاً لاتعطى و يعطيها صاحب التيمار لمن اراد . اه وفى الحامدية ايضاً فى مزرعة وقف تعطلت بسبب تعطل قناتها و دثورها اجرها الناظر لمن يعزل قناتها و يعمرها من ماله ليكون مرصداً له عليها للضرورة الداعية و اذن له بحرثها و كسبها بالتراب و تسويتها ليكون له حق

القرار فيها المعبر عنه بالمسكة و بالغراس و البناء ليكون ذالك ملكاً له فانه يصح (ثم ذكر) عن القنية و الحاوی الزاهدی انه يثبت حق القرار فی ثلاثين سنة فی الارض السلطانية و الملك و الوقف فی ثلاث سنين . اه (ثم ذكر فذلكة الكلام فی فصل فقال) ان المستاجر بعد فراغ مدة اجارته يلزمه تسليم الارض و ليس له استبقاء نباته او غرسه بلارضی المتكلم علی الارض (الی قوله) و هذا شامل الارض الملك و الوقف الا اذا كانت ارض الوقف معدة لذالك كالقریٰ و المزارع اللتی اعدت للزراعة و الاستبقاء فی ايدی فلاحيها الساكنين فيها والخارجين منها باجرة المثل من الدراهم او بقسم من الخارج كنصفه و ربعه و نحو ذالك و مثل ذالك الاراضی السلطانية فان ذالك كله لايتم عمارته و الانتفاع به المعتبر الا ببقائه بايدی المزارعين فانه لولا ذالك ماسكن اهل القریٰ المذكورة فيها فانهم اذا علموا انهم اذا فلحوا الارض و كروا انهارها و غرسوا فيها اخذت منهم و اخرجوا منها مافعلوا ذالك و لا سكنوها فكانت الضرورة داعية الی بقائها بايديهم اذا كان لهم فيها كردار او مشد مسكة ماداموا يدفعون اجرة مثلها و لم يعطلوها ثلاث سنين كما مر (تحرير العبارة جزء رسائل ابن عابدين، ص: ۱۵۴، ج: ۲)

علامہ شامی کی ان تمام عبارات وروایات میں تطبیق اوران کی رائے جوان کی مجموعۂ عبارات سے مستفاد ہے، یہ ہے کہ اراضی وقف اوراراضی سلطانیہ جبکہ ان کو آباد کرنے اوران سے معتد بہ فائدہ اٹھانے کا کوئی ذریعہ بدوں اس کے نہ ہو کہ وہ کرایہ دار یا مزارع کو بطور پٹہ دوامی دے دی جاویں، اوران کو حق قرار دیا جائے، تو ان زمینوں کو بطرز مذکور اجارہ پر دے دیں، اور ہمیشہ نسلاً بعد نسل ان کا قبضہ تسلیم کر لینا اس شرط سے جائز ہے، کہ وہ اس زمین کی اجرت مثل ہمیشہ ادا کرتے رہیں، اوراس کو تین سال تک معطل نہ چھوڑیں، اور وقف کا کوئی ضرر اس سے محسوس نہ کیا جائے، اور جب یہ معاملہ جائز ہوا تو متولیٔ وقف کو اس کی پابندی اس وقت تک لازم ہے جب تک کہ کاشتکار یا کرایہ دار سے شرائط مذکورہ میں سے کسی کی خلاف ورزی سرزد نہ ہو۔ ردالمحتار اور رسالہ تحریر العبارۃ میں جس جگہ جواز مذکور ہے، اس کا یہی محمل ہے، اور جب کسی وقت شرائط مذکور میں سے کسی کی خلاف ورزی ہونے لگے، تو متولیٔ وقف کو قبضہ میں چھوڑنا اوران کو قبضہ میں رکھنا ناجائز وحرام ہے۔ ردالمحتار کی کتاب الاجارہ میں عدم جواز کا فتویٰ جو شامیؒ کی عبارت مذکورہ میں گذرا، اسکا یہی محمل ہے اوراس کا سبب علامہ شامی نے تحریر العبارۃ میں بھی ان الفاظ سے بیان کیا ہے، کہ "وھذا کلہ غیر واقع فی زماننا" جس کا حاصل یہ ہے کہ شامی کے کلام میں کوئی اضطراب نہیں، بلکہ وہ تحقق شرائط کی صورت میں جواز کے قائل ہیں، اور فقدانِ شرائط کی صورت میں عدم جواز کے، جن واقعات میں انہوں نے عدم جواز کا فتویٰ دیا ہے، وہ وہی ہیں، جوان کے زمانے میں پیش آئے، اور جن میں ان کو عدمِ تحقق شرائط کا جزم ہو گیا ہے، اس کلام سے یہ تو معلوم وواضح ہو گیا کہ پٹہ دوامی اور موروثیت کی صورت اگرچہ عامۂ متون و شروح کے بظاہر خلاف ہے، لیکن قنیہ، خصاف، خیریہ، حامدیہ، اور شامی وغیرہ کی تحقیق کے مطابق خاص خاص صورتوں میں جائز ہے، جن کا ذکر ابتدائے تحریر میں آچکا ہے،

پھر ان صورتوں کا جواز اراضیٔ وقف اور اراضی سلطانیہ، جنھیں اراضیٔ بیت المال بھی کہا جا سکتا ہے، ان میں تو تمام کتب مذکورہ میں مصرح ہے، مگر وہ اراضی جو کسی خاص شخص کی ملک ہوں، شامی کی عام عبارات سے معلوم ہوتا ہے، کہ ان میں یہ صورت جائز نہیں، کما قال الشامیؒ فی تحریر العبارۃ:

و الفرق ان الوقف معد للایجار فایجارہ من ذی الید باجرۃ مثلہ اولی من ایجارہ من اجنبی لما فیہ من النظر للوقف و النظر للمستاجر الذی وضع السکنیٰ بالاذن و ثبت لہ حق القرار بخلاف الملک فان لصاحبہ ان لایوجر لیسکنہ بنفسہ او یعیرہٗ او یرھنہ او یبیعہ او یعطلہ (رسائل ابن عابدین ص: ۱۵۴، ج: ۲)

و قال فی اجارۃ رد المحتار تحت قول الدر "و لو استأجر ارض وقف و غرس فیھا الخ" قید بالوقف لما فی الخیریۃ عن الحاوی الزاھدی عن الاسرار من قولہ بخلاف ما اذا استأجر ارضا ملکا لیس للمستاجر ان یستبقیھا کذالک ان أبی المالک الا القلع بل یقلعہ علی ذالک الا اذا کانت قیمۃ الغراس اکثر من قیمۃ الارض فیضمن المستاجر قیمۃ الارض للمالک فیکون الغراس و الارض للغارس و فی العکس یضمن المالک قیمۃ الاغراس فتکون الارض و الاشجار لہ و کذا الحکم فی العاریۃ. اھ (شامی ص: ۲۶، ج: ۵)

لیکن علامہ محقق عبدالرحمٰن آفندی کی عبارتِ منقولہ از شامی (ص: ۲۱، ۲۲،

ج:۵) نیز قنیہ اور حاوی زاہدی کی عبارتِ منقولہ از تحریر العبارۃ جو اوپر منقول ہو چکی ہے، ان سے معلوم ہوتا ہے، کہ اراضی ملک میں بھی یہ معاملہ جاری ہو سکتا ہے، اور خود علامہ شامی کی عبارتِ منقولہ از رد المختار جو ابھی گذری ہے، اس میں بھی املاک میں مطلقاً اس معاملہ کو رد نہیں کیا، بلکہ فیصلہ یہ کیا ہے، کہ کرایہ دار یا کاشتکار نے جو مکان یا درخت کرایہ کی زمین پر نصب کر لئے ہیں، اگر ان کی قیمت زمین کی قیمت سے کم ہو، تب تو کرایہ دار زمین کی قیمت ادا کر کے اس کا بالکلیہ مالک ہو جائے گا، اور اگر قیمت زمین کی زائد ہے، تو زمیندار اس درخت یا تعمیر کی قیمت ادا کر کے مجموعہ کا مالک ہو جائے گا، یہ نہیں کہ بہر صورت زمیندار کو یہ حق دیا جائے کہ وہ اپنی تعمیر یا قائم کردہ درخت وہاں سے اٹھا لے، بناء علیہ احقر کا یہ خیال ہے، (واللہ تعالیٰ اعلم) کہ یہ معاملہ پٹہ دوامی کا جس طرح اوقاف یا اراضی سلطانیہ میں بضرورت جائز رکھا گیا ہے، املاکِ خاصہ میں بھی عند الضرورت جائز ہے، یعنی اگر کوئی زمیندار اپنی زمین کا پٹہ دوامی کسی کو لکھ دے، اور ہمیشہ کے لئے حق قرار اسے دے دے، تو زمیندار کو ہمیشہ اس کا پابند رہنا لازمی ہو گا، اور اس کے بعد اس کے وارثوں کو بھی اس کی پابندی لازم ہو گی، بشرطیکہ کرایہ دار اس کی اجرت مثل ہمیشہ ادا کرتا رہے، یعنی اگر کسی وقت جائیداد کی شرح کرایہ بڑھ جائے، تو وہ اس زیادتی کو بھی قبول کر کے ادا کرتا رہے، اور مسلسل تین سال تک زمین کو معطل نہ چھوڑے، البتہ اگر کرایہ دار ان شرطوں میں سے کسی کی خلاف ورزی کرے، مثلاً جائیداد کی اجرت ادا نہ کرے، یا بوجہ افلاس ادا نہ کر سکے، یا کرایہ بڑھ جانے کی صورت میں زائد کرایہ نہ ادا کر سکے، یا جائیداد کو تین سال تک معطل چھوڑ دے، ان سب صورتوں میں اس کا حق ساقط ہو جائے گا۔

اس تنقیح کے اصل بعد اصل سوالات کے جواب اس طرح سمجھنے چاہییں:

۱:......اگر زمیندار نے صراحۃً پٹہ دوامی لکھ دیا ہے، اور کرایہ دار کو حق استقرار دائمی دے دیا ہے۔ تو متعاقدین میں سے کسی ایک کے انتقال سے یہ معاہدہ باطل نہ ہوگا، (مگر محض اس بناء پر کہ رائج الوقت قانون میں ہے کہ کرایہ دار یا کاشتکار کو مطلقاً حقِ استقرار حاصل ہے، شرعاً یہ معاملہ دائمی اور پٹہ دوامی قرار نہ دیا جائے گا، اگر چہ زمین دار اور کرایہ دار دونوں کو اس قانون کا پورا علم ہو)۔

۲:......موروثی کاشتکاری کا جو مفہوم اس وقت معروف و مشہور ہے کہ جس وقت کاشتکار نے ایک مرتبہ زمین میں ہل ڈال دیا وہ موروثی یا دخیل کار ہو گیا، اور زمین دار اس کو بے دخل نہیں کر سکتا، یہ تو سراسر ظلم اور ناجائز ہے، پٹہ دوامی کی صورت اس سے جدا ہے، وہ حسب تحریر مذکور جائز ہے۔

۳:......معاہدہ بشرائط مذکورہ باطل ہی نہیں ہے لہٰذا اس کے جواب کی ضرورت ہی نہیں۔

۴:......اس کا جواب بھی وہی ہے جو نمبر ۳ میں گذرا۔

۵:......حسبِ تحقیق مذکور بشرائط مذکورہ رکھ سکتا ہے۔

۶:......اس کا حکم نمبر ۲ میں گذر گیا۔

تنبیہ

پٹہ دوامی کا معاملہ اگر حکومت موجودہ سے کیا گیا ہے، یا کسی وقف زمین کے متعلق ہے، تو اس میں جواز اس معاملہ کا خصاف اور قنیہ کے موافق شامی اور بحر وغیرہ میں منقول ومصرح ہے، اس میں تو احقر کے نزدیک کوئی شبہ نہیں ہے، لیکن جو زمین کسی زمین دار کی ملک خاص ہو، اس کے بارہ میں چونکہ ان فقہاء متاخرین کے کلام بھی کچھ مختلف ہیں۔ اس لئے بہتر یہ ہے، کہ دوسرے علماء سے بھی اس کی تحقیق کرلی جائے۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

احقر

محمد شفیع عفی عنہ

ربیع الثانی ۱۳۶۲ھ

۶۸

زمیندارہ بل

پر شرعی تنقید

تاریخ تالیف	ذوالحجہ ۱۳۶۵ھ (مطابق ۱۹۴۵ء)
مقامِ تالیف	دارالعلوم دیوبند
اشاعت اول	——— از دیوبند ۱۳۶۶ھ بہ ترتیب حضرت مولانا محمد متین خطیبؒ ——— نائب ناظم جمعیۃ علماء اسلام ھند۔

متحدہ ہندوستان میں یو۔ پی گورنمنٹ نے زمیندارہ بل کے نام سے ایک قانون جاری کیا جس میں اشتراکیت کے زیر اثر مملوکہ اور موقوفہ اراضی کو بحق سرکار ضبط کیا جانا تھا اس بل سے متعلق سات سوالات کا شرعی جواب حضرت مفتی صاحب قدس سرہٗ نے تحریر کیا جو کتابچہ کی شکل میں شائع ہوا۔ جس کے آغاز میں حضرت تھانویؒ کا فتویٰ بھی شامل تھا یہ کتابچہ اب اس مجموعہ کی زینت ہے اس کے شروع میں پیش لفظ حضرت مولانا محمد متین خطیب رحمۃ اللہ علیہ کا تحریر کردہ تھا۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ و کفی و سلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ

الاپو مغربی سر میں نیا راگ
اٹھو مسجد سے اور دامن کو جھاڑو
جنون مغربی کا دور ہے یہ
فلک کو کد ہے بگڑو اور بگاڑو

تہذیب جدید اور نئی روشنی جس کو نئی اندھیری کہنا زیادہ زیبا ہے، اس نے اقوام دنیا کے آئین تمدن و معاشرت اور اخلاق و اعمال سیرت وصورت میں جو نظر فریب مگر مہلک انقلاب پیدا کیا ہے، اس کی تباہی و بربادی اہل بصیرت پر تو پہلے واضح تھی، اور وہ لوگوں کو اس پر متنبہ بھی کرتے رہے، لیکن نوخیز طبائع پر ایک نیا نشہ چڑھا ہوا تھا، جس نے کوئی نصیحت نہ سننے دی، حوادث زمانہ کے زبردست تازیانہ نے ان کو بار بار چونکایا اور سیاستِ جدیدہ کے تباہ کن نتائج کا مشاہدہ کرادیا، مگر یورپ زدہ طبقہ کی ایک جماعت ہے، جو برابر اسی لکیر کے فقیر رہنے کو سرمایۂ سعادت سمجھتی اور اسی کی نقل اتارنے کو قوم کی فلاح و بہبودی تصور کرتی ہے۔

وہ دن دور نہیں گئے کہ سارے دانایان فرنگ سرمایہ داری کے اصول کو سرمایۂ سعادت سمجھ کر اپنی ساری دماغی قوتیں اس کی تحصیل و تکثیر میں صرف کر رہے تھے، اور اس بت کی پرستش میں وہ دین و دانش کے فرق حلال و حرام اور جائز و ناجائز کی طرف بھی کوئی

التفات نہ کرتے تھے، انسان کی فضیلت و شرافت کو صرف سرمایہ و دولت کے ساتھ تولا جاتا تھا، اس لئے ہر برے سے بر، احرام سے حرام طریقہ جو سرمایہ بڑھانے میں معین ہو، عین حکمت سمجھا جا رہا تھا، سود خوری زندگی کے لوازم میں داخل کر لی گئی تھی، سرمایہ کے اڈوں اور خزانوں پر ایسے ناگ قبضہ کر کے بیٹھ گئے تھے، کہ بعد میں آنے والوں کو وہاں تک پہنچنے کا بھی کوئی امکان نہ رہے، اور غریب و محنت کش لوگوں کے لئے بجز ان کی غلامی کے زندگی گذارنے کا کوئی سامان نہ چھوڑا گیا، اور فرنگی تقلید کے خوگر دماغوں نے اسے عین حکمت سمجھ کر قبول کیا۔

لیکن ہر چیز جب انتہا کو پہنچ جاتی ہے، تو پھر اپنی اصل کی طرف لوٹتی ہے، جفاکش مزدور نے آخر اس ناانصافی کو محسوس کیا، اور سرمایہ داری کا ردعمل اشتراکیت کی صورت میں ظاہر ہوا، جس نے سرے سے ملکیت شخصیہ ہی کو جرم ٹھہرا دیا، اور وہی فرنگی تہذیب کے دل دادہ اب اسی تیزی سے اس کے پیچھے چل کھڑے ہوئے کہ اس مقصد کے حصول میں عقل و مذہب کی ہدایات کو پس پشت ڈال کر ہر جائز و ناجائز طریق سے اشتراکیت کی حمایت اور تنقید کو نجات و فلاح سمجھ لیا گیا، لیکن جن کو حق سبحانہ تعالیٰ نے نور عقل پھر نور وحی کی نعمتِ عظمٰی عطا فرمائی، وہ ان کے پچھلے دونوں نظریات کے حق میں یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ:

اگر غفلت سے باز آیا جفا کی
تلافی کی بھی ظالم نے تو کیا کی

اقوام یورپ کی پہلی تقلید کے نتیجہ میں جو خرابیاں سامنے آئیں، اور طرزِ عمل بدلنے کی ضرورت محسوس ہوئی، تو افسوس ہے کہ پھر بھی انھیں غلط کار مقتداؤں کی تقلید میں ایک کنارہ سے دوسرے کنارہ پر پہنچ گئے سچ ہے:

الجاهل اما مفرط او مفرّط

جاہل یا بہت آگے نکل جاتا ہے، یا بہت پیچھے رہ جاتا ہے، اعتدال پر نہیں چلتا۔

قرآن حکیم نے اقوامِ دنیا کو ان دونوں تباہ کن طریقوں کے درمیان جو معتدل قانون دیا تھا، اس کی بھلائی وخوبی نہ صرف نظری وفکری درجہ میں تھی، دنیا نے اس کو برت کر اور استعمال کر کے دیکھ لیا تھا، افسوس ہے کہ ٹھوکریں کھانے کے بعد بھی مغرب زدہ دماغ اس کی طرف متوجہ نہ ہوئے۔

اسی فرنگی تقلید کے شکست خوردہ مدعیانِ عقل وتہذیب آج بھی انھیں کے دام کا شکار ہیں، اور اصولِ سرمایہ داری سے اکتائے تو اصول اشتراکیت کے پیچھے لگ گئے، وہ قومیں جن کا اپنا کوئی آئین تہذیب وتمدن نہیں، وہ اس یورپ کی اندھی تقلید میں پڑ جاتے تو تعجب نہ تھا۔ افسوس اس کا ہے کہ مسلمان جن کے ہاتھ میں قرآن مبین کا وہ روشن نظام ہے کہ بلا خوف وتردد کہا جا سکتا ہے، کہ دنیا کا امن وچین اور ہر باشندۂ ملک کا اطمینان اگر ہو سکتا ہے، تو صرف اسی کے ماتحت ہو سکتا ہے، وہ بھی اس رو میں بہہ رہے ہیں، اور نہیں سمجھتے کہ اشتراکیت کا اصول قرآن شریف اور تعلیماتِ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کھلی بغاوت ہے، جب شخصی ملکیت ہی کو جرم کہہ دیا، تو پھر زکوٰۃ وصدقات اور حج واوقاف جن کا مدار ہی شخصی ملکیت پر ہے، اور جن سے قرآن وحدیث بھرا ہوا ہے، ان کا قصہ ہی ختم ہو جاتا ہے، عبادات مالیہ کا سوال ہی باقی نہیں رہتا، اس اصول کی حمایت خدا تعالیٰ اور اس کے رسول سے کھلی بغاوت ہے۔

زمیندارہ بل

حال میں یوپی گورنمنٹ نے زمینداری ختم کرنے اور زمینوں کو ملکیتِ شخصیہ سے نکالنے کا جو قانون پاس کیا ہے، اور سنا جاتا ہے کہ بنگال میں بھی یہ قانون زیرِ تجویز ہے، یہ اسی اصول اشتراکیت کی ایک قسط ہے، جو قرآن وحدیث کی تعلیمات کے بالکل مخالف اور مالکانِ اراضی پر ظالمانہ دستبرد ہے، مسلمانوں کو اس کی حمایت کسی طرح کسی حال روا

نہیں، یہ بات اگرچہ بالکل واضح اور قرآن وحدیث پر ادنیٰ نظر رکھنے والے کے لئے بالکل جلی ہے، اس پر کسی برہان وبینہ یا فتویٰ اور دلیل کی ضرورت نہیں، لیکن بمقتضائے وقت دیندار مسلمانوں میں یہ سوالات پیدا ہوئے، سب سے پہلے اس پر ۱۳۵۶ھ مطابق ۱۹۳۷ء میں مجدد الملت حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب قدس سرہٗ کا ایک فتویٰ رسالہ النور تھانہ بھون میں شائع ہوا جو اس قانون کے پیش ہونے سے پہلے ہی کسی دوراندیش کے سوالات کے جواب میں لکھا گیا تھا، پھر حال میں یہ سوالات آئے، تو احقر محمد شفیع نے اس کا جواب مفصل لکھا جو اخبار صدق لکھنؤ، تنویر لکھنؤ، احسان لاہور وغیرہ میں شائع ہوا۔

اور حسنِ اتفاق سے ایک فتویٰ قطبِ عالم حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہٗ کا بھی مل گیا، جو بصورت اشتہار مولانا موصوف کی حیات میں شائع ہوا، اور اس پر کل اکابرِ امت علمائے دیوبند وسہارن پور وتھانہ بھون وغیرہ کے دستخط ثبت ہیں، یہ فتویٰ اگرچہ زمینداری ختم کرنے کے تصورات سے پہلے زمانہ کا ہے، اور حق موروثیت کے متعلق ہے، لیکن اس میں یہ بات واضح طور پر مذکور ہے، کہ ان بزرگوں کے نزدیک ہندوستان کی اراضی ملکیتِ زمینداراں ہے، ان کی مرضی کے خلاف ان زمینوں میں ہر ادنیٰ تصرف کو بھی یہ عمائدِ امت حرام قرار دیتے ہیں، ہم یہ تینوں فتوے یک جا شائع کر کے مسلمانوں سے درخواست کرتے ہیں کہ خدارا غفلت کو چھوڑ کر اس اشتراکیت کے فتنہ کو جو اسلامی شریعت کے لئے بالکل اعلانِ جنگ ہے، روکنے اور مسلمانوں کو اس پر متنبہ کرنے میں پوری ہمت سے کوشش کریں۔ واللہ المستعان

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ دیوبند

۱۳۶۶ھ ربیع الثانی

فتویٰ حضرت حکیم الامۃ مجدد الملۃ

حضرت مولانا شاہ اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہٗ

السوال:...... کیا فرماتے ہیں، علماء دین ومفتیان شرع متین مسائل ذیل میں:

ا:...... صوبہ یوپی میں زمینداریاں اور ارضیات صدہا سال سے زمینداروں کی اس طرح ملکیت میں ہیں، کہ وہ بیع، ہبہ، تملیک، وراثت، وقف وغیرہ کے ذریعہ سے ہر حکومت کے عہد میں بطور جائز ہمیشہ منتقل کرتے رہے ہیں، اور زمینداران اپنی ارضیات میں دوسروں سے کاشت کرا کر پیداوار میں سے یا نصف غلہ اور جنس کی بٹائی کر لیتے ہیں، یا زر نقد مقرر کر کے وصول کرتے رہتے ہیں، سوال یہ ہے کہ مذکورہ بالا ملکیت کی صورت اور کاشت کا طریقہ جو یوپی میں رائج ہے اسلام کی پہلی صدیوں میں اس کا وجود ملتا ہے، یا نہیں؟ زید کا خیال ہے کہ اس سسٹم (طریقہ) کا پتہ اسلام میں نہیں ہے۔

۲:...... اس قسم کی اراضیات کی ملکیت اور اس طریقہ سے دوسروں سے کاشت کرانا شریعت اسلامیہ اور فقہ کی رو سے جائز ہے یا نہیں؟ اور پیداوار میں سے مالک کے حق کی مقدار شریعت مقدسہ نے کس قدر مقرر کی ہے۔

۳:...... اگر یہ ملکیت اور یہ طریقہ جائز ہے، تو مالک اراضی کے لئے اپنے حقوق ملکیت کو اور اس قدر مفاد کو جس قدر کہ فقہ میں جائز قرار دیا گیا ہو، محفوظ رکھنے کی نفس کوشش کرنا درست ہے یا ناجائز؟

۴:...... زید کے اس دعویٰ کو صحیح فرض کرتے ہوئے کہ (زمیندار) انگریز شاہنشاہیت کی پیدا کردہ جماعت ہے، اور انگریزوں نے اپنی حکومت کو مضبوط اور پائدار

بنانے کے لئے اس کی بنیاد ڈالی ہے، ارشاد فرمایا جاوے کہ موجودہ زمینداریاں اور ان کے حقوق مالکانہ جواب وارثانہ یا مشتریانہ یا متولیانہ ہیں، وہ جائز طور پر ہیں، یا ناجائز طریقہ سے اور ان کا منافع از روئے شرع شریف جائز و حلال ہے یا حرام؟ اور اس منافع کو صدقات و کارہائے خیر میں صرف کرنا صحیح ہے یا نادرست؟

۵:......زید کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ زمینداریاں مثل شراب کے ٹھیکہ کی ہیں، جس طرح شراب کا ٹھیکہ فسخ ہوسکتا ہے، اسی طرح زمینداروں سے ان کی مملوکہ زمینداریاں اور اراضیات بھی نکال کر کاشتکاران موجودہ کی ملکیت یا ان کے قبضہ مستقل مالکانہ مخالفانہ میں دی جاسکتی ہیں، اب فرمایا جاوے کہ سوال نمبر ۱، ۲ کے اندر مذکور زمینداریوں کی شراب کے ٹھیکہ سے مثال دینا کیا صحیح اور جائز ہے؟ اور آیا مذکورہ زمینداریاں مالک کی مرضی کے خلاف بالکل مفت یا واقعی اور بازاری قیمت سے کم معاوضہ میں شرعاً منتقل ہو سکتی ہیں، یا نہیں؟

۶:......مذکورہ بالا ارضیات کو مصارف خیر کے لئے وقف کرنا صحیح ہے یا غیر صحیح اور ان اوقاف کا بھی جبریہ انتقال جائز ہے یا نہیں؟

۷:......ایسے انتقالات کرنے والوں میں اگر کوئی عالم یا غیر عالم مسلم بھی شامل ہو، تو اس کو شرعاً اس حق تلفی کی مخالفت کرنا چاہئے یا نہیں؟

الجواب

یہ تعامل تصرفاتِ مالکانہ کا جب کوئی دلیل معارض نہ ہو، شرعاً خود دلیل مستقل ہے ملک کی اور جب تمام حکومتوں نے نیز حکومتِ حاضرہ نے ان تصرفات کو قانوناً بھی جائز رکھا، تو یہ ان کی طرف سے اس مالکیت کا اقرار اور تسلیم ہے، اور بتصریحِ فقہاء اقرار سے رجوع کرنا بدون رضائے مقرلہٗ کے جائز نہیں، اور یہ حکم اس قدر ظاہر ہے، کہ اس پر

دلائل قائم کرتے بھی شرم آتی ہے لیکن تبرعاً دلائل کی طرف بھی اجمالی اشارہ کرتا ہوں، وہ دلائل ابواب بیع و ہبہ و مزارعت و تقسیم غنائم و وقف و غیرہا کی احادیث اور بیع و ہبہ و اجارات و وقف وغیرہا کے مسائل فقہیہ ہیں جن کی قدر مشترک نصاً و اجماعاً قطعی ہے، ثبوتاً بھی اور دلالۃً بھی جو جواز شرعی کے ساتھ [۱] وقوع تاریخی پر بھی دال ہیں، بلکہ ان عقود میں جو صورتیں فاسد ہیں یا امام صاحبؒ نے مزارعت میں کلام فرمایا ہے، وہ بھی دلیل ہیں ملک کی کیونکہ اس فساد کی علت عدم ملک نہیں کہی گئی بلکہ بعض عوارض سے فساد کا حکم کیا گیا، اور جب مالکوں کا حق صحیح ثابت ہو گیا، تو اس کے لئے کوشش کرنا یقیناً جائز بلکہ بعض صورتوں میں طاعت واجب یا مستحب ہے، اور اس میں کوتاہی کرنے کو ناپسند فرمایا گیا ہے۔

کما یدل علیہ حدیث ابی داؤد عن عوف بن مالک ان النبی صلی اللّٰہ علیہ و سلم قضی بین رجلین فقال المقضی علیہ لما ادبر حسبی اللّٰہ و نعم الوکیل [۲] فقال النبی صلی اللّٰہ علیہ و سلم ان اللّٰہ تعالیٰ یلوم علی العجز و لکن علیک بالکیس فاذا غلبک امر فقل حسبی اللّٰہ و نعم الوکیل (باب الاقضیہ و الشھادات)

حتیٰ کہ اس کی حفاظت میں جان جاتی رہنے کو شہادت فرمایا گیا ہے، حدیث من قتل دون مالہ فھو شھید [۳] اس میں نص ہے، اور جب ان کی ملکیت صحیح ہے، تو

---

(۱) یعنی صرف یہی نہیں کہ ملکیت کی یہ صورت شرعاً جائز ہے بلکہ اسلام کے ہر قرن میں تاریخی طور پر ان صورتوں کا وقوع اور ان پر تعامل بھی ثابت ہے۔۱۲ محمد شفیع عفی عنہ

(۲) رسول اللہ ﷺ نے دو شخصوں کے درمیان فیصلہ فرمایا جس کے خلاف فیصلہ ہوا تھا اس نے چلتے ہوئے مجھے اللہ کافی ہے اور وہ بہتر وکیل ہے آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ بیوقوفی و بے تدبیری پر ملامت کرتے ہیں، البتہ تدبیر کرنے کے بعد تم عاجز ہو جاؤ تو اس وقت کہو کہ مجھے اللہ کافی ہے اور وہ بہتر وکیل ہے۔۱۲

(۳) جو شخص اپنے مال کی حفاظت میں مارا جائے وہ شہید ہے۔۱۲

اس سے انتفاع کے حلال وطیب ہونے میں کیا شبہ ہوسکتا ہے، الا لعارض اور اول تو کثرت سے وہی اراضی ہیں، جو حکومت حال سے پہلے سے زمینداروں کے پاس ہیں، انگریزوں کی دی ہوئی نہیں، لیکن جو انگریزوں کی بھی دی ہوئی ہیں، دینے کے بعد ان کی ملک ہوگئیں، اور جب وہ مالک ہیں، تو ملک اور ٹھیکہ کیسے جمع ہوسکتے ہیں، اس کو ٹھیکہ کہنا اور اس پر ٹھیکہ کے احکام کو متفرع کرنا خود باطل ہے، اسی طرح جب وہ مالک ہیں تو ان کی مرضی کے خلاف اس میں کسی کا کسی قسم کا تصرف کرنا خواہ بعوض ہو یا بلاعوض، خود حرام اور ظلم ہے، اور جب اراضی مملوکہ میں جو کہ فی نفسہٖ قابل انتقال ہیں ایسے تصرفات حرام ہیں، تو اوقاف میں جو کہ قابل انتقال بھی نہیں ایسے تصرفات بدرجہ اولیٰ حرام ہوں گے، اور ایسے ظلم کرنے والوں کے ساتھ اول تو شرکت ہی جائز نہیں، اور جو غلطی سے شرکت ہوگئی ہو، تو ان مظالم کے علم کے بعد جدا ہو جانا واجب ہے، اور جدا ہونے کے قبل بھی ان پر نکیر واجب ہے۔

کما قال تعالیٰ: لاتعاونوا علی الاثم و العدوان و کما قال تعالیٰ لولا ینهاهم الربانیون و الاحبار ۔الاٰیۃ واللہ اعلم

کتبہ اشرف علی

۱۲ رجب ۱۳۵۶ھ

فتویٰ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب
مفتی دیوبند
مع تصدیقات اکابر علماء

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین حسب ذیل مسائل میں:

۱:.....موجودہ زمینداریاں زمین دار کی ملک صحیح ہیں یا نہیں؟

۲:.....تنسیخ زمین داری کا قانون جو کانگریس نے پاس کیا ہے، اس کی رو سے برائے نام معاوضہ لے کر زمینداریوں پر قبضہ کیا جائے گا، شرعاً یہ غصب جائز ہے یا نہیں؟

۳:.....جو زمینداریاں موقوفہ ہیں وہ بھی زمینداری بل سے مستثنیٰ نہیں ہیں یہ صریح ملکیتِ شرعیہ ودینیہ کا غصب ہے یا نہیں؟

۴:.....مسلمانوں پر اس غصب ملکیت شرعیہ ونفسیہ کو بچانے کی جدوجہد کرنا اور اجتماعی قوت سے اس لوٹ مار وذلت سے بچنے کی تدابیر کرنا لازم وضروری ہے یا نہیں؟

۵:.....اپنی ملکیت کو بچاتے ہوئے جو شخص مقتول ہو وہ شہید ہے یا نہیں؟

۶:.....اس ابتلائے عام میں ساکت رہنے والا اس لوٹ وغصب کا مؤید اور تعاون بالعدوان کا مرتکب ہے یا نہیں؟

۷:.....چونکہ زمینداری کا اثر ہر زمیندار پر ہے لہٰذا اس کے خلاف جدوجہد میں فساق و مبتدعین بلکہ کافر و جابر کو اگر وہ شامل ہونا چاہیں، شامل کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟

بیّنوا تؤجروا

الجواب

ا:......موجودہ زمینداریاں بلاشبہ ان لوگوں کی ملک صحیح ہیں، جن کا نام کاغذاتِ سرکاری کے خانۂ ملکیت میں درج ہے، اور وہ ان میں مالکانہ تصرفات کرتے ہیں، محمد ابن قاسم ثقفی جو ہندوستان کے پہلے فاتح ہیں، ان کے عہد سے لے کر بعد کے تمام مسلم سلاطین کے فرامین وقوانین اس پر شاہد ہیں جن کی تفصیلات احقر کے رسالہ ''القول الماضی فی احکام الاراضی (ا)'' میں مذکور ہے انگریز حکومت نے بھی اول فتح سے آج تک اس ملکیت کو برقرار رکھا ہے، جس پر اس سلطنت کے ذمہ داروں کے بیانات کے علاوہ حکومت موجودہ کا یہ طرز عمل خود شاہد عدل ہے کہ تمام مالکانہ تصرفات بیع وشراء، رہن وہبہ اور وقف وصدقہ وغیرہ کے اختیارات کو ان لوگوں کے حق میں تسلیم کیا، اور بزورِ قانون خود ان کو نافذ کیا ہے، اور کر رہی ہے، بہت سے لوگوں نے حکومت سے بڑی بڑی رقمیں دے کر زمینیں خریدی ہیں، اور بہت سے مواقع میں حکومت بھی اپنی ضرورت کے وقت ان کی زمینیں قیمت ادا کر کے خریدتی ہے، یہ سب چیزیں ان کی ملکیت کا بین ثبوت ہیں یہ مالکانہ قبضہ اور تصرفات بلانکیر خود سب سے بڑی اور واضح دلیل ملک کی ہے، جس کے ہوتے ہوئے اصحابِ اراضی سے ثبوت ملکیت کے لئے کسی مزید دلیل اور بینہ کا مطالبہ کرنا بھی حسب تصریحات فقہاء درست نہیں، حضرات فقہاء نے مصر وشام اور عراق میں جہاں کی زمینوں کے متعلق وقف ہونے کا احتمال غالب ہے، وہاں بھی جن اراضی پر لوگوں کو مالکانہ تصرفات کرتے ہوئے پایا گیا ان کی ملک صحیح قرار دی، اور حکام وقت کو اس کی بھی اجازت نہیں دی کہ وہ ان سے شہادت وثبوت ملکیت کا طلب کریں، ساتویں صدی ہجری کے اوائل میں سلطان مصر ملک ظاہر بیبرس نے ایک مرتبہ یہ ارادہ کیا تھا کہ

(ا) یہ رسالہ اسلام کا نظام اراضی کے نام سے کراچی میں چھپ چکا ہے۔

وہاں کی جو زمینیں لوگوں کے مالکانہ قبضہ میں ہیں، ان سے بذریعہ اسناد کاغذات قدیمہ اس کا ثبوت طلب کرے، کہ وہ جائز طور سے ان کی ملکیت میں آئی ہیں، اور جو ایسا ثبوت پیش نہ کر سکے، اس سے زمین لے کر بیت المال کے لئے وقف کر دیں۔

اس زمانہ کے شیخ الاسلام امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے سلطان وقت کو اس سے روکا، اور یہ بتلایا کہ ایسا کرنا کسی مذہب میں حلال نہیں علماء مذاہب کا اس پر اجماع واتفاق ہے، اور بار بار حکام وقت کو اس پر متنبہ کیا یہاں تک کہ وہ اس ارادے سے باز رہے، علامہ شامی نے باب الجزیۃ والخراج میں یہ واقعہ نقل فرمایا ہے۔ جس کے چند کلمات یہ ہیں:

الملک الظاهر بيبرس اراد مطالبة ذوی العقارات بمستندات تشهد لهم بالملک و الا انتزعها من ايديهم متعللا بما تعلل به ذالک الظالم فقام عليه شيخ الاسلام الامام النووی و اعلمه بان ذالک غاية الجهل و العناد و انه لايحل عند احد من علماء المسلمين بل من في يديه شئ فهو ملكه لايحل لاحد الاعتراض عليه ولا يكلف اثباته ببينة و لم يزل النووی يشنع على السلطان و يعظه الى ان كف عن ذالک .

شامی ص:۲۵۵، ج:۳

ترجمہ: سلطان ظاہر بیبرس نے ارادہ کیا کہ زمینداروں سے ایسی سندات وثبوت طلب کریں، جن سے ان کی ملکیت ثابت ہو اور جو ایسی سندات پیش نہ کر سکے، اس کی زمین اس سے لے لی جاوے، اور اپنے اس فعل کے لئے وہی حیلے بیان کئے، جو اس ظالم بادشاہ نے اختراع کئے تھے، تو اس کے مقابلے کے لئے شیخ الاسلام امام نووی کھڑے ہوئے اور سلطان ظاہر کو بتلایا کہ یہ عمل

انتہائی جہالت و عناد ہے، اور علمائے اسلام میں سے کسی کے نزدیک حلال نہیں بلکہ جس شخص کے ہاتھ میں جو چیز ہے وہ اس کی ملک ہے، اس سے کوئی تعارض کرنا یا ملکیت کو شہادت وغیرہ سے ثابت کرنے کی تکلیف دینا جائز نہیں۔ امام نوویؒ برابر سلطان کو ملامت کرتے رہے، یہاں تک کہ وہ اپنے اس ارادے سے باز آ گئے۔

اور یہی مضمون علامہ شامی نے امام سبکی اور محقق ابن حجر مکیؒ وغیرہ سے بھی بالفاظ موکدہ نقل کیا ہے، اور حضرات علماء کا یہ اجتماع مصر و شام کی زمینوں کے بارہ میں ہے، کہ جہاں کی اراضی کے متعلق عامہ علماء کا قول یہ ہے، کہ وہ اوقاف ہیں، املاک نہیں تو جن بلاد کی اراضی عام طور پر املاک ہوں، وہاں یہ حکم اور بھی زیادہ قطعی اور ظاہر ہوگا، ہندوستان کی اراضی اس میں شبہ نہیں کہ مختلف اقسام کی ہیں، ان میں سے بعض خود حکومت کی بھی ملک ہیں، لیکن عام اراضی وہ ہیں، جو حکومت نے کسی کو بطور عطیہ دے دی یا اس نے حکومت سے قیمت دے کر خریدی یا فتح سے پہلے جو لوگ زمینوں کے مالک و قابض تھے، انھیں کی ملکیت کو انگریز حکومت نے باقی رکھا، غرض یہاں کی عام زمینوں کا ملکیت ہونا ایسا ظاہر اور صاف ہے کہ مالکان اراضی کو اس پر شہادت و بینہ کی تکلیف دینا بھی باجماعِ مسلمین و باتفاقِ مذاہب ظلم ہے۔

۲:...... بلاشبہ غصب صریح ہے جس کا کسی سلطان مسلم اور امام و امیر کو بھی حق نہیں غیر مسلم حکومت کو کیسے ہوسکتا ہے، حضرت امام ابو یوسف نے کتاب الخراج میں فرمایا ہے۔

ولیس للامام ان یخرج شیئا من ید احد الا بحق ثابت معروف۔ (شامی ص:۳۵۴، ج:۳)

امام مسلمین کے لئے جائز نہیں کہ کسی شخص کے ہاتھ سے کوئی

چیز نکال لے بجز اس کے کہ اس کے خلاف کوئی حق ثابت ہو، اور معروف ہو۔

اور وہ معاوضہ جس کے قبول کرنے اور زمین دینے کے لئے زمیندار بزورِ حکومت مجبور کیا جائے نہ وہ حقیقت میں معاوضہ ہے اور نہ اس کی بناء پر یہ صورت غصب کی حقیقت سے نکل سکتی ہے۔

۳:...... یہ بھی غصب صریح ہے، اور مملوکہ زمینداریوں کے غصب سے بدتر ہے کیونکہ املاک میں تو یہ احتمال بھی ہے کہ کسی وقت مالک راضی ہو جائے، تو اس پر قبضہ صحیح ہو سکے، اوقاف نہ کسی کی ملک ہیں نہ کسی کی رضاء واجازت سے دوسرے کی ملک بن سکتے ہیں، نیز جنگ کے ساتھ تغلب اور انقلاب سلطنت کے وقت فاتح سلطان کا استیلاء و قبضہ بھی ہرگز اثر انداز نہیں ہوسکتا، خواہ استیلاء سلطان مسلم کا ہو یا غیر مسلم کا۔ امام خصاف کی کتاب الاوقاف میں اس پر تصریح موجود ہے۔

بہر حال اوقاف کا غصب املاک کے غصب سے زیادہ اظلم واشنع ہے۔

۴:...... بے شک مسلمانوں پر لازم اور واجب ہے، کہ اس لوٹ اور غصب، کے خلاف مقدور بھر پوری کوشش کریں کیونکہ اس کا پس منظر اگر غور سے دیکھا جائے، تو فقط زمینوں کی لوٹ نہیں بلکہ مطلقاً مذہب اور تمام مذہبی شعائر کا ہدم ہے، کیونکہ یہ قانون جس نظریہ کی پہلی قسط ہے، وہ سوشل ازم کا نظریہ ہے، جس میں کسی چیز پر کسی شخص کی شخصی ملکیت نہیں رہتی اگر خدانخواستہ یہ راستہ کھلا، تو کوئی شخص کسی چیز کا مالک نہیں رہتا اور جب مالک نہیں رہتا، تو عبادات مالیہ زکوٰۃ وصدقات حج اور اوقاف سرے سے ختم ہوئے جاتے ہیں۔

یہی سبب ہے کہ جس ناپاک سرزمین سے اس نظریہ کی ابتداء ہوئی، اس میں سب سے پہلے مطلقاً مذہب اور خدا پرستی کے خلاف کھلی جنگ کی گئی، خدا پرستی اور مذہبیت کو

سب سے بڑا جرم قرار دیا گیا، اس لئے مسلمانوں پر فرض ہے کہ وہ اس قانون کے منسوخ کرانے میں اپنی طاقت وقدرت کے موافق پوری کوشش کریں۔

۵:...... حسب فرمان نبوی صلی اللہ علیہ وسلم وہ شخص شہید ہے، حدیث میں ہے:

من قتل دون دينه فهو شهيد و من قتل دون عرضه فهو شهيد و من قتل دون ماله فهو شهيد۔

جو شخص اپنے دین کی حفاظت کے لئے قتل ہو جاوے، وہ شہید ہے، اور جو شہید اپنی آبرو کی حفاظت میں قتل ہو جاوے، وہ شہید ہے، اور جو اپنے مال کی حفاظت میں قتل کر دیا جادے، وہ شہید ہے۔

علاوہ ازیں اگر اس قانون کی حقیقت پر نظر کر کے دین ومذہب کی حفاظت کی نیت سے، جدوجہد کی جاوے، تو اس کی شہادت اور بھی زیادہ واضح ہو جاتی ہے۔

۶:...... جب تک حق بات کے اظہار پر قدرت ہو سکوت حرام ہے، اور اعانت معصیت اور فرمان الٰہی ولاتعاونوا علی الاثم والعدوان کے خلاف ہے ہاں عاجز ومضطر کے احکام جدا ہیں۔

۷:...... جب تک یہ تحریک محض درخواستیں دینے اور حکام وقت سے آئینی احتجاج کی حد تک ہے، اور اس وقت تک مسلم وغیر مسلم کی شرکت اس میں بلاشرط ہو سکتی ہے، ہاں اس سے آگے بڑھے تو اس کے لئے کچھ شرائط ہیں، جو وقت پر تحقیق کرنے سے معلوم ہو سکیں گی، اور مسلمان خواہ فاسق فاجر بدعتی یا کسی اسلامی فرقہ کا ہو، اس کو بہر حال اس تحریک میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہٗ الاحقر محمد شفیع عفا اللہ عنہ

۷ ذی الحجہ ۱۳۶۹ھ

الجواب صحیح
شبیر احمد عثمانی
۷ ذی الحجہ ۶۵ھ

الجواب صحیح
محمد ادریس کاندھلوی کان اللہ لہٗ
مدرس دار العلوم دیوبند

الجواب صحیح
محمد احتشام الحق مبلغ دعوۃ الحق
مقیم نئی دہلی

الجواب صحیح
ظہور الحسن غفرلہٗ
ناظم امداد الغرباء سہارنپور

الجواب صحیح

لیکن نمبر ۴ کے جواب کا یہ جز اور بھی ہے کہ اگر بالفرض آئندہ کے خدشات کا پیش خیمہ نہ قرار دیا جائے، تب بھی اس سے بچنے کی تدابیر اختیار کرنا ضروری ہے، غالباً حضرت مجیب کا بھی یہی مطلب ہے۔

اصاب المجیب

احقر جمیل احمد
خادم دار الافتاء خانقاہ اشرفیہ
تھانہ بھون ضلع مظفر نگر

ظریف احمد غفرلہٗ
مدرس مدرسہ مظاہر علوم
سہارنپور

حضرات علماء مظاہر علوم سہارنپور کے ارشادات گرامی

حامداً و مصلیاً

صوبہ یوپی کی اسمبلی میں جب سے زمیندارہ کے ختم کرنے کی تجویز پاس ہوئی ہے، زمیندار طبقہ میں ایک عام ہیجان ہے، اور اس سلسلہ میں علماء سے بھی سوالات کئے جا رہے ہیں، دارالافتاء مظاہر علوم میں بھی بہت سے سوالات آئے، اور ہم نے موجودہ حالات کے پیش نظر قانونِ اسلام کے مطابق ان کے جوابات بھی لکھے ہیں مگر ابھی چونکہ اس بل کا مسودہ شائع نہیں کیا گیا اس لئے اس پر ابھی ہم کوئی رائے زنی قطعی طور سے نہیں کر سکتے، البتہ اصولِ شرعیہ کی روشنی میں بلاخوف لومۃ لائم مختصراً اس حقیقت کا اظہار کرنا اور کانگرسی حکومت اور اسمبلی کے ممبران کو اس طرف توجہ دلانا ضروری سمجھتے ہیں، کہ شرعی نقطہ نظر سے کسی کی مملوکہ زمین کا ضبط کرنا یا مالک کو اس کی بیع پر مجبور کرنا ہرگز جائز نہیں ہے، مسلمان ایسی مداخلت کو ہرگز برداشت نہیں کر سکتے، لہٰذا ارکانِ حکومت کو چاہئے کہ مسودہ میں مذکورہ بالا حقیقت کو نظر انداز نہ کریں، فقط واللّٰہ یھدی من یشاء الی صراط مستقیم۔

جوابات صحیح ہیں

عبدالرحمٰن
از مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور
۶۶/۳/۲۸

سعید احمد غفرلہٗ
مفتی مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور
۲۷ ربیع الاول ۶۶ھ

یہ مضمون بالکل درست نیز حکومت وقت کے لئے برمحل اور نہایت ضروری تنبیہ ہے۔

محمد اسعد اللہ
۲۹ ربیع الاول ۶۶ھ

صحیح
عبدالمطلب ناظم مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور

فتویٰ قطبِ (۱) عالم ابوحنیفۂ وقت

حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی قدس سرہٗ

مع تصدیقات دیگر اکابرامت

سوال...... کیا فرماتے ہیں، علماء دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ حاکمان وقت نے ایک حق کاشتکار کا قانونی قائم رکھا ہے، وہ حق یہ ہے کہ جس کاشتکار نے زمین ملکیت کسی زمیندار کی عرصہ بارہ برس تلک متواتر کسی لگان پر کاشت کرلی، وہ کاشتکار موروثی متصور ہوگیا، اس کو بلاوجہ کسی قانونی عمل کے اس اراضی سے بے دخل نہیں کرسکتا، اور نہ بلا نالش عدالت کچھ لگان کا اضافہ کرسکتا ہے، اگرچہ وہ زمین ایسی کامل ہو کہ اگر وہ کاشتکار اس زمین کو چھوڑ دے، تو وہ زمین اور کاشتکار غیر موروثی اس لگان مقررہ موروثی سے دو چند بلکہ سہ چند پر بخوشی زمیندار سے لے لیوے، اور اس کاشتکار کو قانوناً یہ استحقاق بھی حاصل ہے کہ اپنی طرف سے بلا رضامندی مالک زمین دوسرے کاشتکار کو اس لگان سے جو زمیندار کو خود دیتا ہے، دو چند اور سہ چند لگان دے کر وہ منافع جو زیادہ لگان پر دی ہے، اپنے قبضہ تصرف میں لاوے اور زمیندار بوجہ حکم حاکم وقت و پابندی قانون کچھ دم زنی نہیں کرسکتا، اور دل سے اس کاشت کار کی کاشت اور منافع اس کا سخت اسے ناگوار ہے، اندریں صورت بروئے شرع شریف وہ منافع جو اس کی کاشت سے یا دوسرے مزارع سے اس کو حاصل ہوتا ہے، درست اور جائز ہے، یا نہیں۔ اور عند اللہ وہ

---

(۱) یہ فتویٰ حضرت گنگوہی قدس سرہ کے زمانہ میں بصورت اشتہار شائع ہوا تھا یہ مطبوعہ اشتہار دفتر جمعیت علماء اسلام میں محفوظ ہے۔

حق اس زمیندار کا ہے، یا اس کاشتکار موروثی کا جو بوجہ حکم حاکم وقت حاصل کرتا ہے، اور جو نا جائز ہے، وہ کس قسم سے ہے، آیا مکروہ ہے، یا حرام ہے؟ بینوا توجروا

الجواب

حق موروثیت شرعاً کوئی شے نہیں ہے، اور مالک کو استحقاق اپنی زمین واپس لے لینے کا ہے، اگرچہ کاشتکار نے سو برس تک کاشت کیا ہو اور جو شخص کہ بلا مرضی مالک کے اس کی زمین وغیرہ رکھ لیتا ہے، اور مالک کو قبضہ نہیں کرنے دیتا وہ شخص غاصب اور ظالم ہے، اور یہ فعل اس کا حرام ہے، اس پر مواخذہ سخت ہوگا، اور جس قدر اس زمین کا اجر مثل ہے، اس قدر کاشت کار کے ذمہ واجب الاداء ہے، اور مالک کو اس کا مطالبہ شرعاً پہنچتا ہے، مثلاً اگر وہ زمین پندرہ روپیہ سالانہ کے اجارہ کی ہے، اور کاشتکار مالک کو دس روپیہ سالانہ دیتا ہے، اور مالک پندرہ سے کم پر راضی نہیں ہے، تو پانچ روپیہ سالانہ کا مطالبہ بذمہ کاشتکار باقی ہے، اگر مالک نے معاف نہ کیا تو آخرت میں دَین دار ہوگا۔

قال العلامة الشامی ناقلاً عن الذخیرة قالوا ان کانت الارض معدة للزراعة بان کانت الارض فی قریة اعتاد اهلها زراعة ارض الغیر و کان صاحبها ممن لایزرع بنفسه و یدفع ارضه مزارعة فذالک علی الزراعة و لصاحب الارض ان یطالب المزارع بحصة الدهقان علی ما هو متعارف اهل القریة النصف او الربع او ما اشبهه و هکذا ذکر فی فتاویٰ النسفی وهو نظیر الدار المعدة للاجارة اذا سکنها انسان فانه یحمل علی الاجارة و کذا ههنا و علی هذا ادرکت مشائخ زمانی و الذی تقرر عندی و عرضت علی من اثق به ان الارض

ان كانت معدة للزراعة تكون هذه زراعة فاسدة اذ ليس فيها بيان المدة فيجب ان يكون الخارج كله للمزارع و على المزارع أجر مثل الارض انتهىٰ. اقول لكن سيذكر الشارح فى كتاب المزارعة ان المفتى به صحتها بلابيان المدة و تقع على اول زرع واحد فالظاهر ان ما عليه المشايخ مبنى على هذا انتهى كلام العلامة الشامى.

علامہ شامی نے ذخیرہ سے نقل کرتے ہوئے فرمایا کہ مشائخ نے فرمایا کہ اگر زمین زراعت کے لئے تیار کی گئی ہے، بایں طور کہ زمین ایسے گاؤں میں ہو، جس کے اہل دوسرے کی زمین جوتنے کی عادت رکھتے ہوں، اور اس کا مالک ان لوگوں میں سے ہو جو خود نہ بوتا ہو اور اپنی زمین زراعت پر دیتا ہو، تو یہ زراعت پر محمول ہوگا، اور زمین والے کو حق ہوگا کہ مزارع سے مالک زمین کے حصہ کا مطالبہ کرے جیسا متعارف ہو، اہل قریہ کے نزدیک آدھا یا چوتھائی یا اس کے مثل اور ایسا ہی فتاوی نسفی میں ذکر کیا گیا ہے، اور یہ نظیر ہے، اس مکان کی جو اجارہ کیلئے تیار کیا گیا ہو جب کوئی شخص اس میں سکونت کرے، تو وہ اجارہ پر محمول ہوگا، اور ایسا ہی یہاں پر۔ اسی پر میں نے اپنے زمانہ کے مشائخ کو پایا ہے، اور وہ بات جو میرے نزدیک ثابت ہے، اور میں نے اس شخص پر پیش کیا ہے، جس پر مجھے وثوق ہے، یہ کہ اگر زمین تیار کی گئی ہو زراعت کے لئے تو یہ زراعت فاسدہ ہوگی کیونکہ اس میں مدۃ کا بیان نہیں ہے، بس واجب ہے کہ پیداوار کل کی کل مزارع کے لئے ہو، اور

مزارع کے ذمہ زمین کی اجرت مثل ہو ختم ہوا۔ میں کہتا ہوں کہ لیکن آئندہ شارح کتاب المزارعۃ میں ذکر کریں گے، کہ مفتی بہ اجارہ بلا بیان مدۃ کی صحت ہے، جو صرف ایک سال یعنی سال اول کے لئے واقع ہوگا، پس ظاہر یہ ہے کہ مشائخ کا فتویٰ اس پر مبنی ہے۔ (ختم ہوئی عبارت علامہ شامیؒ کی)

اور جب قدر اجر مثل یا قدر حصہ مالک زمین کا ہوا تو اس کے رکھ لینے اور مالک کو نہ دینے کی حرمت احادیث صریحہ و روایات صحیحہ سے خود ثابت ہے، جس کی نقل اور اظہار کی حاجت نہیں ہے۔ واللہ اعلم۔

بندہ
رشید احمد عفی عنہ

رشید احمد
۱۳۰۱ھ

دستخط و مہر حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ

الجواب صحیح
ذوالفقار علی دیوبندی عفی عنہ
دستخط حضرت مولانا ذوالفقار علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ والد محترم حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ

الجواب صحیح
فضل الرحمٰن عفی عنہ دیوبندی
دستخط حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ والد محترم حضرت علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی مدظلہ اللہ العالی۔

الجواب صحیح

محمد منفعت علی عفی عنہ

مدرس مدرسہ عربیہ دیوبند

محمد منفعت علی

دستخط و مہر حضرت مولانا محمد منفعت علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ مشہور و معروف مدرس مدرسہ عربیہ دیوبند

الجواب صحیح حق

بندہ عزیز الرحمٰن عفی عنہ

عزیز الرحمٰن

دستخط و مہر

حضرت مولانا مولوی عزیز الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ مفتی اعظم دیوبند، برادر بزرگوار علامہ شبیر احمد صاحب

شرعاً حق موروثیت کوئی چیز نہیں، اور بحق موروثیت بلا رضا مالک زمین پر قبضہ رکھنا اور نفع اٹھانا حرام ہے۔

حررہ خلیل احمد عفی عنہ

دستخط حضرت مولانا الحاج خلیل احمد صاحب

انبہٹوی صدر مدرس و ناظم مدرسہ مظاہر علوم سہارن پور

الجواب حق صحیح

بندہ محمود عفی عنہ

دستخط حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ

الجواب صحیح

عبدالرحیم رائے پوری

دستخط حضرت مولانا عبدالرحیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ رائے پوری

صح الجواب

صدیق احمد انبہٹوی

دستخط حضرت مولانا صدیق احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ خلیفہ مجاز حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ

الجواب صواب بلا ارتیاب
محمد اشرف علی عفی عنہ دستخط حضرت حکیم
الامۃ مولانا اشرف علی صاحب تھانوی
رحمۃ اللہ علیہ

الجواب صحیح
غلام رسول عفی عنہ (دستخط استاذ الکل
مولانا غلام رسول صاحب ہزاروی
رحمۃ اللہ علیہ)

ہذا ہو الحق والحق احق ان یتبع
نور محمد عفی عنہ مہتمم مدرسہ حقانی
لودھیانوی

السوال صحیح والجواب صحیح
محمد عمر دراز عفی عنہ فتح پور

أصاب المجيب العلام
محمد حسن عفی عنہ
دستخط
حضرت مولانا محمد حسن رحمۃ اللہ علیہ
طبیب و مدرس مدرسہ دار العلوم دیوبند
و برادر حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ

الجواب صحیح والتحقیق نقیح
مغیث الدین ساڈھوروی

٦٩

اسلامی نظام میں
معاشی اصلاحات کیا ہونگی ؟

تاریخ تالیف ـــــــــ رمضان المبارک ۱۳۸۹ھ (مطابق ۱۹۶۹ء)
مقامِ تالیف ـــــــــ کراچی

سرمایہ داری اور سوشلزم کے مقابلے میں اسلام کا معاشی نظام پوری انسانیت کے لئے امن واطمینان کا ضامن ہے، اسلام کا معاشی نظام کیا ہے؟ اور اس سے ملکی معیشت کے مسئلے کس طرح حل ہو سکتے ہیں اس کے جواب میں حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ نے یہ رسالہ تحریر فرمایا کہ اسلامی نظام میں معاشی اصلاحات کیا ہونگی؟ اور اس کے کیا اثرات مرتب ہونگے اور ان کے ذریعہ عام خوشحالی کی فضا کیسے پیدا ہوگی۔

الحمدُ لِلّٰہ و کفیٰ و سَلام علٰی عَبادہِ الّذینَ اِصطفٰی

پیش لفظ

پوچھا جا رہا ہے کہ ''اسلام کا معاشی نظام'' کیا ہے؟ اور اس سے موجودہ معاشی مسائل کیوں کر حل ہو جائیں گے؟ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہم نے اس سوال کا سادہ، عام فہم اور دلنشین جواب اس مقالے میں دیا ہے، اس کے مطالعے سے ایک عام پڑھا لکھا انسان ایک نظر میں یہ جان سکتا ہے کہ اسلام موجودہ نظام معیشت میں کیا بنیادی تبدیلیاں لائے گا؟ ان کے اثرات کیا ہوں گے؟ اور سوشلزم کے برخلاف ان کے ذریعہ سرمایہ داری کی خرابیوں کا انسداد کس طرح ہو سکے گا؟ ضرورت ہے کہ موجودہ ماحول میں اس مقالے کی نشر و اشاعت زیادہ سے زیادہ کی جائے۔ حضرت مفتی صاحب کا یہ مقالہ ماہنامہ ''البلاغ'' کراچی کے رمضان ۸۹ھ کے شمارے سے ماخوذ ہے۔ مضمون کے جن فقہی مسائل میں اہل علم کو خلجان ہو سکتا تھا ان کے فقہی حوالہ جات آخر میں لگا دیئے گئے ہیں۔

کارکنان
مرکزی جمعیت علماء اسلام
کراچی ڈویژن

حواشی وحوالہ جات

صفحہ ۷ اخذ ا بقول ابی یوسف فی أن الا حتکار فی کل مَااضر للعامة حبسه (هدایه ص ۴۷۴ ج ۴)

صفحہ ۹ ظلم وجور سے عوام کو بچانے کے لئے فقہاء نے تسعیر کو جائز قرار دیا ہے، وفی کنز العمال عن نافع مایشیر الیٰ جواز التسعیر فی الأجرة (کنز ص ۲۱۷ ج ۲)

۲ جس کارخانے میں مزدور کام کر رہا ہے، اگر اس کے حصول کا وہ مالک ہو تو نقد اجرت الگ وصول کرنے میں بعض فقہی قباحتیں ہیں، لہذا بہتر یہ ہے کہ کسی دوسرے کارخانے کے حصے اس کو دیئے جائیں تاکہ معاملہ تمام فقہاء کے مسلک کے مطابق درست ہو جائے۔

صفحہ ۱۱

۳ لأن المعطی له لم یملک الا رض بمجر د ا لتحجیر فلم تنعقد المزارعة وصار المزارع هو المالک لأنه هو الذی أحیا الأرض وأما اذن الا مام فلیس بشرط عند الصاحبین وأما عند أبی حنیفة فالاذن اللاحق یقوم مقام السابق فاذا أجازت الحکومة ذلک وقع الملک للمزارع باتفاقهم.

۴ لا ن ذلک لیس برهن وانما هوا جارة فاسدة فیجب أجر المثل لمافی ردالحتار قال فی التتارخانیة ما نصه. ولو استقرض دراهم وسلم حماره الی المقرض لیستعمله الی شهرین حتی یو فیه دینه او داره لیسکنها فهوبمنز لة الا جارة الفاسدة ان استعمله فعلیه أجر مثله ولا یکون رهنا (شامی صفحه ۲۷۴ ج ۵)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اسلامی نظام کے تحت معاشی اصلاحات

حمد و ستائش اس ذات کے لئے جس نے اس کارخانہ عالم کو وجود بخشا!

درود و سلام اس کے آخری پیغمبر پر جنھوں نے اس جہان میں حق کا بول بالا کیا

آج کل یہ سوال عام ہے کہ سرمایہ داری اور سوشلزم کے مقابلے میں اسلام کا معاشی نظام جس کو پوری انسانیت کے لئے امن و اطمینان کا ضامن بتلایا جاتا ہے، وہ نظام کیا ہے؟ اور اس کے ذریعہ ملکی معیشت کے مسئلے کس طرح حل ہو سکتے ہیں؟

اس سوال کے جواب میں اصل بات تو یہ ہے کہ اسلام کا معاشی نظام کوئی خالص نظری فلسفہ نہیں ہے جسے کبھی دنیا نے عملی زندگی میں دیکھا اور برتا نہ ہو۔ بلکہ یہ نظام سینکڑوں سال تک دنیا میں عملی طور پر نافذ رہا۔ اور اس کی یہ برکتیں ہر دور اور ہر ملک میں ہر شخص نے مشاہدہ کی ہیں کہ جب کسی جگہ یہ نظام رائج ہوا وہاں ان معاشی ناانصافیوں کا نام و نشان نہ رہا جن سے آج کی دنیا بے چین ہے۔ وہاں غریب و امیر کی جنگ کا کوئی نام و نشان نہیں تھا، وہاں مزدور اور سرمایہ دار کی کوئی تفریق نہیں تھی، سب ایک ہی برادری کے افراد تھے اور ایک دوسرے کے ساتھ ہمدردانہ تعاون کرتے تھے، وہاں مزدور اور کسان حقیر و ذلیل نہیں تھا، اس کی ایسی ہی عزت کی جاتی تھی جیسی برادری کے دوسرے افراد کی، وہاں صنعت اور

تجارت پر اجارہ داریاں نہیں تھیں جن کی وجہ سے ملک کی دولت صرف بڑے سرمایہ داروں کے لئے مخصوص ہو کر رہ جائے، وہاں ان تمام دروازوں کو بند کر دیا گیا تھا جن کی وجہ سے ''بڑے لوگ'' اشیاء صرف کی قیمتوں پر حاکم بن کر بیٹھ جائیں، گرانی غریبوں کی کمر توڑتی رہے، اور غریب عوام مصنوعی قحط کا شکار ہو کر رہ جائیں۔

پھر یہ نظام ایسا بھی نہیں ہے کہ سینہ بہ سینہ ہی چلا آیا ہو۔ اس کی تفصیلات پر ہزاروں کتابیں موجود ہیں۔ علم فقہ کی کتابوں کا ایک بڑا حصہ اسلام کے معاشی قوانین ہی پر مشتمل ہے اور بہت سے لوگوں نے ان احکام کو قانونی دفعات کی شکل میں بھی مُدَوّن کر دیا ہے، مگر اس کا علاج کس کے پاس ہے کہ ہم مسلمان خود اپنے دین کو پڑھنے اور سمجھنے کے لئے اپنے وقت اور توانائی کا ہزارواں حصہ بھی خرچ نہ کریں، کبھی قرآن، حدیث اور فقہ کو سنجیدگی کے ساتھ نہ پڑھیں، اور جب کوئی شخص ''اسلام کے معاشی نظام'' کا نام لے تو اس کے بارے میں سمجھنا شروع کر دیں کہ یہ کوئی ایسی نئی اصطلاح ہے جس کا نہ کوئی مفہوم ہے اور نہ ماضی میں اس کا کوئی عملی وجود قائم ہوا ہے۔ یہی صورتِ حال ہے جس نے اس وقت یہ سوال کھڑا کیا ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام اور سوشلزم دونوں کے مقابلے میں جس اسلامی نظام کو علماء دین سب سے بہتر کہتے ہیں وہ آخر ہے کیا؟

اس کا مکمل جواب تو یہی ہے کہ اسلامی فقہ کی کتابیں پڑھیئے، ہر ہر جزء کی تفصیلات سامنے آ جائیں گی، لیکن یہ معلوم ہے کہ فی الوقت یہ سوال کوئی خالص علمی حیثیت کا سوال نہیں جس کو فرصت کے اوقات میں حل کیا جا سکے، بلکہ یہ ملک کے ہنگامی حالات کا پیدا کیا ہوا سوال ہے جس کا مختصر جواب جلد سے جلد سامنے آ جانا چاہیے۔ چنانچہ ہم ذیل میں نمونے کے طور پر اسلام کے معاشی نظام کی چند بنیادی خصوصیات پیش کر رہے ہیں جن سے یہ اندازہ ہو سکے گا کہ اگر ہمارے ملک میں صحیح اسلامی نظام رائج ہو تو اپنی معیشت کے موجودہ ڈھانچے میں ہمیں کون سی بنیادی تبدیلیاں کرنی ہوں گی؟ تقسیمِ دولت کے موجودہ نظام پر اس کے کیا اثرات مرتب ہوں گے؟ اور ان کے ذریعہ عام خوشحالی کی فضاء کیوں کر پیدا ہو

سکے گی؟

اس وقت ہمارا سب سے بڑا معاشی مسئلہ دولت کی غیر منصفانہ تقسیم ہے۔ عوام کی سب سے اہم اور معقول شکایت یہ ہے کہ ملک کی معاشی ترقی سے چند گنے چنے خاندان نہال ہو رہے ہیں، اور عام آبادی فقر و افلاس کا شکار ہے، سرمایہ دارانہ نظام کی ستائی ہوئی دنیا کو اس مصیبت سے نجات دلانے کے لئے آج کل ''سوشلزم'' کا نسخہ پیش کیا جا رہا ہے، لیکن ہم دعوے کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ اس صورت حال کا علاج سوشلزم کے پاس نہیں ہے۔ صرف اور صرف اسلام کے پاس ہے۔

غور کیا جائے تو ہمارے معاشرے میں عام آدمی کی معاشی پریشانی کے بنیادی طور پر دو سبب ہیں۔ آمدنی کی کمی اور گرانی کی وجہ سے اخراجات کی زیادتی اور ان دونوں اسباب کی ذمہ داری ہماری معیشت کے اس سرمایہ دارنہ نظام پر عائد ہوتی ہے جس نے پوری قوم کی دولت کو چند ہاتھوں میں سمیٹ کر رکھا دیا۔ اسلام کا نظامِ معیشت نافذ ہو تو مندرجہ ذیل اقدامات کے ذریعہ یہ دونوں چیزیں ساتھ ساتھ ختم ہوتی چلی جائیں گی۔

(۱)...... صنعتی اجارہ داریاں جو کارٹیل وغیرہ کی شکل میں رائج ہیں، ان سب کو ممنوع قرار دے کر آزاد مسابقت کی فضاء پیدا کی جائے تاکہ ناجائز منافع خوری کا انسداد ہو سکے، اس وقت ان صنعتی اجارہ داریوں کی وجہ سے پورا بازار چند بڑے سرمایہ داروں کے ہاتھ میں ہے، اور وہی قیمتوں کے نظام کو اپنی طبعی رفتار سے ہٹا کر گرانی پیدا کرنے کے ذمہ دار ہیں۔ اگر یہ اجارہ داریاں ٹوٹ جائیں تو منافع کی جو زائد مقدار سرمایہ داروں کے پاس جا رہی ہے اس سے عوام مستفید ہو سکیں گے۔

(۲)...... کلیدی صنعتیں مثلاً ریلوے، جہاز رانی، جہاز سازی، فولاد سازی، تیل وغیرہ کی صنعتیں حکومت خود اپنی نگرانی میں قائم کرے اور ان میں صرف ان لوگوں کے حصص قبول کئے جائیں جن کی آمدنی ایک ہزار روپے ماہانہ سے کم ہو، یا جن کا بینک بیلنس پانچ ہزار روپے سے کم ہو، اور اب تک اس قسم کی صنعتوں میں اس سے زائد آمدنی یا بینک بیلنس

والے جن افراد کے حصص ہیں ان کے ساتھ سال کے ختم پر شرکت کا معاہدہ فسخ کر دیا جائے۔

یہ طریقہ صنعتوں کو قومی ملکیت میں لینے سے کہیں زیادہ مفید ہوگا۔ اس لئے کہ صنعتوں کے قومی ملکیت میں چلے جانے سے صنعتیں غریبوں کی ملکیت میں نہیں آتیں بلکہ ان پر سرکاری افسروں کا تسلط قائم ہو جاتا ہے۔ اس کے بجائے اس صورت میں غریب عوام براہ راست صنعتوں کے مالک ہوں گے اور ان پر نہ سرمایہ داروں کا تسلط ہوگا نہ حکومت کا۔

(۳)..... ''سود'' ارتکازِ دولت کا سب سے بڑا سبب ہے، قوم کے لاکھوں افراد کے مجتمع سرمایہ سے جو نفع حاصل ہوتا ہے وہ اس سودی نظام کی وجہ سے سارا کا سارا ان چند سرمایہ داروں کی جیب میں چلا جاتا ہے جو بینک سے لاکھوں روپیہ قرض لے کر بڑی بڑی تجارتیں کرتے ہیں۔ اور عوام کو نہایت معمولی سی رقم سود کی شکل میں ملتی ہے اور چونکہ سرمایہ دار نفع کی اتنی بھاری مقدار حاصل کر کے بازار کے حکمران بن جاتے ہیں اور جب چاہتے ہیں مصنوعی قحط اور گرانی پیدا کر دیتے ہیں۔ اس لئے یہ معمولی سی رقم بھی بالآخر مزید کچھ سود لے کر ان ہی سرمایہ داروں کے پاس پہنچ جاتی ہے۔ مثلاً کراچی میں روئی کی لاکھوں گانٹھیں آتی ہیں اور یہ ساری گانٹھیں صرف چند تاجر خریدتے ہیں جن کو بینک کی پشت پناہی حاصل ہوتی ہے اپنے روپے سے گانٹھوں کا کاروبار کرنے والے ایک بھی نہیں ہے۔

اسلامی نظام قائم ہو تو یہ ظالمانہ نظام ختم ہو کر بینکاری کا نظام سود کے بجائے شرکت اور مضاربت کے اصولوں پر چلایا جائے گا۔ جس کے نتیجے میں بینک میں روپیہ جمع کرنے والے عوام بینک کے جمع شدہ سرمایہ کے نفع میں شریک ہوں گے اور اس سے دو طرفہ فائدے ہوں گے۔ ایک طرف بازار پر سے چند افراد کا تسلط ختم ہوگا اور اس سے ارزانی پیدا ہوگی، دوسری طرف منافع کے حصہ دار بہت زیادہ ہوں گے اور بڑی بڑی تجارتوں کا متناسب منافع بینکوں کے واسطے سے عوام تک پہنچے گا اور دولت زیادہ سے زیادہ وسیع دائروں میں گردش کرے گی۔

بینکاری کے نظام کو سود کے بجائے شرکت اور مضاربت کے اصولوں پر چلانے کی

عملی شکل کیا ہوگی؟ اس کی تفصیلات متعدد عملی حلقوں کی طرف سے بار بار شائع ہو چکی ہیں اور بینکاری کے ماہرین نے انہیں قطعی طور پر قابل عمل اور زیادہ مفید قرار دیا ہے (اس نظام کا ایک خاکہ انشاءاللہ عنقریب الگ شائع کر دیا جائے گا)۔

(۴)......اشیاء کی گرانی اور سرمایہ کے ارتکاز کا دوسرا بڑا سبب ہمارے معاشرے میں سٹہ، کی اندھی تجارت ہے، سٹہ کی مفصل خرابیاں بیان کرنے کے لئے تو ایک مستقل مقالہ چاہئے۔ ایک مختصر مثال یہ ہے کہ اس کاروبار کی وجہ سے مال کے ذخیرے ابھی بازار کے قریب بھی نہیں آنے پاتے کہ اس پر سینکڑوں سودے ہو جاتے ہیں، ایک تاجر مال کا آرڈر دے کر مال کی روانگی سے پہلے ہی اسے دوسرے کے ہاتھ بیچ دیتا ہے۔ دوسرا تیسرے کے ہاتھ اور تیسرا چوتھے کے ہاتھ۔ یہاں تک کہ جس وقت مال بازار میں پہنچتا ہے تو وہ بعض اوقات خرید و فروخت کے سینکڑوں معاملات سے گزر چکا ہوتا ہے اور اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ بازار تک پہنچتے پہنچتے اس کے دام کہیں سے کہیں پہنچ جاتے ہیں۔ بیس روپے کی چیز پچاس ساٹھ روپے میں بکتی ہے۔ یہ سارا نفع سٹہ باز لے اُڑتے ہیں اور عوام کی جیب خالی ہوتی چلی جاتی ہے۔

اسلامی نظام میں اس اندھے کاروبار کی کوئی گنجائش نہیں ہے، اسلام میں مال کے قبضے سے پہلے اسے بیچنا ناجائز ہے۔ لہٰذا اسلامی نظام قائم ہوا تو سٹہ کا یہ سارا کاروبار ممنوع ہو جائے گا۔ جس سے اشیاء صرف لازمی طور پر سستی ہوں گی اور منافع کی وہ زائد مقدار جو اس اندھے کاروبار کی وجہ سے چند سرمایہ داروں کے ہاتھ میں کھیلتی ہے، اس سے غریب عوام مستفید ہو سکیں گے۔

(۵)......ہمارے موجودہ نظامِ معیشت میں ارتکازِ دولت کا تیسرا سبب ''قمار'' ہے انشورنس کا پورا نظام اسی قمار پر قائم ہے، اس کے علاوہ گھوڑوں کی ریس، معمہ بازیاں، انواع و اقسام کی لاٹریاں، کھیل تماشوں کے سیزن ٹکٹ، یہ سب قمار کی وہ ہلاکت آفریں اقسام ہیں جن کی زد سب سے زیادہ غریب عوام پر پڑتی ہے۔ اور ان کے ذریعہ غریب عوام

کی کمائی کا ایک ایک روپیہ جمع ہو کر ایک فرد پر ہن برسا دیتا ہے اور باقی سب لوگ دیکھتے رہ جاتے ہیں۔ اسلامی حکومت میں قمار کی یہ تمام صورتیں ممنوع ہوں گی، اور عوام کو بے وقوف بنانے کے یہ دروازے بند ہو جائیں گے۔

انشورنس کے موجودہ نظام میں انشورنس کمپنیوں کے جمع شدہ سرمایہ سے سب سے زیادہ فائدہ بڑے بڑے سرمایہ داروں کو پہنچتا ہے جو آئے دن مختلف حادثات کے بہانے رقمیں وصول کرتے رہتے ہیں، غریبوں کو اس سے فائدہ اٹھانے کی نوبت بہت کم آتی ہے گویا اس طریقے سے بڑے بڑے سرمایہ دار اپنے جانی و مالی نقصانات کی ذمہ داری بھی ان غریب عوام پر ڈال دیتے ہیں جن کا نہ کبھی کوئی جہاز ڈوبتا ہے، نہ ان کی کسی تجارتی مرکز کو آگ لگتی ہے اس طریقے کو بدل کر اسلامی حکومت، امداد باہمی کی ایسی انجمنیں قائم کرے گی جو سود اور قمار سے خالی ہوں اور جن سے غریب عوام زیادہ بہتر طریقے سے مستفید ہو سکیں گے (اس کی عملی اسکیمیں بھی علماء کی طرف سے شائع کی جا چکی ہیں اور انشاء اللہ عنقریب انہیں الگ منظر عام پر لایا جائے گا)۔

(۶)...... ذخیرہ اندوزی اور چور بازاری پر بدنی تعزیرات مقرر کی جائیں گی، اور ذخیرہ اندوزوں کو اپنے ذخائر بازار میں لانے پر مجبور کیا جائے گا۔

(۷)...... لائسنس اور پرمٹ کا مروجہ طریقہ بھی تجارتی اجارہ داریوں کے قیام میں بہت بڑا معاون ہوتا ہے، آج کل ہو یہ رہا ہے کہ صرف بڑے سرمایہ داروں کو سیاسی رشوت کے اور خویش پروری کے طور پر بڑے بڑے لائسنس دے دیئے جاتے ہیں جس کے نتیجہ میں صنعت و تجارت پر ان کی خود غرضانہ اجارہ داری قائم ہو جاتی ہے اس سے ایک طرف تو گرانی بڑھتی ہے، دوسری طرف تھوڑے سرمایہ والوں کے لئے بازار میں آنے کا راستہ بند ہو جاتا ہے۔ اگر تجارت کو اس ظالمانہ طریق کار سے آزاد کر دیا جائے تو اشیائے صرف خود بخود سستی ہو جائیں گی اور ایک عام آدمی بھی معمولی سرمایہ کے ذریعہ تجارت و صنعت میں داخل ہو سکے گا۔ اور آج کا مزدور کل کا کارخانہ دار بن سکے گا۔

(۸)...... موجودہ نظام میں تنخواہوں کا معیار نہایت غیر منصفانہ اور مختلف درجات کا باہمی تفاوت بہت زیادہ ہے۔ اس تفاوت کو کم کر کے اونچے درجات کی تنخواہیں کم اور نچلے درجات میں زیادہ ہوں گی، پنشن کی شرح بھی اونچے درجات میں کم اور نچلے درجات میں زیادہ ہوگی۔

(۹)...... ہمارے یہاں مزدوروں کی اجرت کی سطح بہت پست ہے، ایک اندازے کے مطابق مغربی پاکستان میں پانچ افراد پر مشتمل ایک اوسط درجے کے خاندان کا کم از کم خرچ دو سو بیس روپیہ ہے اور مشرقی پاکستان میں دو سو ساٹھ روپیہ، لیکن اجرتوں کا معیار اس کے مقابلے میں کہیں زیادہ پست ہے، پاکستان کے مختلف علاقوں اور مختلف صنعتوں میں کم از کم تنخواہ بہتر روپے سے لے کر ایک سو سترہ روپے تک رہی ہے، اور نئی لیبر پالیسی میں زائد سے زائد مقدار ایک سو چالیس روپے مقرر کی گئی ہے، لیکن بڑھتی ہوئی گرانی کے اس دور میں تنخواہ بھی ناقابلِ اطمینان ہے، اور اس میں حقیقت پسندانہ اضافے کی ضرورت ہے، اسلامی حکومت کو اختیار ہے کہ وہ اجرتوں کی ایسی کم از کم شرح متعین کر دے جو مزدور کی محنت کا مناسب صلہ بھی ہو اور صنعتی نظام کے لئے قابل عمل بھی، اس کے تعین کے لئے مزدوروں، آجروں اور حکومت کے مساوی نمائندگان پر مشتمل اجرت بورڈ ہونا چاہئے جو بدلتے ہوئے حالات میں اجرتیں تبدیل کرنے کا مجاز ہو کم از کم شرح متعین کرنے کے بعد اجرتوں کی مزید مقدار مزدوروں کی قوت معاملہ (Bargaining power) پر چھوڑ دی جائے۔

(۱۰)...... آجروں کے ساتھ مزدوروں کے معاملے میں یہ شرط بھی حکومت کی طرف سے عائد کی جاسکتی ہے کہ وہ نقد اجرت کے علاوہ مزدوروں کو کسی خاص کارکردگی پر یا خاص مدت میں، یا اوورٹائم کی مخصوص مقدار کے معاوضے کے طور پر ان کو نقد بونس دینے کے بجائے کسی مخصوص کارخانے کے شیئرز مالکانہ حیثیت میں دے دے۔ اس طرح مزدور کارخانوں میں حصہ دار بھی بن سکیں گے۔ یہاں یہ بات واضح رہنی چاہئے کہ مزدوروں کی اجرت میں یہ اضافہ اسی صورت میں نتیجہ خیز ثابت ہوسکتا ہے جب کہ صنعتی اجارہ داریوں کو

توڑنے کے ساتھ ساتھ وہ اقدامات بھی کیے جائیں جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے ورنہ اجرتوں کی زیادتی سے قیمتیں بڑھ جائیں گی اور سرمایہ دار جو رقم ایک جانب سے مزدور کو دے گا وہ دوسری طرف سے وصول کرلے گا۔ اور مزدور کی مشکلات حل نہ ہوسکیں گے۔

(۱۱)...... مزدوروں کی اجرت کی طرح اسلامی حکومت کو یہ بھی اختیار ہے کہ وہ کسانوں کے لئے بٹائی کی ایسی کم از کم شرح متعین کردے جو کسانوں کی محنت کا مناسب صلہ بھی ہو اور ان کی ضروریات زندگی کی معقول کفالت بھی کرسکے۔ اس غرض کے لئے بھی ایک بورڈ قائم ہونا چاہئے جس میں کسانوں، زمینداروں اور حکومت کو مساوی نمائندگی حاصل ہو۔

(۱۲)...... مزارعت (بٹائی) کے معاملات میں جو ظلم وستم زمیندار کی طرف سے کسانوں پر ہوتے ہیں، ان کی اصل وجہ مزارعت (بٹائی) کا جواز نہیں، بلکہ وہ فاسد شرطیں ہیں جو زمیندار کسانوں کی بیچارگی سے فائدہ اٹھا کر ان پر قولی یا عملی طور سے عائد کردیتے ہیں، اور جو اسلام کی رو سے قطعاً ناجائز اور حرام ہیں اور ان سے بہت سی بیگار کے حکم میں آتی ہیں۔ ایسی تمام شرائط کو، خواہ وہ زبانی طے کی جاتی ہوں یا رسم ورواج کے ذریعہ ان پر عمل چلا آتا ہو، قانوناً ممنوع قرار دے دیا جائے تو مزارعت کا معاملہ کسانوں کے حق میں بالکل بے ضرر ہو جائے گا۔

(۱۳)...... مزارعت کے معاملے میں جس ظالمانہ رسم ورواج نے جڑ پکڑ لی ہے اور جس کی وجہ سے کسانوں پر ناجائز شرطیں عائد کی جاتی ہیں اگر اس پر فوری طور سے قابو پانا ممکن نہ ہو تو اسلامی حکومت کو یہ اختیار بھی حاصل ہے کہ وہ ایک عبوری دور کے لئے یہ اعلان کردے کہ اب زمینیں بٹائی کے بجائے ٹھیکہ پر دی جائیں۔ یا یہ طریقہ تجویز کردے کہ کاشتکار بٹائی کے بجائے مقررہ اجرت پر زمیندار کے لئے بحیثیت مزدور کام کریں گے اس اجرت کا تعین بھی حکومت کرسکتی ہے اور بڑے بڑے جاگیرداروں پر یہ شرط بھی عائد کرسکتی ہے کہ وہ ایک عبوری دور تک زمین کا کچھ حصہ سالانہ اجرت کے طور پر مزدور کاشتکاروں کو

دیں گے۔

(۱۴)...... اِحیاءِ موات کے شرعی قوانین نافذ کئے جائیں، یعنی جو کاشتکار غیر مملوکہ، غیر آباد بنجر زمینوں کو خود آباد کریں ان کو ان زمینوں پر مالکانہ حقوق دیئے جائیں جو زمینیں جاگیرداروں کو آباد کرنے کے لئے دی گئیں اور انہوں نے ان کو خود آباد کرنے کے بجائے کاشتکاروں کو بٹائی پر دے دیا تو وہ کاشتکاروں کی ملکیت ہوگئیں، کاشتکاروں کو ان پر مالکانہ حقوق دیئے جائیں اور پیداوار کا جو حصہ جاگیرداروں نے وصول کیا وہ واپس لیا جائے۔

(۱۵)...... زمینوں کے رہن کے جتنے سودی طریقے رائج ہیں ان سب کو یکسر ممنوع قرار دیا جائے گا۔ اور جو زمینیں اس وقت ناجائز طریقوں سے زیر بار ہیں، ان سب کو چھڑا کر ان کے غریب اور مستحق مالکوں کی طرف لوٹایا جائے، اس عرصے میں قرض خواہوں نے رہن زمین سے جو نفع اٹھایا ہے اس کا کرایہ ان کے ذمہ واجب ہے اس کرائے کو قرض میں محسوب کیا جائے، اور اگر کرائے کی رقم قرض سے زیادہ ہو تو وہ وصول کر کے قرض دار کو دلوائی جائے۔

(۱۶)...... ہمارے یہاں بڑی بڑی جاگیروں کے ارتکاز کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ بہت سی زمینوں میں سالہا سال سے وراثت جاری نہیں ہوتی، اسلامی حکومت ایسی زمینوں کی تحقیق کے لئے بھی ایک بورڈ قائم کرے جو ایسی زمینوں کو ان کے شرعی مستحقین میں تقسیم کرے۔ اگر اسلام کا قانون وارثت صحیح طریقے سے جاری ہو تو ایک ہاتھ میں بڑی بڑی جاگیریں جمع ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

(۱۷)...... انتقالِ جائیداد کے طریقوں کو سہل بنایا جائے، اور زمینوں کی آزادانہ خرید و فروخت کی حوصلہ افزائی کی جائے۔

(۱۸)...... کاشتکاروں کے لئے حکومت کی طرف سے غیر سودی قرضوں کا انتظام کیا جائے۔

(۱۹)...... کاشتکاروں کے لئے آسان قسطوں پر زرعی آلات مہیا کئے جائیں اور زراعت کی بہتر تعلیم وتربیت کا انتظام کیا جائے۔

(۲۰)...... زرعی امداد باہمی کی تحریک میں ایسی باہمی کاشت کے طریقے کو فروغ دیا جائے جس میں کھاد، بیج اور آلات کی فراہمی انجمن کے ماتحت ہو۔

(۲۱)...... ہمارے معاشرے میں زرعی پیداوار کی فروخت اتنے واسطوں سے ہوکر گزرتی ہے کہ ہر درمیانی مرحلے پر قیمت کا حصہ تقسیم ہوتا چلا جاتا ہے، آڑھتیوں، دلالوں اور اس طرح کے دوسرے درمیانی اشخاص (Middle Men) کی بہتات سے دوطرفہ نقصان ہوتے ہیں، ایک طرف کاشتکاروں کو پیداوار کا مناسب معاوضہ نہیں مل پاتا اور دوسری طرف بازار میں گرانی پیدا ہوتی ہے۔ اسی لئے احادیث کی رو سے اسلامی نظام میں موجودہ طریقے کو بدل کر یا تو ایسے منظم بازار (Organised Markets) کافی تعداد میں قائم کئے جائیں جن میں دیہی کاشتکار خود بلاواسطہ پیداوار کو فروخت کرسکیں۔ یا پھر فروخت پیداوار کا کام لینے کے لئے آڑھتیوں اور دلالوں سے کام لینے کے بجائے امداد باہمی کی ایسی انجمنیں قائم کی جائیں جو خود کاشتکاروں پر مشتمل ہوں اور یہ انجمنیں پیداوار فروخت کریں، تاکہ قیمت کا جو بڑا حصہ درمیانی اشخاص کے پاس چلا جاتا ہے اس سے کاشت کار اور عام صارفین فائدہ اٹھاسکیں۔

(۲۲)...... ''نفقات'' کے بارے میں اسلامی قانون کو تمام وکمال نافذ کیا جائے اور بیوی بچوں کے علاوہ جن خاص خاص رشتہ داروں کی معاشی کفالت اسلام نے خاندان کے کشادہ دست افراد پر ڈالی ہے اس کو قانونی شکل دے کر یتیموں، بیواؤں، بیماروں اور اپاہجوں کے معاش کا بندوبست کیا جائے۔

(۳۲)...... زکوٰۃ کی نگرانی کے لئے مستقل محکمہ قائم کیا جائے جو مندرجہ ذیل کام کرے۔

(الف) قیام پاکستان سے لے کر اب تک جن سرمایہ داروں نے زکوٰۃ

ادا نہیں کی ہے، ان سے زکوٰۃ وصول کر کے غریبوں میں تقسیم کرنے کا انتظام کرے۔

(ب) ہر سال مویشیوں کی زکوٰۃ وصول کر کے اسے غریبوں میں تقسیم کرے۔

(ج) سونے چاندی کی سالانہ زکوٰۃ اور زرعی پیداوار کا عشر مالکان خود ادا کریں گے۔ لیکن یہ محکمہ اس بات کی نگرانی کرے کہ انہوں نے زکوٰۃ اور عشر ادا کیا ہے یا نہیں؟

(۲۴)...... ملک کے ہر باشندے کے لئے روزگار فراہم کرنا بھی حکومت کی ذمہ داری ہے اور کوشش کے باوجود جو افراد بے روزگار رہ جائیں ان کے لئے روزگار کی فراہمی تک بیروزگاری الاؤنس'' جاری کئے جائیں۔

(۲۵)...... حکومت کی طرف سے ایک ''فلاحی فنڈ'' قائم کیا جائے اور اس فنڈ کے لئے سالانہ بجٹ میں مستقل رقم رکھی جائے، اور عام چندوں کے ذریعہ بھی اس رقم میں اضافہ کیا جائے۔ اس فنڈ کے ذریعہ بھاری صنعتیں بھی قائم کی جاسکتی ہیں تاکہ اس رقم کے ذریعہ ملکی صنعت کو فروغ بھی ہو اور ان کے منافع سے ''فنڈ'' میں اضافہ بھی ہوتا رہے۔ اس فنڈ کے ذریعہ عام غریبوں، مزدوروں اور کسانوں کی رہائش کا معیار بلند کرنے کے لئے آسان قسطوں پر متوسط درجے کے مکانات تعمیر کئے جائیں، کثیر تعداد میں مفت شفاخانے قائم کئے جائیں، بتدریج میٹرک تک کی تعلیم مفت کی جائے اور عوام کی معاشی حالت بہتر بنانے کے لئے دوسرے اقدامات کئے جائیں۔

(۲۶)...... کسی قوم کی معاشی حالت محض پیسوں کی کثرت سے نہیں سدھر سکتی جب تک وہ بے ہودہ یا مخرب اخلاق چیزوں میں پیسہ خرچ کرنے سے اور ضرورت کے کاموں میں اسراف بیجا سے پرہیز نہ کرے ''اسراف'' یوں تو انفرادی ملکیتوں میں بھی حرام اور ناجائز ہے، لیکن جو رقم کسی شخص کی انفرادی ملکیت نہ ہو بلکہ قومی ملکیت ہو اس میں فضول خرچی کی حرمت اور زیادہ شدید ہوتی جاتی ہے، لیکن ہمارے معاشرے میں سب سے زیادہ

فضول خرچی قومی خزانے میں ہوتی ہے۔ ہر سال خزانے کا بلا مبالغہ کروڑوں روپیہ شاہانہ تقریبات، سرکاری دوروں، عمارتوں کے سامان تعیش اور زینت و آرائش کے بہانے قطعی بے فائدہ اور فضول خرچ ہوتا ہے۔ ان اخراجات کو قطعی طور پر بند کرنا تو ممکن نہیں، لیکن ان مقاصد کے لئے جس بے دردی کے ساتھ قومی روپیہ بہایا جاتا ہے اس کا کوئی شرعی عقلی اور معاشی جواز نہیں ہے، بسا اوقات ایک دعوت پر ایک ایک لاکھ روپیہ خرچ کیا گیا ہے۔ اور اگر حساب لگایا جائے تو قیام پاکستان کے بعد سے اب تک یقیناً اربوں روپیہ ان فضول خرچیوں میں صرف ہوا ہے۔ اسلامی نظام میں قومی دولت کے اس ضیاع کی کوئی گنجائش نہیں، لہٰذا تقریبات اور سرکاری دوروں کے لئے اخراجات کی ایک مناسب حد مقرر کر کے اس کی سختی کے ساتھ پابندی کرائی جائے۔ اور اس طرح جو خطیر رقمیں بچیں انہیں ''فلاحی فنڈ'' میں داخل کیا جائے۔

(۲۷)...... قومی دولت کی ایک بہت بڑی مقدار آج کل ان مقاصد پر صرف ہو رہی ہے جو شرعی طور پر حرام اور ناجائز ہیں، مثلاً شراب، فلموں اور دوسری حرام اشیاء کی درآمد پر کروڑوں روپیہ سالانہ خرچ ہوتا ہے، زرِ مبادلہ کے اس زبردست نقصان کو بالکلیہ بند کیا جائے اور اس خطیر رقم کو عوامی فلاح کے کاموں میں صرف کیا جائے غیر مسلموں کو شراب کے استعمال کرنے کی اجازت ہوگی لیکن درآمد کرنے کی نہیں۔

(۲۸)...... خاندانی منصوبہ بندی کی خالص احمقانہ تحریک نے بھی ہماری معیشت کو نقصان پہنچایا ہے، تیسرے پنجسالہ منصوبہ میں اس تحریک کے فروغ کے لئے ۲۸۴ ملین روپیہ کی رقم مخصوص کی گئی ہے۔ (جب کہ سماجی بہبود کے لئے مخصوص کی جانے والی رقم کل ۱۲۵ ملین ہے) یہ بات پوری طرح ثابت ہو چکی ہے کہ خاندانی منصوبہ بندی شرعی عقلی، سماجی، معاشی غرض ہر اعتبار سے پاکستانی عوام کے لئے ناقابلِ قبول ہے۔ اس صورت میں قومی دولت کا اتنا بڑا حصہ اس پر صرف کرنے کے بجائے زراعت کی ترقی اور کاشتکاروں کی پیداوار بڑھانے پر صرف کیا جائے۔

انتظامیہ کی اِصلاح

قانون اور رواج میں مذکورہ بالا اصلاحات کے علاوہ ہمیں اپنے انتظامی ڈھانچے میں بڑے پیانے پر تبدیلیاں لانے کی ضرورت ہے۔ ہمارے معاشرے میں استحصال کا ایک بڑا سبب انتظامی خرابیاں بھی ہیں۔ بہت سے معاملات ایسے ہیں جن میں ہمارا قانون بالکل درست ہے، اور اگر اس پر عمل ہو تو ان خاص معاملات میں انصاف حاصل ہو سکتا ہے، لیکن ہماری انتظامی مشینری اس قدر ناقص، از کار رفتہ، سست اور ڈھیلی ڈھالی ہے کہ قانون صرف کتابوں کی زینت ہو کر رہ گیا ہے۔ اور عملی زندگی میں اس کا کوئی وجود نظر نہیں آتا، ظاہر ہے کہ اگر انتظامیہ کی صورت حال یہ ہو تو ملک کا قانون کتنا ہی بے داغ کیوں نہ ہو، اس کے اچھے نتائج سامنے نہیں آسکتے، لہٰذا معاشرے کی اصلاح کے لئے انتظامیہ کو ایمان دار مضبوط، فعال اور قابو یافتہ بنانا قانون کے موثر ہونے کے لئے بے انتہا ضروری ہے۔

ہمارے موجودہ انتظامی ڈھانچے میں کیا کیا خرابیاں ہیں؟ اور انہیں کس طرح دور کیا جاسکتا ہے؟ یہ باتیں مکمل طور سے تو انتظام (Administration) کے ماہرین ہی بتا سکتے ہیں، اور قوم کی تعمیر نو کے وقت ان ہی کی خدمات سے انتظامیہ کی اصلاح کی جاسکے گی۔ لیکن ہم یہاں چند سامنے کی مثالیں پیش کرتے ہیں جن سے یہ معلوم ہو سکے گا کہ نظم وضبط کی ابتری کس بری طرح ہمارے عوام کے لئے معاشی انصاف کے حصول میں رکاوٹ بنی ہوئی ہے۔

(۱)......''رشوت'' ایک ایسا جرم ہے جو شاید کسی بھی نظامِ حیات میں جائز نہ ہو، ہمارا قانون بھی اسے ناجائز قرار دیتا ہے لیکن ملک کی جیتی جاگتی زندگی میں آکر دیکھئے تو وہی

رشوت جسے قانون میں بدترین جرم کہا گیا ہے، نہایت آزادی کے ساتھ لی اور دی جا رہی ہے۔ ایک معمولی کانسٹیبل سے لے کر اونچے درجے کے افسران تک سب اسے شیر مادر سمجھے ہوئے ہیں، اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ جس کی جیب گرم ہو وہ سینکڑوں جرائم میں ملوث ہونے کے باوجود بڑی ڈھٹائی کے ساتھ دندناتا پھرتا ہے اور جس کی جیب خالی ہو وہ سو فیصد معصوم اور برحق ہونے کے باوجود انصاف کو ترس ترس کر جان دے دیتا ہے، اس صورت حال کو مضبوط اور ایماندار انتظامیہ ہی ختم کر سکتی ہے، اگر اونچے درجے کے رشوت خور افسروں کو چند بار علی الاعلان عبرت ناک جسمانی سزائیں دی جائیں اور آئندہ رشوت کے لئے کچھ اور سخت سزائیں مقرر کر دی جائیں تو رفتہ رفتہ یہ لعنت مٹ سکتی ہے۔

(۲)...... ہمارا عدالتی نظام اس قدر فرسودہ، پیچیدہ، دشوار گزار اور تکلیف دہ ہے کہ ایک غریب آدمی کے لئے ظلم پر صبر کر لینا دادرسی کی بہ نسبت آسان ہے، اس کے لئے یوں تو پورے عدالتی اور اس کے دیوانی و فوجداری ضابطوں کی تشکیل نو ضروری ہے لیکن خاص طور سے مندرجہ ذیل اقدامات فوری طور پر ضروری ہوں گے۔

(الف) صنعتی تنازعات کے تصفیہ کے لئے سرسری عدالتیں قائم کی جائیں جن تک پہنچنا مزدوروں کی براہ راست دسترس میں ہو اور جن کا طریق کار آسان ہو۔

(ب) زمینداروں اور کاشت کاروں کے تعلقات کی نگرانی اور کاشت کاروں کو ناجائز شرائط کے ظلم سے نجات دلانے کے لئے بھی سرسری عدالتیں قائم کی جاتیں۔

(ج) عورتوں پر ہونے والے مظالم کی دادرسی کے لئے گشتی عدالتیں قائم کی جائیں جو سرسری طور پر مقدمات فیصل کریں۔

(۳)...... مزدوروں کی صحت، حادثات سے تحفظ، غیر معمولی محنت سے بچاؤ اور تنخواہوں کے معیار وغیرہ سے متعلق فیکٹریز ایکٹ اور دوسرے لیبر قوانین میں کافی احکام

موجود ہیں۔ لیکن کارخانوں کی عملی تحقیق کیجئے تو ان قوانین کا کوئی اثر وہاں مشکل ہی سے نظر آتا ہے۔ فیکٹریز ایکٹ کے تحت کارخانوں میں ہوا، روشنی، صفائی، موسمی اثرات سے حفاظت اور دوسرے حفاظتی انتظامات ضروری قرار دیئے گئے ہیں اور ان کی نگرانی کے لئے فیکٹری انسپکٹر بھی مقرر کیا گیا ہے، لیکن عملاً ہو یہ رہا ہے کہ متعلقہ فیکٹری انسپکٹر کا ماہانہ ''وظیفہ'' کارخانوں کی طرف سے مقرر ہو جاتا ہے، چنانچہ انسپکٹر سال بھر میں چند برائے نام چالان کر کے اپنی کارکردگی دکھا دیتا ہے اور چند سو روپے جرمانے کے طور پر سرکاری خزانے کو پہنچ جاتے ہیں، رہا بیچارہ مزدور سو اسکو فیکٹری ایکٹ کی کسی دفعہ سے کوئی فائدہ نہیں پہنچتا، جن مقامات پر وہ کام کرتا ہے، وہ جاڑوں میں سخت ٹھنڈے اور گرمیوں میں نہایت گرم ہوتے ہیں، طعام خانے میں انتہائی مضر صحت اشیاء فروخت ہوتی ہیں، بیت الخلاء اس قدر گندے اور ناکافی ہوتے ہیں کہ فیکٹریز ایکٹ دیکھتا رہ جائے۔ ظاہر ہے کہ اگر انتظامیہ ایسی ہی چست اور دیانت دار ہو تو کوئی بہتر سے بہتر قانون بھی کارگر نہیں ہو سکتا۔

(۴)......سرخ فیتے'' کی مصیبت ہمارے ملک میں کسی تعارف کی محتاج نہیں، اور اس سے ہر وہ شخص آگاہ ہے جسے اپنی کسی ضرورت کے تحت دفتری کاموں سے سابقہ پڑا ہو، اس کا ایک نتیجہ تو یہ ہے کہ جو شخص وسائل و اسباب اور تعلقات نہ رکھتا ہو وہ اپنے جائز حقوق آسانی سے حاصل نہیں کر سکتا اور دوسرا نقص یہ ہے کہ ایک ہی نوعیت کے کاموں کے لئے محکموں اور اداروں کا ایک طویل سلسلہ قائم ہے اور ان میں سے ہر ایک محکمے پر قومی دولت کا مستقل حصہ صرف ہو رہا ہے، لیکن ہر محکمے میں فائلوں کے انبار لگے پڑے ہیں اور کام نبٹنے میں نہیں آتا۔

انتظامیہ کی ابتری کی چند مثالیں صرف یہ واضح کرنے کے لئے دی گئی ہیں کہ نظم وضبط کے فقدان کا براہ راست اثر عوام کی معیشت پر پڑ رہا ہے، اور قانون کی اصلاح کے ساتھ ساتھ جب تک انتظامیہ کو مستحکم اور فعال نہیں بنایا جائے گا۔ عوام کی مشکلات دور نہیں ہو سکتیں۔

سادہ معاشرت کا رواج

معاش کے سلسلے میں عوام کی پریشانیوں کا تیسرا اہم سبب وہ مغربی معاشرت ہے جو ہم نے خواہ مخواہ اپنے اوپر مسلط کر رکھی ہے، اسلام ہمیں سادہ طرزِ زندگی اختیار کرنے کی تلقین کرتا ہے اور اگر ہمارے ملک پر آسمان سے ہُن بھی برسنے لگے تب بھی ہمیں تکلف اور تعیش کی زندگی سے مکمل پرہیز کرنا چاہئے، اگر اسلامی نظام قائم ہو تو ہمیں اپنی معاشرت میں مندرجہ ذیل اصلاحات کرنی ہوں گی۔

(۱)......رہن سہن کے پر تکلف، عیش پرستانہ اور مہنگے طریقے یکسر چھوڑ دینے ہوں گے جو ہم نے مغرب سے درآمد کئے ہیں، اور جن کی وجہ سے عوام اقتصادی بدحالی کا شکار ہیں۔ اس وقت ہماری کیفیت یہ ہے کہ ہم اپنے لباس اپنی وضع قطع، اپنے طرز رہائش، اپنی تقریبات غرض معاشرت کے ہر شعبے میں مغرب کی اندھی تقلید کر رہے ہیں اور اس احمقانہ تقلید کو تہذیب کی علامت سمجھے ہوئے ہیں، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ موجودہ معاشرے میں ایک شخص اس وقت تک مہذب نہیں کہلا سکتا جب تک وہ دوڈھائی سو روپے کا اپ ٹو ڈیٹ سوٹ نہ پہنے ہوئے ہو، اس کے پاس جدید ترین آسائشوں والا بنگلہ نہ ہو، اس کے ڈرائنگ روم میں قیمتی فرنیچر نہ ہو اور اس کے گھر میں ریفریجریٹر اور ٹیلی ویژن نہ لگا ہوا ہو۔ ظاہر ہے کہ جب یہ چیزیں تہذیب کی شرط لازم قرار پائی گئی ہیں تو لوگوں کا شب و روز ان کے حصول میں کوشاں رہنا قدرتی امر ہے۔ چنانچہ اس معاملے میں ہر شخص دوسرے سے آگے نکل جانے کی فکر میں ہے، اس غرض کے لئے جب محدود آمدنی کافی نہیں ہوتی تو رشوت، چور بازاری اسمگلنگ اور دوسرے ناجائز طریقوں سے کام لیتا ہے۔

اس صورت حال کو بدلنے کے لئے ضروری ہے کہ ہمارے حکام، وزراء، سیاسی

رہنما اور سماجی کارکن سادہ طرز معیشت اختیار کرنے کی ملک گیر تحریک چلائیں اور اس کی ابتداء اپنے آپ سے کریں اس لئے کہ جب تک ہمارے اعلیٰ حکام، دولت مند افراد، اور سیاسی رہنما اپنے لباس، اپنی نشست و برخاست، اپنی تقریبات، اپنے طرز رہائش اور اپنی عام زندگی میں سادگی کو نہیں اپنائیں گے، عوام تکلفات کی اس مصنوعی زندگی سے نجات نہیں پاسکیں گے جو ان کی معاشی بدحالی کا بڑا سبب ہے اور جس کا نتیجہ پاکستان جیسے غریب ملک کے لئے معاشی تباہی کے سوا کچھ نہیں۔

(۲)......سامانِ تعیش کی درآمد بالکل بند کردی جائے اور تمام اشیائے صرف میں ملک کی اپنی پیداوار کو فروغ دیا جائے۔

(۳)......جو اشیائے صرف ایسی ہیں کہ وہ پاکستان میں متوسط یا اعلیٰ معیار کی پیدا ہونے لگی ہیں (مثلاً کپڑا) ان کی درآمد پر بھی پابندی عائد کردی جائے تو عوام میں سادگی کو فروغ دینے میں بھی مدد ملے گی اور زرمبادلہ میں بھی کفایت ہوگی۔

(۴)......شادی بیاہ اور تقریبات وغیرہ پر اخراجات کی ایک مناسب حد مقرر کردی جائے جس سے زائد خرچ کرنا قانوناً جرم ہو۔

(۵)......بعض صنعتیں اور کاروبار ایسے ہیں کہ وہ ہمارے معاشرے پر بری طرح چھائے ہوئے ہیں، اور آج ان کو بند کرنے کا تصور بڑا نامانوس معلوم ہوتا ہے۔ اس لئے لوگ ان کی برائی کو جاننے بوجھنے کے باوجود انہیں بند کرنے کا مشورہ دیتے ہوئے جھجکنے لگے ہیں، لیکن اگر اپنے مسائل کو حقیقت پسندی کے ساتھ حل کرنا ہے تو ہمیں اس جھجک کو ختم کر کے کچھ جرأت مندانہ اقدامات کرنے ہوں گے، خواہ وہ کتنے ہی نامانوس اور اجنبی کیوں نہ معلوم ہوں۔ مثلاً فلم انڈسٹری اور ٹیلی ویژن ایسے ادارے ہیں جنھوں نے قوم کو اخلاقی تباہی کی آخری حدود تک پہنچا دیا ہے، جو شخص بھی حقیقت پسندی کے ساتھ حالات کا جائزہ لے گا۔ وہ اس نتیجے پر پہنچے بغیر نہیں رہ سکے گا کہ اس صنعت نے قوم کو نقصان ہی نقصان پہنچایا ہے۔ جس قوم کی نوے فیصد آبادی فقر و افلاس کا شکار، تعلیم و تربیت سے محروم اور فن و تکنیک

میں پسماندہ ہو، اس کے لئے آخر کیسے جائز ہے کہ وہ اپنا کروڑوں روپیہ سالانہ ان کھیل تماشوں پر صرف کردے جو صحت، اخلاق اور ذہنی پاکیزگی کے لئے سمِّ قاتل ثابت ہو رہے ہیں اور جو مالی انسانی وسائل اس وقت اس قسم کی چیزوں پر لگے ہوئے ہیں انہیں موجودہ حالت پر برقرار رکھنا ''گھر پھونک تماشا'' دیکھنے کے مترادف ہے، اگر انہیں کسی ایسی صنعت پر لگایا جائے جو قوم کے لئے بنیادی اہمیت رکھتی ہو تو ہمیں معاشی ترقی میں بڑی مدد مل سکتی ہے، اسلام صحت مند تفریح کو بہ نظر استحسان دیکھتا ہے، لیکن یہ کیا ضروری ہے کہ تفریح کے لئے وہی راستہ اختیار کیا جائے جس کا حاصل صحت، اخلاق اور پیسہ کی بربادی کے سوا کچھ نہ ہو۔ ایسی مفید اور صحت مند تفریحات کو فروغ کیوں نہ دیا جائے جو ہمارے لئے مفید ہوں یا کم از کم مضر نہ ہوں؟

(۶)...... ہمارے معاشرے میں پیشے کی بنیاد پر جو سماجی طبقات پائے جاتے ہیں اور جس طرح انہیں عزت و ذلت کا معیار سمجھ لیا گیا ہے وہ بھی سراسر غیر اسلامی تصور ہے جو ہم نے غیر مسلموں سے لیا ہے۔ یہ چیز اسلام کی معاشرتی مساوات کے تو قطعی خلاف ہے ہی، اس کا معاشی نقصان بھی یہ ہے کہ یہ سماجی تقسیم محنت کی آزاد نقل پذیری (Mobility) میں زبردست رکاوٹ بن جاتی ہے، اور ظاہر ہے کہ محنت کی آزاد نقل پذیری کے بغیر متوازن معیشت کا قیام مشکل ہے۔ اس صورت حال کی اصلاح نظام تعلیم و تربیت، نشر و اشاعت کے ذرائع اور سماجی تحریکات کے ذریعہ کی جا سکتی ہے۔

(۷)...... ملازموں، مزدوروں اور کسانوں کا سماجی رتبہ (Social Status) بلند کرنے کی شدید ضرورت ہے۔ اسلامی تعلیمات کی رو سے مزدور اور آجر ایک ہی برادری کے دو فرد ہیں جو اپنے سماجی مرتبے کے لحاظ سے بالکل برابر ہیں۔ لہٰذا اس کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ آجر اپنے عام رویہ میں مزدور کو کمتر سمجھے اور اس کے ساتھ غیر مساویانہ سلوک کرے۔ معاہدے کی خلاف ورزی پر دونوں کو ایک دوسرے کا قانونی محاسبہ کرنے کا حق حاصل ہے لیکن اس کے کوئی معنی نہیں ہیں کہ مزدور تو آجر کے ساتھ تعظیم کا معاملہ کرنے پر مجبور ہو

اور آجر اس کے ساتھ تحقیر وتوہین کا معاملہ کرے۔ اس صورت حال کی اصلاح کے لئے بھی نظامِ تعلیم اور نشر واشاعت کے تمام ذرائع سے کام لے کر لوگوں کے ذہنوں کی از سر نو تعمیر کی ضرورت ہے، اس کے علاوہ ایسے قانونی احکام بھی نافذ کئے جائیں جن کی رو سے ملازمین کے ساتھ اہانت آمیز رویہ اختیار کرنا قابل تعزیز جرم ہو۔ اس سے جہاں معاشرے کی ذہنی اور اخلاقی بیماریوں کی اصلاح ہوگی وہاں سادہ طرزِ معیشت کے قیام میں بھی بڑی مدد ملے گی۔

آخر میں ہمیں ایک بنیادی نکتے کی طرف توجہ دلانی ہے، یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے کہ ظلم واستحصال درحقیقت اس بیمار ذہن کی پیداوار ہوتا ہے جو خدا کے خوف، آخرت کی فکر اور انسانی اخلاق سے بے نیاز ہو، لہٰذا ہماری معیشت میں جو بدعنوانیاں پائی جاتی ہیں ان کا اصل سبب خودغرضی، سنگدلی، کنجوسی اور مفاد پرستی کی وہ انسانیت سوز صفات ہیں جو ہمیں مغرب کی مادہ پرست ذہنیت سے ورثے میں ملی ہیں۔ اور ہماری زندگی کے ہر شعبے پر چھا چکی ہیں۔ اگر اسلام کا نظام حیات قائم ہو تو چونکہ اس کی بنیاد ہی خدا کے خوف اور آخرت، کی فکر پر ہے لہٰذا یہ ضروری ہوگا کہ قانون کے ساتھ ساتھ قلب اور ذہن کی اصلاح کی طرف پوری توجہ کی جائے، تعلیم وتربیت اور نشر واشاعت کے تمام وسائل کو کام میں لا کر ان اسلامی تعلیمات کو ایک تحریک کی شکل میں پھیلایا جائے جو دل میں خدا کا خوف اور آخرت کی فکر پیدا کریں۔ جن کے ذریعے باہمی اخوت اور ایثار وہمدردی کے جذبات پروان چڑھیں، اور جن سے ایسے ذہن تیار ہوسکیں جو اللہ کی خوشنودی اور آخرت کی فلاح کو دنیا کی ہر مادی منفعت پر فوقیت دیتے ہوں۔

دنیا کا تجربہ اس بات کا گواہ ہے کہ نرا قانون کا ڈنڈا کبھی کسی قوم کی اصلاح نہیں کر سکا، اور جب تک قانون کی پشت پر ایک مضبوط روحانی عقیدہ نہ ہو، ظلم واستحصال کو روکا نہیں جا سکتا۔ اسلامی تاریخ کے ابتدائی دور میں ایثار ومروت، انفاق فی سبیل اللہ اور سخاوت و استغنا کے جو فقید المثال واقعات ملتے ہیں ان کا بنیادی سبب یہی خدا کا خوف اور آخرت کی

فکر تھی جو قوم کے ہر ہر فرد کے رگ و پے میں سما گئی تھی، اگر آج پھر اس جذبے اور عقیدے کو کوئی زندگی دی جائے تو حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا دور آج بھی لوٹ سکتا ہے۔

قلب و روح اور ذہن و دماغ کا یہ انقلاب بعض لوگوں کو مشکل نظر آتا ہے، لیکن اگر حکومت اس انقلاب کو اپنا واقعی نصب العین بنا کر صحیح خطوط پر کام کرے تو ہم دعوے کے ساتھ یہ بات کہہ سکتے ہیں کہ چند ہی سال میں ہمارے معاشرے کی کایا پلٹ جائے گی۔ ہم موجودہ حالت میں خواہ کتنے برے سہی لیکن یہ ایک نا قابل انکار حقیقت ہے کہ الحمدللہ ہمارے دلوں میں ابھی ایمان کی ایک دبی ہوئی چنگاری موجود ہے۔ اور اگر کوئی اس چنگاری کو ہوا دینے والا مل جائے تو یہ آن کی آن میں بھڑک کر شعلہ بن سکتی ہے۔ اس کی واضح دلیل یہ ہے کہ پاکستان کی بائیس سالہ تاریخ میں اسی قوم نے دو مرتبہ بڑا حسین اور قابل فخر کردار پیش کیا ہے، ایک قیام پاکستان کے وقت ۱۹۴۷ء کے موقع پر اور دوسرے ستمبر ۱۹۶۵ء کے جہاد کے وقت۔ ان دونوں مواقع پر اسی گئی گزری قوم کا ایسا حسین رخ نکھر کر سامنے آیا ہے کہ دنیا حیران رہ گئی۔ جس قوم نے ۴۷ء اور ۶۵ء میں شجاعت و جوانمردی، نظم وضبط، فرض شناسی، ایثار و ہمدردی اور سخاوت و فیاضی کا یہ حیرت انگیز مظاہرہ پیش کیا تھا، کیا یہ وہی قوم نہیں تھی جس کی کام چوری، خود غرضی، بدنظمی اور بخل و مفاد پرستی کا آج رونا رویا جا رہا ہے؟ جب یہ وہی قوم ہے تو سوچنے کی بات ہے کہ اس وقت اس میں اتنا بڑا انقلاب کیوں کر رونما ہو گیا تھا؟

اس سوال پر جتنا بھی غور کیجئے، اس کا صرف ایک جواب ہے کہ درحقیقت ان مواقع پر قوم کے رہنماؤں نے سچے دل سے ایمان کی دبی ہوئی چنگاری کو ہوا دی تھی اور قوم کو یہ اطمینان ہو گیا تھا کہ اسے اسلام کے صرف نام پر نہیں بلکہ اس کے حقیقی کام پر دعوت دی جا رہی ہے۔ اس اطمینان نے قوم میں اپنا سب کچھ لٹا کر اسلام کی خدمت کا جذبہ پیدا کیا اور یہ دکھلا دیا کہ ع

ایسی چنگاری بھی یارب میرے خاکستر میں تھی

مگر افسوس کہ اس چنگاری کو ہوا دینے والوں نے آئندہ اس سے کام لینے کی ضرورت نہ سمجھی اور عوام کا یہ ابھار ایک وقتی ابال ثابت ہوا لیکن اگر مستقل طور سے اس چنگاری کو بھڑکایا جاتا رہے تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ یہ قومی شعور دیرپا ثابت نہ ہو، لہٰذا یہ بات پورے وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ اگر صحیح معنی میں اسلامی نظام قائم ہو اور اس کے لئے قوم سے قربانیاں طلب کی جائیں تو یہی قوم چند سالوں میں ایسی عظیم الشان قوت بن کر ابھرے گی جس کا کوئی مدمقابل نہ ہوگا۔ جو قوم جنگ کے زمانے میں یرموک و قادسیہ کی یاد تازہ کرسکتی ہو، وہ امن کے زمانے میں عمر بن عبدالعزیز کے دور کو کیوں زندہ نہیں کرسکتی؟

بس ضرورت اس بات کی ہے کہ:

(۱)...... ملک کے نظام تعلیم کو اسلامی بنایا جائے، (۱) اور طلباء کی تربیت خالص اسلامی خطوط پر کی جائے۔

(۲)...... ملک کے حکمراں مغربی طرز زندگی کو چھوڑ کر سادہ زندگی اختیار کریں اور قومی مفاد کی خاطر ذاتی مفاد کو قربان کرنے کی واضح اور روشن مثالیں عوام کے سامنے لائیں۔

(۳)...... نشر و اشاعت کے تمام ذرائع کو خواہ وہ ریڈیو ہو یا اخبارات، اسلامی رنگ میں رنگا جائے، فحاشی، عریانی، اور عیش پرستی پر ابھارنے والے پروگراموں کو بالکل بند کر کے ان کی جگہ ایسے پروگرام وضع کئے جائیں جو قومی شعور، اجتماعی فکر، ایثار، خدا ترسی اور فکر آخرت کے جذبات پیدا کریں۔

(۴)...... انتظامیہ کے عہدوں پر فائز کرنے کے لئے امیدوار کے مطلوبہ دینی و اخلاقی معیار کو شرط لازم قرار دیا جائے، اور نری کاغذی ڈگریوں کو دیکھنے کے بجائے

(۱)...... نظام تعلیم سے متعلق اپنی مفصل تجاویز ہم البلاغ کے شمارہ ستمبر ۱۹۶۹ میں پیش کر چکے ہیں اور ان کا خلاصہ مرکزی جمعیت علماء اسلام کراچی ڈویژن نے الگ شائع کر دیا ہے۔

امیدوار کے دینی واخلاقی کردار پر کڑی نظر کی جائے۔

(۵)......''امر بالمعروف اور نہی عن المنکر'' کا مستقل ادارہ قائم کیا جائے جو دین دار خدا ترس اور ملت کا درد رکھنے والے مسلمانوں پر مشتمل ہو اور اپنی تمام توانائیاں لوگوں میں اسلامی اسپرٹ پیدا کرنے پر خرچ کرے۔

(۶)......مساجد اسلامی معاشرے کے مرکزی مقام کی حیثیت رکھتی ہیں ان کو آباد کرنے پر پوری توجہ دی جائے، اعلیٰ احکام ''اقامت صلوٰۃ'' کی تحریک چلائیں اور اس کی ابتداء اپنے آپ سے کریں۔

اگر اس قسم کے چند اقدامات حکومت کی طرف سے کر لئے گئے تو یہ بات دعویٰ کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ نہایت مختصر عرصے میں اس ملک کی بالکل کایا پلٹ جائے گی اور یہاں ایک ایسی قوم تیار ہوگی جو اپنے اخلاق و کردار، اپنی سعی وعمل اور اپنے افکار وجذبات کے لحاظ سے دنیا کے لئے قابل صد رشک ہوگی، افراد سازی کے اس کارنامے کے بعد ظلم واستحصال کا بالکل خاتمہ ہو جائے گا، اور دنیا خود کھلی آنکھوں دیکھ لے گی کہ جس معاشی بے چینی نے پورے کرۂ زمین کو تہ وبالا کیا ہوا ہے، وہ اسلامی نظام کے تحت کتنی خوبصورتی کے ساتھ سکون واطمینان اور عمومی خوشحالی کے ساتھ بدل گئی ہے۔

مشکلات دنیا کے ہر اہم کام میں ہوتی ہیں، خاص طور سے وہ کام جو انقلابی نوعیت رکھتا ہو، چنانچہ اسلامی انقلاب لانے میں بھی بلاشبہ مشکلات ہوں گی۔ لیکن یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ اس ملک میں کوئی انقلاب اتنی آسانی سے نہیں لایا جاسکتا ہے جتنی آسانی سے یہاں اسلامی انقلاب آسکتا ہے۔ اول تو اس لئے کہ اسلام کی بنیاد پر جو اصلاحات تجویز کی گئی ہیں وہ فی نفسہ بہت زیادہ مشکل نہیں ہیں۔ دوسرے اس لئے کہ پاکستان کی سرزمین اسلام کے لئے دنیا کے ہر خطے سے زیادہ سازگار ہے۔ کسی قوم کی زندگی میں انقلاب لانے میں سب سے زیادہ مؤثر قوت اس قوم کے جذبات اور اس کا انقلابی شعور ہوتا ہے، اور یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ اسلام کی محبت وعظمت اور اسے روبہ عمل دیکھنے کی آرزو

یہاں کے عوام کی رگ و پے میں سمائی ہوئی ہے، اور اگر انہیں یہ احساس ہو کہ یہاں سچے دل سے اسلامی انقلاب کی کوشش ہو رہی ہے تو وہ ہر کڑی سے کڑی مشکل کو جھیل جائیں گے۔

اس کے برخلاف اگر یہاں سوشلزم نافذ کرنے کی کوشش کی گئی تو قطع نظر اس سے کہ وہ اچھا ہے یا برا اس کے نافذ کرنے میں اس قدر مشکلات ہوں گی کہ سالہا سال تک ملک کا امن اور چین رخصت ہو جائے گا، سوشلزم کی تاریخ شاہد ہے کہ اس کے لائے ہوئے انقلاب میں کشت وخون، جبر وتشدد اور بدامنی وہنگامہ خیزی جزو لازم کی حیثیت رکھتی ہے۔ پھر اس حقیقت سے کوئی شخص ہزار جھوٹ بول کر بھی شاید انکار نہ کر سکے کہ سوشلزم یہاں کے عوام کی آرزو نہیں ہے۔ اسے لانا نہیں تھوپنا پڑے گا، اور یہاں کے عوام ہزار طرح کے پروپیگنڈے اور جبر وتشدد کے باوجود اپنے قلبی جذبات کے ساتھ سوشلزم قائم کرنے کے لئے کام نہیں کر سکیں گے۔ اور صدیوں تک حکومت اور عوام کی رسہ کشی بند ہونے میں نہیں آئے گی۔

اس کے علاوہ سوشلزم کے قیام سے تقسیم دولت کی موجود ناہمواری کبھی ختم نہیں ہو سکتی۔ زمینوں یا کارخانوں کو قومی ملکیت میں لینے سے ایک غریب انسان کی معاشی مشکلات دور نہیں ہوں گی، کچھ اور بڑھ جائیں گی، واقعہ یہ ہے کہ سوشلزم کے وکلاء ہمیشہ ''قومی ملکیت'' کا ایک مبہم نعرہ لگاتے رہے ہیں لیکن ان کے پاس کوئی مربوط، منظم اور سوچا سمجھا معاشی پروگرام نہیں ہے۔

۷۰

اشتراکیت، قومیت اور سرمایہ داری

خطبہ حجۃ الوداع کے تین جملوں کی روشنی میں

تاریخ تالیف	———	۱۳۸۹ھ (مطابق ۱۹۶۹ء)
مقامِ تالیف	———	کراچی
طباعت اول		البلاغ شمارہ ذوالحجہ ۱۳۸۹ھ

دورِ حاضر کے مذکورہ بالا تین فتنوں کے بارے میں حضرت مفتی محمد شفیع صاحب قدس سرہٗ کی ایک تقریر جو سلہٹ (مشرقی پاکستان) کے جلسۂ عام میں کی گئی اور حضرتؒ کے بڑے صاحبزادے مولانا محمد زکی کیفیؒ نے اسے ضبط کرکے ''البلاغ'' میں اشاعت کے لئے دیا۔

اشتراکیت، قومیت اور سرمایہ داری

خطبہ حجۃ الوداع کے تین جملوں کی روشنی میں

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ پچھلے دنوں مشرقی پاکستان کے دورے پر تشریف لے گئے تھے جہاں ڈھاکہ سلہٹ، چاٹگام، نواکھالی، اور تنگائیل کے مقامات پر آپ نے عظیم الشان جلسوں سے خطاب فرمایا، اسی دوران سلہٹ کے ایک جلسہ عام سے خطاب کرتے ہوئے آپ نے جو تقریر ارشاد فرمائی اس میں عصر حاضر کے تین فتنوں، سوشلزم، نیشنلزم اور کیپٹلیزم پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خطبہ حجۃ الوداع کی روشنی میں ایک نئے رخ سے گفتگو کی گئی ہے۔ مولانا محمد زکی صاحب (سابق نائب صدر مرکزی جمعیت علماء اسلام لاہور ڈویژن) نے اس تقریر کا خلاصہ قلمبند کرلیا تھا، قارئین کی دلچسپی کے لئے وہ ذیل میں پیش کیا جارہا ہے......

اس وقت ہمارے ملک میں جو فتنے سر اٹھا رہے ہیں وہ اگرچہ دیکھنے میں مختلف ہیں لیکن اگر غور کیا جائے تو ان سب کا سرچشمہ اور سبب یہاں کی ۲۲ سالہ افسر شاہی اور انگریز کا لایا ہوا وہ نظام سرمایہ داری ہے جس نے ملک کی بنیادوں کو ہلا ڈالا ہے۔ اسی کے نتیجہ میں سوشلزم اور نیشنل ازم کے نظریات نے جنم لیا۔ افسر شاہی نے اپنا تسلط مضبوط کیا اور اقربا پروری، رشوت خوری اور بددیانتی کے ذریعہ عوام کو لوٹا اور سرمایہ داری نظام نے غریب عوام کا بچا ہوا خون بھی نچوڑ لیا، نتیجہ یہ ہوا کہ باطل طاقتوں کو سر اٹھانے کا موقع مل

گیا، اور سوشلزم اور نیشنل ازم کے خالص، مادی اور اسلام دشمن نظریات کے علمبردار سامنے آ گئے اور اس پر مزید ظلم یہ ہوا کہ پاکستان میں اسلامی اثرات ونظریات کی جڑیں بہت گہری دیکھ کر باطل طاقتوں نے اپنے باطل نظریات کے ساتھ بھی اسلامی کا پیوند لگانا ضروری سمجھا تاکہ سیدھے سادھے عوام اس دامِ ہمرنگ زمین میں پھنس کر رہ جائیں۔

کس قدر افسوس کی بات ہے کہ اسلام کو لاوارث سمجھ کر ہر مادہ پرست خالص کفر کے ساتھ اسلام کا لیبل لگا کر اسلام کے نام پر اپنے مفادات اور نظریات کو فروغ دینے کی کوشش میں لگا ہوا ہے، اور کوئی نہیں کہ اس سے باز پرس کر سکے کہ اسلام کو ان باطل نظریات کے ساتھ وابستہ کرنے کی جرأت کیسے کی جارہی ہے۔ دنیا میں اگر کوئی عام آدمی جعلی طور پر اپنے آپ کو سرکاری افسر کہنے کی جرأت کرے تو اس کا ٹھکانہ جیل کے سوا کچھ نہیں۔ ان پڑھ آدمی اگر اپنے نام کے ساتھ ایم اے لگا لے تو اس کو چار سو بیس کے جرم میں گرفتار کرلیا جائے۔ جس نے باقاعدہ ڈاکٹری کی سند حاصل نہ کی ہو اور ایم بی بی ایس کا بورڈ لگا لے تو اس پر مقدمہ چلایا جاسکتا ہے۔ لیکن مظلوم اسلام کے نام کو ہر باطل طاقت اپنے مفادات کے حصول کے لئے بے دھڑک استعمال کرتی ہے اور کوئی خدا کا بندہ ان کو اس حرکت سے روکنے والا نہیں۔

کفر سے اسلام کا تصادم کوئی نئی بات نہیں یہ معرکہ تو پونے چودہ سو سال سے برابر جاری ہے اور اسلام کی پوری تاریخ اس پر گواہ ہے کہ اسلام نے باطل کو ہر محاذ اور معرکہ میں ہمیشہ شکست فاش دی ہے۔ لیکن آج ہمارے ملک میں اسلام کا مقابلہ کھلے کفر سے نہیں ہے بلکہ اس کفر عظیم سے ہے جس نے اپنے ظاہری چہرے پر اسلام کا نقاب ڈال رکھا ہے اور اس طرح سادہ دل مسلمانوں کے ایمان کا شکار کھیلنا چاہتا ہے۔ اس لئے تمام مسلمانوں کا فریضہ ہے کہ وہ اس حق و باطل کے فرق کو پہچانیں تاکہ ان جماعتوں کے پیچھے نہ لگ جائیں جو اسلام کے نام سے اپنے ناجائز اغراض و مقاصد پورے کرنے کی فکر میں لگی ہوئی ہیں۔

صحیح اسلام کو سمجھیں جس کا نظام حیات دین و دنیا کی ہر سعادت اور صلاح و فلاح اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے اور جس کی جامعیت کی دسترس سے زندگی کا کوئی گوشہ باہر نہیں ہے اور جس کے پاس زندگی کے ہر گوشہ کے لئے ایسی جامع اور اکمل ہدایات موجود ہیں جنکی نظیر دنیا کا کوئی ازم پیش نہیں کرسکتا۔

قرآن حکیم نے نہایت واضح الفاظ میں الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی کا اعلان فرما کر مسلمانوں کو اس پر متوجہ فرما دیا کہ اسلام نے قیامت تک کے لئے زندگی کے ہر شعبہ کے لئے اپنا جامع ترین دستور العمل دے دیا ہے، جس میں انسانیت کے لئے فلاح و بہبود کے ایسے اصول بتا دیئے ہیں جن کے بعد دنیا کے کسی ازم کو اپنانے کی ضرورت باقی نہیں رہتی ہے۔ اور نہ اسلام میں اس کی گنجائش ہے، اور نہ دنیا کا کوئی ازم انسانیت کے لئے ایسا امن وسکون کا نظام پیش کرسکتا ہے اور اسلام کے اس نظام حیات کو سمجھنے کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ اور آپ کے ارشادات ہی منبع ہدایت ہیں صحیح اسلام کے نظریۂ حیات کو سمجھانے کے لئے قرآن وسنت کی ہزاروں نصوص و آیات سے بحمد اللہ اسلام کا ذخیرہ کتب بھرا ہوا ہے۔ جو حضرات تفصیلات سمجھنا چاہیں وہ اس ذخیرہ سے استفادہ کریں کیونکہ یہاں اس وقت تفصیلات میں جانے کا وقت نہیں۔

میں اس وقت آپ کے سامنے سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کے بالکل آخری دور یعنی وفات سے صرف اسّی نوے یوم قبل کے اس تاریخی خطبہ کے صرف تین جملے پیش کرنا چاہتا ہوں جو آپ نے حجۃ الوداع کے موقع پر عرفات کے میدان میں ایک لاکھ پچیس ہزار صحابہ کرام کے عظیم اجتماع سے خطاب فرماتے ہوئے ارشاد فرمائے۔ جس کو علمائے امت نے بجا طور پر اسلام کا آئین اور منشور قرار دیا ہے۔ اگر قرآن وسنت میں مزید ہدایات بھی موجود نہ ہوتیں تو بھی یہ خطبۃ الوداع اسلامی آئین

اور نظام زندگی کا دستور العمل سمجھانے کے لئے کافی تھا۔

سوشلزم

اس جامع خطبہ کا ایک جملہ زبان نبوت سے یہ ارشاد فرمایا گیا:

فان دماء کم واموالکم واعراضکم علیکم حرام کحرمة یومکم هذا فی بلدکم هذا فی شهرکم هذا

''تمہارے خون اور اموال اور عزتیں ایک دوسرے پر حرام ہیں اسی طرح جیسے آج کے دن تمہارے اس شہر مکہ اور تمہارے اس مہینہ ذی الحجہ کی حرمت ہے۔''

یہ اس لئے فرمایا کہ یوم عرفہ، حرم مکہ اور ماہ ذی الحجہ کا احترام عرب کے سب مشرکین بھی کرتے تھے ان دنوں میں قتل وقتال کے پاس نہ جاتے تھے۔ یہاں تک کہ باپ کا قاتل بیٹے کے سامنے قابو میں آ جائے تو بھی اس کی طرف انتقام کا ہاتھ نہ اٹھاتا تھا۔

خلاصہ اس ارشاد کا یہ ہے کہ کسی کو حق نہیں ہے کہ بغیر کسی شرعی جرم کے ثبوت کے کسی کی جان لینے کی کوشش کرے۔ خون بہائے، یا کسی کی عزت وآبرو پر حملہ کرے یا کسی شخص کی ملکیت اور مال پر دست اندازی کرے یہ ارشاد فرما کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سوشلسٹ نظریات پر کاری ضرب لگا دی کیونکہ اس ارشاد نے ہر انسان کی جان ومال اور آبرو کا احترام سکھایا ہے اسکے خلاف کرنے کو شدید جرم قرار دیا ہے جبکہ کمیونزم اور سوشلزم کا سارا کھیل ہی لوگوں کی ملکیتوں کو چھیننے سے شروع ہوتا ہے جو اس میں رکاوٹ ڈالے اس کی جان لینا بھی ان کے اصول پر ایک بڑی نیکی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ سوشلزم میں انفرادی ملکیت کا تصور ہی نہیں ہے اس میں صرف قومی ملکیت ہی باقی رہ سکتی ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ پورے ملک کے ہر فرد سے اسکی تمام املاک زبردستی چھین کر چند

افسروں کے سپرد کردی جائیں وہ جس طرح چاہیں اور جس جگہ چاہیں اس دولت کو صرف کریں اور جس کو جتنا چاہیں ان کی خدمت کے عوض تنخواہ کے طور پر دیں۔ کسی کو حق نہیں کہ ان کے فیصلے اور مرضی کے خلاف کسی قسم کی فریاد یا احتجاج بھی کر سکے۔

سوشلسٹ معاشرہ میں انفرادی ملکیت اور سرمایہ دار ہونا نا قابل معافی جرم ہے، ایسے افراد ان کے نزدیک مجرم اور قابل گردن زدنی سمجھے جاتے ہیں۔ خواہ یہ دولت و ملکیت کیسے ہی جائز طریقوں اور شرعی حدود میں رہ کر حاصل کی گئی ہو۔ سوشلزم اس کو بہر حال جبریہ طور پر قومی ملکیت کے نام پر افسر شاہی کے حوالے کر دے گا۔ وہاں جائز و ناجائز اور حرام و حلال کا تصور ہی یکقلم مفقود و معدوم ہے۔

اسلام بھی ناجائز سرمایہ داری کا سخت مخالف ہے اور کسی کو اس کی ہرگز اجازت نہیں دیتا کہ دھوکہ، دباؤ یا جبر و رشوت کے ذریعہ دولت سمیٹ کر بیٹھ جائے اور غریبوں کی خون پسینہ کی کمائی ہوئی دولت پر اپنی امارت کا محل تعمیر کر کے دادِ عیش دے، لیکن اسی کے ساتھ اگر کسی شخص نے جائز طریقہ پر شرعی دائرۂ کار میں رہ کر کچھ دولت حاصل کر لی اور اپنی جدو جہد اور صلاحیت کو بروئے کار لا کر کوئی ملکیت بہم پہنچا لی ہے تو اسکی حفاظت کی ذمہ داری بھی اسلام پوری طرح قبول کرتا ہے۔ اس کی طرف ظلم و ستم کا جو ہاتھ بھی آگے بڑھے گا اسلام اس کو کاٹ کر پھینک دے گا۔

جس طرح کسی سرمایہ دار کو اس کی اجازت نہیں دی جاسکتی کہ غریب مزدور کی بے مائیگی کا ناجائز فائدہ اٹھا کر اپنا تختۂ مشق بنائے اور اس پر ظلم کرے۔ جو بھی ایسا کرے گا وہ اسلام کی عقوبت سے اپنی گردن نہیں بچا سکتا۔ بالکل اسی طرح اگر کسی نے صحیح اسلامی طریقوں سے سرمایہ جمع کیا ہے اس کی حفاظت بھی اسلام کے ذمہ ہے۔ کسی طاقت کو یہ اجازت ہرگز نہیں دی جاسکتی کہ اس کے سرمایہ پر حریصانہ نظر ڈالے اور اسکو لوٹنے کی کوشش کرے۔ اگر کسی نے ایسا اقدام کیا تو اسلام اسکی گردن پکڑ لے گا۔

اسلام کی نظر میں مزدور اور سرمایہ دار کی کوئی تفریق نہیں اس کی نگاہ میں دونوں طبقے

ایک ہی برادری کے افراد ہیں۔ وہ دونوں کے حقوق تسلیم کرتا ہے اور دونوں پر ظلم برداشت نہیں کر سکتا۔

غرض اسلام کے نزدیک اگر دولت غلط طریقہ پر حاصل کی گئی ہے خواہ وہ دو چار روپے ہوں اور خواہ لاکھوں کی رقم ہو غریب نے حاصل کی ہو یا سرمایہ دار نے وہ غلط کار لوگوں سے چھین کر اس کے حق داروں کو پہنچا دے گا اور اگر جائز طریقوں پر حاصل کی ہو وہ کم ہو یا زیادہ، مزدور نے حاصل کی ہو یا امیر نے، وہ دونوں کی حفاظت کرے گا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے زندہ رہو اور زندہ رہنے دو کا اسلامی اصول اپنے اس بلیغ خطبے کے ایک جملہ میں بیان فرما دیا اور سوشلزم جیسے لادینی اور مفسدانہ فتنے کی جڑ اکھاڑ پھینکی۔ اس جملے سے پہلے اس کی اہمیت کی طرف متوجہ کرنے کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے صحابہ کرامؓ سے سوال فرمایا کہ کیا یہ یوم عرفہ نہیں؟ کیا یہ بلدۃ الحرام نہیں ہے؟ اور کیا یہ حرمت کا مہینہ نہیں؟ صحابہ کرامؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) بیشک یہ عرفہ کا دن بھی ہے حرم کعبہ بھی ہے..........اور مہینہ بھی حرمت کا ہی ہے جس میں تمام عرب خواہ مسلمان ہوں یا مشرک اور کسی بھی مذہب سے تعلق رکھتے ہوں بالاتفاق ان تینوں کی حرمت کے قائل ہیں اور ان ایام اور مواقع میں اپنے کسی دشمن سے بھی اپنا بدلہ لینا صحیح نہیں سمجھتے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات کا اقرار کر لینے کے بعد فرمایا کہ:۔

تمہارے خون، اموال اور عزتیں ایک دوسرے پر قیامت تک اسی طرح حرام کر دی گئیں ہیں جیسے اس دن اس شہر اور اس مہینہ کی حرمت ہے۔

اس طرح سوشلزم جیسے فتنے کی مسلمانوں میں سر اٹھانے کی کوئی گنجائش باقی نہیں چھوڑی۔

نیشنل ازم

اس خطبہ حجۃ الوداع کا ایک دوسرا جملہ زبان رسالت سے یہ بیان ہوا :

"کسی عربی کو عجمی پر، گورے کو کالے پر کوئی فضیلت نہیں بجز اس کے کہ وہ متقی ہو"

لا فضل لعربی علیٰ عجمی ولا للاحمر علی الاسود الا بالتقویٰ۔

کسی عربی کو عجمی پر، گورے کو کالے پر کوئی فضیلت نہیں۔ بجز اس کے کہ وہ متقی ہو۔

یہ اعلان فرما کر آپ نے وطنی قومیت اور نیشنل ازم کی بنیاد ختم کر دی اور بتا دیا کہ نیشنل ازم اور اسلام ایک ساتھ نہیں چل سکتے۔ اگر اسلام کا دامن تھامنا ہے تو نیشنل ازم کے بت کو پاش پاش کرنا ہوگا اور اسلام کی ایسی محبت دلوں میں پیدا کرنی ہوگی جس کے سامنے وطنی اور لسانی قومیت کا چراغ نہ جل سکے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ پر جہاں تک میں نے غور کیا ہے، یہ سمجھا ہوں کہ آپ کی مکی زندگی کا پورا دور افراد سازی کا دور تھا۔ آپ نے اپنا تمام وقت اور قوت و توانائی ایسے افراد پیدا کرنے کے لئے صرف فرمائی جن کی زندگی کا ہر لمحہ اور ہر کام محض اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرنے کے لئے ہو۔ جن کا جاگنا، سونا، اٹھنا، بیٹھنا، کھانا پینا، تجارت و زراعت اور صلح و جنگ، غرض ہر قدم محض اللہ کی رضا جوئی کے لئے ہو۔

جب آپ کے فیض صحبت اور تربیت سے ایسا معاشرہ وجود میں آ گیا جو فرشتوں کے لئے بھی قابل رشک تھا اور جس کی نظیر دنیا نے نہ اس سے پہلے کبھی دیکھی تھی اور نہ بعد میں دیکھ سکی تو آپ نے مکہ معظّمہ سے مدینہ منورہ کے لئے ہجرت فرمائی مدینہ منورہ اسلامی حکومت کا پہلا گہوارہ بنا تو آپ نے یہاں اسلامی سیاست کا آغاز اس اقدام سے فرمایا کہ سب سے پہلے مہاجرین وانصار میں بھائی چارہ اور مواخاۃ پیدا کی، مہاجرین وانصار کو باہم بھائی بھائی بنا دیا۔ یہ مواخاۃ صرف نام کی نہیں تھی کہ چند نعرے بھائی بھائی کے

لگائے اور فارغ ہو گئے بلکہ یہ وہ حقیقی مواخاۃ تھی جس نے سب کے دلوں میں حقیقی بھائیوں سے زیادہ الفت ومحبت پیدا کردی۔ اور ایک دوسرے پر ایثار ومحبت میں سبقت لے جانے کا ایک نا قابل فراموش جذبہ پیدا کردیا۔ جس کے بعد مختلف زبانیں بولنے والے قوموں، علاقوں اور وطنوں میں بٹے ہوئے انسان صرف مسلمان کی حیثیت سے ایک اسلامی برادری کے مضبوط رشتہ میں اس طرح مربوط ہو گئے کہ عربی وعجمی کا امتیاز باقی نہ رہا۔ گورے کالے کا تفوق ختم ہو گیا۔ غلام اور آقا کے عجمی تصور کا نام ونشان باقی نہ رہا۔ حضرت بلال حبشیؓ، صہیب رومیؓ، سلمان فارسیؓ رضوان اللہ علیہم اجمعین جیسے غیر عربی مملوک حضرات اسلامی برادری کی عظیم ترین شخصیتیں بن گئیں، جن کے سامنے عرب وطنیت اور جاہ ومال اور شان وشوکت نے سر تسلیم خم کر کے انہیں اپنا پیشوا تسلیم کیا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نسلی اور قبائلی عصبیتوں کو سب سے پہلے قدم پر ختم فرما کر نیشنل ازم کی شہ رگ کاٹ دی۔

اسلامی قومیت اور نسلی وطنی قومیت میں خاص امتیاز

نظریاتی قومیت جو اختیاری ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی کی طرف دعوت دی جب کہ وطنی اور لسانی قومیت غیر اختیاری ہے۔ جو قومیتیں کسی نسل ونسب یا وطن وزمین، یا رنگ وزبان کی بنیاد پر قائم ہوتی ہیں وہ لازمی طور پر عالمگیر نہیں ہو سکتیں۔ کیونکہ جو کسی خاص شہر اور ملک میں پیدا ہو چکا ہے، وہ اب دوسرے ملک میں پیدا نہیں ہو سکتا۔ جو قریش کے نسب میں پیدا ہوا ہے وہ کسی عجمی نسب میں پیدا نہیں ہو سکتا، جو کالا پیدا ہوا ہے گورا نہیں ہو سکتا۔ یہ قومیتیں جن کا تعلق غیر اختیاری امور سے ہے، لامحالہ علاقائی اور طبقاتی ہی ہو سکتی ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ پوری انسانیت ہزاروں، بلکہ لاکھوں قومیتوں میں بٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گی، اور باہمی جنگ وجدال کے دروازے کھلیں گے۔

اس کے برخلاف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام عالم کے انسانوں کو ایک نظریاتی قومیت میں منسلک ہونے کی دعوت دی جس میں داخل ہونا امر اختیاری ہے۔ تمام دنیا کے انسان اس میں شامل ہو کر ایک برادری بن سکتے ہیں قرآن کریم نے فرمایا:

انما المومنون اخوة

یعنی مسلمان سب بھائی ہیں

اسی عالمگیر قومیت کا نتیجہ تھا کہ اتحاد ملی اور دینی حمیت سے سرشار مخلصین اہل اللہ کی یہ جماعت جس ملک اور جس خطہ میں پہنچ گئی وہاں کی کایا پلٹ گئی، ان کے عمل، گفتار اور کردار اسلام کی حقانیت کا زندہ ثبوت بن گئے۔ جن کو دیکھ کر لوگوں کے قلوب نے گواہی دی کہ یہ پاکیزہ انسان غلط راستہ پر نہیں چل سکتے اور ان کی صرف زیارت نے ہی ہزاروں لاکھوں افراد کو حلقہ بگوش اسلام بنا دیا اور دنیا کا اکثر حصہ اسلامی رنگ میں رنگا ہوا نظر آنے لگا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ معرکہ بدر و حنین و احزاب میں جو طاغوتی لشکر اسلام کے سامنے آیا ان میں سے اکثر انہیں قبائل کے افراد اور خونی رشتوں میں مربوط باپ، بھائی، بیٹا، چچا، ماموں وغیرہ مسلمانوں کے سامنے آئے اور مسلمانوں کی شمشیر خارا شگاف نے ان کی گردنیں اڑا دینے میں ادنیٰ سی بھی جھجک محسوس نہیں کی۔

حقیقت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ان غزوات میں مسلمانوں کی تلواریں جو اسلام کی حفاظت کے لئے بلند ہوئیں اور کافر باپ بیٹے اور بھائی کا امتیاز کئے بغیر کفر پر پیغام اجل بن کر گریں۔ وہ افراد پر نہیں بلکہ نیشنل ازم کے بت پر پڑ رہی تھیں، آج جو لوگ نیشنل ازم کے دعویدار ہیں، خدا جانے وہ کس بنیاد اور کس طرح اسلام کے ساتھ مذاق گوارا کرتے ہیں۔

خود پاکستان کا وجود اسلام کے اسی سیاسی سنگ بنیاد پر مجتمع ہو کر کام کرنے کا کرشمہ ہے کہ دنیا کی یہ سب سے بڑی اسلامی مملکت دنیا کے نقشہ پر نمودار ہوگئی۔

پاکستان وطنیت اور قومیت کے نام پر نہیں اسلام اور صرف اسلام کی بنیاد پر بنا اور

اس کیلئے ان خطوں کے رہنے والے مسلمانوں نے سب سے زیادہ اکثریت کے ساتھ ووٹ دیئے جن کو یہ تصور بھی نہیں آ سکتا تھا کہ انکا خطہ بھی پاکستان میں شامل ہوسکتا ہے۔ جن میں سے مسلمانوں کی بڑی تعداد آج بھی ہندوستان کے تنگ نظر ہندو کی بربریت اور ظلم وتشدد کا شکار ہے۔

خود حق تعالیٰ نے قرآن حکیم میں واضح طور پر دنیا میں صرف دو جماعتوں کی نشان دہی فرمائی ہے۔ ارشاد فرمایا کہ:

خلقکم منکم کا فر و منکم مؤ من

اس میں حق تعالیٰ جل شانہ نے دوقومی نظریہ دوٹوک الفاظ میں فرمادیا کہ دنیا میں صرف دوگروہ ہیں ایک خدا کو ماننے والے مسلمان اور مؤمن گروہ اور دوسرا نہ ماننے والا کافر۔

کیپٹل ازم

تیسرا ایک جملہ خطبۂ حجۃ الوداع میں یہ ارشاد فرمایا گیا کہ:

الا ان ربا الجاھلیة موضوع

تمام سودی کاروبار اور لین دین حرام کردیا گیا ہے۔

اور اس حکم حرمت سے قبل جو سودی معاملات ہو چکے ہیں ان میں بھی اب سود کی رقم کا لین دین نہ کرسکیں گے۔ صرف راس المال ہی وصول کیا جا سکے گا۔ اور میں خود سب سے پہلے اپنے چچا عباس کا سود جو قبیلہ بنی ثقیف کے ذمہ ہے چھوڑتا ہوں۔

یہ سود کی رقم بڑی بھاری رقم تھی، آپ نے سب سے پہلے اس سے دستبرداری کا اعلان فرما کر ذہنوں کو اس الجھن اور شک وشبہ سے بچادیا کہ کہیں سود کی ادائیگی کے خوف

سے یہ راستہ اختیار نہ کیا گیا ہو۔

تمام سودی کاروبار اور لین دین حرام کر دیا گیا ہے

اس حکم سے آپ نے سرمایہ دارانہ نظام جس کو کیپٹل ازم بھی کہا جاتا ہے۔اس کی جڑ کاٹ دی کیونکہ سرمایہ دارانہ نظام کی روح سود اور سٹہ کا کاروبار ہے جس کے ذریعہ سے اقوام عالم کی دولت سمٹ کر چند ہاتھوں میں پہنچ جاتی ہے اور پوری انسانیت مفلوک الحال اور سرمایہ داروں کی دست نگر ہو کر رہ جاتی ہے۔غریب، غریب تر ہوتا چلا جاتا ہے اور امیر، امیر تر ہو کر دولت کے ذریعہ ایک طرف سیاست ونظام حکومت پر اثر انداز ہوتا ہے۔اور دوسری طرف سامان تجارت کو روک کر اشیاء کی گرانی عوام پر مسلط کر دیتا ہے۔

رحمت للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم نبی آخر الزماں ہیں، آپ کا اسوۂ حسنہ قیامت تک کیلئے دنیا کے ہر مسئلہ کا حل انسانی فطرت کے مطابق اور انسانیت کی فلاح و بہبود کا ضامن ہے۔آپ کی زبان مبارک کے تین بلیغ جملوں نے تینوں ازموں سوشلزم، نیشنل ازم اور کیپٹل ازم کی قلعی کھول کر رکھ دی اور ان تینوں کی مضرتیں واضح فرما دیں۔

پھر یہ تینوں جامع اور بلیغ جملے ارشاد فرما کر پوری قوت اور شان شوکت کے ساتھ یہ اعلان عام بھی فرمادیا کہ:

> ’’آج کے دن تمام رسوم جاہلیت کو میں اپنے قدموں تلے کچل رہا ہوں۔
> خبر دار جو لوگ اس وقت موجود نہیں ہیں، وہ یہ پیغام دوسروں کو پہنچا دیں۔‘‘

اس سے یہ بات اور زیادہ واضح ہوگئی کہ موجودہ دنیا پر چھائے ہوئے تینوں ازم دور جاہلیت کی یادگار ہیں جو آج نام بدل کر سامنے آئے ہیں۔اور جن کو رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قدموں میں کچل دیا تھا۔

یہ چند اصولی ارشادات تھے جو ارشاد نبوت کی روشنی میں عرض کئے گئے ہیں۔ جس سے یہ بات پوری طرح صاف اور واضح ہو کر سامنے آ گئی۔ اسلام دنیا کے مروجہ ازموں سوشلزم، نیشنل ازم اور کیپٹل ازم تینوں کا سخت مخالف اور شدید دشمن ہے اور ان تینوں ازموں کے تصورات کو دنیا سے مٹانے کے لئے آیا ہے۔ اسلام صرف اسلام ہے اور نہایت جامع معتدل نظام حیات لے کر آیا ہے۔ جس کے ساتھ کسی ازم کی نہ ضرورت باقی رہتی ہے اور نہ اسلام اس قسم کے کسی پیوند کو برداشت کر سکتا ہے۔

کاش اس ملک پاکستان میں امتحان کے لئے ہی اسلامی نظام قائم کر کے دیکھ لیا جاتا۔ میں پورے وثوق اور جزم سے کہتا ہوں کہ اگر صرف تجربہ کے لئے ہی یہ نظام کچھ روز کے لئے جاری کر لیا جاتا تو صرف چھ ماہ کے قلیل عرصہ میں ہی اس کے محاسن اور خوبیاں ملک کے ہر طبقہ کو اپنا گرویدہ بنا لیتیں اور دنیا دیکھتی کہ نادار مفلس عوام کے لئے اسلام کتنے وسیع معاشی راستے کھول دیتا ہے جس میں ہر فرد کو آگے بڑھنے اور ترقی حاصل کرنے کی پوری پوری آزادی مہیا کی گئی ہے۔ اسلامی نظام کا خاصہ ہی یہ ہے کہ وہ ایک طرف غریب عوام کو سرمایہ فراہم کرنے کے لئے ایسے اقدامات کرتا ہے جس کے بعد عام افلاس باقی نہیں رہ سکتا۔ دوسری طرف اجارہ داریوں کو بند کر کے کسی کو اتنا بڑا سرمایہ دار بننے نہیں دیتا جو ملکی معیشت پر اثر انداز ہو کر اشیاء کی گرانی کا سبب بن سکے۔ تاریخ گواہ ہے کہ اسلامی نظام حیات جس وقت قائم تھا اس وقت ایسی مثالیں بھی موجود ہیں کہ زکوٰۃ کی رقوم رکھی ہوئی ہیں اور کوئی مستحق زکوٰۃ نہیں ملتا۔

ہمارے ملک کی بدقسمتی یہ ہے کہ یہاں پاکستان کی ۲۲ سالہ حکومتوں نے اسلامی دستور و آئین کے نفاذ کا دعویٰ اور وعدہ تو مسلسل کیا اور صرف زبان سے اسلامی نظام حیات کو اپنانے پر زور بھی دیا لیکن عملی طور اسلام کا راستہ قدم قدم پر روکا گیا جو چند ادارے اسلام کے نظام حیات کو سمجھانے کے لئے بنائے گئے ان کا مشن ہی اسلام مسخ کرنے کی کوششیں بن کر رہ گیا۔ اور ہر باطل نظریہ کو یورپ سے متاثر ہو کر اسلام کے نام

پر ذہن نشین کرانے کی کوشش کی گئی۔

انگریز کا مسلط کیا ہوا نظام جب اپنے انجام بد کو پہنچا اور انگریز اپنا بوریہ بستر لپیٹ کر اس ملک سے رخصت ہوا تو ہم نے اپنی حماقت، بے حسی اور ذہنی مرعوبیت کی وجہ سے انگریز کے بجائے امریکہ کو اپنا مخدوم اور آقا بنالیا۔ اس کا خراب ناقص مال، اور قرضہ جو سود، در سود کی شکل میں ہم کو دیا گیا۔ ہم نے اس کو امداد کا نام دے کر امریکہ کی خوشنودی حاصل کرنے کی کوششیں شروع کر دیں۔ اور سرمایہ دارانہ لعنتی نظام کا طوقِ غلامی اپنے گلوں میں ڈال کر خوش ہوتے رہے۔ جس کا نتیجہ یہی ہونا تھا کہ دولت چند خاندانوں میں محدود ہو کر رہ گئی اور غریب عوام اقتصادی بدحالی کی انتہا کو پہنچ گئے۔ اور اسی اقتصادی بد حالی نے یہاں کی فضا سوشلزم کے لئے سازگار بنادی۔ سوشلسٹ عناصر نے بھوکے عوام کو فریب اور لالچ دے کر اپنے نظریات انکے ذہن نشین کرنے کی کوششیں تیز تر کر دیں۔

سوشلزم اور کمیونزم عالم اسلام پر عذاب الٰہی بن کر پھیلتا جا رہا ہے۔ اور چونکہ وہ قوت و طاقت اور مادیت کی بنیاد پر ملکوں پر تسلط قائم کرتا ہے اس لئے طاقت کے بل پر سب سے پہلے اسلام اور اسلامی درد رکھنے والوں کو اپنا ہدف بناتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ وہ جس اسلامی ملک میں پہنچا وہاں سے اسلام اور اسلامی آثار ختم ہوتے چلے گئے۔ روسی ترکستان کا علاقہ سمرقند، بخارا جو اسلامی علوم و معارف اور دین کا سرچشمہ تھے جہاں کے علماء آسمان علم کے آفتاب و نجوم سمجھے جاتے تھے جن کی کتابیں اور تصانیف پڑھ کر ہم اور آپ اسلام کو سمجھنے کے قابل ہوئے جن کی بدولت علوم نبوت کی روشنی دنیا میں پہنچی اور پھیلی۔ کس قدر دردناک ہے یہ بات کہ وہی سرچشمۂ علوم اسلام کے نام لیوا حضرات سے خالی نظر آتا ہے اور آج اس وسیع و عریض ملک میں اللہ کا نام لینے والا ڈھونڈے سے بمشکل ہی مل سکے گا۔

سوڈان اور شام میں حال ہی میں سوشلزم کے منحوس قدم پہنچے ہیں، ان دونوں

ملکوں کا بظاہر جرم یہ نظر آتا ہے کہ اس میں قرآن و سنت پر مبنی اسلامی دستور آئین جاری کر لینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اور اسلام دشمن عناصر سے طویل معرکہ آرائی کے بعد اسلام کے نظام زندگی کو سر بلند کرنا چاہا تھا۔ وہاں سوشلزم آنے کے بعد قرآن کریم پڑھنے پڑھانے کے سینکڑوں مکاتب بند کر دیئے گئے۔ اسلامی درس و تدریس کی درسگاہوں پر ایسی پابندیاں لگائی جارہی ہیں جن کے بعد اسلام دوست عناصر کے لئے اسلام کے لئے کام کرنا ممکن نہیں۔

یہ کوئی سنی سنائی بات نہیں بلکہ ناقابل تردید شواہد ہیں جن کا دل چاہے وہ ان ممالک میں جا کر اسلام کی مظلومیت کا نقشہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لے۔

پاکستان کے ایک نہایت دین دار مخیّر صاحب ثروت نے اپنی زندگی کا مشن قرآنی مکاتب کا احیاء ہی بنایا ہوا ہے۔ انہوں نے خود شام و سوڈان میں سینکڑوں قرآنی مکاتب قائم کئے ہوئے تھے وہاں سوشلزم آنے کے بعد ان کے وہ تمام مکاتب قرآنی قانوناً بند کر دیئے گئے۔ اور وہ صاحبِ ثروت بزرگ آج اپنے ان مدارس کے بند ہو جانے کا ماتم کر رہے ہیں۔

جن ممالک میں سوشلزم آیا ان میں سے اکثر کا یہی حال ہے کہ اسلامی تعلیمات پر پابندیاں لگی ہوئی ہیں۔ اور علماء جیلوں میں بند ہیں۔ جن پر مختلف الزامات لگا کر عقوبت کے شکنجوں میں کسا جارہا ہے۔

بڑے افسوس کی بات ہے کہ بعض اہل علم حضرات ان اسلامی ملکوں میں سوشلسٹ غلبہ کے بعد بھی ان کی تعریف میں رطب اللسان ہیں۔ خدا معلوم ان کو یہ واقعات معلوم ہیں یا نہیں۔

سوشلسٹ عناصر ابتدا میں کھلم کھلا سوشلزم لانے کے مدعی نہیں بنتے بلکہ اسلامی لفظ لگا کر سادہ لوح علماء کو اپنے دام تزویر میں پھنسا کر اپنی مطلب براری کرتے ہیں، اور جس

وقت مکمل طور پر غلبہ حاصل کر لیتے ہیں تو سب سے پہلے علماء وصلحاء کو ہی اپنا ہدف بناتے ہیں۔

اگر ہمیں مسلمان رہنا ہے اور ہم چاہتے ہیں کہ ہماری آنے والی نسلیں مسلمان رہیں اور پاکستان میں اسلام زندہ رہے تو اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں کہ سوشلزم جیسے کفر عظیم کے مقابلہ میں تمام مسلمان قوم اور اسلام دوست جماعتیں سد سکندری بن کر اٹھ کھڑی ہوں، اپنے علاقائی، لسانی اور نسلی تعصّبات اور جماعتی مفادات کو پس پشت ڈال کر صرف اللہ کے دین کے احیا اور سر بلندی کے لئے کمربستہ ہو جائیں۔

اسلام پسند حلقہ کو سمجھنا چاہیئے کہ اسکی بقاء اسلام کی بقاء کے ساتھ وابستہ ہے۔ خدا نخواستہ اگر اسلام کو یہاں کوئی نقصان پہنچتا ہے تو اس کی براہ راست زد سب سے پہلے اسلامی حلقہ پر پڑنی ناگزیر ہے۔ اس لئے علاقائی اور لسانی نسلی تعصبات سے صرفِ نظر کر کے اور اپنے معمولی مفادات کو پس پشت ڈال کر اجتماعی اتحاد کی ممکنہ کوشش کی جائے۔ اور اس معاملہ میں گروہی مفادات کو ہرگز راستہ کی روکاوٹ نہ بننے دیا جائے۔ اور سوشلزم جو اپنی پوری قوت کے ساتھ اسلام کے مقابلہ میں آ کھڑا ہوا ہے اس پر کاری ضرب لگائی جائے کیونکہ پاکستان ہی اس وقت اسلام اور اسلامی نظریۂ حیات کا آخری حصار ہے اگر یہ حصار ٹوٹ گیا تو پوری دنیائے اسلام اس کفر عظیم کے سیلاب میں گھر کر فنا ہو جائے گی۔

یہ حق تعالیٰ کا فضل وانعام ہے کہ پاکستان کے عوام بیدار ہو چکے ہیں اور سوشلزم کے فریب کا پردہ چاک ہو چکا ہے۔ یہاں کے بارہ کروڑ عوام سوشلزم کے چیلنج کو قبول کر کے اسکے مدمقابل آ گئے ہیں۔ اب ان پر فریب یا جبر سے یہ ظالمانہ نظام مسلط نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن یہ فتنہ اپنی تمام عیارانہ چالوں اور فریب کاریوں کے ساتھ مقابلہ میں آیا ہے۔ اس لئے ہر قدم پر غور وفکر اور احتیاط کے ساتھ آگے بڑھنا ہوگا۔ اور اس کی ہر چال کو ناکام بنانے کے لئے اپنے ذاتی مفادات کو قربان کر کے ملی مفادات کو پیش نظر رکھنا ہوگا۔ اگر

تمام جماعتوں نے مل کر کام کر لیا تو انشاء اللہ اس مملکت خدا داد پاکستان میں اسلام کا آئین ہی نافذ ہو کر رہے گا۔ اور سوشلزم کو ایسی شکست فاش دی جائیگی جسکے بعد اسکو دوسرے اسلامی ممالک میں بھی اپنے قدم جمائے رکھنا اور سانس لینا مشکل ہو جائے گا۔

۷۱

اسلام اور سوشلزم

مغربی سامراج کے دو مخالف جن میں سے

ایک ظلم کے بدلے انصاف لاتا ہے اور دوسرا ظلم کے بدلے ظلم

تاریخ تالیف ———

اشاعت اوّل از ——— جمعیۃ علماء اسلام کراچی ڈویژن

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اسلام اور سوشلزم مغربی سامراج کے دو مخالف

(جن میں ایک ظلم کے بدلے انصاف لاتا ہے، اور دوسرا ظلم کے بدلے ظلم)

یورپین سامراج کا تسلط ایشیائی ممالک ہندوستان وغیرہ پر ہوا تو اپنے ساتھ بہت کچھ عیش و عشرت کے سامان، گھروں اور بازاروں کی رونق، آرام و راحت، زیب و زینت کے نئے نئے طریقوں کی چہل پہل لے کر آیا اور ہندوستان کی نو سو سالہ اسلامی حکومت کو تہ و بالا کر کے اس پر قبضہ کر لیا، اسلامی شعور اور قومی غیرت رکھنے والوں نے تو اسوقت بھی اپنی مومنانہ فراست سے مغربی تہذیب و معاشرت کے نتائجِ بد کا کچھ اندازہ لگا کر یہی کہا تھا کہ ؎

نگاہ خلق میں دنیا کی رونق بڑھتی جاتی ہے
مری نظروں میں پھیکا رنگِ محفل ہوتا جاتا ہے

مگر عام نظریں اس ظاہری ٹیپ ٹاپ اور نقد آرام و عیش میں الجھ کر رہ گئیں۔ خدا تعالیٰ اور آخرت سے غفلت اس کا لازمی نتیجہ تھا وہ سامنے آیا۔ انگریزوں کی یہ پالیسی کہ مسلمانوں کی مسجدیں اور دینی مدارس منہدم کئے بغیر ویران ہو جائیں۔ اس راہ سے کامیاب ہوتی نظر آئیں۔ لارڈ میکالے کی تعلیمی پالیسی نے اس کو پورا استحکام بخشا۔ دینی اور دنیوی تعلیم میں ایک بڑی خلیج حائل ہو گئی اور بالآخر دینی تعلیم اچھوت کی صورت

میں منتقل ہو کر گمنام گوشوں میں رہ گئی، حکومت کے ایوانوں، تجارتی چیمبروں اور بازاروں پر یورپ سے درآمد کیا ہوا سرمایہ دارانہ نظام چھا گیا۔

سود، سٹہ، قمار، انشورنس کے بازار گرم ہو گئے جن لوگوں کے دماغ نئی تعلیم سے مسحور اور نگاہیں نئے نظام معاشیات کی ظاہری رونق سے خیرہ ہو چکی تھیں۔ ان کا دینی شعور اور مذہبی جذبہ پہلے ہی مضمحل اور نیم مردہ ہو چکا تھا اب ان کے سامنے اہم مسئلہ صرف معاش کا تھا اس نے نئے نظامِ معاش کو انسان کی معاشی صلاح وفلاح کا نسخہ اکسیر سمجھ کر قبول کر لیا۔

اس وقت کون یہ جانتا تھا کہ اس نئے نظام کے نتیجہ میں یہ روز بد دیکھنا پڑیگا کہ دولت سمٹ کر چند ہاتھوں یا چند برادریوں کے قبضہ میں آجائے گی۔ اور پوری قوم محنت مزدوری اور نوکری کرنے پر مجبور ہوگی اور ان کو ان کی محنت کا صلہ بھی ان کی ضرورت اور محنت کے مطابق نہ مل سکے گا اور ان سب آفتوں سے بڑی آفت یہ ہوگی کہ دولت اور پیسہ عزت کا معیار بن جائے گا اس طرح پوری قوم عزت نفس سے بھی محروم ہو کر غلامانہ زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو جائے گی۔

ہاں! قرآن اور اسلامی تعلیمات پر نظر رکھنے والے علماء جانتے تھے کہ جو نظام اس وقت ملک پر مسلط کیا جارہا ہے وہ صرف دین و مذہب کے خلاف نہیں بلکہ عام انسانی معاشیات کے لئے بھی بدترین نتائج کا حامل ہے کہ سود و قمار کے معاملات سے پورے ملک کی دولت سمٹ کر چند افراد اور جماعتوں کے ہاتھ میں آجائے گی اور ملک کے عوام فقر وافلاس کے شکار ہو جائیں گے۔

عام دیندار مسلمانوں اور خصوصاً علماء کرام نے اولاً طاقت کے ساتھ اس سامراج اور سرمایہ دارانہ نظام کا مقابلہ کیا۔ جب اس میں کامیابی نہ ہوئی تو علماء نے فکری اور نظری طور پر جہادِ قلم کے ذریعہ اس کا مقابلہ جاری رکھا۔ قرآنی احکام کے

ماتحت سود، سٹہ اور قمار کے تباہ کن اثرات سے مسلمانوں کو آگاہ کرتے رہے۔ مگر اس وقت علماء کو تنگ خیال کہہ کر ان کی بات کی طرف التفات نہ کیا گیا، یہاں تک کہ اس نظام کی تباہ کاری آنکھوں کے سامنے آگئی اور خلق خدا اس سامراج اور سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف چلا اٹھی مگر ساتھ ہی اس کے مقابلے پر کمیونزم اور سوشلزم کے نظریات جارحانہ صورت میں ابھرے۔ ان نظریت کی بنیاد خدا اور آخرت کے خلاف بغاوت، مذہب سے بیزاری پر رکھی گئی اور اس نے انفرادی ملکیت ہی کو ظلم قرار دے دیا اور محنت کشوں، مزدوروں اور سرمایہ داروں میں ایک طبقاتی منافقت قائم کر کے ہر طرح کی لوٹ مار اور قتل و غارتگری کو ان کے لئے نہ صرف جائز بلکہ مقصدِ زندگی قرار دیدیا اور یہ سبز باغ دکھلایا کہ ان سرمایہ داروں کو لوٹ کھسوٹ لو سب تجارتوں، صنعتوں، ملوں اور کارخانوں کے مالک تم ہو۔ پھر تعبیر اس خواب کی یہ نکلی کہ ان غریب فاقہ کش عوام کا دین وایمان تو اس نظریہ نے پہلے ہی رخصت کر دیا تھا۔ اب قومی ملکیت کا دلفریب عنوان دے کر تمام وسائل پیداوار پر حکمران ٹولی قابض ہوگئی اور سابقہ سامراج کی جگہ اس خونی سرخ سامراج نے لے لی اور محنت کش طبقہ کو جانوروں کی طرح بلکہ بے جان مشینی کل پرزوں کی طرح استعمال کیا۔ طاقت سے زائد محنت اور فریاد کی اجازت نہیں۔ خدا اور مذہب کا نام لینا جرم اور سامراج کے ایجنٹ ہونے کی علامت قرار دے کر ان لوگوں پر وہ مظالم توڑے گئے جن کو زمین وآسمان نے اس سے پہلے نہ دیکھا تھا نہ سنا۔

ایک خاندان کی جوان لڑکیوں کو جہاں اور جس کام میں لگانے کا حکم ملے گا اس کے خلاف کوئی حرف زبان سے نکالنے کی اجازت نہیں، باپ کسی ایک مشین کا پرزہ بنا ہوا ہے اور بیٹا کسی دوسری کا، اور بیوی کسی اور جگہ مزدوری کرنے پر مجبور ہے، جوان بیٹی کسی اور کارخانے میں خدمت پر مامور ہے۔ اس طرح پورا معاشرہ آزادی ضمیر اور فریاد کرنے کی اجازت سے محروم اور شدید محنت کشی کے علاوہ حرام کاری کی ایسی لعنتوں میں گرفتار ہوگیا کہ جنگل کے جانور بھی انہیں دیکھ کر شرما جائیں۔ حلال وحرام کی بحث،

حیاء و شرم کے پرانے قصے خاندانی شرافت کا فسانہ ماضی، سب خواب و خیال ہو گئے اور جس نے ذرا ان چیزوں کا نام لیا وہ سامراج کا ایجنٹ کہلا کر قابل گردن زدنی ہو گیا۔

کفر و شرک دنیا میں ہمیشہ سے ہوتا چلا آیا ہے۔ مگر کفر کی تمام اقسام میں جتنا شرمناک اور وحشت ناک کفر اس نظریہ سوشلزم اور کمیونزم کا ہے اس کی نظیر کہیں زمانہ ماضی میں بھی نہیں ملتی۔ عام طور پر تو کفار کا ہر طبقہ کسی نہ کسی صورت میں خدا کو مانتا ہے، اس کی تعظیم کو سب سے مقدم جانتا ہے صرف مٹھی بھر قدیم دہریوں کی ٹولی ہے جس نے خدا کا انکار کیا۔ مگر یہ جرأت اس کو بھی نہ ہوئی جو ان جدید دہریوں کی سوشلسٹ اقوام نے کی کہ براہ راست خدا کی توہین کی اور اس کے جنازے کے جلوس نکالے اور یہ نعرے لگائے کہ ہم نے اس ملک سے خدا کو نکال دیدیا۔ (معاذ اللہ)

یہ کوئی کہانی نہیں ہے، اسلامی تاریخ میں اسلام کے سب سے بڑے گہوارے سمرقند و بخارا اور پورے روسی ترکستان کی مساجد و معابد سے پوچھو وہاں یہی کچھ ہوا، اور ہو رہا ہے۔ آج ان شہروں میں اسلام کا مرثیہ پڑھنے والا کوئی نہیں ملتا۔ جہاں سے علومِ حدیث و قرآن کے چشمے پھوٹے تھے، اس ملک سے اپنا ایمان اور اپنی جان بچا کر ہجرت کرنے والوں کی بڑی تعداد آج بھی اسلامی ممالک میں پھیلی ہوئی ہے۔ انکے جاں گداز حالات کو سننے کے لئے بھی پتھر کا دل چاہئے۔

خلاصہ یہ کہ جن محنت کش عوام نے اپنی جانوں کی بازی لگا کر سرمایہ دارانہ نظام کو ختم کیا تھا۔ اب ان کی آنکھ کھلی تو اپنا گلا ایک ایسے سامراج کے چنگل میں دبا ہوا پایا جہاں : ع

نہ تڑپنے کی اجازت ہے نہ فریاد کی ہے

یہی سوشلزم اور کیمونزم کا وہ سبز باغ ہے جو غریب مزدوروں اور محنت کش عوام کو دکھلا کر ان کا دین و ایمان اور آزادی ضمیر خودداری، شرافت نفس سب کچھ پہلے قدم

پر لوٹ لیا جاتا ہے۔ اس کے کفر عظیم اور انسانیت کیلئے فسادِ عظیم ہونے میں کس کو شبہ ہوسکتا ہے؟

خلاصہ یہ ہے کہ مغربی سامراج ایک لعنت اور قہر الٰہی کا مظہر تھا تو یہ سرخ سامراج اس سے بڑی لعنت اور پوری انسانیت کے لئے عذاب الیم ہے۔ برطانوی سامراج تو دم توڑ چکا اور اپنی شامت اعمال کو اسی دنیا میں بھگت رہا ہے۔ اور امریکی سامراج جو اس کا وارث بن کر دنیا پر چھا گیا تھا اب اس کی بھی باری آرہی ہے لیکن مشاہدہ یہ ہو رہا ہے کہ جس جگہ سے اینگلو امریکی سامراج کا قدم پیچھے ہٹتا ہے وہیں سوشلسٹ سرخ سامراج اپنا قدم جمالیتا ہے اس وقت کے تمام اسلامی ممالک کا ایک سرسری جائزہ لیا جائے تو آپکو اس کی تصدیق ہو جائے گی، شام، مصر، عراق، شمالی یمن، الجزائر، سوڈان، لیبیا، وغیرہ اس کے شاہد ہیں اور وہاں اسلام اور اسلامی شعائر اور خدا و مذہب کے نام لینے والے، مسلمانوں پر جو کچھ بیت رہی ہے، وہ کوئی ڈھکی چھپی چیز نہیں ہے۔

اس لئے آج اینگلو امریکی سامراج کے مقابلہ پر جہاد کرنے والوں کیلئے پہلے قدم پر یہ سوچنا ہے کہ وہ کہیں اس سفید سامراج کو مٹا کر اس کی جگہ سرخ سامراج کی لعنت اور پوری انسانیت کی تباہی کو دعوت نہیں دے رہے۔

غور کریں تو واضح ہو جائے گا کہ مغربی سامراج کو مٹانے کے لئے ایک راستہ اسلام اور اسلامی نظام کا ہے اور دوسرا راستہ سوشلزم اور کیمونزم کا۔ یہ دونوں راستے ایک دوسرے سے مختلف سمتوں کو جاتے ہیں، ان کے طریقے الگ الگ اور مرحلے الگ الگ ہیں۔

سوشلزم کا راستہ

اس نظریہ کی بنیاد تو خدا اور مذہب سے بغاوت اور خالص مادّہ پرستانہ نظریہ پر

ہے۔ اس میں انفرادی ملکیت جرم اور ہر زمین جائداد یا کسی سرمایہ کا مالک مجرم ہے اسلئے وہ ہر سرمایہ دار کا دشمن، صرف مزدور کا طرفدار ہے۔ مگر اس نظریہ کے پرستار جب اسلامی ملکوں میں گھستے ہیں تو اپنے اس نظریہ اور عقیدہ کو ظاہر نہیں کرتے، اپنے مقاصد کو کبھی اسلامی مساوات، کبھی اسلامی سوشلزم کا نام دیکر کر پھیلاتے ہیں۔ ان کے عقیدہ میں چونکہ انفرادی ملکیت ہی جرم اور سرمایہ دار مطلقا مجرم ہے، وہ مزدوروں کو سرمایہ داروں کے خلاف استعمال کرتے ہیں اور پہلے قدم میں مزدوروں اور سرمایہ داروں میں طبقاتی جنگ اور منافرت پیدا کرتے ہیں اور غریب عوام اور محنت کش مزدوروں کو جن کی بھاری اکثریت مومن، مسلمان ہوتی ہے، روٹی اور پیٹ کے مسئلوں میں ایسا الجھا دیتے ہیں کہ وہ حلال وحرام اور خدا و آخرت کے خوف سے بیگانہ ہوکر رہ جائیں پھر ان کو خونی انقلاب کیلئے آمادہ کیا جاتا ہے اور یہ سبز باغ دکھایا جاتا ہے کہ آتش زنی، قتل و غارت گری کے ذریعے ان تمام ملوں، کارخانوں، زمینداروں، اور تمام وسائل پیداوار پر جارحانہ اور غاصبانہ قبضہ کرلو تو تم ہی اس کے مالک ہو اور جو تمہارے راستہ میں حائل ہو اس کو سامراج کا ایجنٹ اور جاسوس سمجھو اور مار ڈالو اور جب یہ سب کچھ غریب عوام اور مزدوروں کی طاقت سے ہوسکتا ہے تو نتیجہ وہ ہوتا ہے جو پہلے بیان ہو چکا کہ تمام وسائل پیداوار اور سرمایہ پر ایک حکمراں ٹولی قابض ہو جاتی ہے اور غریب عوام اور مزدوروں کی حیثیت جانوروں کی بھی نہیں رہتی بلکہ بے جان مشینی کل پرزوں کی سی ہو جاتی ہے، وہ اپنی مرضی سے کوئی کام نہیں کر سکتے۔

یہ مزدور اور سرمایہ دار کی طبقاتی منافرت اور باہمی جنگ اسلام کے بنیادی اصول کے منافی ہے۔ اسلام کا قانون مزدور اور آجر دونوں کی جان و مال کی حفاظت کا ضامن ہے جس شخص نے جائز طریقوں سے کوئی دولت حاصل کی ہے اس کے چھین لینے کا کسی کو حق نہیں دیتا اور ناجائز طریقوں کی کمائی خواہ سرمایہ دار کی ہو یا مزدور کی دونوں کو ناجائز، قابل واپسی قرار دیتا ہے۔

اسلام کی نظر میں مزدور اور آجر دونوں ایک ہی برادری کے افراد ہیں کوئی شخص ماں کے پیٹ سے نہ مزدور پیدا ہوتا ہے نہ سرمایہ دار یہ اپنے اپنے عمل اور کوشش کے مختلف رخ ہیں جو بدل بھی سکتے ہیں اور رات دن بدلتے رہتے ہیں۔ کیا آپ کی نظر میں یہ واقعات نہیں کہ سینکڑوں مزدور سرمایہ دار بن گئے اور سینکڑوں سرمایہ دار مزدور بن گئے۔

البتہ مغربی سرمایہ دارانہ نظام جو سراسر ظلم و جور پر مبنی ہے اس کے رد عمل میں منافرت اور جنگ اس طرح پیدا ہوتی ہے کہ اس نظام نے مزدوروں، محنت کشوں کے لئے دولت مند ہونے کے راستے بند کر دئے دولت سمٹ کر محدود اور معدود افراد میں رہ گئی ان کی بڑی بڑی تجارتوں اور صنعتوں نے چھوٹی تجارتوں اور صنعتوں کیلئے کوئی راستہ نہ چھوڑا اب باقی دنیا ان کی نوکری یا مزدوری کرنے کے بغیر اپنی ضروریات زندگی سے محروم ہوگئی اور وہ بھی انکی من مانی سے کم سے کم مزدوری اور تنخواہ پر جو مزدور کی ضروریاتِ زندگی کیلئے قطعاً کافی نہیں اس کے ساتھ انکی عزتِ نفس کو بری طرح مجروح کیا گیا، ان کو حقیر و ذلیل سمجھا گیا۔ یہ سب مغربی سامراج اور سرمایہ دارانہ نظام کی لائی ہوئی آفتیں تھیں۔

سوشلزم یہ دعوی لے کر کھڑا ہوا کہ وہ مزدوروں کو اس ظلم وستم سے نجات دلائے گا۔ مزدوروں اور غریبوں کی اپنی حکومت ہوگی لیکن اشترا کی ملکوں کے مشاہدہ نے بتلایا کہ یہ سب فریب ہی فریب تھا۔ اس نظریہ نے مزدور کو کچھ نہیں دیا۔ اس کا دین وایمان ہی لوٹ لیا اور آزادی ضمیر بھی۔

اسلام کا راستہ

اسلام اور قرآن کی نظر میں انسانوں کی تقسیم اگر ہے تو صرف اللہ کے ماننے اور نہ ماننے یعنی کفر و ایمان پر ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

خلقکم فمنکم کافر ومنکم مؤمن۔

''یعنی تم کو پیدا کیا اور تم میں سے بعض کافر ہیں اور بعض مومن''۔

اسی طرح اسلام کی نظر میں کل انسان دو پارٹیوں میں منقسم ہیں ایک کا نام قرآنِ کریم میں حزب اللہ اور دوسری کا نام حزب الشیطان ہے طبقہ داری اور علاقائی یا قبائلی کوئی مؤثر تقسیم نہیں۔

اسلام ایک عادلانہ اور حکیمانہ نظام اور امن عالم کا واحد ذریعہ ہے۔ اس میں حدود کی پابندی اور حقوق انسانیت کی ہر حال میں رعایت کی جاتی ہے۔ اسلام ہی کا نظام ہے جو عین میدانِ جنگ میں بھی اپنے مقابل دشمنوں کے کچھ حقوق محفوظ رکھتا ہے۔ جن کی خلاف ورزی شرعی جرم ہے، اسلام جو کچھ کہتا ہے وہ کر کے دکھاتا ہے، جو وعدہ کرتا ہے وہ پورا کرتا ہے۔ اس میں کسی دھوکہ فریب کی کوئی گنجائش نہیں، اس میں دشمنوں کے ساتھ بھی عدل وانصاف لازم ہے، غداری جرم ہے۔ وہ حدود شرعیہ کے خلاف کسی غاصبانہ قبضہ کو روا نہیں رکھتا، ہاں ظالم کا ہاتھ روکتا ہے مظلوم کی امداد کر کے اس کا حق دلواتا ہے۔ غریب وامیر، مزدور و دولت مند کے طبقاتی فرق کی نفی کرتا ہے، سب کو ایک اسلامی برادری کا مساوی فرد بناتا ہے، مساوی حیثیت بھی دیتا ہے۔

اس اجمال کی کچھ تفصیل یہ ہے کہ :

(۱) اسلامی نظام میں بنیادی چیز یہ ہے کہ وہ نسلی، وطنی، علاقائی، طبقاتی تقسیم کا قائل نہیں۔ اس کا اصول "المؤمنون إخوة" کا ہے یعنی مسلمان، مسلمان سب بھائی ہیں، کوئی امیر ہو یا غریب، مزدور اور نوکر ہو یا مالدار اور آقا عزت سب کی برابر ہے، حقوق سب کے برابر ہیں، بلکہ غریب اور مزدور اگر زیادہ نیک اور متقی ہے تو اسلام کی نظر میں وہ مالدار سے زیادہ عزت والا ہے۔

قرآن کا ارشاد ہے:

"إن أكرمكم عند الله أتقٰكم"

اسلام کی تاریخ گواہ ہے کہ اس نے بلال حبشی کو وہ عزت بخشی ہے جو عرب و عجم کے بڑے بڑے بادشاہوں کو حاصل نہیں۔ مزدوروں کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان یہ ہے:

إخوانكم خَوَلكم جعلهم الله تحت أيديكم فمن كان أخوه تحت يده فليطعمه من طعامه و ليلبسه من لباسه ولا يكلفه فان كلفه ما يغلبه فليعنه۔

"تمہارے بھائی تمہارے خادم ہیں، اللہ نے ان کو تمہارے زیر دست کر دیا ہے، لہٰذا جس کا بھائی اس کا زیر دست ہو وہ اپنے کھانے میں سے اس کو کھلائے اور اپنے لباس میں سے اس کو پہنائے اور اسے کسی ایسے کام پر مامور نہ کرے جو اس کی طاقت سے زیادہ ہو، اور اگر ایسا کوئی کام اسے بتائے تو خود اسکی مدد کرے"۔

اس میں یہ بات خاص طور پر قابل نظر ہے کہ یہاں موقع بظاہر اس کا تھا کہ "خَوَلكم إخوانكم" کہا جاتا، کیونکہ مقصود اس ارشاد کا مزدوروں اور نوکروں کو بھائی قرار دینا ہے۔ مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اخوانکم کو مقدم کر کے بتلا دیا کہ وہ تمہارے بھائی پہلے ہیں اور نوکر یا مزدور بعد میں۔

پاکستان میں اسلامی نظام کا مغالطہ

افسوس ہے کہ مملکت پاکستان جو اسلام کے نام پر وجود میں آئی اور اس کے حکمران اوّل سے آج تک اس میں اسلامی نظام رائج کرنے کے دعوے کرتے چلے آئے ہیں مگر عمل میں وہی سرمایہ دارانہ نظام رائج رکھا جو انگریز ہم پر مسلط کر کے چھوڑ گیا

تھا۔ اس کا اثر ناواقف عوام پر یہ ہونے لگا کہ ملک کے عوام جس اقتصادی بحران کا شکار ہیں یہ شاید اسلامی نظام ہی کے نتائج ہیں، سوشلسٹ طبقات کو موقع مل گیا۔ انہوں نے مزدوروں اور غریب عوام کی توجہ اسلام سے پھیر کر اپنے ملحدانہ اصول کی طرف کھینچنے کی کوششیں شروع کر دیں اور مزدور و سرمایہ دار کی طبقاتی جنگ کا میدان گرم کر دیا اور ان کو یہ فریب دیا کہ تمہاری اقتصادی مشکلات کا حل صرف سوشلزم میں ہے۔

اس وقت علماءِ اُمت کا کام یہ ہے کہ ہر مکتبۂ فکر کے علماء اس فتنۂ ارتداد کے روکنے کی طرف متوجہ ہوں، ملک کے غریب عوام اور مزدور و محنت کش مسلمان جو اسلام کے نام پر جان دینے والے ہیں، ان کو سوشلسٹ گروہوں کے گمراہ کن پروپگنڈہ کا شکار نہ ہونے دیں۔ ان کو سلامی نظام کی ان تعلیمات سے آگاہ کریں جن میں ان کی تمام مشکلات کا صحیح اور سچا، منصفانہ حل موجود ہے۔ مثلاً:

(۱)...... ملک میں اسلامی نظام رائج ہوا تو وہ تمام راستے یکسر بند کر دیئے جائیں گے جن کے ذریعہ ملک کی دولت سمٹ کر ایک محدود دائرے میں محصور ہو جائے اور عام خلق اللہ افلاس و تنگ دستی کی شکار بنے یعنی سود، سٹہ، قمار، انشورنس ،جن میں دس ہزار روپیہ کا مالک بنک کے واسطہ سے لاکھوں روپے کا کاروبار کرتا ہے۔ اور نفع میں چند ٹکے بنک کو اور بنک کے ذریعہ قوم کو دے کر باقی سب منافع کا مالک خود بنتا ہے۔ اور اس طرح ملک کی دولت سمٹکر ایک جیب میں جمع ہوتی چلی جاتی ہے۔

(۲)...... بیرونی تجارت میں لائسنس پرمٹ کا مروجہ طریقہ کہ بڑے سرمایہ داروں کو سیاسی رشوت کے طور پر بڑے بڑے لائسنس دے کر صنعت و تجارت کے مرکزوں پر ان کی اجارہ داری قائم کر دی جاتی ہے، بازار کے نرخ اور اشیاء ضرورت کی قیمتیں ان کے قبضہ میں آجاتی ہیں جس سے ایک طرف پورے

ملک میں گرانی بڑھتی ہے دوسری طرف چھوٹے سرمایہ والوں کے لئے صنعت وتجارت کے میدان میں آنے کا راستہ بند ہو جاتا ہے کیونکہ صنعت وتجارت کے مرکزوں پر قابض بڑے بڑے سرمایہ داران کی چھوٹی صنعت وتجارت کو بڑھنے بلکہ چلنے نہیں دیتے، جب اسلامی نظام کے تحت یہ طریقہ ختم ہوگا تو مزدور ومحنت کش صرف مزدوری کرنے اور سرمایہ داروں کی من مانی ماننے پر مجبور نہیں ہونگے، ان کی مرضی کے مطابق محنت کا صلہ ملے گا اور وہ صنعت وتجارت کے مالک بھی بن سکیں گے۔

(۳)......اسلامی نظام میں کسی کو یہ حق نہیں دیا جائیگا کہ وہ ملازم ومزدور کو اپنی محنت وضرورت سے کم تنخواہ پر کام کرنے کے لئے عملاً مجبور کر ڈالے اور جب چھوٹی تجارتوں اور صنعتوں کا رواج ہوگا تو یہ مجبور کرنے کی صورتیں خود بخود ختم ہو جائیں گی۔ اور اگر پھر بھی کوئی فرد یا جماعت مزدوروں پر ایسا ظلم روا رکھے تو اسلامی حکومت اس کو مزدور کا پورا حق دلوانے پر مجبور کرے گی۔

(۴)......اسلامی نظام میں چونکہ مزدور اور دولت مند ایک ہی برادری کے افراد ہیں تو ایک طرف مزدور کا یہ احساس کمتری ختم ہوگا کہ وہ مالکان صنعت وتجارت سے کوئی کم حیثیت رکھتا ہے۔ دوسری طرف دولتمندوں کا معاملہ ان کے ساتھ مشفقانہ اور برادرانہ ہوگا، جس سے مزدور وسرمایہ دار کی تباہ کن کشمکش ختم ہوگی۔

(۵)......موجودہ سرمایہ داریوں، زمینداریوں، جاگیرداریوں کی تحقیق کی جائے گی، ان میں جو کچھ ناجائز طریقوں سے حاصل کیا گیا ہے اسکو واپس لے کر حقداروں کو دلوایا جائے گا۔ جائدادوں میں اگر شرعی قانونِ میراث جاری کرکے تقسیم نہیں کی گئی تو ان کو شرعی اصول کے مطابق تقسیم کرکے حقداروں کو دلوایا جائے گا اس طرح فوری طور پر بھی بڑی زمینیں اور جائدادیں تقسیم ہو کر

فردِ واحد کی اجارہ داری سے نکل جائینگی اور آئندہ کے لئے اس کا راستہ بند ہوگا۔

(۶)......اسلام کا نظام زکوۃ باقاعدہ جاری کیا جائے گا جو منافع پر نہیں بلکہ سال بھر میں بچے ہوئے اس مال پر ہے جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کوئی عقلمند انسان اپنے سرمایہ کو بند کر کے نہیں رکھے گا ورنہ سالانہ زکوۃ کچھ عرصہ میں اس کو ختم کردے گی اس لئے ہر مالدار اپنے مال کو کسی تجارت، صنعت پر لگانے کے لئے مجبور ہوگا اور دولت گردش میں آکر پورے ملک وعوام کو نفع پہنچائے گی۔

(ومثال ذلک)

خلاصۂ کلام

یہ ہے کہ مغربی سامراج اور سرمایہ دارانہ نظام کا مخالف اسلام بھی ہے اور سوشلزم بھی مگر دونوں کی راہیں بالکل الگ الگ ہیں۔ اسلام کا راستہ عادلانہ، حکیمانہ، سچا اور صاف ہے۔ اسکے بالمقابل سوشل ازم کا راستہ فساد ہی فساد کا ہے جسکے نتیجہ میں غریب مزدور اور محنت کش طبقہ پہلے سے زیادہ مصائب کا شکار ہو جاتا ہے اور اپنے دین ومذہب اور آزادی ضمیر سے بھی محروم کردیا جاتا ہے۔

سوشلسٹوں کے ساتھ ملکر اسلامی نظام کا خواب

ہمارے بعض علماء جو اس وقت سوشلسٹ عناصر کیساتھ اپنے اشتراک عمل کی یہ توجیہ کرتے ہیں کہ ہم انکی صفوں میں داخل ہوکر سوشلزم کے کافرانہ عقائد سے روکیں گے اور پھر خالص اسلامی نظام قائم کرینگے انکا یہ کہنا کسی درجہ میں قابل غور ہوتا اگر وہ سامراج کی مخالفت میں ان عناصر کو اسلام کی راہ پر چلانے کی قدرت رکھتے۔ مزدور اور سرمایہ دار کی کشمکش جو خالص سوشلسٹ نظریہ کا نتیجہ ہے انکو اس سے روک کر اسلام کے

عادلانہ نظام کا دعویدار بناتے مگر ہو یہ رہا ہے کہ وہ خود مزدور اور سرمایہ دار کی جنگ کی کمان کرنے لگے۔ سوشلزم کے کافرانہ عقیدہ والے اگر ایسا کریں تو وہ انکے اصول کا تقاضا ہے کیونکہ وہ انفرادی ملکیت کے قائل نہیں اسلئے انکے خیال میں ہر سرمایہ دار مجرم ہے اسکا مال انکے لئے مباح ہے جس طرح چاہیں لوٹ لیں مگر اسلامی نظریہ رکھنے والے خدا جانے کس تاویل سے اسکو صحیح قرار دیدیتے ہیں اور صرف یہی نہیں بلکہ میدان سیاست میں انکے نعرے، انکے بیانات، انکا طریقہ کار سب سوشلسٹ طبقات کے عین مطابق ہے یہی وجہ ہے کہ تمام اشتراکی پریس انکے پروپگنڈے پر لگا ہوا ہے اور ان لوگوں کو اپنے اشتراکی کاروبار میں اپنا بڑا معاون سمجھتا ہے جسکے اعلانات بھی انکے ذمہ داروں کی طرف سے آتے رہتے ہیں۔ اور وہی اشتراکی عناصر اپنے اشتراکی نظریات کے ساتھ ہر جگہ ان حضرات کے گردو پیش نظر آتے ہیں۔

ان حالات میں ان کو اسلامی نظام کے دعوے میں کتنا ہی نیک نیت سمجھ لیا جائے مگر نتائج تو کسی کی نیت کے تابع نہیں ہوتے سعی و عمل کے تابع ہوتے ہیں۔ کعبہ اور حرم کا مسافر کسی بیکنگ چین کو جانے والے جہاز میں کتنی ہی نیک نیتی سے سوار ہو مگر وہ بہر حال کعبہ کے بجائے چین پہنچے گا۔

کاش! یہ حضرات اس حقیقت کو اس وقت سے پہلے سمجھ لیں جبکہ دشمن خدا، دشمن مذہب اپنا قبضہ جما چکے ہونگے اور یہ حضرات خود بھی اسلام یا نظام اسلام کا نام لینے کی پاداش میں سامراج کے جاسوس اور ایجنٹ کہلائیں اور دوسرے مسلمانوں کیساتھ وہ بھی ان بلاؤں میں مبتلا ہوں جن کا مشاہدہ روسی ترکستان اور دوسرے اشتراکی ممالک میں ہو چکا ہے اور ہوتا جاتا ہے اللہ تعالی سب مسلمانوں کو اس سے محفوظ رکھیں۔ آمین۔

۷۲

سوشلزم اور سرمایہ داری

دونوں افراط وتفریط کی لعنتیں ہیں

تاریخ تالیف ــــــــ ذوالحجہ ۱۳۸۹ھ (مطابق ۱۹۶۹ء)

مقامِ تالیف ــــــــ لاہور

یہ ایک انٹرویو ہے جو ۱۹۶۹ء میں جناب ممتاز لیاقت صاحب نے حضرت مفتی صاحب قدس سرہٗ سے وہ ''ہفت روزہ چٹان لاہور'' کے لئے لیا، اور سب سے پہلے اسی میں شائع ہوا۔

انٹرویو

برائے ہفت روزہ چٹان لاہور

(شائع شدہ جلد ۲۲ شمارہ ۳۳)

...... مرتبہ ......

ممتاز لیاقت

حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ کے خلیفہ مجاز اور علمی جانشین مفتی محمد شفیع پچھلے دنوں لاہور تشریف لائے تو میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا تا کہ کچھ ان کی کہانی اور کچھ ملکی مسائل کے متعلق ان کا موقف انہی کی زبانی سنا جائے۔ مفتی صاحب اپنے صاحبزادے ذکی میاں کے ہاں چٹائی کے فرش پر تشریف فرما تھے۔ شیخ الحدیث مولانا ادریس کاندھلوی، مفتی جمیل احمد تھانوی اور بعض دوسرے عقیدت مند بھی موجود تھے۔ میں نے حضرت مفتی صاحب سے ابتدائی حالات پوچھنے شروع کیے۔

ابتدائی حالات زندگی

میں شعبان ۱۳۱۴ھ (جنوری ۱۸۹۷ء) کو دیوبند ضلع سہارن پور میں پیدا ہوا۔ والد محترم مولانا محمد یسٰین دارالعلوم دیوبند میں استاد تھے۔ انہوں نے محمد یعقوب نانوتویؒ، مولانا سید احمد دہلویؒ، مولانا محمود دیوبندی اور حضرت شیخ الہند محمود حسنؒ جیسے یگانہ عصر اساتذہ سے تعلیم پائی۔ مولانا رشید احمد گنگوہیؒ سے بیعت تھے۔ حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ اور مولانا حافظ محمد احمدؒ ان کے ہم سبق رہے ان کے شاگردوں

میں مولانا سید اصغر حسینؒ، مولانا شبیر احمد عثمانیؒ، مولانا ثناء اللہ امرتسری اور مولانا محمد یٰسینؒ قابل ذکر ہیں۔ والد مرحوم چالیس برس تک دیوبند میں پڑھاتے رہے۔ میں نے علم وتقویٰ کے اسی ماحول میں آنکھ کھولی۔ میرے اردگرد روحانیت وتقویٰ کے پہاڑ تھے۔ انہی کی شفقت ومحبت کا نتیجہ تھا کہ مجھے شروع سے درس وتدریس اور تعلیم وتعلم سے شغف رہا۔ ابتدائی تعلیم والد مرحوم اور چچا مولانا منظور احمد سے پائی۔ پھر دار العلوم میں داخلہ لے لیا جہاں استاد اکبر مولانا سید انور شاہ کشمیریؒ۔ مفتی اعظم مولانا عزیز الرحمان عثمانیؒ شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانیؒ عالم ربانی مولانا سید اصغر حسینؒ۔ مولانا محمد احمد بن حضرت قاسم نانوتویؒ، شیخ الادب مولانا اعزاز علیؒ، مولانا محمد ابراہیم بلیاویؒ اور مولانا رسول خانؒ جیسے جید علماء اور اساتذہ سے کسب فیض کیا۔ صبح سویرے دار العلوم جاتا اور رات ایک بجے تک دار العلوم ہی کی فضاء میں رہتا اسے تعلیمی شغف کہہ لیجئے یا کوئی اور نام دیجئے۔ ان دنوں بلکہ اس کے بعد ایک عرصہ تک مجھے دیوبند کی گلیوں اور بازاروں کی خبر ہی نہ تھی۔

ابھی تعلیم جاری تھی کہ ۱۳۳۶ھ میں ابتدائی درجوں کی تدریس سونپ دی گئی ایک سال بعد یعنی ۱۳۳۷ھ میں دار العلوم کے عملہ میں باقاعدہ شامل ہوگیا۔ چونکہ شروع ہی سے درس وتدریس اور تبلیغ وارشاد کو ذریعہ معاش بنانے کا ارادہ نہ تھا اس لئے فن خطاطی کاپی نویسی اور طب کا علم بھی حاصل کیا۔ طب میں مولانا انور شاہ صاحبؒ اور مولانا حکیم محمد حسن کی شاگردی کی۔ ابتدائی دنوں میں دار العلوم سے کوئی وظیفہ نہیں لیا لیکن جلد ہی درس وافتاء کی ذمہ داریوں نے ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیا اور دار العلوم سے پانچ روپیہ ماہانہ وظیفہ لینے لگا۔ دار العلوم سے ۲۶ سال کی وابستگی کے بعد ۱۳۶۲ھ میں علیحدہ ہوا تو اس وقت ۵۶ روپیہ ماہانہ وظیفہ تھا، اس دوران میں کئی مرتبہ باہر کے مدرسوں نے سہ گنا چار گنا وظیفہ پر بلانا چاہا۔ مدرسہ عالیہ کلکتہ نے سات سو روپے ماہانہ کی پیش کش کی لیکن مجھے مادر علمی سے دوری کسی صورت میں پسند نہ تھی۔ لہٰذا انکار کر دیا۔ استاد العلماء مفتی

اعظم عزیز الرحمان عثمانیؒ تدریس کے ابتدائی دنوں ہی میں اکثر فتاوی میرے پاس بھیج دیتے تھے لیکن ان کے انتقال پر ۱۳۴۹ھ میں دارالعلوم کے صدر مفتی کی ذمہ داری بھی میرے کندھوں پر آپڑی۔ جسے دارالعلوم سے علیحدگی ۱۳۶۲ تک نبھاتا رہا۔ ایک مرحلہ میں اس فرض کی گرانباری کا سوچ کر اس سے مستعفی ہونے کا خیال ظاہر کیا لیکن ساتھی اساتذہ نے روک دیا۔ دارالعلوم سے الگ ہوا تو حضرت تھانویؒ اور علامہ عثمانیؒ کے اصرار پر یہ سلسلہ جاری رکھا۔ دارالعلوم کی خدمت کے دوران جن استفسارات پر جو فتاویٰ جاری کیے گئے تھے ان کا انتخاب دارالعلوم دیوبند سے چار جلدوں میں شائع ہو چکا ہے اور پندرہ مستقل رجسٹر غیر مطبوعہ ہیں۔

حصول تعلیم کے بعد حضرت شیخ الہندؒ سے بیعت کی تھی۔ ان کے انتقال پر ۱۳۴۶ھ میں حکیم الامت حضرت مولانا تھانویؒ سے فیض پایا اور ہر سال کئی کئی ماہ ان کی صحبت میں گزرتے رہے۔ ۱۳۴۹ھ میں حضرت تھانویؒ نے بیعت کا مجاز قرار دیا۔ حضرت مجھ پر بہت شفقت فرماتے تھے۔ چنانچہ ۱۳۶۲ھ میں جب دارالعلوم سے استعفیٰ دے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوا تو ایک عربی شعر قدرے تصرف سے پڑھا جس کا مطلب یہ تھا۔

"لوگوں نے تجھے اپنے ہاتھوں سے کھودیا وہ کیسے عظیم انسان کو کھو بیٹھے۔"

دارالعلوم دیوبند سے علیحدگی مولانا حسین احمد مدنیؒ کی سیاسی روش سے اختلاف کا نتیجہ تھی۔

تحریک پاکستان کی جدوجہد میں حصہ

نومبر ۱۹۴۵ء میں حضرت عثمانیؒ نے کلکتہ میں جمعیۃ العلماء اسلام کی بنا ڈالی تو ابتدأ میں اس سے الگ تھلگ رہا لیکن چند ماہ بعد اس قافلہ میں اس لیے شامل ہو گیا کہ

تحریک پاکستان یعنی آزاد اسلامی مملکت کے قیام کی جد و جہد کا مرحلہ تھا اور ہمارے سامنے اس وقت ایک ہی مقصد تھا کہ ہم پاکستان کو حاصل کرنا اور حصول کے بعد اسے ایک صحیح اسلامی مملکت بنانا چاہتے تھے۔ یہ دور برصغیر کے مسلمانوں کی تاریخ کا نازک ترین دور تھا کیونکہ کانگرس اور انگریز پاکستان دینے کے حق میں نہ تھے اور کچھ اپنے بھی مخالفت کر رہے تھے۔ حضرت عثمانیؒ کی قیادت میں علماء سارے ملک میں پھیل گئے، میں نے بھی سرحد سے سلہٹ تک حضرت عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کی قیادت میں سارے ملک کا دورہ کیا۔ نتیجۃً پاکستان قائم ہوگیا۔ پاکستان بنا تو میں دیوبند ہی میں تھا۔ حکومت پاکستان نے جشن آزادی میں شرکت کی دعوت دی۔ لیکن میں بیماری کی وجہ سے کراچی نہ جا سکا اور پھر فسادات پھوٹ پڑنے کی وجہ سے وہیں رک گیا۔ وہاں تحریک پاکستان کی پر جوش حمایت کے ''جرم'' میں رہنا مشکل تھا۔ گو اس نئے اسلامی ملک کی طرف ہجرت کر جانے کی آرزو ضرور تھی لیکن حالات ایسے تھے کہ دیوبند سے نکلنا بھی خطرے سے خالی نہ تھا اور دیوبند کی محبت بھی ترک سکونت کے راستہ میں حائل تھی۔

پاکستان میں آمد

اپریل ۱۹۴۸ء میں شیخ الاسلام حضرت شبیر احمد عثمانیؒ نے سید سلیمان ندویؒ۔ مولانا مناظر احسن گیلانیؒ اور ڈاکٹر حمید اللہ کے ساتھ ساتھ مجھے بھی بلا بھیجا کہ ایک اسلامی آئین کا خاکہ مرتب کر کے حکومت کو پیش کریں۔ چنانچہ میں ۶ر جولائی ۱۹۴۸ء کو پاکستان پہنچا اور کراچی میں مقیم ہوگیا۔ کراچی میں اس عظیم شہر کے شایان شان علوم دینیہ کا کوئی مدرسہ نہ تھا۔ چنانچہ پاکستان پہنچتے ہی یہاں اسلامی دستور کے نفاذ کو مطمح نظر اور ایک معیاری و مثالی دارالعلوم کو زندگی کا مقصد ٹھہرالیا۔ پہلا مقصد ابھی تشنہ تکمیل ہے۔ دوسرے کی تکمیل ہو رہی ہے۔ اس دارالعلوم کا آغاز ۱۹۵۲ء میں نانک واڑہ کی ایک مختصر عمارت میں چند طلباء اور ایک استاد سے ہوا تھا۔ اللہ کا فضل ہے کہ اس وقت کورنگی ٹاؤن

میں دار العلوم کی اپنی عمارت ہے۔ پاکستان اور دوسرے ملکوں کے ایک ہزار۔۔۔ سے زیادہ طلباء تیس اساتذہ سے تعلیم پا رہے ہیں، اس کے علاوہ شہر میں اس کے بیس بائیس مراکز قائم ہو چکے ہیں۔ مجموعی طور پر اب تک بیس ہزار طالب علموں نے مجھ سے قرآن و حدیث اور علوم دینیہ کی تعلیم پائی ہے۔

۱۹۴۹ء میں اسلامی مشاورتی بورڈ کا رکن نامزد ہوا۔ مولانا سید سلیمان ندویؒ کا انتقال ہو گیا تو بورڈ کی صدارت کے فرائض بھی مجھے انجام دینے پڑے۔ ۱۹۵۰ء میں حکومت نے مروجہ قوانین کو اسلامی ڈھانچے میں ڈھالنے کے لیے لاء کمیشن مقرر کیا تو اس میں سید سلیمان ندویؒ کے ساتھ مجھے بھی شامل کیا گیا۔ لاء کمیشن کی سفارشات کو بعد کی حکومتوں نے قطعاً نظر انداز کر دیا اور آج تک انہیں عملی جامہ نہیں پہنایا جا سکا۔ اگر ان سفارشات کو تسلیم کر لیا جاتا تو ہمارے عدالتی قوانین آج بالکل اسلامی ہوتے۔

قائد اعظم کے انتقال پر حکومت نے ان کی یاد میں ایک دینی دار العلوم قائم کرنے کا منصوبہ بنایا۔ اس دار العلوم کا نصاب بھی میں نے ہی مدون و مرتب کیا۔ لیکن افسوس ہے کہ بعد کی حکومتوں نے اس منصوبے کو بھی ترک کر دیا۔

دس سال ۵۴ سے ۱۹۶۴ء تک ریڈیو پاکستان سے درس قرآن دیتا رہا۔ کبھی ایک پیسہ بھی عوضانہ نہیں لیا۔ اسی طرح قرآن و حدیث مسائل فقہ، تصوف و اصلاح وغیرہ پر اب تک تقریباً ڈیڑھ سو سے زائد کتب و رسائل لکھ چکا ہوں لیکن رفاہ عامہ کے لیے ان پر نہ کسی سے رائلٹی لی ہے اور نہ کسی مکتبہ کو کوئی کتاب صرف اپنے لیے مخصوص و محفوظ کرنے کی اجازت دی ہے۔ ان کتابوں میں ''اسلام کا نظام اراضی'' اور ''اسلام میں نظام تقسیم دولت'' پسند کی گئی ہیں۔ آجکل ''معارف القرآن'' کے نام سے تفسیر مکمل کر رہا ہوں پہلی جلد جو ڈھائی سیپاروں پر مشتمل ہے چھپ چکی ہے۔ یہ تفسیر آٹھ دس جلدوں میں مکمل ہوگی اور تفسیر میں متن کا ترجمہ شیخ الہند محمود حسنؒ اور مولانا اشرف علی تھانویؒ کا ہے لیکن تشریحات و تصریحات میرے قلم سے ہیں قرانی تعلیمات کو عام

کرنے کے خیال سے اس بات کا خاص اہتمام کیا ہے کہ علمی اصطلاحات غیر معروف الفاظ مشکل مطالب اور مباحث علمیہ جو عوام کی سطح سے بلند ہیں نہ آنے پائیں بلکہ سیدھی سادی زبان میں عوام قرآنی تعلیمات سے آگاہ ہو جائیں۔

سوال :۔ مفتی صاحب آپ نے فرمایا ہے کہ مولانا شبیر احمد عثمانی ؒ کی دعوت پر آپ کراچی تشریف لائے اور مقصد یہ تھا کہ پاکستان میں اسلامی دستور نافذ کرایا جائے کیا آپ ان کوششوں پر جو علمائے کرام نے اسلامی آئین کے نفاذ کی خاطر کیں اور ان کے نتائج پر تفصیلی روشنی ڈالنا پسند فرمائیں گے؟

جواب :۔ پاکستان میں اسلامی آئین کے نفاذ کی کوششیں قیام پاکستان سے پہلے ہی شروع ہو چکی تھیں۔ ۹ رجون ۱۹۴۶ء کو جب مسلم ممبران اسمبلی نے دہلی میں اکٹھے ہو کر پاکستان کے حصول پر صاد کیا تو جمعیۃ العلمائے اسلام کا ایک وفد جس میں مولانا ظفر احمد عثمانی ؒ اور یہ احقر بھی شامل تھا۔ شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی کی قیادت میں قائد اعظم کی قیام گاہ پر پہنچا۔ انہیں اس کامیابی پر مبارکباد دینے کے ساتھ یہ سوال اٹھایا کہ آپ اس موقعہ پر یہ اعلان بھی کر دیں کہ پاکستان اسلامی مملکت ہوگا اور اس میں ٹھیک ٹھیک اسلام کا دستور قانون نافذ ہوگا۔ اس کے جواب میں قائد اعظم نے فرمایا کہ یہ مسلمانوں کا ملک ہے اس اسلامی نظام اور اسلامی آئین کے سوا کسی دوسرے نظام کے بارے میں سوچا بھی نہیں جا سکتا ہے، مگر میری حیثیت ایک وکیل کی ہے۔ میں نے یہ مقدمہ لڑ کر ایک خطۂ ملک مسلمانوں کے لیے حاصل کر لیا ہے۔ اب میں اس خطہ کے نظم ونسق کا مالک نہیں بلکہ جمہور اہل اسلام اس کے مالک ہیں۔ یہ فیصلہ انہی کے کرنے کا ہے اور انشاء اللہ وہ یہی فیصلہ کریں گے۔

پاکستان بننے کے فوراً بعد حضرت شیخ الاسلام مولانا عثمانی ؒ نے اپنے رفقاء کے تعاون سے یہ فیصلہ کیا کہ حکومت کو تو دستور اور قانون بنانے میں دیر لگے گی مناسب یہ ہے کہ چند ماہر علماء کو جمع کر کے ایک مسودۂ دستور مرتب کر لیا جائے اور پھر حکومت کو پیش

کر دیا جائے۔ چنانچہ انہوں نے مولانا سید سلیمان ندویؒ، مولانا مناظر احسن گیلانیؒ ڈاکٹر حمید اللہ اور اس ناکارہ محمد شفیع کو فوراً کراچی پہنچنے کی دعوت دی۔ اس وقت ہم سب کے سب ہندوستان میں تھے انہوں نے مولانا احتشام الحق کو بذریعہ ہوائی جہاز بھارت بھیجا۔ آخر الذکر تین حضرات فوراً تیار ہو کر کراچی پہنچ گئے۔ مولانا سید سلیمان ندویؒ نے اپنے عذرات کی بناء پر کچھ مہلت مانگی۔۔۔ کراچی میں تین ماہ شب و روز کام کرنے کے بعد شیخ الاسلام کی ہدایت پر ایک خاکہ دستور اسلامی مرتب کر لیا گیا۔ اور پھر جب دستور ساز اسمبلی کا اجلاس ہوا تو اس میں یہ طے پایا کہ ایک اسلامی مشاورتی بورڈ تشکیل دیا جائے جو ماہر علماء پر مشتمل ہو اور تمام دستوری مسائل ان کے مشورہ سے طے کئے جائیں۔ بورڈ کے ارکان کی نامزدگی کے مرحلہ میں شیخ الاسلام حکومت کے مشیر تھے۔ انہوں نے جمعیۃ العلمائے اسلام کے ارکان عاملہ میں سے احقر کا نام بطور رکن بورڈ اور مولانا ظفر احمد انصاری کا نام بطور سیکرٹری مجلس تجویز کیا جو منظور ہو گیا۔ بورڈ کے صدر سید سلیمان ندویؒ اور ممبر ڈاکٹر حمید اللہ، مولانا عبدالخالق اور مجتہد جعفر حسین تھے۔ اس بورڈ نے ۴۹ء سے ۵۴ء تک کام کیا اور اپنی سفارشات ترتیب دے کر حکومت کے حوالے کر دیں۔

''اسلامی مشاورتی بورڈ کے قیام کے علاوہ اس عرصہ میں ہمیں ایک اور کامیابی ہوئی اور وہ کامیابی اسمبلی قرارداد مقاصد کی منظوری تھی قرارداد مقاصد کا ابتدائی مسودہ خود شیخ الاسلامؒ نے تیار کر کے اسمبلی میں پیش کیا۔ اقلیتی فرقوں کے نمائندوں، سوشلسٹ ذہن رکھنے والوں اور ان کے ساتھی مسلمانوں نے مخالفت کی لیکن کافی دنوں کی اختلافی بحث کے بعد شیخ الاسلام کی تجویز غالب آئی اور شہید ملت لیاقت علی مرحوم نے اس مسودہ کو اپنی طرف سے اسمبلی میں پیش کر کے منظور کرا لیا لیکن اس کے بعد جب حکومت کی طرف سے پہلا دستوری مسودہ شائع کیا گیا تو معلوم ہوا کہ اسلامی مشاورتی بورڈ کی سفارشات کے بالکل خلاف ایک ایسا دستور لایا گیا ہے جو کسی طور بھی اسلامی اصولوں

کے مطابق نہیں۔ جمعیت العلمائے اسلام اور ملک کے اطراف و جوانب سے ہر مکتب فکر کے مسلمانوں نے اس کی مخالفت کی۔ پھر جمعیت کے ذمہ دار افراد نے یہ قدم اٹھایا کہ ملک کے ہر مکتب فکر کے ۳۴ نمایندہ اور مسلمہ علماء کو کراچی میں جمع کیا۔ ان میں دیوبندی، بریلوی جماعت اسلامی، اور شیعہ سب شریک تھے۔ انہوں نے تین روز کے مکمل اور مسلسل غور وفکر کے بعد ۲۲ دفعات پر مشتمل ایک خاکہ دستور شائع کر دیا۔ نتیجۃً جو دستوری مسودہ شائع ہوا۔ اس میں اسلام کے بنیادی اصول ایک حد تک آ گئے تھے۔ مگر کچھ باتیں ترمیم طلب تھیں۔ علماء کراچی میں دوبارہ جمع ہوئے اور ترمیمات تحریری طور پر حکومت کو پیش کر دیں جن میں سے بعض ترامیم دستور میں شامل کر لی گئیں۔ نتیجۃً ۱۹۵۶ء میں یہ دستور منظور ہو گیا۔ ۵۶ء کے اس آئین کو پاکستان کے تمام طبقوں نے بخوشی قبول کیا۔ علماء نے بھی دستور میں بعض ترمیمات کی ضرورت کے باوجود اس کا خیر مقدم کرنا ہی دینی اور ملکی مصالح کا تقاضا سمجھا بلکہ اسے قبول کر لیا لیکن اس پر عمل کیے بغیر ۵۸ء میں اسے منسوخ کر دیا گیا اور ملک میں آمریت مسلط ہو گئی۔

سوال:۔ اس وقت پاکستان میں سوشلزم کی تحریک جس نہج پر چل رہی ہے آپ اس کے مقابلہ اور توڑ کے لیے کون سے اقدام بہتر سمجھتے ہیں؟ اور ان کا صحیح نقشہ کیا ہو؟

جواب:۔ پاکستان ایک اسلامی ملک ہے اور اسلام ہی کے نام پر حاصل کیا گیا ہے اس کا نظام اسلامی اصول کے مطابق شورائی ہی ہو سکتا ہے لیکن سابقہ آمریت نے ۵۶ء کے دستور کو منسوخ کر کے ملک کو ایک بار پھر ۱۹۴۷ء کی سطح کی طرف دھکیل دیا ہے۔ سوشلسٹ عناصر روز اول ہی سے پاکستان میں دستور اسلامی اور قانون اسلامی کے نفاذ کی مخالفت کرتے چلے آئے ہیں۔ انہوں نے ۱۰ سالہ دور استبداد میں آمریت سے ملی بھگت کر کے اپنا داخلی و خارجی استحکام پیدا کر لیا ہے وہ جانتے ہیں کہ ۵۶ء کا دستور نافذ ہو گیا تو پاکستان میں سوشلزم کے لیے راہیں ہموار کرنے کی تمام کوششیں ناکام ہو جائیں گی اور سوشلزم کے نفاذ کا خواب کبھی شرمندہ تعبیر نہ ہوگا۔ اس لیے وہ

دوبارہ دستور سازی کا چکر چلانا چاہتے ہیں۔ کیونکہ وہ اپنے طور پر سمجھتے ہیں کہ اب وہ فضا نہیں جس میں اسلام کے ان بنیادی اصولوں کو تسلیم کرلیا جائے جو ۵۶ء کے آئین کی بنیاد تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ از سر نو دستور سازی پر زور دے رہے ہیں۔ اس کا توڑ ہمارے نزدیک یہ ہے کہ ہم از سر نو اسلامی نظریات پر ایمان رکھنے والے مسلمانوں کی منتشر صفوں کو پھر متحد، آپس کے اختلافات کو ملتوی یا خاص علمی حدود تک محدود کر کے متحدہ محاذ کی صورت میں مسلم اکثریت کو ۵۶ء کے دستور اور اس کے تحت انتخابات کرانے پر جمع کریں اور سوشلسٹ عناصر نے جن محنت کش عوام اور مزدوروں میں کہ جو پکے مسلمان ہیں اپنے جال پھیلا رکھے ہیں اور انہیں یہ تاثر دینے میں مصروف ہیں کہ ملک کے اقتصادی مسائل کا حل (معاذ اللہ) اسلام میں نہیں سوشلزم میں ہے۔ اس کے توڑ کی خاطر ضروری ہے کہ ہر طبقہ اور ہر مکتب فکر کے علماء اور عوام اپنی پوری توانائی سے کام لیں۔ کسانوں اور مزدوروں کو سوشلزم کے کافرانہ، مفسدانہ جھوٹے پروپیگنڈے کا شکار ہونے سے بچائیں اور انہیں بتائیں کہ سارے عالم انسانیت کا امن واطمینان اور اقتصادی مشکلات کا صحیح اور پائیدار حل صرف اسلام میں ہے۔

سوال:۔ ہمارے خیال میں مسلمان فضلاء نے سوشلزم کی تحریک کو جہاں تک اس کے ذہنی محاذ کا تعلق ہے اگر شکست نہیں دی تو پس پشت ضرور ڈال دیا تھا۔ لیکن بعض علماء کرام نے اس گرتی ہوئی دیوار کو سہارا دے کر اسے مسلمان معاشرہ کے لیے خطرناک مسئلہ بنا دیا ہے؟ آپ اس کی مدافعت کے لیے کونسا حل تجویز کرتے ہیں۔؟

جواب:۔ ہمارے نزدیک اس وقت اسلام اور مسلمانوں کے لیے سب سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ جن عناصر کے خلاف سب مسلمانوں کو مل کر جہاد کرنا چاہئے۔ ان کی صفوں میں نہ صرف اپنے بھائی مسلمان بلکہ بعض علماء بھی نظر آتے ہیں لیکن ہم کسی ادنیٰ مسلمان اور خصوصاً کسی عالم کے متعلق یہ گمان نہیں کرسکتے کہ وہ سوشلزم کی حقیقت اور سوشلسٹوں کے ساتھ مل جل کر کام کرنے کے انجام بد کو جانتے ہوئے ایسا اقدام

کرے گا۔ اس لیے ضرورت نہیں کہ ہم ان کی نیتوں پر کوئی شبہ کریں مگر قرآن حکیم نے فیصلہ کر دیا ہے کہ ہر کوشش اللہ کے نزدیک مقبول وسعید نہیں جب تک کہ کوشش مقصد کے مطابق اور مناسب نہ ہو ارشادِ خداوندی ہے:

ومن ارادالاخرۃ وسعیٰ لھا سعیھا وھو مومنٌ فاولئک کان سعیھم مشکورا

اس میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے آخرت کے واسطے کام کرنے والوں کی کوشش قبول ہونے کی لیے سعیٰ لھا کیساتھ سعیھا کی قید لگا کر بتا دیا ہے کہ جو سعی مقصد کے مناسب نہ ہو وہ کتنی ہی نیک نیتی سے کی جائے۔ اس کے نزدیک مشکور ومقبول نہیں ہے اور نہ اس کے کامیاب ہونے کا امکان ہے۔ کعبہ کی نیت کر کے ترکستان کی طرف سفر کرنے والے کا انجام کسی سے ڈھکا چھپا نہیں۔ اب سوشلسٹ عناصر کے ساتھ خصوصی روابط قائم کرنے والے حضرات کی مساعی کا جائزہ لیجئے تو آپ ہر قدم پر یہ محسوس کریں گے کہ ان کے گرد وپیش سب سوشلزم کے داعی ہیں۔ ان کی مساعی کی داد دینے اور ہر جگہ ان کی حمایت کرنے والے یہی لوگ ہیں۔ ان کے نعرے بھی وہی سوشلزم والے ہیں۔ وہی مزدور وسرمایہ کی طبقاتی جنگ ان کا بنیادی اصول ہے وہی مزدوروں اور طالب علموں کے جذبات سے کھیلنا اور انہیں سرمایہ داروں سے لڑانا ان کا کام ہے تو اس کے منطقی اور قدرتی نتیجہ میں جو چیز آئے گی وہ سوشلزم ہی ہوسکتا ہے اس عمل کے نتیجہ میں اسلام کا انتظار کرنا خود فریبی کے سوا کچھ نہیں۔

اس لیے موجودہ حالت میں علماء۔ اور عام مسلمانوں کو دو کام کرنے ہیں۔ ایک یہ کہ ہمدردی اور خیر خواہی کے جذبہ سے ان حضرات کو اس غلط راہ سے روکنے کی سعی جاری رکھیں دوسرے یہ کہ ان کی مخالفت کی وجہ سے اپنی صفوں میں کوئی اختلال یا عزم وہمت میں کسی کمزوری کو راہ نہ دی جائے اور ملک پر آنے والی ہر افتاد کا مقابلہ پوری قوت سے کیا جائے کہ درحقیقت یہ کفر واسلام کی فیصلہ کن جنگ ہے!

سوال:۔ کیا اسلام میں موجودہ سرمایہ داری کی کوئی گنجائش ہے اور کیا اسلامی مملکت میں اس قسم کا سرمایہ دارانہ معاشرہ پیدا ہوسکتا ہے جو اسوقت موجود ہے؟

جواب:۔ قطعاً گنجائش نہیں۔ اسلامی نظام رائج ہو تو نہ مروجہ قسم کی سرمایہ داری اور اجارہ داری پیدا ہوسکتی ہے اور نہ باقی رہ سکتی ہے مگر افسوس ہے کہ پاکستان کی ۲۲ سالہ عمر میں اسلام کا نام تو سبھی حکمران لیتے رہے اور اسلامی نظام کے وعدے بھی کرتے رہے مگر عملاً اس سلسلے میں کوئی قدم نہ اٹھایا گیا۔ اس وجہ سے ناواقف لوگ یہ سمجھنے لگے کہ یہی اسلامی نظام ہے۔ جس کی چکی میں ہم پسے جارہے ہیں اور اس سلسلے میں وہ مجبور ومعذور بھی ہیں کیونکہ انہوں نے اسلامی نظام کی صورت ہی نہیں دیکھی بلکہ پچھلے دس سالہ دور میں تو بچی کھچی اسلامی اقدار کو بھی مٹانے کی منظّم اور مسلسل جدوجہد جاری رہی۔ درحقیقت سرمایہ دارانہ نظام اور سوشلزم دونوں افراط وتفریط کی لعنتیں ہیں جو آجکل دنیا پر مسلط ہیں اور انہی کی وجہ سے پوری دنیا جنگ وجدل کا جہنم بنی ہوئی ہے۔ اسلامی نظام ان دونوں کے خلاف ایک عادلانہ اور متعدلانہ نظام ہے جس میں باشندگان ملک کے ہر طبقہ اور ہر فرد کے امن واطمینان کا سامان اور ہر شخص کے لیے اس کی ضروریات زندگی حاصل ہونے کی مکمل ضمانت موجود ہے۔

اس نظام میں سرمایہ دار اور مزدور کی کوئی تفریق نہیں۔ ہر ایک کے حقوق محفوظ ہیں۔ اس کی نظر میں خلاف شریعت جو مال حاصل کیا جائے وہ تھوڑا ہو یا زیادہ غریب کا ہو یا امیر کا۔ سب کا سب حرام اور قابل واپسی ہے اور جو مال شرعی اصول کے مطابق جائز طریقوں سے حاصل کیا گیا ہو، خواہ وہ مقدار میں کتنا ہی ہو اسلام اس کی ملکیت کو جائز قرار دیتا ہے اور اس کا محافظ ہے۔ کسی کو اس کے سلب کرنے کا حق نہیں۔ نہ کسی کا دولت مند ہونا بذاتہ جرم ہے۔ نہ غریب ہونا کوئی ہنر ہے۔

اسلامی نظام متقاضی ہے کہ ہر شخص جائز طریقوں سے معاش حاصل کرنے میں اپنی پوری محنت اور کوشش صرف کرے اور اس کے راستے اسلامی مملکت میں اس کو کھلے

ہوئے ملیں گے، اسلامی مملکت میں خزانوں پر سرمایہ دارانہ نظام کے سانپوں کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ ہر شخص کے لیے اس کی محنت کا صلہ اور حسن عمل کا اجر ہے مگر سوشلزم ایک اجتماعی سوداگری ہے جس میں محنت کش پیدا کرتے ہیں اور ریاست کھاتی ہے (اس مسئلہ کی پوری تفصیل میرے رسالہ ''اسلام میں تقسیم دولت کا نظام'' میں ملاحظہ کی جا سکتی ہے، جو اردو انگریزی، بنگلہ اور عربی میں شائع ہو چکا ہے)

سوال:۔ کیا آپ اس سے اتفاق کرتے ہیں کہ علماء کی باہمی لڑائی سے علماء کا وقار کم ہوگا اور اس کا فائدہ لادین عناصر کو پہنچے گا؟

جواب:۔ اس میں کیا شبہ ہے کہ علماء کے اس اختلاف سے لادین عناصر فائدہ اٹھائیں گے لیکن اس اختلاف کے مفاسد سے گھبرا کر کلمۂ حق میں سکوت اختیار کرنا اپنے محاذ کو باطل کے سپرد کرنے کے مترادف ہے۔ البتہ اس نقصان سے بچنے کے لیے علماء سے میری اپیل ہے کہ وہ اختلاف میں دلائل کا جواب دلائل سے دیں طعنہ زنی، الزام تراشی اور شخصیات کے خلاف کیچڑ اچھالنے سے پرہیز کریں۔ میں حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ کے ایک جملہ پر اپنی بات ختم کرتا ہوں۔

''اختلاف کا مضائقہ نہیں مگر بدگمانی اور بدزبانی سے پرہیز کیا جائے۔''

آخر میں مفتی صاحب نے اپنے اکابر اساتذہ کے بارے میں اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا کہ مولانا سید انور شاہ کشمیریؒ معاملات دینی میں مصلحت آمیز روش اختیار کرنے کے سخت مخالف تھے۔ ایک دفعہ لاہور کے ایک اجتماع میں مسئلہ سود زیر بحث تھا۔ ایک گروہ جس میں ''انقلاب'' کے ایڈیٹر عبدالمجید سالک بھی موجود تھے کہہ رہا تھا کہ ہم نے سود کو نہ اپنایا تو مسلمان ترقی نہیں کر سکیں گے۔ علماء نے سود کو اپنانے کے حامی گروہ کے دلائل کا مسکت جواب دیا لیکن سالک مطمئن نہ تھے۔ مولانا انور شاہؒ جو خاموشی سے ان کی باتیں سن رہے تھے، کہنے لگے۔

''سالک صاحب آپ سالک ہیں اور میں ایک نیم مجذوب! لیکن یہ بات یاد رکھیں کہ جہنم کے دروازے کھلے ہیں۔ اگر کوئی اس میں گرنا چاہتا ہے تو اسے کوئی نہیں روک سکتا ہے۔

لیکن اگر کوئی مولوی کی گردن پھلانگ کر اس میں گرنے کی کوشش کرے گا تو مولوی ہرگز اس جہنم میں نہیں گرنے دے گا بلکہ اس کی ٹانگ کھینچ لے گا۔'' اور اس کے بعد محفل میں کسی کو یارائے سخن نہیں رہا۔

مفتی عزیز الرحمانؒ کی زندگی انتہائی سادہ تھی۔ ان کا یہ معمول تھا کہ صبح کی نماز سے فارغ ہوتے اور محلّہ کے غریب غرباء کے گھروں میں جاتے۔ اُن سے پوچھتے بازار سے کچھ منگوانا تو نہیں۔ اور پھر جب بازار سے لوٹتے تو ان کی قمیض میں متعدد گرہیں لگی ہوتیں۔ جو کچھ کسی نے منگوایا ہوتا وہ اس کے سپرد کرتے اور گرہوں کو کھولتے جاتے۔ مولانا اصغر حسین کسی کو تکلیف نہ دیتے تھے اور اس بات کا احساس اس قدر تھا کہ اگر کبھی کوئی مہمان آتا اور اس کی خاطر پھلوں سے کرتے تو پھلوں کے چھلکے ایسی جگہ لے جا کر پھینکتے جہاں جانور انہیں فوراً کھالیں تا کہ غریبوں کو اپنی محرومی کا احساس نہ ہو آپ نے باوجود سرمایہ ہونے کے اس وقت تک اپنا مکان پکا نہ بنوایا جب تک اہل محلّہ کے مکان پختہ نہ ہو گئے۔ اور اگر اس سلسلے میں کسی نے انہیں کچھ کہا بھی تو یہی جواب دیا کہ:

> ''اہل محلّہ جو غریب غرباء ہیں ان سب کے مکان کچے ہیں۔ میں پختہ بناؤں گا تو ان کا دل ٹوٹ جائے گا۔''

مولانا حبیب الرحمان عثمانیؒ مہتمم دارالعلوم سخت گیر مشہور تھے لیکن حضرت تھانوی فرمایا کرتے تھے کہ ''تم انہیں سخت گیر کہتے ہو لیکن وہ سخت نہیں بلکہ مضبوط ہیں، ریشم کے رسے کی طرح جو نرم اتنا کہ ہر بچہ موڑے اور مضبوط اتنا کہ ہاتھی کو جنبش نہ

کرنے دے اور حقیقت بھی یہی تھی۔ اگر کوئی حق بات کہتا تو اُسے قبول کرنے میں کبھی عار نہ سمجھتے لیکن مسلک کی حفاظت میں کبھی جان کی پرواہ بھی نہ کی۔ ایک بار مولانا حبیب الرحمانؒ کے مخالفین درپے آزار ہوئے تو احباب نے مشورہ دیا کہ آپ رات کو دارالعلوم میں نہ سویا کریں لیکن انہوں نے فرمایا:۔

''میں عثمانی ہوں۔ میرے جدامجد کے جنازہ پر صرف تین افراد تھے جنہوں نے اُن کو دفنایا۔ تم مجھے موت سے ڈراتے ہو۔''

لیکن اب ان کی یادیں ہی یادیں ہیں اُن کا سا عالم باعمل اور حق میں جری کوئی نظر نہیں آتا۔

مرکزی جمعیت علماءِ اسلام کے اغراض و مقاصد

(۱)......اقامت دین اور اعلاء کلمۃ اللہ کی منظّم جدوجہد کے لیے علمائے اسلام کو بلالحاظِ مسلک ومکاتبِ خیال ایک مرکز پر جمع کرنا۔

(۲)......اسلامی نظام حیات کے تمام شعبوں کی شریعت اسلامیہ کی روشنی میں علمی وضاحت اور پاکستان میں ان کے عملی قیام اور مکمل نفاذ کی جدوجہد کرنا۔

(۳)......مسلمانوں کے دینی شعور کو تبلیغ وتذکیر کے ذریعے بیدار کرنا تاکہ وہ اپنی زندگی کے تمام شعبوں کو اسلامی سانچہ میں ڈھال کر اسلام کے انفرادی واجتماعی تقاضوں کو پورا کرسکیں اور پاکستان کو اس قابل بنا سکیں کہ وہ عالمگیر امن وعدل اور خوش حالی وآسودگی کے قیام میں اسلام کے شایانِ شان حصہ لے سکیں۔

(۴)......مملکت پاکستان میں منشاءِ اسلام کے مطابق ایک ایسے متوازن اور عادلانہ معاشی نظام

کے قیام کی جدوجہد جو بلالحاظِ نسل ومذہب وطبقہ تمام باشندگانِ پاکستان کی بنیادی ضروریات اور باوقار زندگی کے وسائل فراہم کرنے کا ضامن ہوتا کہ پاکستان میں انسانیت کش قارونیت (سرمایہ داری) اور الحاد آفریں اشتمالیت واشتراکیت کے مہلک اثرات سے محفوظ ہوکر دنیا کے سامنے اسلام کے پیش کردہ نظامِ معاشی کی برکتیں ظاہر کرسکے۔

(۵)......مملکت پاکستان میں جامع وہمہ گیر نظام تعلیم کی ترویج وترقی جس کا مرکزی نقطہ اور محور اسلام ہو اور جو انسان کے تمام شعبہ جات، حیات اور ضروریاتِ زندگی پر محیط ہو۔

(۶)......مسلمانوں میں جہاد فی سبیل اللہ کا دینی شعور اور مملکتِ پاکستان کے دفاع اور اس کے استحکام کی خاطر جذبہ ایثار وقربانی پیدا کرنا۔

(۷)......مسلمانانِ پاکستان کے دلوں میں مقصدِ حیات اور فکر وعمل کی وحدت کی بنا پر جذبہ یگانگت واخوت کو ترقی دینا اور صوبائی، لسانی، نسلی اور طبقاتی تعصبات کو دور کرکے انہیں پاکستان کی وحدت واستقلال کے تحفظ اور اسلامی خطوط پر اس کی تعمیر وترقی کے لئے موثر خدمات انجام دینے کا اہل بنانے کی سعی کرنا۔

(۸)......مسلمانانِ عالم بالخصوص علماء ومفکرین عالم اسلام سے اقامتِ دین اعلاءِ کلمۃ اللہ اور فروغِ اسلام کے لیے روابط کا قیام واستحکام۔

(۹)......محکوم مسلم ممالک کے استخلاص واستقلال اور غیر مسلم ممالک کی مسلم اقلیتوں کی آبرومندانہ اسلامی زندگی کیلئے حسبِ استطاعت وحالات کوشش کرنا۔

(۱۰)......حسبِ تقاضۂ اسلام غیر مسلم باشندگانِ پاکستان کے جان ومال، آبرو اور حقوقِ شہریت کی خاطر خواہ تحفظ کی سعی اور پسماندہ اقوام وطبقات کے معیار زندگی کو بہتر کرنے کی جدوجہد۔

(۱۱)......اسلام کو ایک عالمگیر دین اور مثالی اور مکمل نظامِ حیات کی حیثیت سے دنیا کے سامنے پیش

کرنا اور اس کی حقانیت کی دعوت وتبلیغ کے لئے مناسب اور موثر انتظامات کرنا تا کہ عالم انسانیت کو اس کی روشنی سے مستفید ہونے کا پورا موقع فراہم ہو۔ نیز اسلام کے عملی، تاریخی، اور ثقافتی سرمایہ کی خاطر خواہ نشر واشاعت اور اس کی ترقی کے لئے موثر تدابیر وذرائع اختیار کرنا۔

۴۷

اشتراکیت، سرمایہ داری

کے متعلق ایک انٹرویو

تاریخ تالیف ——— ۱۳۸۹ھ (مطابق ۱۹۶۹ء)

مقامِ تالیف ——— لاہور

یہ انٹرویو جناب مجیب الرحمٰن شامی صاحب نے ۱۹۶۹ء میں حضرت مفتی صاحب قدس اللہ سرہٗ سے "ہفت روزہ اخبار جہاں" کے لئے لیا تھا اور سب سے پہلے اسی میں شائع ہوا۔

تعارف

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ

از

(مجیب الرحمان شامی)

''وہ شمع اجالا جس نے کیا چالیس برس تک غاروں میں''۔۔۔اس کی روشنی علمائے حق نے ہر دور میں پھیلائے رکھی ہے۔شرار بولہبی ہر زمانے اور ہر دور میں اس سے ستیزہ کار رہا، لیکن کبھی اس شمع کی لو مدھم نہیں ہوسکی ۔ یہ فروزاں سے فروزاں ہوتی چلی گئی تابناک ، آج بھی دنیا میں اس کی بدولت ایمان کا اجالا ہے۔ یقین کی روشنی ہے۔ایسے بندگان خدا ہر دور ہر زمانے میں موجود رہے جنہوں نے اپنا ناطہ سرکار دربار سے جوڑنے کی بجائے صرف اللہ سے جوڑا۔ وظیفوں پر پلنے کی بجائے روکھی سوکھی پر قناعت کی اور جب ضرورت پڑی۔ جب دین کی بنیادوں پر کوئی ضرب لگتے دیکھی دیوانہ وار اٹھ کر دفاع میں ڈٹ گئے ۔۔۔ وطن عزیز میں بھی ایسے بندگان حق موجود ہیں ۔ ہر چند کہ انہیں انگلیوں پر گنا جاسکتا ہے۔ مفتی محمد شفیع ان چند بزرگوں میں بہت نمایاں مقام رکھتے ہیں ۔ انہوں نے شہر کراچی سے پندرہ میل دور کورنگی کے ویرانوں میں ایمان کی مشعل جلا رکھی ہے۔ اس کا نور پورے برصغیر میں پھیلا ہوا ہے۔ اس کی

روشنی بے شمار دلوں میں ۔۔۔ اجالا بکھیر رہی ہے۔ مفتی صاحب نے کبھی اپنا مقدر اقتدار کے ایوانوں سے وابستہ نہیں کیا۔ وزراء اور امراء کی خیر مقدمی تقاریب میں شرکت نہیں کی۔ کبھی ہوائی اڈے پر جا کر کسی مقتدر شخصیت کو ہار نہیں پہنائے۔ ان کی جبیں پر ایک ہی سجد کے داغ ہے اور یہ وہ سجدہ ہے جس نے انہیں ہزار سجدوں سے نجات دلا دی ہے۔ مفتی صاحب اس دور میں امام ابو حنیفہؒ اور امام حنبلؒ کا نشان ہیں۔ ان میں ابوذر غفاریؓ کا سا استغناء ہے تو ابو عبیدہؓ کی سی تمکنت ۔۔۔ ان کی نگاہ مؤمنانہ نے کئی تقدیریں بدل کر رکھ دیں۔ آج بھی ہزار ہا طالب علم ان کے چشمہ فیض سے استفادہ کر رہے ہیں اور اپنے سینوں کو نور سے بھر رہے ہیں۔ مفتی صاحب کے سامنے شاہان وقت کی گردن ہمیشہ خم رہی کیونکہ انہوں نے اپنی گردن خدا کے سوا کبھی کسی کے سامنے خم نہیں کی۔ ان کی ذات ستودہ صفات حکیم الامت مولانا اشرف علی خاں تھانویؒ کے صحیح معنوں میں جانشین ہے۔ ان کے کردار کی پختگی اور اصول پرستی نے ہی انہیں یہ مقام عطاء کیا ہے کہ ہر طبقہ فکر ہر مکتب خیال سے وابستہ افراد ان کی عظمت کے سامنے سر جھکاتے اور ان پر تحسین کے پھول نچھاور کرتے ہیں۔

(مجیب الرحمان شامی)

انٹرویو

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ

(از مجیب الرحمٰن شامی)

نوٹ: ۔ یہ انٹرویو ماہ ربیع الاول میں لیا گیا تھا۔ چنانچہ اسلام میں اس مہینہ کی اہمیت کے پیش نظر گفتگو کا آغاز اسی موضوع سے کیا گیا ہے۔

(مرتب)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کیوں تشریف لائے؟

ربیع الاول کا مہینہ تاریخ عالم میں بہت اہم اور یادگار حیثیت رکھتا ہے۔ اس میں حضور خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت مسعود ہوئی اور یوں بنی نوع انسان کی رفعتوں کے نئے اور سب سے اعلیٰ باب کا عنوان لکھا گیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ کچھ کر دکھایا جو نہ تو کوئی ان سے پہلے کر سکا اور نہ بعد میں ہی کر سکتا تھا۔ انہوں نے پورے زمانے، پوری دنیا اور پوری نوع انسانی کے سوچنے اور عمل کرنے کے انداز کو بدل ڈالا، ظلم، گمراہی اور ضلالت کے گھٹا ٹوپ اندھیروں کے درمیان افکار ایمانی کی مشعل روشن کی اور تھوڑے ہی عرصے کے اندر ایک مثالی ریاست کی تشکیل کر ڈالی۔ ایسی ریاست جس میں زمین اپنی نعمتیں اگلتی اور آسمان اپنی رحمتیں برساتا تھا۔ حضور صلی

اللہ علیہ وسلم نے جب اعلائے کلمۃ الحق کہا تو وہ تنہا تھے۔ اس تنہا وجود نے کفر کے ایوانوں میں کھلبلی مچادی۔ ہزار مصائب اور مشکلات کے باوجود ان کے قول و فعل میں یکسانیت اور قوت عمل کے کرشموں نے لوگوں کو اپنا قائل کرنا شروع کیا۔ ایک، ایک دو، دو کر کے حق کے جویا بندے ان کے سائیہ رحمت میں پناہ لیتے گئے۔ یہاں تک کہ بڑا کارواں بن گیا۔ پھر لوگ جوق در جوق آنے شروع ہوئے اور یوں اللہ کے اس ایک بندے نے تاریخ انسانی کا دھارا موڑ کر رکھ دیا۔ پوری دنیا کو جہاں بانی اور جہاں داری کے ساتھ ساتھ دینداری کے اصول بھی سمجھائے اور ''دین و سیاست'' کو الگ الگ رکھنے کے فتنے کی جڑ کاٹ کر رکھدی۔ حضور ﷺ کی سیرت مقدسہ سے یہ بات بھی ظاہر ہوتی ہے کہ فرد جماعت سے نہیں، جماعت فرد سے بنتی ہے۔ اگر کچھ نیک بندے راہ حق پر چل نکلیں تو پھر آخر کار پورا زمانہ ان کے ساتھ ہو کر رہتا ہے۔

ربیع الاول کا مہینہ ہمیں ذرا زیادہ شدت سے اس عالمگیر انقلاب کی یاد دلاتا اور اس کے بانی کے نقوش ہائے قدم پر چلنے کی دعوت دیتا ہے۔ لیکن ہمارے ہاں اس مہینے کا چاند طلوع ہوتے ہی جس طرح جشنوں اور گانے بجانے کی محفلوں کا اہتمام شروع کیا جاتا ہے۔ پھر عید میلاد کے روز جس طرح بھنگڑے ڈالے جاتے (اور بعض جگہ ٹوسٹ بھی ہوا ہے) اور جسم کے تھرکنے کے جو مظاہر پیش کئے جاتے ہیں اس سے یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ محبت رسول ﷺ کا حق ادا ہو گیا۔ اگر خدا ہمیں عقل و بصیرت سے نوازے تو یہ سوچنا چاہئے کہ کیا قرآن کریم اور رسول رحیمؐ اس دنیا میں اسی لیے آئے تھے کہ کہاں کچھ جلسے جلوس، چراغاں اور گانے بجانے کی محفلوں کی کمی تھی۔ اللہ اور رسول ﷺ کے نام پر ایسے جشن منانے کے لئے قرآن اور رسول ﷺ کے آنے کی کیا ضرورت تھی جو لوگ اس میں لگ گئے انہوں نے نزول قرآن اور بعثت نبویؐ کے مقصد کو پورا کر دیا، پھر چاہے وہ سو فیصد جھوٹ بولیں۔ غریبوں کو ستائیں، حرام کھائیں، نماز روزے کے پاس نہ جائیں معاملات میں سب دھوکہ فریب ہوتا رہے۔ یا ان کے آنے کا مقصد کفر و

شرک اور لادینی جاہلیت کو مٹانا۔ انسان کو اللہ تعالیٰ کی عبادت میں لگا کر دنیا کے کھیل تماشوں سے بچانا اور انسان کے اخلاق و کردار کو اعلیٰ معیار پر پہنچانا، انہیں خداترسی کے ذریعے باہمی ہمدردی اور ایثار پیدا کرنا تھا، کاش ہم سب قبر اور آخرت کو اور اس بات کو سامنے رکھیں کہ ایک دن رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی پناہ لینی ہے، آپ ہی کی شفاعت سے کام چلنا ہے۔ اگر آپ نے پوچھ لیا کہ جن مقاصد کے لیے میں نے اپنی تمام زندگی صرف کی دشمنوں کے جو ستم سہے، مصیبتوں کے پہاڑ برداشت کیے اس سلسلے میں تم نے کیا کام انجام دیا تو یقین فرمایئے کہ کوئی شخص ان رسمی جشنوں اور جلوسوں اور ان کے پیچھے مسلمانوں کے باہمی جنگ و جدال کو اپنی خدمات کی حیثیت سے پیش کرنے کی جرأت نہیں کر سکے گا۔ کاش مسلمان اپنی توانائی اور دینی جذبے کا رخ خالص ان منکرات اور باطل عقائد کی طرف سے پھیر دے جو دیوبندی، بریلوی، اہل حدیث غرض کسی جماعت کے عقائد و نظریات میں قابل تحمل نہیں اور وہی آج کل طوفانی رفتار سے مسلمانوں کو اپنی لپیٹ میں لیے چلے جا رہے ہیں۔ کاش مسلمان اپنی فرقہ بندیوں اور دوسری خرافات سے دامن چھڑا کر مغربی الحاد کے جھکڑ اور اشتراکیت کی آندھی کے آگے بند باندھ سکیں۔ یہ بات دن منانے اور جلوس نکالنے سے حاصل نہیں ہوسکتی۔ اس کے لیے تھرکنے والے جسم کی بجائے تڑپنے والے دل کی ضرورت ہے اور وہی آج جنس گراں مایہ بنا ہوا ہے۔

دن منانے اور جشن رچانے میں اپنی صلاحیتوں کو وہ قوم صرف کر سکتی جو قابل تعظیم بزرگوں کے معاملے میں مفلس ہوں یعنی ان میں گنے چنے افراد ایسے ہوں جن کے کارناموں کی یادگار منانا ضروری سمجھا جائے لیکن جس قوم کا حال یہ ہو کہ ''ایں خانہ تمام آفتاب است'' وہ اگر ان چیزوں کا اہتمام کرے تو پورے سال میں کوئی دن بھی ایسا نہ رہے جسمیں کوئی دن نہ منایا جائے بلکہ سال کے پورے دن بھی کفایت نہ کریں۔ امت کے علماء نے رسول ؐ کی زندگی کے ہر قول و فعل اور حرکت و سکون کی اتنی حفاظت کی

ہے کہ پچھلی امتیں اپنی آسمانی کتابوں کی بھی اتنی حفاظت نہیں کر سکیں۔ آپؐ نے یا آپؐ کے صحابہ کرام نے کبھی عید معراج، یا عید ہجرت یا کوئی اور عید (سوائے عید الفطر اور عید الضحیٰ) کے منائی ہوتی تو اسلامی تاریخ میں اس کے ہزاروں واقعات مذکور ہوتے مگر یہاں پورے ذخیرۂ حدیث و تاریخ میں کوئی ضعیف سے ضعیف روایت بھی ایسی نہیں ملتی۔ جھوٹی حدیثیں گھڑنے کا سلسلہ منافقین یا حاسدین کیطرف سے ہمیشہ جاری رہا مگر اس معاملہ میں جھوٹ بولنے کی بھی جرأت کسی کو نہیں ہو سکی۔ آج کوئی حدیث گھڑے تو ممکن ہے۔ مگر زمانۂ قدیم میں تو اس قسم کی کوئی موضوع روایت بھی نظر نہیں آتی۔ غور کرنے کا مقام ہے کہ تنہا سید الانبیاء والمرسلین رسول کریمؐ کی حیات طیبہ میں کیا صرف یوم ولادت ہی قابل تعظیم ہے۔ اگر ذرا بھی عقل و انصاف سے کام لیا جائے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا ہر دن بلکہ ہر گھنٹہ اور ہر لمحہ پوری انسانیت کے لیے، حیات جاودانی ہے۔

خلافت الٰہیہ کے نفاذ کی تدابیر

رسول اکرمؐ کا اصل مشن خلافت الٰہیہ کو دنیا میں نافذ کرنا تھا۔ خلافت الٰہیہ کے قیام کی بدولت ہی انسان کو دائمی فلاح و بہبود حاصل ہو سکتی ہے۔ یہ فلاح و بہبود دو حصوں میں منقسم ہے۔ ایک موجودہ دنیا کی معاشرت اور اس میں امن وسکون سے زندگی، دوسرے موت کے بعد عالم ثانی میں دائمی اور لازوال زندگی، اسلام ہی وہ نظام حیات ہے جو آدمی کی دونوں زندگیوں کو سدھارنے کا عزم کرتا اور ذمہ لیتا ہے جب کہ اشتراکیت اور سرمایہ داری دونوں صرف ایک ہی زندگی سے بحث کرتے ہیں۔ عالم آب وگل کی زندگی جو انتہائی ناپائیدار اور عارضی شے ہے دائمی زندگی کا نہ تو انہیں ادارک ہی ہے اور نہ یہ سبب ہے۔ عمر نبویؐ کا تو ہر دن جشن مسرت منانے کا مستحق تھا لیکن صحابہ کرام اور خود آنحضرتؐ

نے جشن منانے کی کوئی طرز نہیں ڈالی۔ جو قومیں عمل کی دھنی ہوتی ہیں وہ ایسی باتوں میں کہاں الجھتی ہیں؟ ہاں جب معاملہ عمل کی بجائے محض ''گفتار کا غازی'' بننے کا رہ جائے تو پھر خود کو ایسے ہی سرابوں کے سہارے زندہ رکھا جاتا ہے۔ وہاں کے لیے انسان کو کچھ تو شہ لے جانے دیتے ہیں۔

اسلام نے دنیا کی اصلاح کے لیے بھی دو نظام بنائے ہیں۔ ایک اصلاح اخلاق واعمال کے لیے اور دوسرا قانون وسیاست سے متعلق۔ قرآن کی یہ صفت خاص ہے کہ وہ لوگوں کو عام قانون کی دفعات کے طور پر احکام نہیں دیتا۔ محض تعزیرات کی دفعات قائم نہیں کرتا بلکہ جب حکم دیتا ہے یا کسی چیز سے منع کرتا ہے تو اس کے ساتھ اللہ سے ڈرنے کی تلقین کرتا ہے۔ اکثر ایسی آیتوں کے ساتھ اس مضمون کی آیتوں کے جوڑ لگے دکھائی دیتے ہیں۔ دراصل قانون کو اخلاق سے جدا کرنا وہ بھیانک غلطی ہے جس میں گرفتار ہو کر دنیا گوناگوں مصائب میں مبتلاء ہو گئی۔ دنیا کا کوئی قانون خودکار مشین نہیں ہوتی اس کو چلانے والے بہر حال انسان ہوتے ہیں۔ یہ اگر اخلاق اوصاف سے کورے ہوں دنیا کو وہی نقصان پہنچے گا جو آج پہنچ رہا ہے۔ اس کا مشاہدہ آپ ہر جگہ کر سکتے ہیں۔ قرآن کے دونوں طریقوں سے ایک ایسا معاشرہ تیار ہوتا ہے جو قانون کو صحیح طور پر قائم کر سکے اور یہی نظام دنیا کے امن وسکون کا ضامن بن سکتا ہے اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے سب سے پہلے افراد کے اخلاق واعمال درست کیے ان کی فکر کج روی کو صراط مستقیم دکھائی یا اس کے بعد ہی وہ ایک مثالی ریاست قائم کرنے میں کامیاب ہوئے۔

اسلامی سیاست کی بنیادیں

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سب سے پہلے تو افراد سازی پر توجہ دی۔ مکی زندگی کے تیرہ سالہ دور میں وہ اسی کام میں مشغول رہے۔ اس دوران انہیں افراد کی ایک ایسی

جماعت مل گئی جن کی صلح و جنگ، دوستی اور دشمنی، محبت اور عداوت کوئی چیز بھی اپنے لیے نہیں تھی، صرف اور صرف اللہ کے لیے تھی، اس کے بعد مدنی تعمیری دور میں اسلام نے قدم رکھا تو نبی کریمؐ نے اسلامی سیاست کو دو بنیادوں پر قائم فرمایا۔

پہلی بنیاد اسلامی وحدت و اخوت کی تھی، مدینہ طیبہ میں ہجرت کے بعد دو'' قومیں بن رہی تھیں۔ ایک انصار اور دوسرے مہاجرین۔ اگر دنیا کے عام رسوم و رواج کے تابع یہی امتیاز رہتا تو اسلامی ریاست کا بھی وہی حشر ہوتا جو آج قبائلی اور نسلی بنیادوں پر قائم کی جانے والی ریاستوں اور معاشروں کا ہو رہا ہے۔ رسول اللہؐ نے مہاجرین اور انصار کو بھائی بھائی بنا دیا۔ ان دینی بھائیوں میں اخوت، ہمدردی اور ایثار کی فضا نسبی بھائیوں سے کہیں بڑھ کر تھی۔ نسبی بھائی جو کفر پر تھے ان سے کٹ گئے۔ بدر اور احد کی جنگیں شاہد ہیں کہ بھائی کی تلوار بھائی پر چل رہی تھی۔ بیٹا باپ سے مصروف جنگ تھا، اللہ اور رسول ﷺ کے نام لیوا ایک طرف تھے، ایک قوم تھے اور نہ ماننے والے دوسری قوم۔ اس طرح رسول اللہ نے ایسی وحدت قائم فرما دی جس کی بنیاد نسل و رنگ، زبان اور وطن قبائل و نسب سب سے بالا ہو کر ایک اللہ کو ماننے پر رکھی گئی تھی۔!

ایک طرف تو اسلامی جماعت میں اتحاد و یگانگت کی یہ فضا تھی دوسری طرف مخالفین اسلام میں جس کی مخالفت وقتی طور پر کم اور قابل برداشت نظر آئی، اس کے ساتھ صلح کا معاہدہ کر لیا گیا۔ مدینے کے ارد گرد یہودیوں کے قبائل آباد تھے جو مستقل ریاستوں کی سی حیثیت رکھتے تھے۔ ان سب قبائل کے ساتھ رسول اللہ ﷺ نے یہی فرمایا، مگر یہ بات یاد رہنی چاہئے کہ غیروں کے ساتھ معاہدات پر نزاعی معاملات کا آخری فیصلہ نبی کریمؐ کے ہاتھ میں تھا۔ اس لئے اس بات کا کوئی شائبہ تک نہ تھا کہ اسلامی شعار اور اسلامی ضروریات میں کوئی کتر بیونت یا نرمی اختیار کی جائے۔ غیروں کے ساتھ معاہدوں کے سلسلے میں حضور کا یہی طرز عمل دنیا کے لیے سبق آموز اور مسلم اور

غیر مسلم معاہدات کی دائمی بنیاد ہے۔

آج کا بحرانی دور اور مسلمان

آج جب کہ ہم ایک بحرانی دورے سے گزر رہے ہیں۔ طرح طرح کی فکری اور عملی گمراہیوں سے دوچار ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہی طرز عمل ہمارے لیے مشعل راہ ہے۔ اسلامی سیاست کی بنیاد یہی دو باتیں ہیں لیکن افسوس کہ مسلمانوں نے ان سے بھی صرف نظر کرلیا ہے۔ اب وہ غیر مسلموں، ملحدوں اور اشتراکیوں سے تو بغل گیر ہیں لیکن خود مسلمانوں کے خون کے درپے ہیں۔

جب میں یہ سنتا ہوں تو میرا دل بہت کڑھتا ہے کہ بعض علماء کرام سوشلزم کے نام لیواؤں اور اشتراکیت کے دعوے داروں کے ساتھ قدم ملا کر چلنے کو تیار ہو رہے ہیں۔ ان سے ملاقاتیں اور عہد و پیمان کرتے ہیں مگر اپنے توحید پرست اور کلمہ گو بھائیوں سے گلے ملنے کو تیار نہیں ہوتے۔ یہ مسلمانوں کی کم نصیبی نہیں تو پھر کیا ہے کہ وہ لوگ جو مسند رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے وارث اور ان کی رہنمائی کے دعویدار ہوں، گمراہی کی دلدلوں میں پھنس کر رہ جائیں۔ میری آرزو ہے اور دعا بھی کہ ایک اسلامی محاذ قائم ہو جائے جو ہمیں گمراہیوں اور ضلالتوں کی دلدل سے محفوظ رکھنے کے لیے کام کرے۔ یہ دور بڑا نازک ہے۔ اس وقت تمام کلمہ گوؤں کو جو توحید، آخرت اور رسالت پر ایمان رکھتے ہوں۔ مغربی الحاد اور اشتراکیت کا مقابلہ کرنے کے لیے ایک ہو جانا چاہئے۔ اگر کچھ لوگوں نے یا کچھ گروہوں نے محض جماعتی تعصّبات اور شخصی اختلافات کو اس مقصد کے حصول کی راہ میں رکاوٹ بنائے رکھا تو پھر انہیں اللہ کے حضور جواب دینا پڑے گا۔ اس بات کو وہ خوب اچھی طرح سمجھ لیں اور جان لیں۔ حیرت ہے جنہیں دوسروں کو بیدار کرنا تھا وہ خود خواب غفلت کا شکار ہیں۔

اشتراکیت اور مساوات کا فریب

بات سرمایہ داری اشتراکیوں اور اشتراکیت کی طرف آئی ہے تو ان کا بھی کچھ بیان ہو جانا چاہیے۔ تفصیلات نہیں تو مجملاً سہی۔ نظام سرمایہ داری میں حلال وحرام کی قیود سے بالاتر ہو کر اور دوسرے لوگوں کی خوشحالی یا بدحالی سے آنکھیں بند کر کے زیادہ سے زیادہ دولت جمع کرنا ہی سب سے بڑی انسانی فضیلت سمجھی جاتی ہے۔ دوسری طرف اشتراکیت میں شخصی اور انفرادی ملکیت کو ہی سرے سے جرم قرار دے دیا جاتا ہے۔ غور کیجیے تو معلوم ہوگا ہر دو نظاموں کا حاصل اور مقصد مال و دولت کی پرستش اور اس کو مقصد زندگی سمجھتے ہوئے اس کے لیے دوڑ دھوپ ہے جبکہ اسلام میں یہ مقصد حیات نہیں وسیلۂ حیات ہیں۔ اسلام نے ایک طرف تو دولت کو مقصد زندگی بنانے سے منع فرمایا اور اس پر کسی منصب وعہدہ کا مدار نہیں رکھا۔ دوسری طرف تقسیم دولت کے ایسے پاکیزہ اصول مقرر کیے جن سے کوئی انسان ضروریات زندگی سے محروم نہ رہے اور کوئی فرد ساری دولت کو نہ سمیٹ لے، اسلام معاشی انصاف کا علم بردار ہے اور صرف اسی نظام سے یہ مقصد حاصل ہو سکتا ہے۔ یورپ کی ظالمانہ سرمایہ داری اور اس کے مظالم سے عاجز آ کر قریباً ڈیڑھ سو برس پہلے کچھ لوگوں نے معاشی مساوات کا دلفریب نعرہ لگایا اور امیر وغریب کی تفریق مٹانے کا دعویٰ لے کر اٹھے۔ مساوات کی اس خیالی جنت کے فریب میں بہت سے غریب عوام اور مزدور اس تحریک کے علمبردار ہو گئے۔ اب اسی تحریک کے علمبردار یہاں بھی ایسے ہی نعرے لگا رہے ہیں جبکہ سوشلسٹ معاشروں میں یہ مساوات کسی طور پر بھی حاصل نہیں کی جا سکی۔ حتیٰ کہ ۱۹۳۱ء میں اسٹالن نے یہ اعلان کر دیا کہ ہم مساوات کے علمبردار نہیں ہیں۔ جو لوگ ایسا کہتے ہیں وہ اشتراکیت کے دشمن ہیں۔ مسائل لینن ازم مطبوعہ ماسکو کے صفحہ نمبر ۵۰۳ پر اسٹالن صاحب کے یہ الفاظ درج ہیں ''مارکسزم مساوات پرستی کا دشمن ہے'' دوسری جنگ عظیم

کے بعد عملی طور پر مزدوریوں اور تنخواہوں میں بے پناہ تفاوت پیدا ہو گیا۔ ۱۹۳۷ء میں ایک اشتراکی مصنف ایم وائی یون نے روس میں اس کی کیفیت یوں بیان کی تھی۔

عام مزدور کی تنخواہ.......... ۱۱۰ روبل سے ۴۰۰ تک

درمیانہ افسر کی تنخواہ.......... ۳۰۰ روبل سے دس ہزار تک

اونچے افسر کی تنخواہ.......... ۱۵۰۰ روبل سے دس ہزار تک

اس کے علاوہ اسی مصنف کے بقول چوٹی کے لوگ بیس سے تیس ہزار روبل تک تنخواہ پاتے ہیں۔ خردشیف نے ۵ رمئی ۱۹۶۰ء کو سپریم سوویٹ کے سامنے تقریر کرتے ہوئے کہا تھا۔

''ہم اجرتوں میں فرق مٹانے کی تحریک کے سختی سے مخالف ہیں۔ ہم اجرتوں میں مساوات قائم کرنے اور ان کے ایک سطح پر لانے کے کھلے بندوں مخالف ہیں۔ یہی لینن کی تعلیم ہے۔ اس کی تعلیم یہ تھی کہ سوشلسٹ سماج میں مادی محرکات کا پورا پورا لحاظ رکھا جائے گا۔''
(سوویٹ ورلڈ صفحہ نمبر ۳۴۶)

ملاحظہ فرمایئے کہ معاشی مساوات کے خواب کی یہ تعبیر کس قدر بھیانک نکلی۔ دیکھتے ہی دیکھتے یہ عدم مساوات اور امیر و غریب کا تفاوت اشتراکی مملکت روس میں عام سرمایہ دار ملکوں سے بھی آگے بڑھ گیا۔ روسی فوج میں ۱۹۴۳ء میں ایک سپاہی کو صرف ۱۰ روبل تنخواہ ملتی تھی جب کہ لیفٹیننٹ کو ایک ہزار روبل اور کرنل کو دو ہزار چار سو روبل ملتے تھے حتیٰ کہ اجرتوں کے درمیان یہ تفاوت ایک اور تیس سے بڑھ کر ایک اور سو تک جا پہنچا اب روس میں اجرتوں میں تفاوت سرمایہ دار ممالک سے بھی کہیں زیادہ ہے۔ اس طرح مساوات کا وہ دلفریب نعرہ جس نے لوگوں کو سوشلزم کے جال میں پھنسایا تھا، عمل کی کسوٹی پر پورا نہ اتر سکا خود اشتراکی معاشرے اس کی منہ بولتی تصویریں ہیں لیکن یہی نعرہ اب سوشلزم کے نام لیوا پاکستان میں لگا رہے ہیں اور غریب مزدوروں

اور محنت کشوں کی ہمدردیاں جیتنے کے درپے ہیں۔ اس بات کا ان کے پاس کیا جواب ہے؟ جب ان کے فکری اور علمی آباء اس نعرے کو روس میں عملی جامہ نہ پہنا سکے بلکہ اس سے منحرف ہو گئے تو یہ حضرات پاکستان میں اسے کیسے اور کیوں کر عملی طور پر نافذ کر سکیں گے۔۔۔ دراصل یہ سب ایک فریب محض ہے۔ لوگوں کو اس دام میں الجھانے اور پھنسانے کے لئے ورنہ سرمایہ داری میں غریب کی زندگی جتنی اجیرن ہوتی ہے ویسی ہی اشتراکیت میں ہے۔

اسلامی نظام میں تقسیم دولت

جہاں تک اس سوال کا تعلق ہے کہ اسلامی نظام میں معاشی مسئلہ کیوں کر سلجھے گا اور اسلامی نظام میں تقسیم دولت کیسے ہوگی؟ یا یہ کہ اسلام کا نظام تقسیم دولت کیا ہے تو اسے سمجھنے کے لیے سب سے پہلے تو یہی بات پیش نظر رہنی چاہئے جس کی طرف میں پہلے بھی اشارہ کر چکا ہوں کہ اسلامی معاشیات میں معاشی ترقیات ضروری اور ناگزیر تو ہیں لیکن انسانی زندگی کا مقصد اصلی نہیں اسلام کی نظر میں تمام وسائل معاش انسان کی رہگذر کے مرحلے ہیں اس کی اصلی منزل ان سے آگے ہے اور وہ ہے کردار کی بلندی اور اس کے نتیجہ میں آخرت کی بہبود۔ چنانچہ جب تک معاشی وسائل اس منزل کے لیے رہگذر کا کام دیں وہ ''فضل اللہ'' اور ''خیر'' لیکن اگر یہ اس منزل کے راستے میں رکاوٹ بنیں اور خود منزل و مقصود بن جائیں تو پھر یہ ''فتنہ'' اور ''متاع الغرور'' کہلائے جاتے ہیں۔

دوسری بنیادی بات یہ ہے کہ قرآن کریم کی رو سے دولت خواہ جونسی شکل میں ہو، اللہ کی پیدا کردہ ہے اور اصلا اس کی ملکیت ہے۔ انسان کو کسی چیز پر حق ملکیت اللہ کی عطاء سے ہی ہوتا ہے۔ اس کی وجہ قرآن کریم کی ہی تصریح کے مطابق یہ ہے کہ انسان تو صرف عمل میں ہی کوشاں رہ سکتا ہے لیکن اس کوشش کے نتائج میں برکت ڈالنا اور اس

سے پیداوار مہیا کرنا خدا کے سوا اور کسی کا کام نہیں؟ انسان تو اتنا ہی کر سکتا ہے کہ زمین میں بیج ڈالا لیکن اس بیج کو کونپل کو اور کونپل کو درخت بنانا اللہ ہی کے لیے خاص ہے۔ دولت خواہ کسی بھی شکل میں ہو اللہ کی ملکیت ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ قرآن کریم کے ہی ارشادات کے مطابق اللہ تعالیٰ جو کسی کو عطاء کر دیں وہ اس کا مالک بن جاتا ہے۔ ''دولت'' پر اصل ملکیت تو اللہ کی ہے اس نے انسان کو اس میں تصرف کرنیکا حق دیا ہے۔ چنانچہ انسان کو اپنی زیر تصرف اشیاء پر آزاد، خود مختار اور بے لگام ملکیت حاصل نہیں۔ اس پر ''دولت'' کے اصل مالک نے کچھ حدود و قیود عائد کر رکھی ہیں۔ جہاں وہ خرچ کرنیکا حکم دیتا ہے وہاں اُسے خرچ کرنا ضروری ہے اور جس جگہ ہاتھ روکنے کا حکم دیتا ہے وہاں ہاتھ روک لینا ضروری ہے۔ دولت پر انسان کا تصرف حکم خداوندی کے ماتحت ہوا تو اسکی دو صورتیں ہونگی۔ ایک تو یہ کہ وہ انسان کو اس بات کا حکم دے کہ مال کا کوئی حصہ کسی دوسرے کو دیدے، دوسرے یہ کہ وہ دولت کے ''عارضی مالک'' کو بھی یہ حکم دیدے کہ تم بھی اسمیں تصرف نہیں کر سکتے کیونکہ وہ اجتماعی خرابیوں اور زمین میں فساد پھیلانے کیلئے دولت کے خرچ کرنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔

یہی امر اسلام کو اشتراکیت اور سرمایہ داری دونوں سے ممتاز کرتا ہے۔ سرمایہ داری کا ذہنی پس منظر نظری اور عملی طور پر مادہ پرستی ہے اس لیے وہ انسان کو اپنی دولت پر آزاد اور خود مختار ملکیت کا حق دے دیتی ہے خواہ وہ اسے جس طرح چاہئے صرف کرے قرآن کریم نے قوم شعیب علیہ السلام کا ایک مقدمہ نقل کرتے ہوئے اس نظریے کی مذمت کی ہے۔ وہ لوگ یہ کہتے تھے۔

کیا تمہاری نماز تمہیں اس بات کا حکم دیتی ہے کہ ہم اپنے باپ دادوں کے معبودوں کو چھوڑ دیں۔ یا اپنے اموال میں اپنی مرضی کے مطابق تصرف کرنا ترک کر دیں۔ (۱۱۔۸۶)

وہ لوگ چونکہ ''اموال'' پر اپنی بے لگام اور بے قید ملکیت سمجھتے تھے اس لیے جو چاہیں اور جس طرح چاہیں اسے استعمال کرنے کے دعویدار تھے۔ یہی طرز فکر سرمایہ داری کی روح ہے قرآن کریم نے سورۂ نور میں اس ''اموال'' کے لفظ کو ''مال اللہ'' قرار دیا اوران کے فکر کی جڑ کاٹ کرر کھ دی۔ اس کے ساتھ ہی '' **الذی اتاکم** '' (جو تمہیں دیا ہے) کی قید لگا کر اشتراکیت کی بھی نفی کر دی جو سرے سے انفرادی ملکیت سے ہی انکاری ہے۔

اسلام کا نظام تقسیم دولت اشتراکیت اور سرمایہ داری دونوں سے قطعاً مختلف ہے اشتراکی نظام میں تقسیم دولت صرف اجرت کی شکل میں ہوتی ہے کیونکہ اس میں نجی ملکیت کا کوئی تصور ہی نہیں ہے۔ اس کے برخلاف اسلامی نظریۂ تقسیم دولت کے اصولوں کی رو سے کائنات کی تمام اشیاء۔ اصلا اللہ تعالیٰ کی ملکیت ہیں۔ پھران اشیاء میں سے ایک کثیر حصہ تو وہ ہے جسے اس نے وقف عام کے طور پر تمام انسانوں کو مساوی طور پر دے دیا۔ آگ، پانی، مٹی، ہوا، روشنی خودرو گھاس، جنگل اور پانی کا شکار، معادن اور غیر مملوک بنجر زمین وغیرہ وقف عام ہیں۔ ہر شخص ان سے فائدہ اٹھانے کا یکساں حق دار ہے۔ دوسری طرف بعض ایسی اشیاء ہیں جن میں انفرادی ملکیت کو تسلیم کئے بغیر وہ قابل عمل اور فطری نظام معیشت قائم نہیں ہوسکتا جس کی بدولت معاشی وسائل انسانی زندگی کے مقاصد اصلی، کردار کی بلندی اور پھر اخروی نجات کے حصول میں ممد ثابت ہو سکیں۔ اشتراکیت میں تمام چھوٹے سرمایہ دار ختم ہو جاتے ہیں، ایک بڑا سرمایہ دار ریاست کی شکل میں وجود میں آجاتا ہے اور دولت کے سارے انباروں پر سانپ بن کر بیٹھ جاتا ہے، من مانے طریقے پر اس سے کھیلتا ہے۔ اس کے علاوہ انسانی محنت اختیار اور مرضی کے فطری حق سے محروم ہو جاتی ہے۔ اس کے استعمال کے لیے جبر وتشدد ناگزیر ہو جاتا ہے۔ اس سے محنت کی کارروائی پر انتہائی برا اثر پڑتا ہے اور اس کی ذہنی صحت بھی متاثر ہوتی ہے۔ اسی لیے اسلام نے انفرادی ملکیت کو تسلیم کر کے سرمایہ دار

اورزمین کی جداگانہ حیثیت بھی برقرار رکھی ہے اوران میں رسد وطلب کے فطری نظام کو بھی صحت مند بنا کر استعمال کیا ہے۔ چنانچہ اس کے یہاں اشتراکیت کی طرح تقسیم دولت صرف اجرت کی شکل میں نہیں بلکہ کرائے اور منافع کی صورت میں بھی ادا ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس نے سود کو ختم کر کے اور دولت کے ثانوی مستحقین کی (جن میں معاشرے کے نادار اور ضرورت مند افراد شامل ہیں اوران کی مدد کرنے کی تاکید کی گئی ہے۔قرآن نے فرمایا۔ ان کے اموال میں سائل اور محروم کا ایک معین حق ہے۔ پھر ارشاد ہوا اس کی کھیتی کے کٹنے کے دن اس کا حق ادا کرو۔ ان دونوں مقامات پر ''حق کا لفظ ظاہر کرتا ہے کہ مفلس اور نادار افراد بھی دولت کے ٹھیک اسی طرح مستحق ہیں جس طرح اولین مالک اور اللہ تعالیٰ اس قسم کا حکم دینے کا بہرطور مجاز ہے کیونکہ اصلاً ملکیت اسی کی ہے) ایک طویل فہرست بنا کر ارتکاز دولت کی اس خرابی کا بھی قلع قمع کر دیا جو سرمایہ داری کا خاصۂ لازمہ ہے۔ زکوٰۃ، عشر، کفارات، صدقۃ الفطر، نفقات اور وراثت کے نظام کے ذریعے دولت زیادہ سے زیادہ ہاتھوں میں بٹتی چلی جاتی ہے اور اس میں وہ خرابیاں پیدا نہیں ہو پاتیں جو نظام سرمایہ داری کا لازمہ ہیں یا پھر اشتراکیت کے ذریعے سرابھارتی ہیں۔ گویا نہ تو سرمایہ داری کی سی بے قیدی اور بے لگامی اسلامی نظام میں پنپ سکتی ہے اور نہ اشتراکیت کی سی مجبوری و مقہوری۔

(اقتباسات انٹرویو ہفتہ روز اخبار جہاں کراچی ۶۹)

۴۷

اسلام کا نظام تقسیم دولت

تاریخ تالیف ——— ۲۸؍ذیقعدہ ۱۳۸۷ھ (مطابق ۱۹۶۷ء)

مقامِ تالیف ——— کراچی

پاکستان کی وزارت قانون نے راولپنڈی میں ایک بین الاقوامی کانفرنس منعقد کی تھی جس میں مراکش سے لے کر انڈونیشیا تک پورے عالم اسلام کے مسلمان اصل فکر کو مدعو کیا گیا تھا، ان کے علاوہ پاکستان کے علماء دین اور اہلِ فکر کی ایک بڑی تعداد نے اس کانفرنس میں شرکت کی۔

حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ نے یہ مقالہ اسی کانفرنس کے لئے تحریر فرمایا تھا جس کی تلخیص کانفرنس کے کھلے اجلاس میں پڑھکر سنائی گئی، جس کو حاضرین نے بڑی دلچسپی سے سنا اور بعد میں علمی حلقوں میں اس کی غیر معمولی پذیرائی ہوئی۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حرف آغاز

حال ہی میں پاکستان کی وزارت قانون نے راولپنڈی میں ایک بین الاقوامی کانفرنس منعقد کی تھی جس میں مراکش سے لیکر انڈونیشیا تک پورے عالم اسلام کے مسلمان اہل فکر کو مدعو کیا گیا تھا، غیر ملکی مندوبین میں سے مفتی اعظم فلسطین جناب الحاج محمد امین الحسینی، جناب شیخ باقوری (جامعۃ الازھر)، جناب ڈاکٹر حب اللہ (جامعۃ الازہر) شیخ منصور المجوب (چیف جسٹس لیبیا)، شیخ حسن کتمی (سعودی عرب) ڈاکٹر حسین نصر (ایران) شیخ عبدالرحمٰن الدکالی (مراکش) پروفیسر ابراہیم حسن (انڈونیشیا) کے نام بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ پاکستان کے علماء دین اور اہل فکر کی ایک بڑی تعداد نے اس کانفرنس میں شرکت کی۔

یہ مقالہ...... ”اسلام کا نظام تقسیم دولت“...... میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہم العالی نے اسی کانفرنس کے لئے تحریر فرمایا، اور ۱۲/ ذیقعدہ ۱۳۸۷ھ مطابق ۱۲/ فروری ۱۹۶۸ء کی صبح کو اس کی تلخیص کانفرنس کے کھلے اجلاس میں پڑھ کر سنائی۔ اس محفل میں اہل علم وفکر کا منتخب ذہن موجود تھا، اس مقالے کو

حاضرین نے بڑی دلچسپی کے ساتھ سنا شیخ الازھر جناب باقوری نے مقالہ سن کر کہا:

"وَاللّٰهِ علمٌ غزیرٌ!"

راقم الحروف اس میں موجود تھا، اجلاس کے بعد مختلف طبقہ ہائے خیال کے حضرات سے ملکر میں نے یہ محسوس کیا کہ مقالے نے سامعین پر غیر معمولی اثر چھوڑا ہے، ان سب کی زبان پر ایک ہی فرمائش تھی کہ اس مقالے کو الگ شائع کر دیا جائے چنانچہ زیر نظر رسالہ انہی حضرات کی فرمائش کی تعمیل ہے۔

ماہ محرم ۱۳۸۸ھ کے ماہنامہ البلاغ میں یہ مقالہ پورا شائع کر دیا گیا، اس کی اشاعت کے بعد اہل علم وفکر کے جو خطوط ہمیں موصول ہوئے ان سے اندازہ ہوا کہ علمی حلقوں میں اس کی غیر معمولی پذیرائی ہوئی ہے، روزنامہ جنگ راولپنڈی، الحق اکوڑہ خٹک، اور الفرقان لکھنؤ میں بھی اسے نقل کیا گیا، مولانا عبدالماجد صاحب دریا آبادی ۱۹/اپریل ۶۸ء کے "صدق جدید" میں ایک قابل قدر مقالہ" کے عنوان سے ایک ادارتی تحریر میں لکھتے ہیں:

> "حضرت تھانویؒ کے علمی جانشین اس وقت دو صاحب ہیں......ان میں ایک صاحب سرپرستی ماہ نامہ البلاغ کراچی کی کر رہے ہیں اور رسالہ وقت کی ایک بہترین دینی خدمت انجام دے رہا ہے، اور ایک بہت بڑی بات پرچے کا اعتدال، اس کی میانہ روی اور اس کی غایت احتیاط ہے۔ اس کے تازہ نمبر (محرم اپریل) میں انہیں مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی ثم کراچوی کے قلم سے ایک قابل دید مقالہ دولت کی تقسیم پر نکلا ہے۔ طریق تفہیم بالکل علامہ تھانویؒ کے رنگ کا سادہ و سلیس عبارت میں بغیر مصطلحات فن سے بوجھل کئے ہوئے اسلامی معاشیات کو پانی کی طرح حل کر دیا ہے "(ص ۴)

مقالہ کا صحیح مقام تو آپ اس کے مطالعہ کے بعد ہی معلوم کر سکیں گے، لیکن اتنا عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ اس مقالہ میں تقسیم دولت کے موضوع پر بالکل اچھوتے اسلوب سے خالص فنی انداز میں گفتگو کی گئی ہے، سرمایہ داری، اشتراکیت اور اسلام کے مختصر مگر جامع تقابل کے علاوہ اس میں حرمت سود کی معاشی توجیہات اور اسلام کے فلسفہ ملکیت پر بھی فکر انگیز بحثیں آ گئی ہیں۔ امید ہے کہ انشاءاللہ یہ مقالہ علماء دین کے علاوہ معاشیات کے محققین کے لئے بھی نہایت کار آمد ثابت ہوگا، اور جو حضرات اسلامی معاشیات کو مدون کرنا چاہ رہے ہیں ان کے لیے تحقیق نظر کی نئی راہیں کھولے گا۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ یہ مقالہ زیادہ سے زیادہ ہمارے اصحاب فکر کی نگاہوں سے گذرے اور وہ پوری سنجیدگی کے ساتھ اس پر غور فرمائیں۔ امید ہے کہ آپ بھی اس کار خیر میں ہمارے ساتھ تعاون فرمائینگے، اور اس کو زیادہ سے زیادہ پھیلانے کی کوشش کریں گے۔ واللہ الموفق۔

محمد تقی عثمانی

مدیر ماہنامہ البلاغ کراچی

۲۸/ذیقعدہ ۱۳۸۷ھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمدللہ و کفی وسلام علی عبادہ الذین اصطفی

"تقسیم دولت" کی بحث معاشی زندگی کے ان اہم ترین مباحث میں سے ایک ہے جنہوں نے آج کی دنیا میں عالمگیر انقلابات کو جنم دیا ہے، اور عالمی سیاست سے لیکر ایک فرد کی نجی زندگی تک ہر شعبہ اس سے متاثر ہوا ہے، صدیوں سے اس موضوع پر زبانی، قلمی اور حربی معرکے گرم ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ "وحی الٰہی" کی رہنمائی کے بغیر نری عقل کے بل پر اس موضوع کے سلسلے میں جو کچھ کہا گیا ہے، اس نے اس الجھی ہوئی ڈور کے خم و پیچ میں کچھ اور اضافہ کر دیا ہے۔

زیر قلم مقالے میں پیش نظر یہ ہے کہ قرآن وسنت اور مفکرین اسلام کی کاوشوں سے اس معاملے میں "اسلام" کا جو نقطہ نظر سمجھ میں آتا ہے اسے واضح کیا جائے، وقت کی تنگی اور صفحات کے محدود ہونے کی وجہ سے یہ تو ممکن نہیں ہے کہ اس موضوع کو پورے بسط اور تفصیل کے ساتھ بیان کیا جائے، البتہ اس کے اہم نکات کو اختصار مگر جامعیت کے ساتھ عرض کرنے کی کوشش ہوگی۔

قرآن وسنت اور اسلامی فقہ سے "تقسیم دولت" کے بارے میں اسلام کا جو موقف احقر نے سمجھا ہے، اسے بیان کرنے سے قبل ضروری معلوم ہوتا ہے کہ کچھ بنیادی باتیں واضح کر دی جائیں جو اسلامی معاشیات کے تقریباً ہر مسئلے میں بنیادی اہمیت رکھتی ہیں، انہیں آپ "اسلامی نظریہ تقسیم دولت کے اصول" کہہ لیجئے، اس کا "فلسفہ" سمجھ لیجئے یا اس نظریے کے مقاصد قرار دیجئے، بہر حال! یہ چند وہ باتیں ہیں جو

قرآن کریم سے اصولی طور پر سمجھ میں آتی ہیں اور اسلام کے معاشی طرز فکر کو غیر اسلامی معاشیات سے ممتاز کرتی ہیں۔

ا......معاشی مسئلہ کا مقام

اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلام رہبانیت (۱) کا مخالف ہے اور انسان کی معاشی سرگرمیوں کو جائز مستحسن بلکہ بسا اوقات واجب اور ضروری قرار دیتا ہے، انسان کی معاشی ترقی اسکی نگاہ میں پسندیدہ ہے اور ''کسب حلال'' اسکے نزدیک ''فریضۃ (۲) بعد فریضۃ'' کا مقام رکھتا ہے، لیکن ان تمام باتوں کے ساتھ یہ حقیقت بھی اتنی ہی واضح ہے، کہ اسلام کی نظر میں انسان کا بنیادی مسئلہ ''معاش'' نہیں اور نہ ''معاشی ترقی'' اس کے نزدیک انسان کا مقصد زندگی ہے۔

معمولی سوجھ بوجھ سے یہ حقیقت سمجھ میں آسکتی ہے کہ کسی کام کا جائز، مستحسن یا ضروری ہونا ایک الگ بات ہوتی ہے اور اس کا مقصد زندگی اور محو فکر وعمل ہونا بالکل جدا چیز اسلام کے معاشی مسائل پر بحث کرتے وقت بہت سی الجھنیں اور غلط فہمیاں انہی دو چیزوں کو خلط ملط کرنے سے پیدا ہوتی ہیں۔ اس لئے پہلے ہی قدم پر اس بات کا صاف ہوجانا ضروری ہے، درحقیقت اسلامی معاشیات اور مادی معاشیات کے درمیان ایک گہرا بنیادی اور دوررس فرق یہی ہے کہ مادی معاشیات میں ''معاش'' انسان کا بنیادی مسئلہ اور معاشی ترقیات اس کی زندگی کا منتہائے مقصود ہیں، اور اسلامی معاشیات میں یہ چیزیں ضروری اور ناگزیر سہی، لیکن انسان کی زندگی کا اصل

---

(۱) اسباب معاش کو بالکل ترک کرکے عبادت میں لگ جانا۔

(۲) دوسرے درجے کا فرض۔

مقصد نہیں ہیں۔

اس لئے جہاں ہمیں قرآن کریم میں ''رہبانیت'' کی مذمت اور ''وابتغوا من فضل الله'' (۱) کے احکام ملتے ہیں، جہاں ہمیں تجارت کیلئے ''فضل الله'' اموال کے لئے ''خیر'' اور ''التی جعل الله لکم قیاما'' (۲) خورک کے لئے الطیبات من الرزق'' لباس کے لئے'' زینة الله'' اور رہائش کے لئے'' سکن'' (۳) کے احترامی القاب ملتے ہیں، وہاں دنیوی زندگی کے لئے'' متاع الغرور'' (۴) کے الفاظ بھی نظر آتے ہیں۔ان سب چیزوں کے لئے'' الدنیا'' کا لفظ ملتا ہے جو اپنے لغوی مفہوم کے اعتبار سے کچھ اچھا تاثر نہیں دیتا ہے اور قرآن کریم کے مجموعی اسلوب سے بھی اس کی حقارت سمجھ میں آتی ہے۔

کوتاہ نظری اس موقعہ پر تضاد کا شبہ پیدا کرسکتی ہے، لیکن درحقیقت اس کے پیچھے اصل راز یہی ہے کہ قرآن کریم کی نظر میں تمام وسائل معاش انسان کی رہگذر کے مرحلے ہیں۔اس کی اصل منزل درحقیقت ان سے آگے ہے اور وہ ہے کردار کی بلندی اور اس کے نتیجے میں آخرت کی بہبود، انسان کا اصل مسئلہ اور اس کی زندگی کا بنیادی مقصد انہی دومنزلوں کی تحصیل ہے لیکن چونکہ ان دومنزلوں کو دنیا کی شاہراہ سے گذرے بغیر حاصل نہیں کیا جاسکتا، اس لئے وہ تمام چیزیں بھی انسان کے لئے ضروری ہو جاتی ہیں۔جواس کی دنیوی زندگی کے لئے ضروری ہیں، چنانچہ جب تک وسائل معاش انسان کی اصلی منزل کیلئے رہگذر کا کام دیں، وہ'' فضل الله''،'' خیر'' ''زینة الله'' اور'' سکن'' ہیں، لیکن جہاں انسان اسی رہگذر کی بھول بھلیوں میں

(۱) اللہ کا رزق تلاش کرو۔ ۱۲ (۶۲:۱۰) (۲) مال کو اللہ نے تمہاری بقاء کا ذریعہ بنایا ہے۔ ۱۲ (۴:۳)
(۳) سکون واطمینان کی جگہ ۱۲ (۱۶:۸۰) (۴) دھوکے کا سامان۔ ۱۲ (۳:۸۵)

الجھ کر رہ جائے اور اس پر اپنی اصل منزل مقصود کو قربان کر ڈالے یا با الفاظ دیگر وسائل معاش کو ''رہ گذر'' بنانے کے بجائے اپنی منزل مقصود کے راستے میں رکاوٹ بنا دے تو پھر یہی وسائل معاش ''متاع الغرور''، ''فتنة'' اور ''عَدُوّ'' بن جاتے ہیں۔

قرآن کریم نے ایک مختصر جملے میں وابتغ فیما اتاک اللہ الدار الآخرۃ میں اسی بنیادی حقیقت کو بیان فرمایا ہے، اس کے علاوہ اس مضمون کی بہت سی آیات ہیں، اہل علم کے سامنے تمام آیات کو ذکر کرنے کی ضرورت نہیں، احقر کی رائے میں ''انسانی معاش'' کے متعلق قرآن کریم کی یہ روش اور اس کے مختلف پہلو نظر میں رہیں تو اسلامی معاشیات کے بہت سے مسائل حل کرنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔

۲......دولت اور ملکیت کی حقیقت

دوسری بنیادی بات جو خاص طور سے ''تقسیم دولت'' کے مسئلے میں بڑی اہمیت رکھتی ہے، یہ ہے کہ قرآن کریم کی تصریح کے مطابق ''دولت'' خواہ کسی شکل میں ہو، اللہ کی پیدا کردہ اور اصلاً اسی کی ملکیت ہے، انسان کو کسی چیز پر ملکیت کا جو حق حاصل ہوتا ہے وہ اللہ ہی کی عطا سے ہوتا ہے۔ سورہ نور میں قرآن کریم کا ارشاد ہے۔

وَاٰتُوھُمْ مِّنْ مَّالِ اللّٰہِ الَّذِیْ اٰتٰکُمْ (۱۸ : ۳۳)

''اور انہیں اللہ کے اس مال میں سے دو جو اس نے تم کو عطا کیا ہے''

اس کی وجہ بھی قرآن کریم نے ایک دوسری جگہ بتلا دی ہے کہ انسان زیادہ سے زیادہ یہی تو کر سکتا ہے کہ عمل پیدائش میں اپنی کوشش صرف کرے، لیکن اس کوشش کو بارآور کرنا، اور اس سے پیداوار کا مہیا کرنا خدا کے سوا کون کر سکتا ہے؟ انسان کے بس میں اتنا ہی تو ہے کہ وہ زمین میں بیج ڈال دے، لیکن اس بیج کو کونپل، اور کونپل کو

درخت بنانا تو کسی اور ہی کا کام ہے، ارشاد ہے:

اَفَرَأَیْتُمْ مَّا تَحْرُثُوْنَ ءَ اَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَهٗ اَمْ نَحْنُ الزّٰرِعُوْنَ
(۶۳:۲۷)

"دیکھو تو جو کچھ تم کاشت کرتے ہو، کیا تم اسے اگاتے ہو یا ہم ہیں اگانے والے"۔

اور سورہ یسٰین میں ہے:۔

لِیَاْکُلُوْا مِنْ ثَمَرِهٖ وَمَا عَمِلَتْهُ اَیْدِیْهِمْ اَفَلَا یَشْکُرُوْنَ

"یعنی ہم نے زمین میں چشمے جاری کئے تاکہ وہ درختوں کے پھل کھائیں، حالانکہ یہ پھل ان کے ہاتھوں نے نہیں بنائے سو کیا وہ شکر نہیں کرتے"۔ (۳۵:۲۳)

نیز ارشاد ہے:

اَوَلَمْ یَرَوْا اَنَّا خَلَقْنَا لَهُمْ مِّمَّا عَمِلَتْ اَیْدِیْنَآ اَنْعَامًا فَهُمْ لَهَا مٰلِکُوْنَ (۲۳: ۷۱)

"کیا ان لوگوں نے اس پر نظر نہیں کی کہ ہم نے ان کے لئے جانوروں کو اپنے ہاتھ سے بنا کر پیدا کیا، پھر یہی لوگ ان کے مالک بن رہے ہیں"۔

یہ تمام آیات اس بنیادی نکتے پر وضاحت کے ساتھ روشنی ڈالتی ہیں کہ دولت خواہ کسی شکل میں ہو، اصلاً اللہ کی پیدا کردہ اور اسی کی ملکیت ہے، اور یہ بھی کہ اللہ تعالیٰ جس کو عطا کردیتے ہیں وہ اس کا مالک بن جاتا ہے۔ اور آخری آیت میں جہاں یہ بتلایا گیا ہے کہ ہر چیز کا اصل خالق اور مالک اللہ تعالیٰ ہے وہیں "ھم لھا مالکون" فرما کر بعطاء حق تعالیٰ انسان کی انفرادی ملکیت کو بھی واضح طور پر قائم کردیا ہے۔ پھر

اسلام کی نظر میں چونکہ ''دولت'' پر اصل ملکیت اللہ کی ہے، اور اسی نے انسان کو اس میں تصرف کرنے کا حق عطا کیا ہے، اس لئے اسی کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اس دولت پر انسان کے تصرفات کو اپنی مرضی اور اپنے مصالح کا پابند بنائے۔ چنانچہ انسان کو اپنی زیر تصرف اشیاء پر ''ملکیت'' تو حاصل ہے مگر یہ ملکیت آزاد، خود مختار اور بے لگام نہیں ہے، اس پر ''دولت'' کے اصل مالک کی طرف سے کچھ حدود و قیود اور پابندیاں عائد ہیں جس جگہ وہ اس دولت کو خرچ کرنے کا حکم دیدے، وہاں اس کے لئے خرچ کرنا ضروری ہے، اور جہاں خرچ کی ممانعت کردے، وہاں رک جانا لازم ہے، اسی بات کو سورہ قصص میں زیادہ وضاحت کے ساتھ کھول دیا گیا ہے۔

وَابْتَغِ فِيمَا اٰتَاكَ اللّٰهُ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ وَلَاتَنْسَ نَصِيبَكَ مِنَ الدنيا وَاَحْسِنْ كَمَا اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَيْكَ وَلَاتَبْغِ الْفَسَادَ فِي الْاَرْضِ۔

''جو تجھ کو اللہ نے دیا ہے اس سے پچھلا گھر (آخرت کا توشہ) کمالے اور دنیا سے اپنا حصہ نہ بھول اور بھلائی کر جیسے اللہ نے تجھ سے بھلائی کی اور ملک میں خرابی ڈالنی مت چاہ''۔ (۲۰:۷۷)

اس آیت نے اسلام کے فلسفہ ملکیت کو خوب کھول کر بیان فرمادیا ہے، اس سے مندرجہ ذیل ہدایات واضح طور پر سامنے آتی ہیں۔

(۱) انسان کے پاس جو کچھ دولت ہے، وہ اللہ کی دی ہوئی ہے۔ (اتاک اللہ)

(۲) انسان کو اس کا استعمال اس طرح کرنا ہے کہ اس کی منزل مقصود دار آخرت ہو۔ (وابتغ الدار الآخرۃ)

(۳) چونکہ دولت اللہ کی دی ہوئی ہے، لہٰذا اس پر انسان کا تصرف حکم خداوندی کے تابع ہوگا، اب حکم خداوندی کی دو شکلیں ہیں، ایک یہ کہ وہ انسان کو اس بات کا حکم

دے کہ مال کا کوئی حصہ کسی دوسرے کو دیدو، اس کی تعمیل اس لئے ضروری ہے کہ اللہ نے تم پر احسان کیا ہے، تو وہ تمہیں دوسرے پر احسان کا حکم دے سکتا ہے۔ (وأحسن كما أحسن الله إليك)

(۴) دوسری شکل یہ ہے کہ وہ تم کو اس دولت کے تصرف سے منع کرے اور اس کا بھی اس کو اختیار ہے کیونکہ تمہیں دولت کے کسی ایسے استعمال کی اجازت نہیں دے سکتا جس سے اجتماعی خرابیاں پیدا ہوں اور زمین میں شر و فساد پھیلے (ولا تبغ الفساد في الأرض)

یہی وہ چیز ہے جو اسلام کو سرمایہ داری اور اشتراکیت دونوں کے نظریہ ملکیت سے ممتاز کرتی ہے۔ سرمایہ داری کا ذہنی پس منظر جو چونکہ نظری یا عملی طور پر مادیت ہے اس لئے اس کے نزدیک انسان کو اپنی دولت پر آزاد اور خود مختار ملکیت حاصل ہے وہ اس کو جس طرح چاہے صرف کر سکتا ہے، لیکن قرآن کریم نے قوم شعیب علیہ السلام کا ایک مقولہ نقل فرماتے ہوئے اس نظریئے کو مذمت کے پیرائے میں ذکر کیا ہے، وہ لوگ کہا کرتے تھے۔

اَصَلٰوتُكَ تَاْمُرُكَ اَنْ نَّتْرُكَ مَا يَعْبُدُ اٰبَاؤُنَآ اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ فِيْٓ اَمْوَالِنَا مَانَشٰٓؤُا (۱۲ : ۸۶)

”کیا تمہاری نماز تمہیں اس بات کا حکم دیتی ہے کہ ہم اپنے باپ دادوں کے معبودوں کو چھوڑ دیں، یا اپنے اموال میں اپنی مرضی کے مطابق تصرف کرنا ترک کر دیں؟“

وہ لوگ چونکہ ”اموال“ کو حقیقۃً ”اپنا“ (أموالنا) سمجھتے تھے، اس لئے ” نفعل مانشاء “ جو چاہیں کریں کا دعویٰ اس کا لازمی نتیجہ تھا، یہی فکر سرمایہ داری کی روح ہے اور قرآن کریم نے سورہ نور میں اپنے اموال ”اموالنا“ کے لفظ کو مال الله (اللہ کا

مال) سے بدل کر سرمایہ دارانہ فکر کی اسی بنیاد پر ضرب لگائی ہے مگر اس کے ساتھ ہی "الذی اتاکم" "جو تمہیں دیا ہے" کی قید لگا کر اشتراکیت کی بھی جڑ کاٹ دی ہے جو سرے سے انسان کی انفرادی ملکیت ہی کا انکار کرتی ہے۔

اب اسلام، سرمایہ داری اور اشتراکیت کے درمیان واضح خط امتیاز اس طرح کھینچا جا سکتا ہے۔ کہ

سرمایہ داری...... آزاد اور خود انفرادی ملکیت کی قائل ہے

اشتراکیت...... انفرادی ملکیت کا سرے سے انکار کرتی ہے اور حق ان دو انتہاؤں کے درمیان ہے، یعنی

اسلام...... انفرادی ملکیت کو تسلیم کرتا ہے، مگر یہ ملکیت آزاد اور خود مختار نہیں۔ جس سے "فساد فی الارض" پھیل سکے۔

۳...... تقسیم دولت کے اسلامی مقاصد

اسلام نے تقسیم دولت کا جو نظام مقرر کیا ہے، اور جس کا خاکہ انشاء اللہ آگے پیش کیا جائے گا، قرآن کریم پر غور کرنے سے اس کے تین مقاصد معلوم ہوتے ہیں۔

الف...... ایک قابل عمل نظم معیشت کا قیام

تقسیم دولت کا سب سے پہلا مقصد یہ ہے کہ اسکے ذریعہ دنیا میں معیشت کا ایک ایسا نظام نافذ کیا جائے جو فطری اور قابل عمل ہو، اور جس میں ہر انسان جبر وتشدد کے بجائے قدرتی طور پر اپنی لیاقت اپنی استعداد اپنے اختیار اور اپنی پسند کے مطابق خدمات انجام دے تاکہ، اس کی خدمت زیادہ مؤثر، مفید اور صحت مند ہوں، اور یہ بات مستاجر" (جسے مروجہ معاشی اصطلاح میں آجر کہا جاتا ہے) اور "اجیر" کے صحت

مندر شتے اور ''رسد'' و ''طلب'' کی فطری قوتوں کے صحیح استعمال (۱) کے بغیر ممکن نہیں ہے، اس لئے اسلام نے انہیں تسلیم کیا ہے۔

اسی بات کی طرف مندرجہ ذیل آیت میں جامع اشارہ فرمایا گیا ہے۔

نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَّعِيشَتَهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضاً سُخْرِيّاً

''ہم نے ان کے درمیان ان کی معیشت کو دنیوی زندگی میں تقسیم کیا ہے اور ان میں سے بعض کو بعض پر درجات کے اعتبار سے فوقیت دی ہے تا کہ ان میں سے ایک دوسرے سے کام لے سکے''۔(۳۲:۲۵)

ب......حق کا حقدار کو پہنچانا

اسلام کے نظام تقسیم دولت کا دوسرا مقصد حق کا حقدار کو پہنچانا ہے۔لیکن اسلام میں استحقاق کا معیار دوسرے نظام ہائے معیشت سے قدرے مختلف ہے، مادی معاشیات میں دولت کے استحقاق کا صرف ایک راستہ ہوتا ہے، اور وہ ہے عمل پیدائش میں شرکت، جتنے عوامل دولت کی پیداوار میں شریک ہوتے ہیں انہی کو دولت کا مستحق سمجھا جاتا ہے، اور بس! اس کے برخلاف اسلام کا بنیادی اصول چونکہ یہ ہے کہ دولت اصلاً اللہ کی ملکیت ہے اور وہی اس کے استعمال کے قوانین مقرر فرماتا ہے، اس لئے اسلام میں دولت کے حقدار صرف عاملین پیدائش ہی نہیں ہوتے بلکہ ہر وہ شخص بھی دولت کا مستحق ہے جس تک کا پہنچانا اللہ نے ضروری قرار دیا ہے لہذا افقراء ومساکین اور معاشرے کے نادار اور بیکس افراد بھی دولت کے حقدار ہیں اسلئے کہ جن عوامل

(۱) صحیح استعمال کی قید اس لئے لگائی گئی ہے کہ ان قوتوں کا غلط استعمال بھی ممکن ہے اور سرمایہ داری میں ہوتا رہا ہے، اسلام نے انفرادی ملکیت کی بے لگامی کو ختم کر کے اسی غلط استعمال کی بیخ کنی کی ہے۔

پیدائش پر اولاً دولت تقسیم ہوتی ہے، ان کے ذمے اللہ نے لازم کیا ہے کہ وہ ان تک اپنی دولت کا کچھ حصہ پہنچائیں اور قرآنی تصریحات کے مطابق یہ مفلسوں اور ناداروں پر کوئی احسان نہیں ہے، بلکہ وہ فی الواقعہ دولت کے مستحق ہیں، ارشاد ہے

فی اُموالھم حَقٌّ مَعلوم للسائل وَالحرُوم

''اوران کے اموال میں سائل اور محروم کا ایک معین حق ہے'' (۷۰:۲۴)

اس حق کو بعض مقامات پر اللہ کا حق قرار دیا گیا ہے کھیتوں کے بارے میں فرمایا جاتا ہے۔

وَاٰ توُاحَقَّهٗ یَوۡمَ حَصَادِهٖ (۸ : ۱۴۱)

''اوراس (کھیتی) کے کٹنے کے دن اس کا حق ادا کرو''۔

ان دونوں آیتوں میں ''حق'' کا لفظ ظاہر کر رہا ہے کہ استحقاق دولت کا مآخذ صرف عمل پیدائش ہی نہیں ہے بلکہ مفلس و نادار افراد بھی دولت کے ٹھیک اس طرح مستحق ہیں جس طرح اس کے اولین مالک۔

لہذا اسلام دولت کو اس طرح تقسیم کرنا چاہتا ہے کہ اس سے تمام عوامل پیدائش کو ان کے عمل کا حصہ بھی پہنچ جائے اور اس کے بعد ان لوگوں کو بھی ان کا حصہ مل جائے جنہیں اللہ نے مستحق دولت قرار دیا ہے، (ان دونوں قسم کے حقداروں کی تفصیل آگے آرہی ہے)۔

ج......ارتکاز دولت کی بیخ کنی

تقسیم دولت کا تیسرا مقصد جس کو اسلام نے بہت اہمیت دی ہے یہ ہے کہ دولت کا ذخیرہ چند ہاتھوں میں سمٹنے کے بجائے معاشرے میں زیادہ سے زیادہ وسیع پیمانے پر گردش کرے اور اس طرح امیر وغریب کا تفاوت جس حد تک فطری اور قابل عمل ہو کم کیا جائے اس سلسلے میں اسلام کا طرز عمل یہ ہے کہ دولت کے جو اولین مآخذ

اور دہانے ہیں ان پر اس نے کسی فرد یا جماعت کا پہرہ نہیں بیٹھنے دیا، بلکہ معاشرے کے ہر فرد کو ان سے استفادے کا مساوی حق دیا ہے کانیں، جنگل، غیر مملوک بنجر زمینیں، جنگل اور پانی کا شکار، خودرو گھاس، دریا اور سمندر، مال غنیمت وغیرہ یہ تمام پیدائش دولت کے اولین مأخذ ہیں، اوران میں ہر فرد کو یہ اختیار دیا گیا ہے کہ وہ ان سے اپنے کسب وعمل کے مطابق فائدہ اٹھائے اور اس پر کسی کی اجارہ داری قائم نہیں۔

كَيْلَا يَكُوْنَ دُوْلَةً بَيْنَ الْاَغْنِيَآءِ مِنْكُمْ (۱) (۲۸ : ۷)

" تاکہ (یہ دولت) تم میں سے (صرف) مالداروں کے درمیان دائر ہو کر نہ رہ جائے "

اس کے بعد جہاں انسانی عمل کی ضرورت پیش آتی ہے، اور کوئی شخص اپنے کسب وعمل سے کوئی دولت حاصل کرتا ہے تو وہاں اس کے کسب وعمل کا احترام کر کے اس کی ملکیت کو تسلیم کیا گیا ہے، اور اس میں ہر ایک کو اس کے کسب وعمل کے مطابق حصہ دیا گیا ہے، اور اس معاملے میں ارشاد یہ ہے کہ۔

نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَعِيْشَتَهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُخْرِيًّا

" ہم نے ان کے درمیان ان کی معیشت کو دنیوی زندگی میں تقسیم کیا ہے اور ان میں سے بعض کو بعض پر درجات کے اعتبار سے فوقیت دی ہے تاکہ ان میں سے ایک دوسرے سے کام لے سکے"۔ (۴۳ : ۳۲)

---

(۱) واضح رہے کہ یہ آیت مال غنیمت کے بارے میں نازل ہوئی ہے کہ وہ بھی حصول دولت کے اولین مآخذ میں سے ہے۔

لیکن درجات کے اس فرق کے باوجود کچھ ایسے احکام دیدیئے گئے ہیں کہ یہ فرق اسی قدر رہے جتنا ایک قابل عمل نظم معیشت کے قیام کے لئے ضروری ہے، ایسا نہ ہو کہ دولت کا ذخیرہ صرف چند ہاتھوں میں سمٹا رہے۔

تقسیم دولت کے ان تین مقاصد میں سے پہلا مقصد اسلامی معیشت کو اشتراکیت سے ممتاز کرتا ہے، تیسرا مقصد سرمایہ دارانہ نظام سے دوسرا دونوں سے جس کی تفصیل عنقریب عرض کی جائے گی۔

تقسیم دولت کا اسلامی نظام

اسلامی نظم معیشت کے ان چند بنیادی اصولوں کی طرف اشارہ کرنے کے بعد اب مختصراً ''تقسیم دولت'' کا وہ نظام بیان کرنے کی کوشش کرتا ہوں جو قرآن وسنت اور فقہاء امت کی کاوشوں سے سمجھ میں آتا ہے لیکن اس کی پوری طرح سمجھنے کے لئے اس کے بالمقابل دوسرے نظاموں اور نظریوں کا سامنے رکھنا بھی ضروری ہے، جس کی تشریح یہ ہے۔

تقسیم دولت کا سرمایہ دارانہ نظریہ

سرمایہ دارانہ نظم معیشت میں ''تقسیم دولت'' کا جو نظام مقرر کیا گیا ہے پہلے اس پر ایک نظر ڈال لینا مناسب ہوگا، مختصر لفظوں میں اس نظریئے کو اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے کہ دولت انہی لوگوں پر تقسیم ہونی چاہیے جنہوں نے اس کی پیداوار میں حصہ لیا ہے، اور جنہیں معاشی اصطلاح کے مطابق ''عاملین پیداوار'' کہا جاتا ہے۔ سرمایہ دارانہ معاشیات میں یہ کل چار عوامل ہیں۔

(۱) سرمایہ: جن کی تعریف ''پیدا کردہ ذریعہ پیدائش'' سے کی گئی ہے یعنی وہ شے

جس پر ایک مرتبہ انسانی عمل پیدائش ہو چکا ہو، اور اسے ایک دوسرے عمل پیدائش کیلئے ذریعہ بنایا جارہا ہو۔

(۲) محنت : یعنی انسانی عمل

(۳) زمین : جس کی تعریف ''قدرتی وسائل'' سے کی گئی ہے، یعنی وہ اشیاء جو انسان کے کسی سابقہ عمل پیدائش کے بغیر پیدائش کا وسیلہ بن رہی ہوں۔

(۴) آجر یا تنظیم : یعنی وہ چوتھا عامل جو مذکورہ بالا تینوں عوامل کو جوڑ کر انہیں کام میں لگاتا ہے اور نفع ونقصان کا خطرہ مول لیتا ہے۔

سرمایہ دارانہ نظم معیشت میں ان چار عاملین پیداوار کے مشترکہ عمل سے جو پیداوار ہوتی ہے، اس کو انہی چاروں پر اس طرح تقسیم کیا جاتا ہے کہ ایک حصہ سرمایہ کو سود کی شکل میں دیا جاتا ہے، دوسرا حصہ محنت کو اجرت کی شکل میں دیا جاتا ہے، تیسرا حصہ زمین کو لگان یا کرایہ کی صورت میں ملتا ہے اور چوتھا حصہ آجر کے لئے منافع کی صورت میں باقی رکھا جاتا ہے۔

تقسیم دولت کا اشتراکی نظریہ

اس کے برخلاف اشتراکی معیشت میں چونکہ سرمایہ اور زمین کسی کی انفرادی ملکیت ہونے کے بجائے قومی ملکیت ہوتے ہیں، اس لئے سود اور لگان کا اس نظام کے فلسفے میں سوال ہی پیدا نہیں ہوتا(۱) آجر بھی اشتراکی نظام میں کوئی فرد واحد ہونے کے بجائے خود حکومت ہوتی ہے۔ اس لئے منافع بھی اس کے یہاں نظری طور پر خارج از بحث ہے، اب صرف ''محنت'' رہ جاتی ہے، اور اشتراکی نظام میں دولت کی

(۱) یہاں یہ واضح رہے کہ اس وقت گفتگو اشتراکیت کے اصل فلسفے سے ہورہی ہے، اس کے موجودہ عمل سے نہیں اشتراکی ممالک کا موجودہ طرز عمل اس فلسفے سے بہت مختلف ہے۔

وہی مستحق ہے جو اسے ''اجرت'' کی شکل میں ملتی ہے۔

تقسیم دولت کا اسلامی نظریہ

اسلام کا نظام تقسیم دولت ان دونوں سے مختلف ہے اسکے نزدیک دولت کے مستحقین دو قسم کے ہیں ایک اولین مستحق، یعنی وہ لوگ جو کسی عمل پیدائش کے بعد بلاواسطہ اس کے مستحق ہوتے ہیں، یہ مستحقین وہی عوامل پیداوار ہیں جنہوں نے کسی پیداوار کے عمل پیدائش میں حصہ لیا، دوسرے ثانوی مستحقین یعنی وہ لوگ جو براہ راست عمل پیدائش میں شریک نہیں تھے لیکن عاملین پیدائش کے ذمے لازم کیا گیا ہے کہ وہ اپنی دولت میں ان کو بھی شریک کریں یہاں مستحقین دولت کی ان دونوں قسموں کو ہم قدرے تفصیل سے بیان کرتے ہیں۔

دولت کے اولین مستحق

جیسا کہ عرض کیا گیا، دولت کے اولین مستحق عوامل پیداوار ہوتے ہیں لیکن عوامل پیداوار کی تعیین ان کی اصطلاحات اور ان پر تقسیم دولت کے طریقے اسلام میں بعینہ وہ نہیں ہیں جو سرمایہ دارانہ نظم معیشت میں مقرر کئے گئے ہیں بلکہ بہت مختلف ہیں، اسلامی نظریئے کے مطابق پیدائش کے حقیقی عوامل چار کے بجائے تین ہیں۔

(۱) سرمایہ: یعنی وہ وسائل پیداوار جن کا عمل پیدائش میں استعمال کرنا اس وقت تک ممکن نہیں جب خرچ نہ کیا جائے اور اسی لے ان کا کرایہ پر چلانا ممکن نہیں ہے۔ مثلاً نقد روپیہ یا اشیائے خوردنی وغیرہ۔

(۲) زمین: یعنی وہ وسائل پیداوار جن کا عمل پیدائش میں اس طرح استعمال کیا جاتا ہے کہ ان کی اصل شکل وصورت برقرار رہتی ہے، اور اسی لئے انہیں کرایہ پر دیا جاسکتا ہے، مثلاً زمین

،مکان، مشینری وغیرہ

(۳) محنت: یعنی انسانی فعل خواہ وہ اعضاء وجوارح کا ہو، یا ذہن اور قلب کا لہذا اس میں تنظیم اور منصوبہ بندی بھی داخل ہے۔

ان تین عوامل کے مشترکہ عمل سے جو پیداوار ہوگی وہ اولاً انہی تینوں پر اس طرح تقسیم کی جائے گی کہ اس کا ایک حصہ سرمایہ کو بہ شکل منافع (نہ کہ بہ شکل سود) ملے گا دوسرا حصہ زمین کو بہ شکل کرایہ دیا جائے گا، اور تیسرا حصہ محنت کو بہ شکل اجرت ملے گا، جس میں جسمانی محنت اور تنظیم ومنصوبہ بندی کی ذہنی اور فکری محنت سب داخل ہیں۔

اشتراکیت اور اسلام

تقسیم دولت کا یہ نظام اشتراکیت سے بھی مختلف ہے اور سرمایہ داری سے بھی، اشتراکیت سے تو اس کا فرق بالکل ظاہر ہے کہ اشتراکیت میں چونکہ انفرادی ملکیت کا کوئی تصور ہی نہیں ہے، اسلئے اس میں تقسیم دولت صرف اجرت کی شکل میں ہوتی ہے اسکے برخلاف اسلامی نظریہ دولت کے جو اصول ہم نے شروع میں بیان کئے ہیں انکی روشنی میں کائنات کی تمام اشیاء اصلاً اللہ تعالیٰ کی ملکیت ہیں پھر ان اشیاء میں سے ایک کثیر حصہ تو وہ ہے جسے اس نے وقف عام کے طور پر تمام انسانوں کو مساوی طور پر دے دیا ہے آگ، پانی، مٹی، ہوا، روشنی، خودرو گھاس جنگل اور پانی کا شکار معاون اور غیر مملوک بنجر زمین وغیرہ اسی قسم میں داخل ہیں جن پر کسی کی انفرادی ملکیت نہیں، بلکہ وہ وقف عام ہیں۔ ہر انسان ان سے فائدہ اٹھا سکتا ہے اور ان کا مساوی طور پر حقدار رہے۔

دوسری طرف بعض اشیاء وہ ہیں جن میں انفرادی ملکیت کو تسلیم کئے بغیر وہ قابل عمل اور فطری نظم معیشت قائم نہیں ہوسکتا جس کی طرف ہم نے تقسیم دولت کے پہلے مقصد میں اشارہ کیا ہے اشتراکی نظام کو اختیار کرتے ہوئے تمام سرمایہ اور زمین کو

کلیۃً حکومت کے حوالے کردینے کا نتیجہ مآل کار اسکے سوا کچھ نہیں ہوتا کہ چھوٹے چھوٹے بے شمار سرمایہ داروں کو ختم کر کے ملکی دولت کے عظیم الشان ذخیرے کو ایک بڑے سرمایہ دار کے حوالہ کرنا پڑتا ہے جو من مانے طریقے پر دولت کے اس تالاب سے کھیلتا ہے اور اسطرح اشتراکیت کا نتیجہ بدترین ارتکاز دولت کی صورت میں سامنے آتا ہے اس کے علاوہ اس سے دوسری بڑی خرابی یہ پیدا ہوتی ہے کہ انسانی محنت چونکہ اپنے اختیار اور مرضی کے فطری حق سے محروم ہو جاتی ہے اسلئے اس کے استعمال کے لئے جبر وتشدد ناگزیر ہے جس کا برا اثر محنت کی کارکردگی پر بھی پڑتا ہے اور اس کی ذہنی صحت پر بھی اس سے واضح ہو گیا کہ اشتراکی نظام میں اسلامی نظریہ تقسیم دولت کے دو مقاصد مجروح ہوتے ہیں ایک فطری نظم معیشت کا قیام اور دوسرے حقدار کو حق پہنچانا۔

غرض اشتراکیت کے غیر فطری نظام کی ان چند در چند خرابیوں کی وجہ سے اسلام نے انفرادی ملکیت کو سرے سے ختم کرڈالنا پسند نہیں کیا، بلکہ کائنات کی جو اشیاء وقف عام نہیں ہیں ان میں انفرادی ملکیت کو تسلیم کر کے اس نے سرمایہ اور زمین کی جداگانہ حیثیت بھی برقرار رکھی ہے اور ان میں رسد وطلب کے فطری نظام کو بھی صحت مند بنا کر استعمال کیا ہے۔ چنانچہ اسکے یہاں اشتراکیت کی طرح تقسیم دولت صرف اجرت کی شکل میں نہیں ہوتی بلکہ منافع اور کرایہ کی صورت میں بھی ہوتی ہے لیکن ساتھ ہی اس نے ''سود'' کی مد کو ختم کر کے اور دولت کے ثانوی مستحقین کی ایک طویل فہرست بنا کر ارتکاز دولت کی اس زبردست خرابی کو بھی ختم کر دیا ہے۔ جو سرمایہ داری کا خاصہ لازمہ ہے اور جسے دور کرنے کا دعویٰ اشتراکیت کرتی ہے۔

سرمایہ داری اور اسلام

یہ تھا اسلامی نظریہ تقسیم دولت کا وہ بنیادی فرق جو اسے اشتراکیت سے ممتاز کر

تا ہے، اس کے ساتھ ہی اس فرق کو بھی اچھی طرح سمجھنے کی ضرورت ہے جو سرمایہ داری اور اسلام کے نظام تقسیم دولت میں پایا جاتا ہے یہ فرق چونکہ قدرے دقیق اور پیچیدہ ہے اس لئے اسے نسبۃً زیادہ تفصیل سے بیان کرنے کی ضرورت ہوگی۔

اوپر ہم نے اسلام اور سرمایہ داری کے نظام تقسیم دولت کے جو اجمالی خاکے پیش کئے ہیں انکا تقابل کرنے سے اسلام اور سرمایہ داری کے درمیان مندرجہ ذیل فرق واضح ہوتے ہیں۔

(۱) عوامل پیداوار کی فہرست سے آجر کو مستقل عامل ہونے کی حیثیت سے ختم کر دیا گیا ہے اور صرف تین عوامل پیداوار تسلیم کئے گئے ہیں۔ لیکن اس کے معنی یہ نہیں کہ آجر کے وجود سے انکار کیا گیا ہے بلکہ مقصد یہ ہے کہ وہ کوئی الگ عامل نہیں، بلکہ ان تین عوامل میں سے کسی نہ کسی میں شامل ہے۔

(۲) سرمایہ کا صلہ ''سود'' کے بجائے ''منافع'' قرار دیا گیا۔

(۳) عوامل پیدائش کی تعریفیں بدل دی گئی ہیں ''سرمایہ'' کی تعریف سرمایہ دارانہ معیشت میں پیدا شدہ ذریعہ پیدائش'' سے کی جاتی ہے لہذا نقد روپیہ اور اشیائے خوردنی کے علاوہ مشینری وغیرہ بھی اس میں داخل ہے، لیکن ہم نے اسلامی نظریہ تقسیم دولت کی توضیح کرتے ہوئے'' سرمایہ'' کی جو تعریف بیان کی ہے اس میں صرف وہ چیزیں شامل ہیں جنہیں خرچ کئے بغیر ان سے استفادہ ممکن نہیں، یا بالفاظ دیگر جنہیں کرایہ پر نہیں چلایا جا سکتا، مثلاً روپیہ لہذا مشینری اس تعریف کی رو سے ''سرمایہ'' میں داخل نہیں۔

(۴) اسی طرح ''زمین'' کی تعریف زیادہ عام کر دی گئی ہے، یعنی اس میں ان تمام چیزوں کو شامل کر لیا گیا ہے جن سے استفادہ کے لئے انہیں خرچ کرنا نہیں پڑتا لہذا مشینری بھی اس میں داخل ہوگئی ہے۔

(۵) محنت کی تعریف میں بھی زیادہ عموم پیدا کر دیا گیا ہے، اور اس میں ذہنی محنت، تنظیم اور منصوبہ بندی بھی شامل ہوگئی ہے۔

آجر سرمایہ اور محنت سے الگ نہیں

اسلام کے نظریہ تقسیم دولت کے مذکورہ بالا امتیازات میں سب سے بڑا اور بنیادی امتیاز یہ ہے کہ اس نے آجر اور سرمایہ کی تفریق ختم کر دی ہے، جس کے نتیجے میں تقسیم دولت کے تین مد قرار پائے ہیں، منافع، اجرت اور کرایہ، چوتھے مد یعنی سود کو ناجائز قرار دیدیا گیا ہے۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ سرمایہ دارانہ معیشت میں ''آجر'' کی سب سے بڑی خصوصیت جس کی بناپر اسے ''منافع'' کا مستحق قرار دیا گیا ہے، یہ بتلائی جاتی ہے کہ وہ کاروبار کے نفع ونقصان کا خطرہ برداشت کرتا ہے، گویا سرمایہ دارانہ نقطہ نظر سے ''منافع'' اس کی اس ہمت کا صلہ ہے کہ اس نے ایک ایسی کاروباری مہم کا آغاز کیا جس میں اگر نقصان ہو جائے تو وہ تن تنہا اسی پر پڑے گا، باقی تینوں عوامل پیداوار میں سے سرمایہ کو معین سود، زمین کو معین لگان اور محنت کو معین اجرت مل جاتی ہے، اس لئے وہ نقصان سے بری ہیں۔

اسلام کا نقطہ نظر یہ ہے کہ درحقیقت ''نقصان کا خطرہ مول لینے'' کی یہ صفت خود سرمایہ میں موجود ہونی چاہیے، اس خطرے کا بار کسی اور پر نہیں ڈالا جاسکتا ہے جو شخص کسی کاروبار میں اپنا سرمایہ لگانا چاہتا ہے، اسی کو یہ خطرہ مول لینا پڑے گا، اس لئے جو سرمایہ دار ہے، وہی خطرہ مول لینے کے لحاظ سے آجر بھی ہے، اور جو شخص آجر ہے وہی سرمایہ دار بھی ہے۔

اب سرمایہ کے کسی کاروبار میں لگنے کی تین صورتیں ہیں۔

ا...... انفرادی کاروبار

سرمایہ لگانے والا بلا شرکت غیرے خود ہی کاروبار بھی چلائے، اس صورت میں

اس کو جو صلہ ملے گا وہ خواہ عرفی اور قانونی اعتبار سے صرف ''منافع'' کہلائے لیکن معاشی اصطلاح کے مطابق وہ صلہ دو چیزوں کا مجموعہ ہوگا، سرمایہ لگانے کی وجہ سے ''منافع'' کا، اور کاروبار چلانے کی محنت کے لحاظ سے اجرت کا۔

۲......شرکت

دوسری صورت یہ ہے کہ کئی آدمی مل کر سرمایہ لگائیں، کاروبار چلانے میں بھی سب شریک ہوں اور نفع و نقصان میں بھی اسے فقہی اصطلاح میں ''شرکۃ العقود'' کہا جاتا ہے۔ اس صورت میں بھی معاشی اصطلاح کے مطابق تمام شرکاء سرمایہ لگانے کی حیثیت سے ''منافع'' کے حقدار ہوں گے، اور کاروبار چلانے کی حیثیت سے ''اجرت'' کے یہ صورت بھی اسلام نے جائز قرار دی ہے، آنحضرت ﷺ سے قبل تجارت کا یہ طریقہ رائج تھا، آپ ﷺ نے لوگوں کو اس پر برقرار رکھا، اور اس کے جواز پر اجماع منعقد ہو گیا (۱)

۳ ......مضاربت

تیسری صورت یہ ہے کہ ایک شخص سرمایہ لگائے، اور دوسرا کاروبار چلائے اور نفع میں دونوں شریک ہوں، اسے فقہی اصطلاح میں ''مضاربت'' کہا جاتا ہے، اس صورت میں معاشی اصطلاح کے مطابق سرمایہ لگانے والے رب المال کو اس کا حصہ ''نفع'' کی صورت میں ملے گا، اور کاروبار چلانے والے (مضاربت) کو ''اجرت'' کی صورت میں، ہاں اگر کاروبار میں نقصان ہو جائے تو جس طرح رب المال کا سرمایہ بیکار گیا، اسی طرح طرح مضارب کی محنت بیکار رہی۔

---

(۱) ملاحظہ ہو المبسوط للسرخسی ص: ۱۵۱، ج: ۱، مطبع السعادہ مصر۔

یہ صورت بھی اسلام میں جائز ہے، خود آنحضرت ﷺ نے حضرت خدیجہؓ کے ساتھ نکاح سے قبل یہی معاملہ فرمایا تھا،(۱) اس کے بعد اس کے جواز پر فقہاء امت کا اجماع ہو چکا ہے۔(۲)

ان تینوں صورتوں کے سوا کاروبار میں سرمایہ کے شریک ہونے کی اسلام میں کوئی اور صورت نہیں ہے۔

سود کا کاروبار

شغل سرمایہ کی چوتھی صورت جو غیر اسلامی معاشروں میں شروع سے رائج چلی آتی ہے، سود کا کاروبار ہے، یعنی ایک شخص سرمایہ بطور قرض دے، دوسرا محنت کرے، نقصان ہو تو محنت کو ہو، اور سرمایہ کا سود ہر صورت میں کھرا رہے، اس کو اسلام نے حرام قرار دیا ہے، قرآن کریم کا ارشاد ہے۔

يَـآ يُّهَـاالَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ۔

''اے ایمان والو! سود میں سے جو کچھ باقی رہ گیا ہو، اسے چھوڑ دو، اگر تم مومن ہو، پس اگر تم ایسا نہ کرو تو اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے اعلان جنگ سن لو۔'' (۳ :۲۷۸)

فَـاِنْ تُبْتُـمْ فَـلَـكُـمْ رُءُوْسُ اَمْـوَالِـكُمْ لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ۔

(۱) زرقانیؒ شرح المواہب ص:۱۹۸،ج:اول الازہر مصر ۱۳۲۵ھ (۲) المبسوط للسرخسیؒ ص:۱۸،ج:۲۲

پس اگر تم (سود سے) توبہ کرو تو تمہیں اصل اموال مل جائیں گے نہ تم کسی پر ظلم کرو، نہ کوئی تم پر ظلم کرے۔ (۳: ۲۷۸)

ان دو آیتوں میں "مابقی من الرّبوا" فلکم رؤس اموالکم کے الفاظ نے پوری وضاحت کے ساتھ یہ بات صاف کر دی ہے کہ سود کی ادنیٰ سے ادنیٰ مقدار کا باقی رہنا بھی اللہ کو گوارا نہیں ہے، اور سود کو چھوڑنے کا مطلب یہ ہے کہ قرض دینے والے کو صرف "رأس المال" واپس ملے، لہذا اس سے یہ معلوم ہو گیا کہ اسلام کی نظر میں صفر کے سوا سود کی ہر شرح نامعقول ہے۔

جاہلیت میں بعض قبائل عرب دوسرے قبیلوں سے سود پر قرض لیکر کاروبار کرتے تھے، اسلام نے ان تمام معاملات کو یکسر موقوف کر دیا، ابن جریجؒ نے فرماتے ہیں۔

کانت بنو عمرو بن عمیر بن عوف یاخذون الربا من بنی المغیرة وکانت بنو المغیرة یربون لھم فی الجاھلیة فجاء الاء سلام ولھم علیھم مال کثیر،

"جاہلیت میں بنو عمرو بن عمیر بنو المغیرہ سے سود لیا کرتے تھے اور بنو مغیرہ انہیں سود دیتے تھے، جب اسلام آیا تو ان کا ان پر بہت سارا مال واجب تھا" اور

کان بنو المغیرة یربون لثقیف (۱)

بنو مغیرہ بنو ثقیف کو سود دیا کرتے تھے۔

واضح رہے کہ قبائل عرب کی حیثیت مشترکہ کمپنیوں کی سی تھی جو افراد کے مشترکہ سرمایہ سے کاروبار کرتی تھیں، اس لئے ایک قبیلے کا اجتماعی طور پر قرض لینا عموماً

(۱) تفسیر الدر المنثور بحوالہ ابن جریر ص ۳۶۶ جلد اول۔

کاروبار کے لئے ہوتا تھا اور اس کو بھی قرآن کریم نے ممنوع قرار دیدیا ہے۔

غرض اسلامی نظام معیشت میں جو شخص کسی کاروباری آدمی کو اپنا روپیہ کاروبار میں لگانے کے لئے دینا چاہتا ہے اسے پہلے یہ متعین کرنا پڑے گا کہ وہ یہ روپیہ کاروبار کے نفع میں خود حصہ دار ہونے کے لئے دے رہا ہے یا وہ اس روپیہ سے اس کاروباری آدمی کی امداد کرنا چاہتا ہے، اگر اس کا مقصد یہ ہے کہ وہ روپیہ دے کر کاروبار کے نفع سے مستفید ہو تو اسے ''شرکت'' یا ''مضاربت'' کے طریقوں پر عمل کرنا پڑے گا، یعنی اسے کاروبار کے نفع ونقصان کی ذمہ داری بھی اٹھانی پڑے گی کاروبار کو نفع ہوا تو وہ نفع میں شریک ہوگا، اور اگر کاروبار کو خسارہ ہوا تو اسے خسارے میں بھی حصہ دار ہونا پڑے گا۔

اور اگر وہ روپیہ دوسرے کی امداد کی غرض سے دے رہا ہے تو تو پھر ضروری ہے کہ وہ اس امداد کو امداد ہی سمجھے اور ''نفع'' کے ہر مطالبے سے دستبردار ہو جائے وہ صرف اتنے ہی روپے کی واپسی کا مستحق ہوگا جتنے اس نے قرض دیئے تھے، اسلام کی نظر میں اس ناانصافی کے کوئی معنی نہیں ہیں کہ وہ اپنے ''سود'' کی ایک شرح معین کر کے نقصان کا بوجھ مقروض پر ڈال دے۔

اس تفصیل سے واضح ہوگیا کہ اسلام میں ''نقصان کا خطرہ مول لینے'' کی ذمہ داری ''سرمایہ'' پر ہے، جو شخص کاروبار میں سرمایہ لگائے گا، اسے یہ خطرہ ضرور مول لینا پڑے گا، اگر کسی شخص نے قرض حسن لے کر کاروبار میں سرمایہ لگایا ہے، اور دائن کے ساتھ شرکت یا مضاربت کا معاملہ نہیں کیا تو قرض لینے کے بعد مدیون خود اس روپے کا مالک ہوگیا، اب وہ خود سرمایہ دار کی حیثیت سے روپیہ لگا رہا ہے، اس لئے نقصان کی ذمہ داری بھی اسی پر ہوگی۔

لہٰذا اگر ''آجر'' کی بنیادی خصوصیت یہ ہے (جیسا کہ بیشتر ماہرین معاشیات کا خیال ہے کہ وہ ''خطرہ مول لیتا ہے'' تو یہ خصوصیت اسلام کی نظر میں درحقیقت ''سرمایہ'' کی ہے، اس لئے اسلامی نظام معیشت میں سرمایہ اور اصطلاحی آجر ایک ہی چیز ہو جاتے ہیں، اور تقسیم دولت میں ان کا حصہ منافع ہے نہ کہ سود، اگر ''آجر'' کی بنیادی خصوصیت یہ سمجھی جائے کہ وہ تنظیم اور منصوبہ بندی کرتا ہے کہ (جیسا کہ بعض ماہرین معاشیات کا خیال ہے) تو پھر یہ کام ''محنت'' میں داخل ہے، اور اسے عامل پیدا وار سمجھنا طول لاطائل اور نامعقول ہے۔

کرایہ اور سود کا فرق

مذکورہ بحث سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ اسلام کی رو سے منافع اور اجرت جائز ہے اور سود ناجائز، اب چوتھی چیز ''کرایہ'' رہ جاتی ہے، اسلام نے اسے بھی جائز قرار دیا ہے، بعض حضرات کو یہاں یہ اشکال ہونے لگتا ہے کہ جب سرمایہ پر سود کا لین دین معین ہونیکی وجہ سے ناجائز ہے تو زمین کا کرایہ (واضح رہے کہ ہماری اصطلاح میں زمین کے اندر مشینری وغیرہ بھی داخل ہے) کیوں جائز ہے جبکہ وہ بھی معین ہوتا ہے۔

اس سوال کے جواب کیلئے پہلے یہ سمجھنا چاہیے کہ معیشت کے مادی وسائل دو قسم کے ہوتے ہیں، ایک تو وہ جنہیں استعمال کرنے اور ان سے فائدہ اٹھانے کے لئے انہیں خرچ کرنا نہیں پڑتا، بلکہ وہ اپنا وجود برقرار رکھتے ہوئے فائدہ دیتے ہیں، مثلاً زمین، مشینری، فرنیچر، سواری وغیرہ کہ ان کے وجود کو باقی رکھتے ہوئے ان سے فائدہ اٹھایا جاتا ہے، ان سے مستفید ہونے کے لئے خرچ یا فنا کرنا نہیں پڑتا ایسی چیزیں چونکہ بذات خود قابل استفادہ ہوتی ہیں اور ان کے بہت سے فوائد وہ ہیں جنہیں

حاصل کرنے کیلئے کرایہ لینے والے کو ذرہ برابر محنت نہیں کرنی پڑتی، دوسری طرف انکے استعمال سے ان کی قدر گھٹتی ہے، اس لئے ان کے ''منافع'' کی اجرت کا لین دین بالکل معقول اور درست ہے، اور اسی ''منافع کی اجرت'' کو اسلام ''کرایہ'' کہتا ہے۔

اس کے برخلاف نقد روپیہ وہ چیز ہے، جس سے فائدہ حاصل کرنے کے لئے اسے خرچ یا فنا کرنا پڑتا ہے اس سے کسی قسم کا فائدہ اس وقت تک نہیں اٹھایا جا سکتا ہے جب تک کہ اس سے کوئی چیز خریدی نہ جائے، لہذا روپیہ بذات خود قابل استفادہ نہیں ہوتا، اسلئے ایک طرف تو اس سے جس قسم کا فائدہ بھی مقروض اٹھانا چاہے اسے خرچ کر کے خود کچھ عمل کرنا پڑتا ہے، دوسری طرف مقروض کے استعمال کی وجہ سے روپیہ کی قدر میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی، اس لئے اس پر کوئی معین شرح سود مقرر کرنے میں کوئی معقولیت نہیں ہے، روپیہ کے مالک کو اختیار ہے کہ وہ چاہے تو قرض نہ دے یا چاہے تو اس کے ذریعہ روپے کے حاجتمندی کیساتھ شرکت و مضاربت کا روبار کرے، لیکن اگر وہ قرض دیتا ہے تو اس پر معین ''شرح'' سے سود لینے کی اسلام اجازت نہیں دے سکتا۔

اسی بناء پر ہم نے اصطلاح مقرر کی ہے کہ جو چیزیں بذات خود خرچ کئے بغیر قابل استفادہ نہیں ہوتیں۔ وہ ''سرمایہ'' کہلائیں گی، اور جب وہ عامل پیداوار کی حیثیت سے کاروبار میں شریک ہوں گی تو ''منافع'' کی مستحق ہوگی، اور جو چیزیں خرچ کئے بغیر قابل استفادہ ہوتی ہیں، وہ زمین'' کہلائیں گی، اور عمل پیدائش میں حصہ دار ہونے کی وجہ سے انہیں ''کرایہ'' کی صورت میں دولت تقسیم کی جائے گی۔

حرمت سود کا اثر تقسیم دولت پر

مذکورہ بالا بحث سے یہ بات واضح ہوگئی ہے کہ اسلام اور سرمایہ داری کے نظام تقسیم دولت میں ایک بنیادی فرق یہ ہے کہ سرمایہ دارانہ معاشیات میں ''سود'' جائز

ہے اور اسلام میں ناجائز، اب مختصراً اس پہلو پر نظر ڈال لینا بھی مناسب ہوگا کہ حرمت سود کے معاشی اثرات کیا ہیں؟

یوں تو ''سود'' کی حرمت سے ''پیدائش دولت'' کے نظام پر بھی بڑے گہرے، دوررس اور مفید اثرات مرتب ہوتے ہیں، لیکن یہاں یہ بحث ہمارے موضوع سے خارج ہے، اس لئے اس کے صرف ان اثرات کی طرف مجمل اشارے عرض کئے جاتے ہیں جو ''تقسیم دولت'' کے نظام پر مرتب ہوتے ہیں۔

حرمت سود کا ایک سادہ اثر تو یہ ہے، کہ اس کی وجہ سے تقسیم دولت کے نظام میں توازن اور ہمواری پیدا ہو جاتی ہے، سودی نظام معاشیات کا خاصہ لازمہ ہے کہ اس میں ایک فریق (سرمایہ) کا نفع تو معین صورت میں بہر حال کھڑا رہتا ہے، لیکن اس کے مقابل دوسرے فریق، محنت کا نفع مشتبہ اور موہوم رہتا ہے، وسیع پیمانے کی تجارتیں خواہ کتنی ہی نفع بخش کیوں نہ ہو جائیں، لیکن انہیں بہر حال، خطرے سے خالی نہیں کہا جاسکتا، بلکہ جہاں موجودہ وسائل معیشت کی فراوانی سے بڑے پیمانے کی تجارتوں کے خطرات کم ہوئے ہیں، وہاں کچھ خارجی عوامل کی بنا پر ان میں اضافہ بھی ہوا ہے، اور تجارت جتنے بڑے پیمانے کی ہوتی ہے یہ خطرات بھی اتنے ہی وسیع ہو جاتے ہیں، اس لئے سرمایہ دارانہ معیشت میں تقسیم دولت کا توازن نہایت ناہموار ہو جاتا ہے، کبھی ایسا ہوتا ہے کہ قرض لینے والے کو سخت نقصان اٹھانا پڑا، لیکن قرض دینے والے کی تجوری بھرتی ہی چلی گئی، اور کبھی اس کے برعکس یہ ہوتا ہے کہ آجر کو بے انتہا منافع ہوا، اور سرمایہ دینے والے کو اس میں سے بہت معمولی سا حصہ مل سکا۔

اس کے برخلاف اسلامی نظام میں چونکہ سود حرام ہے، اس لئے موجودہ دنیا میں عموماً شغل سرمایہ کی دو صورتیں ہوں گی، شرکت اور مضاربت اور یہ دونوں صورتیں

تقسیم دولت کی اس غیر منصفانہ ناہمواری سے خالی ہیں، ان صورتوں میں نقصان ہوتا ہے تو فریقین کو ہوتا ہے اور نفع ہوتا ہے، تو دونوں فریق متناسب طریقے سے اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔

''ارتکاز دولت جو سرمایہ دارانہ نظام معیشت کی بدترین خرابی ہے، اس طریقے کی بدولت اس کی بڑی حد تک مؤثر روک تھام ہو جاتی ہے، اور دولت کا ذخیرہ چند ہاتھوں میں سمٹنے کے بجائے معاشرے کے افراد میں اس طرح پھیلتا ہے کہ اس سے کسی شخص پر کوئی ظلم نہیں ہو پاتا۔ وجہ یہ ہے کہ سرمایہ دارانہ معیشت میں ارتکاز دولت کی ایک بہت بڑی وجہ ''سود'' ہے اسی وجہ سے مٹھی بھر سرمایہ دار نہ صرف یہ کہ دولت کے بڑے خزانے پر قابض ہو جاتے ہیں، بلکہ وہ پورے بازار پر بھی پوری خود غرضی کے ساتھ حکمرانی کرتے ہیں، اس کے نتیجے میں ''رسد اشیاء'' اور ''قیمتوں'' کا نظام بھی قدرتی رہنے کے بجائے مصنوعی ہو جاتا ہے، اور معیشت و اخلاق سے لیکر ملکی سیاست تک زندگی کا کوئی گوشہ اس کے برے اثرات سے محفوظ نہیں رہتا۔

اسلام نے ''سود'' کو ممنوع قرار دیکر ان تمام خرابیوں کی بنیاد کو منہدم کر دیا ہے، اسلامی نظام میں ہر روپیہ لگانے والا کاروبار اس کی پالیسی میں شریک ہوتا ہے، نفع و نقصان کی ذمہ داریاں بھی اٹھاتا ہے، اور اس طرح اس کی کاروباری مرضی بے لگام نہیں ہونے پاتی۔

ایک شبہ اور اس کا ازالہ

یہاں ایک شبہ کا ازالہ کر دینا مناسب ہوگا، ''سود'' کے نقصانات کے بارے میں جو یہ کہا گیا ہے کہ اس کی وجہ سے تقسیم دولت میں ناہمواری پیدا ہوتی ہے اور فریقین میں سے کوئی نہ کوئی اس سے متاثر ہوتا ہے، اس پر بعض حضرات کے دل میں

یہ اعتراض پیدا ہوتا ہے کہ سودی کاروبار میں جس شخص کو بھی نقصان پہنچتا ہے وہ اس کی مرضی سے پہنچتا ہے، اور جب وہ خود یہ خطرہ مول لینے پر راضی ہے تو اس میں قانون شریعت کیوں دخل انداز ہوتا ہے؟ حالانکہ ذرا غور کیا جائے تو اس کا جواب سمجھنا کوئی مشکل نہیں، اسلامی نظام زندگی کا معمولی سا مطالعہ بھی یہ ثابت کرنے کے لئے کافی ہے کہ اسلام میں فریقین کی باہمی رضامندی ہمیشہ کسی معاملے کی وجہ جواز نہیں ہوتی، اگر کوئی شخص دوسرے کے ہاتھوں قتل ہوجانے پر راضی ہو تو یہ بات قاتل کو بری نہیں کرسکتی یہاں تک کہ زنا'' جسے مغربی تہذیب کی تنگ نظری نے خالص نجی زندگی کا مسئلہ سمجھا ہوا ہے اس میں بھی فریقین کی رضامندی مجرموں کو بری نہیں کرسکتی، دولت کی تقسیم اور معاشی نظام کی بہبود کا معاملہ تو اس سے کچھ آگے ہی ہے! شروع میں قرآن کریم کے حوالوں سے عرض کیا جاچکا ہے کہ دولت اصلاً اللہ کی ملکیت ہے، اور اس نے انسان کو جو ملکیت عطا کی ہے، وہ آزاد اور بے لگام ہونے کی بجائے اصولوں کہ پابند ہے یہی وجہ ہے کہ ہر وہ معاملہ جو اسلام کی نظر میں فی نفسہ غیر منصفانہ ہے اور اس کا اثر معاشرے کی اجتماعی بہتری پر پڑسکتا ہے اس میں اسلام نے فریقین کی رضامندی کو وجہ جواز قرار نہیں دیا، سود، قمار، رشوت اور بے حیائی کے سب کام اگرچہ فریقین کی پوری رضامندی سے ہوں شریعت اسلام نے ان سب کو اسی لئے حرام قرار دیا ہے کہ ان کا فساد پورے انسانی معاشرے کو متاثر کرتا ہے جس کا حق کسی فرد یا افراد کو نہیں دیا جاسکتا،

احادیث میں فریقین کی رضامندی کے باوجود جو ''تلقی الجلب''(۱)

(۱) قدیم رسم تھی کہ سرمایہ دار لوگ دیہات کے غلہ کو بازار میں آنے سے پہلے دیہات میں پہنچ کر خرید لیتے اور ذخیرہ کرکے قیمت میں من مانی زیادتی کرتے تھے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو منع فرمایا اسی کا نام ''تلقی الجلب'' ہے ۱۲۔

''بیع الحاضر بساد''(۱)، ''محاقلہ''(۲)، مزابنہ اور ''مخابرہ'' وغیرہ کی شدید ممانعت آئی ہے، اس کے پیچھے یہی حکمت کارفرما ہے، اس لئے ''سود'' کے معاملے کو بھی محض اس بناء پر جائز قرار نہیں دیا جاسکتا کہ فریقین اس پر رضامند ہیں۔

جاہلیت کے لوگ حرمت سود پر اسی قسم کا اعتراض کیا کرتے تھے۔

اِنَّمَا الْبَیْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا (۳: ۲۷۵)

''بیع ربوا ہی کی طرح تو ہے''

قرآن کریم نے مختصر لفظوں میں اس کا جواب دیتے ہوئے فرمایا کہ۔

وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَیْعَ وَ حَرَّمَ الرِّبٰوا (۳: ۲۷۵)

''اور اللہ نے بیع کو حلال کیا ہے اور ربا کو حرام''

یہاں یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے اعتراض کے جواب میں ''حرمت سود'' کی کوئی حکمت اور مصلحت نہیں بیان فرمائی، بلکہ صرف یہ فرمایا ہے جب اللہ نے بیع کو حلال اور ربوا کو حرام کر دیا ہے تو خواہ مصلحت تمہاری سمجھ میں آئے یا نہ آئے اس حکم کو ماننا پڑے گا، یہاں قرآن کریم نے حکمتوں کو بیان فرمانے کے بجائے حاکمانہ اسلوب اختیار فرمایا ہے جس سے حرمت سود پر ہر قسم کے اعتراض کی جڑ کٹ جاتی ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ ''سود کی حرمت'' اسلام کا وہ حکیمانہ فیصلہ ہے جس کی وجہ سے سرمایہ دارانہ نظام معیشت کی بہت سی خرابیاں بھی دور ہو جاتی ہیں، اور اسکے بعد اشتراکیت کے مستبداد اور غیر فطری نظام معیشت کو اختیار کرنے کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہتی یہی وہ اعتدال کی راہ ہے جو دنیا کو افراط و تفریط سے نجات دلا کر ایک متوازن اور منصفانہ نظام معیشت کی طرف رہنمائی کر سکتی ہے، فرانسیسی پروفیسر لوئی

ماسینِ نون نے بڑی سچی بات کہی ہے کہ۔

"سرمایہ داری اور اشتراکیت کے تصادم میں اسی تمدن اور تہذیب کا مستقبل محفوظ اور درخشاں رہے گا جو سود کو ناجائز قرار دے کر اس پر عمل کرا رہا ہو"(۱)

اجرتوں کا مسئلہ

یہاں تک تقسیم دولت کے معاملے میں اسلام اور سرمایہ داری کا ایک بنیادی فرق واضح ہوا ہے، اور وہ ہے مسئلہ سود! اس کے بعد ان دونوں کے درمیان ایک اور فرق کو ذہن میں رکھنا بھی ضروری ہے، جو آجر اور اجیر کے رشتے سے متعلق ہے، اور جس میں اجرتوں کا مسئلہ زیر بحث آتا ہے۔

سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف موجودہ دنیا میں جو شدید ردعمل ہوا ہے، اس کی بہت بڑی وجہ آجر اور اجیر کے جھگڑے اور اجرتوں کی تعیین کے مسائل تھے، سرمایہ دارانہ نظام معیشت کی بنیاد ہی چونکہ خود غرضی اور بے لگام انفرادی ملکیت پر ہے، اس لئے اس نظام میں آجر اور اجیر کے درمیان "رسد و طلب" کا ایک ایسا خشک، کھردرا اور رسمی تعلق ہے، جس کی بنیاد خالص خود غرضی پر استوار ہوئی ہے، آجر صرف اس حد تک اجیر کی انسانیت کا احترام کرتا ہے، جب تک وہ اپنے کاروبار کے لئے اس کے ہاتھوں مجبور ہے، لہٰذا جہاں یہ مجبوری ختم ہو جاتی ہے، وہاں وہ اس پر اپنے ظلم کا شکنجہ کس دیتا ہے، دوسری طرف اجیر صرف اس وقت تک آجر کے کام اور اس کے احکام سے دلچسپی رکھتا ہے، جب تک اس کا روزگار کسی آجر پر موقوف ہو، لہٰذا جہاں اس کی یہ

(۱) آڑھت کا کام کرنے والے دیہات کا غلہ اپنے پاس ذخیرہ کر کے گراں قیمت پر فروخت کریں، اس کے انسداد کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے شہر والوں کو گاؤں کا دلال بننے سے منع فرما دیا ۱۲ منہ۔

مجبوری ختم ہو جاتی ہے وہاں وہ کام چوری اور ہڑتال سے نہیں چوکتا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ مزدور اور سرمایہ دار میں ایک ابدی کشمکش قائم رہتی ہے، اور دونوں کے درمیان کوئی صحت مند رابطہ نہیں ہو پاتا۔

اس کے برخلاف اسلام نے اگرچہ آجر اور اجیر کے درمیان رسد اور طلب کے نظام کو ایک حد تک تسلیم کیا ہے، لیکن ساتھ ہی محنت کی رسد اور طلب دونوں پر کچھ ایسی پابندیاں عائد کر دی ہیں کہ ان کا باہمی رابطہ ایک خشک رسمی تعلق نہیں رہا۔ بلکہ بڑی حد تک بھائی چارہ بن گیا ہے، آجر کا نقطہ نظر اجیر کے بارے میں کیا ہونا چاہیے؟ اس کو قرآن کریم نے حضرت شعیبؑ کا ایک مقولہ نقل فرماتے ہوئے مختصر لفظوں میں واضح فرما دیا ہے، حضرت شعیب علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لئے ''آجر'' تھے اور انہوں نے فرمایا۔

وَمَآ اُرِیْدُ اَنْ اَشُقَّ عَلَیْكَ سَتَجِدُنِیْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰلِحِیْنَ۔

میں تم پر (غیر ضروری) مشقت ڈالنا) نہیں چاہتا، خدا نے چاہا تو تم مجھے نیکوکار پاؤ گے۔ (۲۷:۲۰)

اس آیت نے واضح فرما دیا کہ ایک مسلمان آجر کی اصل منزل مقصود ''صالح'' ہونا ہے، اس وقت تک ''صالح'' نہیں ہو سکتا جب تک وہ اپنے اجیر کو غیر ضروری مشقت سے بچانے کا داعیہ نہ رکھتا ہو۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات کو مزید واضح الفاظ میں اس طرح کھول دیا ہے کہ:

انّ اِخوانکم خولکم جَعلهم اللّٰه تحت اَیدیکم فمن کان اخوه تحت یده فلیطعمه مما یاکل وَلیُلبسه ممّا

یلبس، وَلا تکلفوھم مَایغلبھم فان کلفتموھم ما یغلبھم فأعینوھم (۱)

''تمہارے بھائی تمہارے خادم ہیں جنہیں اللہ نے تمہارے زیردست کیا ہے لہٰذا جس شخص کا بھائی اسکے ماتحت ہو اسے چاہیے کہ وہ جو خود کھائے اسی میں سے اس کو بھی کھلائے اور جو خود پہنے اسی میں سے اس کو بھی پہنائے، اوران پر کسی ایسے کام کا بوجھ نہ ڈالو جوان کی طاقت سے زیادہ ہو، اوراگر کسی ایسے کام کا بوجھ ڈالوتو خود ان کی مدد کرو۔''

نیز ارشاد فرمایا کہ۔

اعطو الاجیر اجرہ قبل ان یجف عرقہ (۲)

''مزدور کی اجرت اس کا پسینہ خشک ہونے سے پہلے ادا کردو۔''

اسی طرح آپ ﷺ کا ارشاد ہے کہ تین شخص ایسے ہیں جن کا میں قیامت کے دن دشمن ہونگا۔ ان میں سے ایک وہ ہے کہ۔

رجلٌ استاجر اجیراً فاستوفیٰ منہ ولم یعطہ اجرہ (۳)

''وہ شخص جو کسی مزدور کو اجرت پر لے، پھر اس سے کام پورا لے، اوراس کو اس کی اجرت نہ دے۔''

آنحضرت ﷺ کو مزدوروں کے حقوق کا کس قدر احساس تھا؟ اس کا اندازہ

---

(۱) یہ تینوں قسمیں بیع فاسد کی ہیں ایک فریق کو نقصان کا خطرہ رہتا ہے اس کو بھی باوجود رضامندی فریقین منع کردیا گیا ۱۲ منہ۔

(۲) ڈاکٹر یوسف الدین: اسلام کے معاشی نظریئے ص: ۴۲۸، ج، ۲ بحوالہ ڈاکٹر حمید اللہ انجمن برائے قرضہ حسنہ کی اہمیت مجلد طیلسانین عثمانیہ ج ۷ حصہ معاشیات ج ۲، ۱۹۴۳ء

(۳) صحیح بخاری کتاب العتق ص: ۳۴۶، جلد اول

حضرت علیؓ کی اس روایت سے ہوتا ہے جس میں وہ فرماتے ہیں کہ وفات سے قبل آپ ﷺ کے آخری الفاظ یہ تھے۔

الصلوٰۃ وما ملکت ایمانکم (۱)

''نماز کا خیال رکھو، اور ان لوگوں، کے حقوق کا جو تمہارے زیر دست ہیں''

ان ہدایات کے نتیجے میں'' مزدوروں کو اسلامی معاشرے میں جو باوقار اور برادرانہ مقام حاصل ہوا، اس کی بے شمار مثالیں قرون اولیٰ کی اسلامی تاریخ میں ملتی ہیں۔ اور پورے وثوق اور یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ'' مزدوروں'' کے حقوق کی رعایت اس سے بہتر طریقے پر ممکن ہی نہیں ہے۔

دوسری طرف اسلام نے'' اجیر'' کو بھی کچھ احکام کا پابند بنا کر آجر سے اس کے تعلقات کو مزید خوشگوار کر دیا ہے، مزدور آجر کے جس کام کی ذمہ داری اٹھاتا ہے اسلامی نقطہ نظر سے وہ ایک ایسا معاہدہ کرتا ہے جس کی پابندی اسے صرف اپنا پیٹ بھرنے کے لئے نہیں کرنی ہے، بلکہ اس کی اصل منزل مقصود یعنی آخرت کی بہتری بھی اسی پر موقوف ہے، قرآن کریم کا ارشاد ہے۔

يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ (۶ : ۱)

''اے ایمان والو! تم اپنے معاہدوں کو پورا کرو''

اور

اِنَّ خَيْرَ مَنِ اسْتَاْجَرْتَ الْقَوِيُّ الْاَمِيْنُ (۲۸:۲۶)

''بہترین اجیر وہ ہے جو قوی بھی ہو اور امانت دار بھی''

(۱) ابن ماجہؒ وطبرانیؒ عن ابن عمرؓ، جمع الفوائد ص: ۲۵۶ جلد اول میرٹھ ۱۳۴۵ھ

نیز ارشاد ہے۔

وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ الَّذِيْنَ إِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ وَإِذَا كَالُوْهُمْ أَوْ وَّزَنُوْهُمْ يُخْسِرُوْنَ۔(۱:۳۰)

''دردناک عذاب ہے ان ناپ تول میں کمی کرنے والوں کے لئے جو اپنا حق لینے کے وقت پورا پورا وصول کریں، اور جب انہیں ناپ تول کر دینے کا موقع آئے تو کمی کر جائیں۔

فقہا امت کی تصریحات کے مطابق اس آیت میں ''تطفیف'' یا ناپ تول میں کمی کرنے والے کے مفہوم میں وہ مزدور بھی داخل ہے جو طے شدہ اجرت پوری وصول کرنے کے باوجود کام چوری کا مرتکب ہو، اور اپنے جو اوقات اس نے آجر کو بیچ دیئے ہیں، انہیں آجر کی مرضی کے خلاف کسی اور کام میں صرف کرے۔ اس لئے ان احکام نے '' کام چوری'' کو گناہ عظیم قرار دے کر اجیر کو بھی یہ جتلا دیا ہے کہ جس آجر کا کام کرنا اس نے قبول کیا ہے اس کی ذمہ داری اٹھا لینے کے بعد اب وہ خود اس کا اپنا کام بن گیا ہے، اور اس کے ذمہ ضروری ہے کہ وہ پوری دیانت داری، مستعدی اور لگن کے ساتھ اسے انجام دے، ورنہ وہ آخرت کی اس بہتری کو حاصل نہ کر سکے گا، جو اس کا اصل منتہائے مقصود ہے۔

خلاصہ یہ کہ اسلام نے اجرتوں کے مسئلے میں رسد وطلب کے نظام کو ایک حد تک تسلیم کرنے کے ساتھ ساتھ آجر اور اجیر دونوں کے لئے کچھ ایسے احکام دیدیئے ہیں کہ ان کی وجہ سے رسد وطلب کا یہ نظام خودغرضی کے بجائے اخوت و ہمدردی پر مبنی ہو گیا ہے۔

ہوسکتا ہے یہاں کسی صاحب کو یہ شبہ پیدا ہو کہ آجر اور اجیر دونوں پر پابندیاں

عائد کرنے کے لئے قرآن وسنت نے جو احکام دیئے ہیں۔ ان کی حیثیت اخلاقی ہدایات کی سی ہے جو ٹھیٹھ معاشی اور قانونی نقطہ نظر سے خارج از بحث ہیں، لیکن یہ اعتراض اسلام کے مزاج کو نہ سمجھنے کا نتیجہ ہوگا، یہ بات واضح رہنی چاہیے کہ اسلام محض ایک معاشی نظام ہی نہیں ہے بلکہ وہ زندگی کا ایک مکمل دستور العمل ہے جس میں زندگی کے تمام شعبے باہم مربوط رہ کر ساتھ ساتھ چلتے ہیں، ان میں سے کسی ایک شعبے کو دوسرے تمام شعبوں سے کاٹ کر سمجھنے کی کوشش لازماً غلط فہمیاں پیدا کرے گی، اس کے ہر شعبے کا صحیح روکا راسی وقت سامنے آسکتا ہے جب اسے اس کے مجموعی نظام زندگی میں فٹ کر کے دیکھا جائے، اس لئے اسلامی معاشیات کی بحث میں ان اخلاقی ہدایات کو خارج از بحث قرار نہیں دیا جاسکتا۔

پھر اسلام کا ایک امتیاز یہ ہے کہ اگر ذرا وسیع نظر سے دیکھا جائے تو اس کی اخلاقی ہدایات بھی درحقیقت قانونی احکام ہیں۔ اس لئے کہ ان پر بالآخر آخرت کی جزا اور سزا مرتب ہوتی ہے جس کو ایک مسلمان کی زندگی میں بنیادی اہمیت حاصل ہے۔۔ یہ ''عقیدہ آخرت'' ہی وہ چیز ہے جس نے نہ صرف یہ کہ اخلاق کو قانون کا درجہ عطا کیا ہے بلکہ اصطلاحی قوانین کی پشت پناہی بھی کی ہے۔ قرآن کریم کے اسلوب پر اگر آپ غور فرمائیں تو نظر آئیگا کہ کہ اس کے ہر قانونی اور اخلاقی حکم کے ساتھ ''خوف خدا'' اور ''فکر آخرت'' کے مضامین لگے ہوئے ہیں اسمیں اصل راز یہی ہے کہ درحقیقت قانون کی پابندی محض انسانی ڈنڈے کے زور سے کبھی نہیں کرائی جاسکتی، تاوقت یہ کہ انسان کی ہر نقل وحرکت اور ہر فکر وعمل پر پہرہ دینے کے لئے ''فکر آخرت'' موجود نہ ہو، تو دنیا کی ہزار ہا سالہ طویل تاریخ جو پوری قانونی جکڑ بندیوں کی باوجود مظالم اور جرائم کی داستانوں سے بھری ہوئی ہے، اس ناقابل انکار حقیقت کی تصدیق کرتی ہے۔ لیکن خاص طور سے آج کی مہذب دنیا نے تو اسے روز روشن کی طرح عیاں کر دیا ہے کہ

جس رفتار سے قانونی مشینریوں میں اضافہ ہو رہا ہے، اس سے کہیں زیادہ تیز رفتاری سے جرائم بڑھ رہے ہیں۔

اس لئے یہ سمجھنا کہ "اجیر" اور "آجر" کے تعلقات محض قانونی جکڑ بندیوں سے درست ہو سکیں گے، انتہا درجے کی خود فریبی کے سوا کچھ نہیں، اس کا اصل علاج صرف اور صرف "فکر آخرت" ہے اور اسلام نے اس معاملے میں اسی پر زیادہ زور دیا ہے۔

آج کا ذہن جو محض دنیوی زندگی کے الٹ پھیر میں الجھ کر "مادے" کے اس پار جھانکنے کی صلاحیت کھو چکا ہے، اس کے لئے شاید اس بات کو سمجھنا مشکل ہو، لیکن یقین ہے کہ اگر امن وسکون انسانیت کیلئے مقدر ہے تو وہ سینکڑوں ٹھوکریں کھا کر بالآخر اس حقیقت تک پہنچے گی، جس کی طرف قرآن کریم نے بار بار توجہ دلائی ہے جس زمانے میں اسلام ایک عملی نظام کی حیثیت سے اس دنیا میں کارفرما تھا، اس وقت دنیا اس قرآنی نظریئے کی صداقت کو خوب اچھی طرح دیکھ چکی ہے، اس دور کی تاریخ میں "آجر" اور "اجیر" کے جھگڑوں اور ہڑتالوں کی کیفیت ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتی جس نے کچھ عرصے سے پوری دنیا کو تہ و بالا کیا ہوا ہے، قرآن وسنت کی یہی وہ اخلاقی ہدایات تھیں۔ جنھوں نے اس مسئلے کا اطمینان بخش حل پیش کر کے دکھایا اور جن کی وجہ سے اسلام کے قرون اولیٰ کی تاریخ آجر کے جبر وتشدد اور اجیر کی ہڑتالوں سے تقریباً خالی نظر آتی ہے۔

تقسیم دولت کی ثانوی مدات

اب تک ہماری بحث تقسیم دولت کے اولین حقداروں سے متعلق تھی، اسلامی نظریہ تقسیم دولت کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس نے معاشرہ کے کمزور عناصر کو قوی کرنے اور بیکار افراد کو قابل کار بنانے کیلئے عاملین پیداوار کے ساتھ دولت کے

ثانوی مستحقین کی ایک طویل فہرست دی ہے، اوراس کا ایک باقاعدہ نظام بنایا ہے۔

مقالے کی تمہید میں اس بات کی طرف جامع اشارے کئے جا چکے ہیں کہ دولت اصلاً اللہ کی ملکیت ہے، وہی اس کا پیدا کرنے والا ہے، اوراسی نے انسان کو اس پر ملکیت کے حقوق عطا کئے ہیں، انسان کو اسکے کسب وعمل کا جو بھی صلہ ملتا ہے، وہ اس کا مالک ضرور ہے، لیکن چونکہ کسب وعمل کی تمامتر تخلیق پھر توفیق اللہ ہی دیتا ہے، اور دولت کی تخلیق بھی اسی نے کی ہے، اسلئے انسان اپنی ملکیت کے استعمال میں قطعی طور پر خود مختار نہیں ہے، بلکہ اللہ کے احکام کا پابند ہے، لہٰذا جس جگہ خرچ کرنے کا وہ حکم دے دے، انسان کے لئے وہاں خرچ کرنا ضروری ہوجاتا ہے۔

اسی بنیادی نظریے سے عمل پیدائش کے علاوہ ''استحقاق دولت'' کا ایک دوسرا مد خود بخود نکل آتا ہے، یعنی ہر وہ شخص اسلامی نقطہ نظر سے دولت کا مستحق ہے جس تک دولت کا پہنچانا اللہ نے دولت کے اولین مالکوں کے ذمے فرض قرار دیا ہے۔ اسطرح تقسیم دولت کے ثانوی مدات کی ایک طویل فہرست مرتب ہوجاتی ہے جن میں سے ہر ایک دولت کا مستحق ہے۔

ان مدات کو مقرر کر کے اسلام درحقیقت یہ چاہتا ہے کہ دولت کو معاشرے میں زیادہ سے زیادہ گردش دی جائے اور ارتکاز دولت پر جو پابندیاں ''سود'' کی حرمت کے ذریعہ عائد کی گئی ہیں، انہیں مزید توسیع دی جائے، ان مدات کا تفصیلی بیان تو اس مختصر مقالے میں ممکن نہیں ہے، تاہم انہیں اختصار کے ساتھ شمار کیا جاتا ہے۔

ا......زکوٰۃ

ان میں سب سے پہلا اور سب سے زیادہ وسیع مد ''زکوٰۃ'' ہے قرآن کریم نے بے شمار مقامات پر اس فریضے کو ''نماز'' کے ساتھ ذکر کیا ہے ہر وہ شخص جو سونے چاندی

،مویشی اور مال تجارت کا مقدار نصاب کی حد تک مالک ہو، اسکے لئے ضروری قرار دیا گیا کہ وہ سال گذرنے پر اپنی ان مملوکات کا ایک حصہ دوسرے ضرورت مند افراد پر صرف کرے، اور جو شخص اس فریضے کو ادا نہ کرے، اسکے لئے قرآن کریم کا ارشاد ہے۔

" اَلَّذِیْنَ یَکْنِزُوْنَ الذَّھَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا یُنفِقُوْنَھَا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ فَبَشِّرْھُمْ بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ، یَّوْمَ یُحْمٰی عَلَیْھَا فِیْ نَارِ جَھَنَّمَ فَتُکْوٰی بِھَا جِبَاھُھُمْ وَ جُنُوْبُھُمْ وَ ظُھُوْرُھُمْ ھٰذَا مَا کَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِکُمْ فَذُوْقُوْا مَا کُنْتُمْ تَکْنِزُوْنَ۔

(۱۰: ۳۴، ۳۵)

" جو لوگ سونے چاندی کو جمع کر رکھتے ہیں اور اسے اللہ کے راستے میں خرچ نہیں کرتے، ان کو آپ دردناک عذاب کی خبر سنا دیجئے، جس دن اس (دولت) کو جہنم کی آگ میں گرم کیا جائے گا پھر اس سے ان کی پیشانیوں اور پہلوؤں کو داغا جائے گا، یہ وہ مال ہے جو تم نے اپنے لئے جمع کیا تھا، چکھو جسے تم جمع کیا کرتے تھے۔

پھر اس زکوٰۃ کی ادائیگی کے لئے قرآن کریم نے آٹھ مصارف خود مقرر فرما دیئے ہیں۔

اس طرح "زکوٰۃ" کے اس ایک مد کے لئے آٹھ مصارف مقرر فرما کر قرآن کریم نے دولت کی زیادہ سے زیادہ گردش کا دروازہ کھول دیا ہے۔

زکوٰۃ کے مصارف میں وجہ استحقاق کی قدر مشترک "ناداری" اور "افلاس" ہے اور اس میں مد میں افلاس ہی کے خاتمے پر زور دیا گیا ہے، اس طریقے سے نادار اور مفلس افرد کے درمیان کس وسیع پیمانے پر تقسیم دولت ممکن ہے، اس کا اندازہ اس بات

سے لگایا جا سکتا ہے کہ ۱۹۶۵ء میں پاکستان کی قومی آمدنی تقریباً پندرہ ارب تیس کروڑ روپیہ تھی زکوٰۃ کی ادنیٰ ترین شرح یعنی ۲۶۵ ۲ فیصد کے حساب سے اگر قومی آمدنی کی پوری زکوٰۃ نکالی جائے تو کم از کم اڑتیس کروڑ پچیس لاکھ روپیہ سالانہ صرف غریبوں میں تقسیم ہوتا ہے، اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اگر تمام عاملین پیداوار ہر سال باقاعدگی کے ساتھ زکوٰۃ نکالیں تو سالانہ کتنی خطیر رقم سرمایہ داروں کی جیب سے نکل کر غریبوں اور ناداروں کے پاس پہنچتی ہے، اور اس طرح تقسیم دولت کی ناہمواری کتنی تیزی سے رفع ہو سکتی ہے؟

۲......عشر

''عشر'' درحقیقت زمینی پیداوار کی ''زکوٰۃ'' ہے لیکن چونکہ اس پیداوار میں انسانی محنت کا دخل نسبۃً کم ہوتا ہے اس لئے اس کی شرح ۵، ۲ فیصد کے بجائے ۱۰ فیصد رکھی گئی ہے، عشر'' صرف ان زمینوں کی پیداوار پر واجب ہوتا ہے جو فقہی تفصیلات کے مطابق عشری ہوں، اور اس کو زکوٰۃ ہی کے مصارف پر خرچ کیا جاتا ہے۔

۳......کفارات

معاشرہ کے کمزور افراد تک دولت پہنچانے کا ایک مستقل راستہ اسلام نے کفارات کے ذریعہ مقرر کیا ہے، کوئی شخص بلا عذر رمضان کا روزہ توڑ دے، یا کسی مسلمان کو بلا عمد قتل کر دے، یا اپنی بیوی سے اظہار کر لے، یا قسم کھا کر اسے توڑ دے تو بعض صورتوں میں لازمی اور بعض صورتوں میں اختیاری طور پر اسے حکم دیا گیا ہے کہ وہ اپنے مال کا حصہ ناداروں پر خرچ کرے، یہ نقد روپیہ کی شکل میں بھی ہو سکتا ہے اور کھانے کپڑے کی صورت میں بھی۔

۴......صدقۃ الفطر

اس کے علاوہ جولوگ صاحب نصاب ہوں انکے لئے عید الفطر کے موقع پر لازم کیا گیا ہے کہ نماز عید کو جانے سے پہلے فی کس پونے دوسیر گندم یا اس کی قیمت مفلسوں ، ناداروں ، یتیموں اور بیواؤں پر خرچ کریں ، رقم نہ صرف اپنی طرف سے بلکہ نابالغ اولاد کی طرف سے بھی نکالی جاتی ہے ، اوراس کے لئے مقدار نصاب کا ''نامی'' ہونا یا اس پر پورا سال گزار ابھی ضروری نہیں ہے۔ لہٰذا اس فریضے کا دائرہ زکوۃ سے بھی زیادہ وسیع ہو جاتا ہے ، اوراس کے ذریعہ خاص طور سے ایک اجتماعی مسرت کے موقع پر زیادہ سے زیادہ مساوات پیدا کی جاسکتی ہے۔

مذکورہ بالا چار مدات غریبوں اور مفلسوں میں دولت تقسیم کرنے کے لئے تھے۔ اسکے علاوہ دو مدوہ ہیں جن سے اعزہ واقرباء کی امداد اوران تک دولت کا پہنچانا مقصود ہے ، ان میں سے ایک مدنفقات کی ہے اور دوسری وراثت کی۔

۵....نفقات

اسلام نے ہر انسان پر یہ ذمہ داری عائد کی ہے ، کہ وہ اپنے خاص خاص رشتہ داروں کی معاشی کفالت کرے ، پھر ان میں سے بعض تو وہ ہیں ، جن کی کفالت بہر صورت واجب ہے ، خواہ انسان تنگدست ہو یا خوشحال مثلاً بیوی اولاد اور بعض وہ ہیں جن کی کفالت کی ذمہ داری وسعت کے ساتھ مشروط ہے ، ایسے رشتہ داروں کی ایک طویل فہرست اسلامی فقہ میں موجود ہے ، اوراسکے ذریعہ خاندان کے اپاہج ، کمزور افراد کی معاشی کفالت کا بڑا اچھا نظام بنایا گیا ہے۔

۶......وراثت

اسلام کا نظام وراثت ، اس کے نظریہ تقسیم دولت میں ایک بنیادی امتیاز رکھتا ہے

، وراثت کی مرتکز تقسیم سے تقسیم دولت میں جو ناہمواری پیدا ہوتی ہے، وہ محتاج بیان نہیں۔ مغربی ممالک میں اس ناہمواری کا ایک بہت بڑا سبب یہ ہی ہے جس کا اقرار بہت سے ماہرین معاشیات نے کیا ہے۔

یورپ میں بالعموم اکبر الاولاد کی جانشینی کا طریقہ رائج ہے۔ جس میں سارا ترکہ بڑے لڑکے کو مل جاتا ہے، باقی سب محروم ہو جاتے ہیں، پھر بعض مقامات پر اگر مرنے والا چاہے تو کسی دوسرے شخص کے نام اپنے سارے ترکہ کی وصیت کر سکتا ہے اور اس سلسلہ میں اسے مذکر اولاد کو بھی محروم کرنے کا حق ہے۔ اس طریقے کے نتیجہ میں دولت پھیلنے کے بجائے سمٹتی ہے، اس کے برعکس ہندو مذہب میں تقسیم وراثت کو مردوں میں تو اشتراکی حد تک مساوی کر دیا گیا ہے، لیکن عورتیں بہرحال وراثت سے محروم رکھی گئی ہیں جس سے ان پر ظلم ہونے کے علاوہ گردش دولت کا دائرہ اسلام کی نسبت سمٹ جاتا ہے۔

اس کے برخلاف اسلام نے تقسیم وراثت کا جو نظام بنایا ہے اسمیں ان تمام خرابیوں کا انسداد ہو جاتا ہے، اس نظام کی خصوصیات مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) قرابت کے لحاظ سے وارثوں کی ایک طویل فہرست رکھی گئی ہے جس کی وجہ سے متروکہ دولت زیادہ وسیع پیمانے پر پھیلتی ہے، یہاں یہ بات قابل نظر ہے کہ دولت کے وسیع پھیلاؤ کے پیش نظر یہ حکم دیا جا سکتا تھا کہ سارا ترکہ غریبوں میں تقسیم کر دیا جائے یا بیت المال میں داخل کر دیا جائے لیکن اس صورت میں ہر مرنے والا کوشش کرتا کہ وہ اپنی زندگی ہی میں سارا مال ختم کر جائے، اور اس سے معیشت کے نظام میں ابتری پیدا ہو جاتی ہے، اس لئے اسلام نے اسے میت کے رشتہ داروں میں تقسیم کرنے کا نظام بنایا ہے جو مالک سرمایہ کی فطری خواہش ہے۔

(۲) دنیا کے تمام نظام ہائے وراثت کے برخلاف عورتوں کو بھی میراث کا مستحق قرار دیا گیا ہے، قرآن کریم کا ارشاد ہے۔

لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ أَوْ كَثُرَ نَصِيبًا مَّفْرُوضًا (۴ : ۷)

مردوں کے لئے بھی ایک حصہ ہے اس مال میں جو والدین اور اقرباء چھوڑ کر جائیں، اور عورتوں کے لئے بھی ایک حصہ ہے اس مال میں جو والدین او اقارب چھوڑ کر جائیں، تھوڑے میں سے بھی اور زیادہ میں سے بھی ایک معین حصہ ہے۔

(۳) مرنے والے کو یہ اختیار نہیں دیا گیا کہ وہ کسی وارث کو محروم کر دے یا کسی کے حصہ میں ترمیم کر سکے، اسطرح وراثت کے راستے سے ارتکاز دولت کا امکان ختم کر دیا گیا ہے۔ ارشاد ہے۔

اٰباؤکم وَابناؤکم لاتدرون اَیّھم اقرب لکُم نَفعاً، فَرِیضَة من اللّٰه (۴:۱۰)

”تمہارے باپ بیٹوں میں کون نفع کے اعتبار سے تم سے قریب تر ہے؟ تم نہیں جانتے! یہ اللہ کا مقرر کیا ہوا قانون ہے“

(۴) چھوٹی اور بڑی اولاد میں کوئی تفریق نہیں کی گئی، بلکہ سب کو برابر حصہ دیا گیا ہے۔

(۵) کسی وارث کے لئے اس کے حصہ رسدی کے علاوہ کسی مال کی وصیت کرنے کی ممانعت کر دی گئی ہے، اس طرح کوئی وراث متوفی کے مال سے اپنے وارثت کے سوا کچھ نہیں پا سکتا۔

(۶) متوفی کو اختیار دیا گیا ہے کہ وہ وارثوں کے سوا دوسرے لوگوں کے لئے وصیت کر جائیں، اس

سے بھی دولت کے پھیلاؤ میں مدد ملتی ہے، اور تقسیم وارثت سے قبل دولت کا ایک حصہ وصیت پر صرف ہو جاتا ہے۔

(ے) لیکن وصیت کرنے والے کو اس بات کا اختیار نہیں دیا گیا کہ وہ پورے مال کی وصیت کر جائے بلکہ اسے اپنے مال کے صرف ایک تہائی حصہ میں ایسا کرنے کی اجازت دی گئی ہے۔ اس سے زیادہ کی وصیت کا وہ مجاز نہیں، اس طرح ارتکاز دولت کے اس خطرے کا سد باب بھی کر دیا گیا ہے جو پورے مال کی وصیت کی اجازت کی صورت میں پیدا ہو سکتا تھا، اور اقرباء کے حقوق کو بھی محفوظ کر دیا گیا۔

ے ......خراج و جزیہ

مذکورہ بالا مدات کے علاوہ دو مدیں ایسی ہیں جن میں مالکان دولت کے لئے ضروری قرار دیا گیا ہے کہ وہ اپنی دولت کا کچھ حصہ حکومت وقت کو ادا کریں، ایک خراج اور دوسرا جزیہ۔

خراج ایک قسم کا زمینی لگان ہے، جو صرف ان زمینوں پر عائد کیا جاتا ہے۔ جو فقہی تفصیلات کے مطابق خراجی ہوں۔ اور اسکو حکومت اجتماعی کاموں میں صرف کر سکتی ہے۔ اور جزیہ ایک تو ان غیر مسلم افراد سے وصول کیا جاتا ہے جو اسلامی حکومت کے باشندے ہوں اور حکومت نے ان کے جان مال اور آبرو کی حفاظت کا ذمہ لیا ہو دوسرے ان غیر مسلم ممالک سے بھی جزیہ وصول کیا جا سکتا ہے جن سے جزیہ کی ادائیگی پر صلح ہوئی ہو۔ یہ رقم بھی حکومت کے اجتماعی مقاصد میں صرف ہوتی ہے۔

اوپر تقسیم دولت کے جو ثانوی مدات بیان کئے گئے ہیں، ۔ یہ سب وہ ہیں جن میں دولت صرف کرنا دولت کے اولین مالکوں کے ذمہ شخصی طور پر واجب قرار دیا گیا ہے، غربا و مساکین پر اور مسلمانوں کے اجتماعی مقاصد میں خرچ کرنے کی جو ترغیبات قرآن وسنت میں وارد ہوئی ہیں، وہ ان کے علاوہ ہیں، قرآن کریم کا ارشاد ہے۔

يَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ قُلِ الْعَفْوَ (۲: ۲۱۹)

لوگ آپ سے پوچھتے ہیں کہ وہ کیا خرچ کریں، آپ فرمادیجئے کہ جو بچ رہے۔

اس ارشاد نے واضح فرمادیا ہے کہ اللہ کے نزدیک پسندیدہ بات یہ ہے کہ انسان صرف مقدار واجب خرچ کرنے پر اکتفا نہ کرے، بلکہ جس قدر دولت اس کی ضرورت سے زائد ہو، وہ سب معاشرے کے ان افراد تک پہنچانے کو اپنی سعادت سمجھے جو دولت سے محروم ہیں، قرآن کریم اور احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم "انفاق فی سبیل اللہ" کے احکام وفضائل سے بھرے ہوئے ہیں۔

پیشہ وارانہ گداگری کا انسداد

معاشرہ کے کمزور افراد کو سرمایہ داروں کے اموال میں حق دلانے سے دوسری طرف معاشرہ میں اس خرابی کے امکانات تھے کہ معاشرہ کا یہ طبقہ مفلوج ہوکر ہمیشہ قوم پر بار بنا رہے، شریعت اسلام نے اس پر بھی گہری نظر کر کے ان کو بھی خاص قانون کا پابند بنایا ہے کہ

۱۔ تندرست توانا آدمی کو بجز مخصوص حالات کے سوال کرنے کا حق نہیں دیا، قرآن کریم نے "فقراء" کی قابل تعریف صفت یہ بیان فرمائی ہے کہ

لایسئلون النّاس الحافاً

"یعنی وہ لوگوں سے لگ لپٹ کر سوال نہیں کرتے۔"

۲۔ جس شخص کے پاس ایک دن کے گذارہ کا سامان موجود ہو اس کے لئے سوال حرام کردیا۔

۳۔ سوال کرنے کو حدیث میں ذلت قرار دیا۔

۴۔ جس شخص کے پاس بقدر نصاب مال موجود ہو اس کے لئے بغیر سوال کے بھی صدقہ لینا حرام

کر دیا۔

۵۔ غرباء و مساکین کو اس کی ترغیب دی کہ محنت مزدوری کی کمائی کو عزت سمجھیں صدقات سے گریز کریں۔

۶۔ ارباب اموال کو اس کی ہدایت کی اموال صدقات صرف اپنی جیب سے نکالنا کافی نہیں بلکہ اس کے مستحقین حاجت مندوں کو تلاش کر کے ان کو پہنچانا بھی ان کی ذمہ داری ہے۔

۷۔ محکمہ احتساب کے ذریعہ گداگری کا انسداد کیا گیا۔

ان احکام کے ذریعہ اسلام نے تقسیم دولت کا جو خوشگوار نظام قائم فرمایا ہے اس کے نتیجہ میں ہماری تاریخ میں ایسی مثالیں بھی ہیں کہ معاشرے میں صدقات کو قبول کرنے والا ڈھونڈنے سے نہیں ملتا تھا، یہ اسلامی نظام تقسیم دولت کے چند نمایاں خدو خال تھے۔ اس مختصر مقالے میں اس نظام کی اتنی ہی جھلک دکھائی جا سکتی تھی لیکن امید ہے کہ ان گذارشات سے یہ بات واضح ہوگئی کہ، اس معاملے میں اسلامی نظام معیشت سرمایہ داری اور اشتراکیت دونوں سے کس طرح ممتاز ہے اور اس کی بنیادی خصوصیات کیا ہیں۔

وللہ الحمد اولہ و آخرہ وظاہرہ و باطنہ

بندہ محمد شفیع

خادم دار العلوم کراچی ۱۴

یکم ذیقعدہ ۱۳۸۷ھ یکم فروری ۱۹۶۸ء

۷۵

کیا ہندوستان دارالحرب ہے؟

تاریخ تالیف ——— ۲۹ر ربیع الثانی ۱۳۵۲ھ (مطابق ۱۹۳۳ء)

مقامِ تالیف ——— دارالعلوم دیوبند

ہندوستان کے دارالاسلام اور دارالحرب ہونے کا مسئلہ ایک عرصہ تک زیر بحث تھا، اس مسئلہ میں حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک مفصل اور مکمل فتویٰ فارسی زبان میں شائع ہوا تھا، حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ نے افادۂ خاص و عام کے لئے اردو زبان میں اس کا ترجمہ کیا جس کو اب جواہر الفقہ کا حصہ بنایا جا رہا ہے۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

کیا ہندوستان دار الحرب ہے؟ (۱)

ہندوستان چونکہ باعتبار اپنی آبادی حکومت وتسلط مسلم وغیر مسلم پر مشتمل ہے اوران کے بدلنے کے ساتھ ساتھ بہت سے احکام اسلام میں بھی تغیر وتبدل ہو جاتا ہے۔ اسی لئے ہندوستان کے دار الاسلام ودار الحرب ہونے کا مسئلہ ایک عرصہ سے زیر بحث چلا آتا ہے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں آج قطب عالم جنید زمان ابوحنیفۂ وقت حضرت مولانا رشید احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا وہ فتویٰ شائع کیا جاتا ہے جو آپ نے ہندوستان کے دار الحرب ہونے کے متعلق بعض اہل علم تلامذہ کے سوال کے جواب میں مفصل ومکمل تحریر فرمایا ہے اور جس کی نقل حضرت ممدوح کے صاحبزادے حضرت العلامۃ مولانا حکیم مسعود احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے احقر کو عطا فرمائی تھی اور حضرت کے اقارب وتلامذہ میں دوسرے متعدد حضرات کے پاس بھی اس کی نقلیں موجود ہیں۔

اس مسئلہ کی ضرورت اور شرعی اہمیت

جولوگ فقہ اور فتاویٰ سے مناسبت رکھتے ہیں ان پر یہ بات مخفی نہیں کہ تقریباً فقہ کے تمام ابواب نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، نکاح، طلاق اور بالخصوص بیع وشراء، اجارہ و

---

(۱) دار الحرب فقہ کا اصطلاحی لفظ ہے جو دار الکفر وغیرہ کے مفہوم کو بھی شامل ہے۔ ۱۲

دیگر معاملات میں سیکڑوں مسائل شرعیہ دارالاسلام کے لئے کچھ ہے اور دارالحرب کے لئے دوسرا۔ اس لئے اگر یوں کہا جائے کہ احکام شرعیہ کا ایک بہت بڑا حصہ اس پر موقوف ہے کہ ان پر عمل کرنے والے جس ملک میں آباد ہیں پہلے اس کا دارالاسلام یا دارالحرب ہونا متعین کریں تو بالکل صحیح و درست ہے اسی لئے مدت سے یہ مسئلہ علماء ہندوستان میں زیر بحث ہے۔ قطب عالم حضرت مولانا گنگوہی قدس سرہٗ سے بھی یہ مسئلہ دریافت کیا گیا۔ حضرت نے ضرورت وقت کا لحاظ فرما کر خلاف عادت اس کا جواب نہایت شرح و بسط کے ساتھ تحریر فرمایا جو الحمد للہ احقر کو دستیاب ہو گیا اور رسالہ المفتی کو اس کی اشاعت کا شرف حاصل ہوا۔

(نوٹ) اصل فتویٰ فارسی زبان میں ہے احقر نے افادۂ خاص و عام کے خیال سے اصل فتویٰ کو بعنیہ باقی رکھنے کے ساتھ اس کا ترجمہ اردو بھی ساتھ ساتھ لکھ دیا۔ حق تعالیٰ اس کو بھی اصل کی طرح مقبول و مفید فرمائے۔ آمین اصل رسالہ پر حضرت نے کوئی نام تجویز نہیں فرمایا بغرض سہولت احقر نے اس کا نام بھی فیصلۃ الاعلام فی دارالحرب و دارالاسلام رکھ دیا

ناکارۂ خلائق بندہ محمد شفیع

۲۹ ربیع الثانی ۱۳۵۲ھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

سوال:۔ حضرت علماء کرام اور مفتیان اسلام کی خدمت میں عرض ہے کہ بہت سے احکام شرعیہ اس پر موقوف ہیں کہ دار الاسلام اور دار الحرب میں امتیاز کیا جاوے جیسا کہ حضرات علماء پر مخفی نہیں۔

پس اس مسئلہ میں حضرات علماء عصر کیا فرماتے ہیں کہ بلاد ہندوستان جو آج کل ہر طرح سے نصاریٰ کے تسلط وحکومت میں ہیں احکام شرعیہ میں ان کو دار الحرب قرار دیا جائے گا یا دار الاسلام۔ بینوا توجروا۔

الجواب:۔ پہلے یہ بات سمجھ لینا چاہئے کہ کسی ملک اور کسی شہر کے دار الاسلام یا دار الحرب ہونے کا مدار اس پر ہے کہ اس پر غلبہ اہل اسلام کا ہے یا کفار کا۔ بناء علیہ جو شہر مسلمانوں کے زیر حکومت ہے وہ دار الاسلام کہلائے گا جیسا کہ جامع الرموز میں ہے:۔

دار الاسلام ما یجری فیه حکم امام المسلمین و کانوا فیه آمنین و دار الحرب ما خافوا فیه من الکافرین . انتهی .

دار الاسلام وہ ملک ہے جس میں مسلمانوں کے امام کا حکم چلتا ہو اور مسلمان اس میں مامون ہوں اور دار الحرب وہ ہے جس میں مسلمان کفار سے اپنے جان و مال کا خوف رکھتے ہوں۔

اور در مختار میں ہے۔

سئل قارئ الهداية عن البحر الملح امن دار الحرب او الاسلام اجاب انه ليس من احد القبيلتين لا نه لا قهر لاحد عليه انتهىٰ

''قاری الہدایہ سے سمندر کے متعلق دریافت کیا گیا کہ وہ دار الحرب میں داخل ہے یا دار الاسلام میں تو انہوں نے جواب دیا کہ وہ دونوں میں سے کسی میں بھی داخل نہیں کیونکہ اس پر کسی کا (مکمل) قبضہ نہیں ہے۔''

اس عبارت کے نقل کرنے سے ہماری غرض یہ ہے کہ کسی ملک کے دار الاسلام یا دار الحرب ہونے کا مدار صرف اسلام یا کفر کے غلبہ پر ہے اور اگر چہ سمندر کے بارے میں قول راجح یہی ہو کہ وہ دار الحرب میں داخل ہے لیکن ہر ایسے مقام کو جو اہل اسلام و کفار دونوں کا (برابر درجہ میں) مقہور ہو دار الاسلام ہی کہا جائے گا۔ کیونکہ قاعدہ مشہورہ ''الاسلام يعلو ولا يعلى'' (یعنی اسلام غالب رہتا ہے مغلوب نہیں ہوتا) اسی کا مقتضی ہے۔ مگر اس مقام کو دار الاسلام اسی شرط مذکور کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ بعض حکام اسلام کا قبضہ اور تسلط اس جگہ ہو ورنہ محض اس بنا پر کہ اس ملک میں مسلمان آباد ہیں یا وہ کفار کی اجازت سے شعائر اسلامیہ کو ادا کر سکتے ہیں اس ملک کو دار الاسلام نہیں کہہ سکتے۔ کیونکہ کسی ملک میں محض مسلمانوں کے آباد ہونے اور باذن کفار شعائر اسلامیہ کو ادا کر سکنے کا کوئی اعتبار نہیں۔ اسی طرح کسی ملک میں کفار کا آباد ہونا یا شعائر کفر کا مسلمانوں کی اجازت یا ان کی غفلت سے وہاں ظاہر کرنا اس ملک کے دار الاسلام ہونے میں کوئی فرق پیدا نہیں کرتا۔ اس لئے کہ ان دونوں صورتوں میں غلبہ ان لوگوں کا نہیں پایا جاتا اور مدار حکم غلبہ ہی ہے محض وجود یا ظہور پر نہیں۔

یہی وجہ ہے کہ کفار اہل ذمہ دار الاسلام میں مسلمانوں کی اجازت سے آباد

رہتے ہیں اور اپنے شعائر کا اظہار بھی کرتے ہیں۔ مگر دارالاسلام اپنے حال پر دارالاسلام ہی رہتا ہے۔ اسی طرح مسلمان دارالحرب میں جاتے ہیں اور اپنے شعائر کو بھی ظاہر کرتے ہیں۔ مگر صرف اتنی بات سے وہ ملک دارالحرب ہونے سے خارج نہیں ہو جاتا۔ کیا آپ نہیں دیکھتے کہ فخر عالم صلی اللہ علیہ وسلم فتح مکہ سے پہلے جب کہ مکہ مکرمہ دارالحرب تھا۔ عمرۂ قضا میں صحابہ کرام کی ایک بڑی جماعت کے ساتھ مکہ معظّمہ تشریف لے گئے اور جماعت و نماز و عمرہ وغیرہ شعائر اسلام کو اعلان کے ساتھ ادا فرمایا اور اتنی بڑی جماعت آپ کے ساتھ تھی کہ کفار کو مقہور و مغلوب کر سکتی تھی۔ چنانچہ (عمرہ قضا سے پہلے) غزوہ حدیبیہ میں اسی قدر لشکر کے ساتھ یہ عزم ہو چکا تھا کہ مکہ معظّمہ پر چڑھائی کر دی جائے (مگر پھر جب واقعات کی تحقیق سے حضرت عثمان غنیؓ کے قتل کی خبر غلط ثابت ہوئی تو اس عزم کو چھوڑ دیا گیا۔ الغرض آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت اس قدر لشکر اپنے ساتھ رکھتے تھے جو کفار مکہ کو مغلوب کر سکتا تھا) مگر چونکہ یہ (مکہ کا داخلہ) اور شعائر اسلام کا اظہار باذن کفار تھا اس لئے ان تین روز میں مکہ معظّمہ کو بحکم دارالاسلام نہیں سمجھا گیا بلکہ وہ بدستور دارالحرب رہا۔ کیونکہ یہ قیام مکہ اور اظہار اسلام اجازت کی بنا پر تھا غلبہ کی بنا پر نہ تھا۔

خلاصہ یہ ہے کہ قاعدہ کلیہ اس بات میں یہ ہے کہ دارالحرب وہ ہے جو مقہور کفار ہو اور دارالاسلام وہ جو مقہور اہل اسلام ہو۔ اگرچہ ایک دار میں دوسرے دار کے لوگ بھی بدوں غلبہ و قہر کے آباد ہوں (مثلاً دارالاسلام میں کفار یا دارالحرب میں مسلمان بلا غلبہ و قہر آباد ہوں)

اور جس ملک پر دونوں فریق (اہل اسلام اور کفار) کا تسلط ہو وہ بھی دارالاسلام ہی سمجھا جائے گا۔ اس قاعدہ اور اصل کلی کو اچھی طرح ذہن نشین کر لینا

چاہیئے ۔ کیونکہ تمام مسائل متعلقہ اسی اصل سے نکلتے ہیں اور اس باب کی تمام جزئیات اسی اصل کلی پر دائر ہیں)۔

دارالحرب پر مسلمانوں کا قبضہ

اسکے بعد ایک اور بات سن لینا چاہیئے وہ یہ کہ جو ملک اصل سے دارالحرب و دارالکفر تھا۔ پھر مسلمانوں نے اس پر غلبہ پالیا اور احکام اسلام کو وہاں جاری کر دیا۔ اسکے متعلق تمام علماء کا اتفاق ہے کہ وہ ملک اب دارالاسلام ہو گیا۔ کیونکہ اس میں مسلمانوں کا غلبہ اور قہر متحقق ہو گیا۔ اور اگر چہ کسی حیثیت سے کفار کا بھی کچھ غلبہ وہاں باقی ہو۔ تاہم بحکم **الاسلام یعلو ولا یعلیٰ** یہ ملک باتفاق دارالاسلام ہو گیا۔ جیسا کہ پہلے واضح کر دیا گیا ہے اور اس کے بعد یہ بھی ظاہر کر دینا ضروری ہے کہ اگر مسلمانوں کا داخلہ اور احکام اسلامیہ کا اجراء اس ملک میں غلبہ کے ساتھ نہ ہوتو اس ملک کے دارالحرب ہونے میں کوئی فرق پیدا نہ ہوگا۔ ورنہ جرمن اور روس اور فرانس اور چین وغیرہ جو نصاریٰ یا بت پرستوں کے قبضہ میں ہیں سب کے سب دارالاسلام کہلانے کے مستحق ہو جائیں گے اور ساری دنیا میں کہیں دارالحرب کا نام و نشان نہ رہے گا۔ کیونکہ تمام ممالک کفار میں مسلمان باذن کفار احکام اسلامیہ کو ادا کرتے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ تمام دنیا کو بحالت موجودہ دارالاسلام قرار دینا بالکل باطل ہے۔

دارالاسلام پر کفار کا قبضہ

اور جو ملک یا شہر دارالاسلام تھا پھر اس پر کفار نے غلبہ کر لیا۔ اگر وہاں سے اسلام کا غلبہ بالکلیہ زائل ہو گیا تو وہ ملک اب دارالحرب کے حکم میں ہو گیا۔ اور اگر کفار کا غلبہ تو ہوا مگر بعض حیثیات سے اس میں اسلام کا غلبہ بھی باقی ہے تو اس کو اب

بھی دار الاسلام ہی کہا جائیگا نہ کہ دار الحرب۔ اتنی بات پر سب ائمہ کا اتفاق ہے۔ البتہ اس میں کلام ہے کہ غلبہ اسلام کے بالکل زائل ہو جانے کی حد کیا ہے۔ سو اس میں صاحبین یعنی امام ابو یوسف و محمد رحمۃ اللہ علیہما فرماتے ہیں کہ جب کفار نے علی الاعلان احکام کفر کو جاری کر دیا اور مسلمان اپنے غلبہ وقدرت سے بلا اجازت کفار احکام اسلام کو جاری نہیں کر سکتے تو غلبہ اسلام بالکل مرتفع ہو گیا اور یہ ملک بحکم دار الحرب ہو گیا۔ البتہ اگر دونوں فریق یعنی اہل اسلام و کفار اپنے اپنے احکام کو اپنے اپنے غلبہ اور قدرت سے علی الاعلان جاری کرتے ہوں تو ابھی تک اس سے غلبہ اسلام بالکلیہ زائل نہیں ہوا اور اس ملک کو دار الحرب نہیں کہہ سکتے۔ اور جب کہ کفار اپنے احکام کو غلبہ وتسلط کے ساتھ علی الاعلان جاری کرتے ہوں اور مسلمان بلا ان کی اجازت کے اپنے احکام علی الاعلان جاری رکھنے پر قدرت نہ رکھیں تو وہاں غلبۂ اسلام بالکل مرتفع اور زائل ہو گیا۔ اور قیاس اسی کا مقتضی ہے جو حضرات صاحبین فرماتے ہیں۔ کیونکہ جب کفار اس طرح مسلط ہو گئے کہ احکام کفر اپنے غلبہ سے علی الاعلان جاری کرتے ہیں اور اہل اسلام اس قدر عاجز و مغلوب ہو گئے کہ اپنے احکام جاری نہیں کر سکتے اور احکام کفر کو جو کہ اسلام کے لئے عار اور ننگ ہیں دور نہیں کر سکتے۔ تو اب کون سا درجہ اسلام کا باقی ہے کہ اس ملک کو دار الاسلام کہا جائے۔ بلکہ اس صورت میں تسلط اور غلبہ کفار انتہا کو پہنچ گیا۔ اور یہ ملک بالفعل دار الحرب ہو گیا آئندہ جو کچھ ہونا مقدر ہے وہ ہو رہے گا مگر اس وقت اس کے دار الحرب اور مقہور کفار ہونے میں کوئی دقیقہ باقی نہیں رہا اور قدیم دار الحرب کی طرح کفار کا مغلوب و مقہور ہو گیا جیسا کہ بالکل ظاہر ہے۔ لیکن امام اعظم ابو حنیفہؒ نے نظر دقیق سے بطور استحسان کے یہ فرمایا ہے کہ جب تک غلبہ اسلام کے آثار میں سے کوئی چیز پائی جائی یا استیلاء کفار میں ایسا ضعف محسوس ہو کہ مسلمانوں پر اس کا

زائل کر دینا مشکل نہ ہو۔ اس وقت تک اس ملک پر دارالکفر ہونے کا حکم نہیں کرنا چاہئیے۔ اسی بناء پر امام اعظمؒ نے اس ملک کے دارالحرب ہونے کے لئے دو شرطیں زائد فرما دیں۔ شرط اول: ایک یہ کہ جس دارالاسلام پر کفار نے تسلط کیا ہے وہ دارالحرب کے ساتھ متصل ہو، اسکے اور دارالحرب کے درمیان کوئی ملک یا شہر دارالاسلام حائل نہ ہو۔ کیونکہ اس طرح دارالحرب کے ساتھ اتصال اور دارالاسلام سے انقطاع کی وجہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اب یہ ملک پوری طرح سے کفار کے قبضہ میں چلا گیا اور تسلط اور غلبہ ان کا مستحکم ہو گیا اور ان کے ہاتھوں سے چھڑانا اس کا مشکل ہو گیا۔

اور یہ مسئلہ اس کی نظیر ہے کہ اگر کفار مسلمانوں کے مال پر استیلاء و تسلط کر لیں تو اس کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ اس مال کو اپنے ملک میں لے جا کر مکمل قبضہ کر لیں۔ اس صورت میں تو یہ مال ان کی ملک میں داخل سمجھا جائے گا۔ اور دوسری صورت یہ ہے کہ ہنوز اس مال کو اپنے ملک میں نہیں لے گئے اور احراز و قبضہ مکمل نہیں ہوا تو اس وقت تک اس کے مالک کی ملک اس سے منقطع نہیں ہوئی اور کفار کی ملک میں داخل نہیں ہوا۔ جیسا کہ تمام کتب فقہ میں یہ مسئلہ طے شدہ ہے۔ ہدایہ میں ہے:

واذا غلبوا علی اموالنا واحرزوھا بدارھم ملکوھا.

انتھی.

اور جب کفار ہمارے اموال پر غالب آ جائیں اور ان کو اپنے ملک میں لے جائیں تو وہ ان اموال کے مالک ہو جاتے ہیں۔

اور فرمایا ہے:

غیر ان الاستیلاء لا یتحقق الا بالا حراز بالدار لانہ عبارۃ عن الاقتدار علی المحل حالاً و مالاً.

”مگر استیلاء کفار اس وقت تک متحقق نہیں ہوتا جب تک وہ ان اموال کو اپنے ملک میں نہ لے جائیں کیونکہ استیلاء کی حقیقت یہ ہے کہ کسی محل پر قبضہ بالفعل بھی ہو اور (بظاہر اسباب) وہ قبضہ بھی باقی رہ سکے۔“

پس اسی طرح اگر کسی زمین یا کسی شہر پر کفار کا استیلاء و مکمل تسلط اس طرح ہو گیا کہ اس کا احراز دارالحرب کے ساتھ ہو گیا اور احراز کی صورت زمین کے بارہ میں یہی ہو سکتی ہے کہ اس کا اتصال دارالحرب کے ساتھ ہو جاوے اور دارالاسلام سے منقطع ہو جاوے تو اس صورت میں وہ ملک بالکلیہ مقہور کفار ہو گیا اور جب تک ایسا نہ ہو تو اس پر استیلاء اہل اسلام باقی سمجھا جائیگا۔ اگرچہ یہ استیلاء و تسلط ضعیف ہی ہو اور بحکم الاسلام یعلو و لا یعلی اس کا مقتضیٰ یہ ہوگا کہ یہ ملک دارالاسلام باقی رہے۔ پس خلاصہ اس شرط کا بھی وہی غلبۂ کفار اور مغلوبیت اہل اسلام ہے جو ابتداء میں بطور قاعدہ کلیہ کے بیان کر دیا گیا ہے۔

شرط دوم: امام اعظمؒ کے نزدیک یہ ہے کہ حاکم اسلام نے جو امان مسلمانوں کو بسبب اسلام کے اور کفار رعایا کو بسبب ذمی ہونے کے دے رکھا تھا وہ امان زائل ہو جاوے کہ کوئی شخص اس سابقہ امان کی وجہ سے اب اپنے جان و مال پر مامون نہ رہے۔ یعنی جیسا کہ حاکم مسلم کے امن دے دینے کی وجہ سے سب بے خوف تھے کسی کو اس کی مجال نہ تھی کہ کسی کے جان و مال پر ظلم کرے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ ایسا امن بدون حاکم مسلم کے غلبہ اور قوت و شوکت کے حاصل نہیں ہو سکتا۔ پس اب یہ امان باقی نہ رہے بلکہ بے کار ہو جاوے اور باعث امن صرف وہ امان ہو جو غالب آنے والے کفار اپنے قانون کے موافق دیں۔ پس ظاہر ہے کہ جب تک حاکم مسلم کے امن کی وجہ سے موذی کا خوف رفع ہوتا رہے تو غلبہ و شوکت اس حاکم مسلم کا باقی سمجھا جائیگا۔ اور جب یہ کچھ باقی نہ رہے بلکہ کافر متغلب کے امن ہی پر نظر رہ جائے تو

امان اول زائل ہو گیا۔

خلاصہ: یہ ہے کہ امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک علی الاعلان اجرائے احکام کفر کے بعد یہ دو شرطیں بھی پائی جائیں اس وقت من کل الوجوہ غلبۂ کفار مانا جائے گا اور غلبۂ اہل اسلام کو زائل و مرتفع سمجھا جائے گا۔ اس وقت ناچار اس ملک پر دار الحرب ہونے کا حکم کیا جائے گا۔

اہل عقل کو اس سے بھی معلوم ہو گیا کہ اس قول کا مدار بھی صرف قہر و غلبہ پر ہے جس کی توضیح ابتداء میں بضمن قاعدہ کلیہ کر دی گئی ہے۔

اس کے بعد فقہاء کی روایات و عبارات سننی چاہئیں کہ ان میں سے بعض سے بندہ کی تقریر مذکور کی دلیل حاصل ہو گی اور بعض سے اس مسئلہ کے متعلق روایات کی حقیقت واضح ہو جائے گی۔

عالمگیری میں ہے:۔

قال محمد فی الزیادات انما یصیر دارالاسلام دارالحرب عند ابی حنیفة بوجوهٍ احدها اجراء احکام الکفر علی سبیل الاشتهار وان لا یحکم فیها بحکم الاسلام . الثانی ان تکون متصلةً بدارالحرب لا یتخلل بینهما بلدة من بلاد الاسلام . الثالث. ان لا یبقی مسلم او ذمی آمنا بامانه الاول الذی کان ثابتاً قبل استیلاء الکفار للمسلم باسلامه وللذمّی بعقد الذمة وصورة المسئلة علی ثلثة اوجهٍ اما ان یغلب اهل الحرب علی دار من دورنا او ارتد اهل مصرٍ وغلبوا واجروا احکام الکفر او نقض اهل ذمة العهد وتغلبوا علیٰ دارهم ففی

کل ھذا لا تصیر دار حرب الا بثلث شرائط . وقال ابو یوسف رحمة اللّٰہ علیہ و محمد رحمة اللّٰہ علیہ بشرط واحدٍ لا غیر وھو اظھار احکام الکفر وھو القیاس . انتھیٰ.

''امام محمدؒ نے زیادات میں فرمایا ہے کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک دارالحرب ہونا چند وجوہ پر ہے ایک احکام کفر کا علی الاعلان جاری کرنا۔ احکام اسلام وہاں جاری نہ رہنا۔ دوسرے یہ کہ وہ دارالحرب کے ساتھ متصل ہو جاوے ان کے درمیان کوئی شہر دارالاسلام کا حائل نہ ہو۔ تیسرے یہ کہ کوئی مسلمان اور کوئی ذمی کافر اپنے اس امان سابق کے ساتھ مامون و محفوظ نہ رہ سکے جو اس کو غلبۂ کفار سے پہلے مسلمان ہونے کے یا بحیثیت عہد ذمہ کے حاصل تھی اور صورت دارالحرب بننے کی تین ہیں۔ ایک یہ کہ اہل حرب ہمارے دارالاسلام پر غالب آجائیں۔ دوسرے یہ کہ (معاذ اللہ) کسی شہر کے مسلمان مرتد ہو کر شہر پر غالب آجائیں اور احکام کفر جاری کردیں۔ تیسرے یہ کہ ذمی کافر جو مسلمانوں کی رعایا بن کر رہتے تھے عہد شکنی کر کے باغی ہو جاویں اور دارالاسلام پر غالب آجائیں۔ لیکن ان تمام صورتوں میں دارالاسلام اس وقت تک درالحرب نہ ہوگا جب تک تین شرطیں (مذکورہ) نہ پائی جاویں۔ اور امام ابو یوسفؒ و محمدؒ فرماتے ہیں کہ صرف ایک شرط متحقق ہونے سے دارالحرب کا حکم کر دیا جائے گا اور وہ شرط یہ ہے کہ احکام کفر کو علی الاعلان جاری کر دیں اور قیاس اسی کا مقتضی ہے۔ انتہی۔

اور جامع الرموز میں ہے:

فاما صیر و رتھا دار الحرب فعندہ بشرائط احدھا اجراء

احکام الکفر اشتهاراً بان یحکم الحاکم بحکمهم و لا یرجعون الی قضاة المسلمین کما فی البحر و الثانی اتصال بدار الحرب بحیث لا یکون بینهما بلدة من بلاد الاسلام ما یلحقهم المدد منها الخ

''لیکن دار الاسلام کا دار الحرب ہو جانا سو یہ امام اعظمؒ کے نزدیک تین شرطوں پر موقوف ہے ایک اجراء احکام کفر علی الاعلان اس طرح کہ حکام وقت کفار کے حکم کو جاری کریں اور لوگ مسلمان قاضیوں کی طرف مراجعت نہ کر سکیں جیسا کہ بحر الرائق میں مذکور ہے دوسرا اس کا دار الحرب کے ساتھ ایسا متصل ہو جانا کہ کوئی شہر اسلامی شہروں میں سے درمیان میں حائل نہ رہے جس سے مسلمانوں کو مدد پہنچ سکے۔''

جامع الرموز کی اس روایت سے دو امر واضح ہوئے اول یہ کہ احکام اسلام کے جاری کرنے سے مراد یہ ہے کہ غلبہ اور قوت کے ساتھ احکام اسلام جاری کئے جائیں نہ مطلقاً ادائے جماعۃ و جمعہ باذن کفار کیونکہ جامع الرموز کی عبارت میں ہے یحکم بحکمهم ولا یرجعون الیٰ قضاة المسلمین ۔یعنی قضاۃ مسلمین کو کسی قسم کی شوکت و وقعت نہ رہے کہ لوگ ان کی طرف رجوع کر سکیں۔ اسی طرح مسلمانوں کا دار الحرب میں احکام اسلام کا جاری کرنا اسی صورت میں اس کو دار الاسلام بنا سکتا ہے جب کہ یہ اجراء احکام علی الاعلان اپنے غلبہ و تسلط کے ذریعہ ہو جیسا کہ بالکل ظاہر ہے۔

بہر حال حکم اسلام اور حکم کفر دونوں بطریق غلبہ معتبر ہیں نہ کہ محض ادا بطریق اظہار دوسری بات جامع الرموز کی عبارت سے یہ مستفاد ہوئی کہ دار الحرب کے ساتھ متصل ہونے کی جو شرط امام صاحبؒ کے نزدیک ضروری ہے اس کا مطلب بھی وہی قوت و غلبہ ہے۔ کیونکہ دار الحرب کے ساتھ متصل ہو جانے کی صورت میں

مسلمانوں کو مدد نہیں پہنچ سکتی ہے۔ بخلاف اس صورت کے کہ دارالحرب سے انقطاع ہو تو مسلمانوں کو استخلاص دارالاسلام میں پہنچنے کا احتمال قریب ہے۔ اس لئے ابھی تک قوت اسلام کو باقی سمجھا جائے گا۔

اور خزانۃ المفتیین میں ہے کہ کوئی دارالاسلام اس وقت تک دارالحرب نہیں بن سکتا جب تک کہ اس میں احکام کفر علی الاعلان جاری نہ ہو جائیں اور وہ ملک دارالحرب کے ساتھ متصل نہ ہو جائے کہ اس کے اور دارالحرب کے درمیان کوئی شہر بلاد مسلمین میں سے باقی نہ رہے اور یہ کہ کوئی مسلمان یا ذمی رعایا امان سابق کے ساتھ اب مامون و محفوظ نہ رہ سکے۔ بلکہ ہر مسلمان اور ذمی کو اس ملک میں بسر کرنا بغیر امان دینے کفار کے نہ ہو سکے۔ الخ

اور فتاویٰ بزازیہ میں ہے سید امامؒ فرماتے ہیں کہ آج کل جو شہر کفار کے قبضہ میں ہیں بلا شبہ وہ ابھی تک دارالاسلام ہیں کیونکہ ان میں احکام کفر ظاہر نہیں ہوئے بلکہ قضاۃ و حکام وہاں مسلمان ہیں۔ تو اب یہ دیکھنا چاہئے کہ عبارت مذکورہ میں ان شہروں کے دارالاسلام ہونے پر یہ دلیل لائے ہیں کہ حکام و قضاۃ وہاں مسلمان ہیں جس کی وجہ سے احکام اسلام ان میں بدستور سابق باقی ہیں۔ دلیل میں یہ نہیں فرمایا کہ لوگ یہاں نماز پڑھتے ہیں اور جمعہ قائم کرتے ہیں۔ کیونکہ اجرائے احکام سے مراد وہی اجراء ہے جو بطور غلبہ و شوکت کے ہو نہ کہ اپنے دین کے مراسم و شعائر کو حاکم کافر کی رضا و اجازت سے ادا کیا جائے۔

اور درمختار میں ہے۔ معراج الدرایہ میں مبسوط سے نقل کیا ہے کہ وہ شہر جو کفار کے قبضہ میں ہیں دارالاسلام ہیں دارالحرب نہیں کیونکہ انہوں نے ان شہروں میں احکام کفر جاری نہیں کئے بلکہ وہاں ایسے حکام اور قاضی موجود ہیں جن کو مسلمانوں نے منتخب کر کے حاکم بنایا ہے اور وہ ان کی بضرورت و بلا ضرورت اطاعت کرتے

ہیں۔ اور ہر ایسا شہر جس میں مسلمانوں کی طرف سے کوئی والی مقرر ہو اس کے لئے اقامت جمعہ وشعائر اسلامیہ اور حدود وقصاص اور احکام وقضاۃ کا مقرر کرنا سب جائز ہیں کیونکہ ان پر امیر مسلم حاکم ہے اور اگر خود کفار ہی نے کسی مسلمان کو حاکم بنا دیا تب بھی مسلمانوں کے لئے جائز ہے کہ اس کی زیر حکومت جمعہ وغیرہ قائم کریں اور مسلمانوں کے اتفاق ورضامندی سے قاضی بن سکتا ہے۔ اور (دار الحرب کے) مسلمانوں پر واجب ہے کہ کوئی والی مسلم تلاش کریں (اور اپنے معاملات کا رجوع اس کی طرف کریں) انتہی

اور اسی معراج الدرایہ میں ہے کہ میں کہتا ہوں کہ اس سے یہ بھی ظاہر ہو گیا کہ ملک شام میں جو پہاڑ ''ایتم اللہ'' اور اس کے متعلقہ بعض شہر ہیں سب کے سب بلاد اسلام ہیں کیونکہ ان کے حکام اگرچہ قوم دروز یا نصاریٰ ہیں لیکن وہ سب ہمارے مسلم حکام کے تابع ہیں اور ان کی طرف سے قضاہ وحکام مقرر ہیں اور چاروں طرف سے بلاد اسلام ان کے اس طرح محیط ہیں کہ جب ہمارے حکام واولوالامر چاہیں تو وہاں اپنے احکام نافذ کر سکتے ہیں انتہی۔

ان دونوں روایتوں سے واضح ہو گیا کہ غلبہ کفار کے بعد کسی ملک کے دار الاسلام باقی رہنے کے لئے جو اجراءِ احکام اسلام شرط ہے اس سے یہی مراد ہے کہ بطریق غلبہ و شوکت احکام اسلام جاری ہو سکتے ہوں۔ اسی طرح دار الحرب میں احکام اسلام کا اجراء جب اس کے دار الحرب ہونے کو زائل کر سکتا ہے جب کہ یہ اجرائے احکام بطریق غلبہ وقوت ہو نہ یہ کہ دار الحرب کا حاکم اپنی اجازت سے احکام اسلام جاری کراوے۔

حاصل یہ ہے کہ امام اعظمؒ کے نزدیک مذکورہ سابقہ تین شرطوں سے اور صاحبین کے نزدیک شرط واحد یعنی اجراء احکام اسلام سے مقصود ایک ہی چیز ہے یعنی وجود غلبہ وقوت اگرچہ بعض وجوہ سے ہو۔ لیکن علماء اسلام میں کوئی شخص بھی اس کا

قائل نہیں کہ کفار کے ملک میں اگر کوئی شخص ان کی صریح اجازت سے یا ان کی چشم پوشی کی وجہ سے شعائر اسلام کا اظہار کرے تو یہ ملک درالاسلام ہو جائے گا۔ حاشا وکلا۔ کیونکہ ایسا خیال بالکل تفقہ سے دور ہے۔

حالت ہندوستان

اور جب یہ مسئلہ (کلی طور پر) محقق ہو چکا تو اب ہندوستان کی حالت پر خود غور کر لیں کہ اس جگہ کفار نصاریٰ کے احکام کا اجراء کس قوت وغلبہ کے ساتھ ہے کہ اگر کوئی ادنیٰ کلکٹر یہ حکم کر دے کہ مساجد میں جماعت ادا نہ کرو تو کسی امیر وغریب کی مجال نہیں کہ ادا کر سکے۔ اور یہ جو کچھ ادائے جمعہ وعیدین اور عمل (بعض) قواعد شرعیہ پر جو کچھ ہو رہا ہے محض ان کے قانون کی وجہ سے کہ انہوں نے یہ حکم جاری کر دیا ہے کہ ہر شخص اپنے اپنے مذہب میں آزاد ہے کسی کو اس سے مزاحمت کا حق حاصل نہیں۔

اور سلاطین اسلام کا دیا ہوا امن جو یہاں کے رہنے والوں کو حاصل تھا اب اس کا کہیں نام ونشان نہیں۔ کون عقلمند کہہ سکتا ہے کہ ہمیں جو امن شاہ عالم نے دیا ہوا تھا آج بھی ہم اسی امن کے ذریعے مامون بیٹھے ہوئے ہیں۔ بلکہ امن جدید کفار سے حاصل ہوا ہے اور اسی نصاریٰ کے دیئے ہوئے امن کے ذریعہ تمام رعایا ہندوستان میں قیام پذیر ہے۔ لیکن اتصال بدار الحرب سو یہ ممالک واقالیم عظیمہ کے لئے شرط نہیں بلکہ گاؤں اور شہر وغیرہ کے لئے شرط ہے جس کا مقصد صرف یہ ہے کہ وہاں سے مدد پہنچنا آسان ہے اور اگر کوئی کہے کہ اگر شاہ کابل یا شاہ روم کی طرف سے مدد پہنچ جائے تو کفار کو ہندوستان سے نکال سکتے ہیں مگر حاشا وکلا یہ بالکل صحیح نہیں بلکہ ان کا اخراج ہندوستان سے سخت مشکل ہے بہت بڑے جہاد اور عظیم الشان سامان جنگ کو

چاہتا ہے۔ بہر حال تسلط کفار کا ہندوستان پر اس درجہ میں ہے کہ کسی وقت بھی کفار کا تسلط کسی دار الحرب پر اس سے زیادہ نہیں ہوتا۔ اور شعائر اسلامیہ جو مسلمان یہاں ادا کرتے ہیں وہ محض ان کی اجازت سے ہے ورنہ مسلمانوں سے زیادہ عاجز رعایا کوئی نہیں ہے۔ ہندوؤں کو بھی ایک درجہ کا رسوخ حکومت میں حاصل ہے مسلمانوں کو وہ بھی نہیں۔ البتہ ریاست ٹونک اور رامپور اور بھوپال وغیرہ کہ وہاں کے حکام باوجود مغلوب کفار ہونے کے اپنے احکام کو جاری رکھتے ہیں ان کو دار الاسلام کہا جا سکتا ہے جیسا کہ درمختار وغیرہ کی روایات سابقہ سے مستفاد ہوتا ہے۔

فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم۔

بندہ رشید احمد گنگوہی

الحمدللہ والمنۃ کہ رسالہ دار الحرب کا ترجمہ اردو تمام ہوا حق تعالیٰ اس کو بھی اصل کے ساتھ مقبول فرمائے آمین۔

والحمد لله الذى بعزته وجلاله تتم الصالحات.

بندہ

محمد شفیع دیوبندی عفا اللہ عنہ

۷۶

افادات اشرفیہ در مسائل سیاسیہ

تاریخ تالیف ——— ۷/محرم ۱۳۶۵ھ (مطابق ۱۹۴۵ء)

مقامِ تالیف ——— کراچی

سیاسی مسائل میں حکیم الامت مجدد الملت حضرت مولانا شاہ محمد اشرف علی تھانویؒ کا موقف جس میں احتیاط، اور اعتدال کے ساتھ شرعی حدود کی مکمل رعایت رکھی گئی ہے۔

تمہید

بسم اللہ الرحمن الرحیم

بعد الحمد والصلوٰۃ۔ کمترین خدام بارگاہِ اشرفی ناکارہ خلائق محمد شفیع دیوبندی عفا اللہ عنہ عرض گزار ہے کہ سیدی وسندی حضرت حکیم الامت تھانوی قدس سرہٗ کو حق سبحانہ وتعالیٰ نے عام کمالات علمیہ وعملیہ اور رجوع الی الحق میں ایک خاص امتیاز اور تمام معاملات میں دور بینی اور اصابت رائے اور اُس کے ساتھ بے نظیر ہمت واستقلال عطاء فرمایا تھا ایک طرف تو آپ شان فاروقی کان وقّافا عند حدود اللّٰہ کے مظہرِ اتم تھے کہ ایک بچہ یا اَن پڑھ کے کہنے سے اگر اپنی غلطی معلوم ہو جاوے تو فوراً غلطی کا اعتراف اور اس سے رجوع شائع فرمادیں۔ تصانیف میں سلسلہ ترجیح الراجح اُس کے ثبوت کے لئے کافی ہے دوسری طرف جب تک کسی چیز کو حق سمجھیں اُس کو کسی دنیوی مصلحت یا عوام کی مخالفت کے سبب چھوڑ بیٹھیں یا اُس کا کتمان کریں یہ آپ کی عادات میں ناممکن تھا۔

اسی کے ساتھ سب سے بڑی اہم اور قابل تقلید صفت حق تعالیٰ نے یہ عطاء فرمائی تھی کہ مسائل اختلافیہ میں ہمیشہ حدود محفوظ رہتی تھیں جس کے آثار آپ کے عمل میں یہ تھے۔

(الف) جن معاملات میں علماء کا اختلاف ہو اُن میں بدون کسی مکمل تحقیق وتفتیش کے کوئی فتویٰ یا اعلان شائع نہ فرماتے تھے۔

(ب) مقدور بھر تحقیق کے بعد اگر اعلان کی ضرورت بھی ثابت ہوئی تو اُس وقت

بھی دوسری جانب کی پوری رعایت رکھ کر اعلان کیا جاتا تھا۔ جس سے اختلاف کی خلیج وسیع ہونے اور عوام کو علماء کے خلاف برسر پیکار آنے کا موقع نہ ملے۔

(ج) اعلان کے بعد بھی تحقیق حال اور مفاہمت باہمی کا سلسلہ جاری رہتا تھا اور قابلِ قبول چیزوں کے قبول کرنے کے لئے ہمیشہ تیار رہتے تھے۔ پہلی جنگِ عظیم اور زوالِ خلافت کے وقت سے ہندوستان میں موجود سیاسی تحریکات کا آغاز ہوا اُن میں قیام و استحکامِ خلافت اور ہندوستان کی آزادی وغیرہ کے مقاصد صحیحہ کے لئے جدوجہد شروع ہوئی مگر کچھ تو طرزِ عمل کے مفید و منتج ہونے نہ ہونے میں رائے کا اختلاف رہا اور کچھ منکرات اُس میں شامل ہو گئے جن کے سبب شرکت تحریکات میں علماء کا اختلاف پیش آیا۔ پھر اُس وقت سے آج تک سیاسی نظریات اور عملیات میں بیشمار تغیرات واقع ہونے کی وجہ سے اختلاف کی جہتیں بڑھتی گئیں۔

حضرت اقدس رحمتہ اللہ علیہ کا طبعی رنگ درویشانہ یکسوئی کا تھا اُس کا مقتضےٰ یہ تھا کہ ان سیاسی تحریکات میں آپ کوئی دخل نہ دیتے۔ لیکن اس طبعی رنگ کے ساتھ حق تعالیٰ نے آپ کو ایک مجددانہ اصلاح و تربیت اور ہمدردی خلق کا بھی وہ جذبہ صادقہ عطاء فرمایا تھا جو آپ کو اکثر بے چین کئے رکھتا تھا اور اسی وجہ سے جب ملک میں کوئی ہنگامی تحریک شروع ہوئی اُس پر شرعی حیثیت اور تجربہ کارانہ بصیرت کے ساتھ نظر ڈال کر اپنے نزدیک اُس کے حسن و قبح اور پھر صحیح راہ عمل واضح کر دینے کا معمول رہا۔

مسلم لیگ اور کانگریس میں مسلمانوں کی شرکت کے منافع و مضار پر بھی انہیں معمولات کے ماتحت ہمیشہ نظر رہی اور حالات وواقعات کی تفتیش بھی جاری رہی لیکن چونکہ علماء کی ایک جماعت کانگریس کے ساتھ بھی تعاون کر رہی تھی۔ اس لئے باوجود مشاہدۂ منکرات کے حسب دستور اُس کی شرکت پر مطلقاً کوئی حکم نہیں فرمایا۔ سوالات کئے گئے تو

کانگریس میں پیش آنے والے معاملاتِ جزئیہ کا علیحدہ علیحدہ حکم شرعی جائز یا ناجائز کر کے تحریر فرمایا مطلقاً اُس کی شرکت کو ممنوع و ناجائز نہیں کہا۔ یہاں تک کہ متواتر خطوط اور خبروں سے یہ ثابت ہوا کہ اب کانگریس میں کلی قبضہ اور غلبہ ہندوؤں کا ہے اور مسلمان شرکاء کانگریس کو طوعاً یا کرھاً اُن کی متابعت کرنا پڑتی ہے۔ نیز کانگریس کا ڈھائی سالہ دورِ حکومت بھی اس اثناء میں سامنے آ گیا جس نے مسلمانوں سے غداری اور (۱) لا یألونکم خبالا وما تخفی صدورھم کی تصدیق ظاہر کر دی اُس وقت مسلمانوں کی کانگریس سے بیزاری خود بخود بڑھی سوالات کی کثرت ہوئی خود بھی مسلمانوں کی یہ تباہی جو ہندو عزائم کا پس منظر تھا کسی حساس مسلمان کے لئے قابل گوارائی نہ تھا۔

دوسری طرف کچھ علماء کی اس میں شرکت اس سے مانع بھی تھی کہ اس کے متعلق کوئی عام حکم لکھا جاوے۔ اس لئے حسب معمول اول یہ ارادہ فرمایا کہ اُن علماء کے گفتگوئی مفاہمت کی جائے۔ چنانچہ متعدد مرتبہ اکابر جمعیۃ العلماء سے اس میں مکالمہ کیا گیا لیکن کانگریس کی شرکت میں جو شرعی قبائح اور مسلمانوں کے قومی مضار تھے اُس کا کوئی شافی جواب نہ ہو سکا تو پھر یہ تجویز فرمایا کہ جمعیت علماء اور مسلم لیگ دونوں سے تحریری سوالات کر کے مسائلِ حاضرہ کی مکمل تحقیق بھی کی جائے اور دونوں جماعتوں میں اتحاد کی کوشش بھی، لیکن افسوس یہ ہے کہ یہ کوشش بعض ناقابل ذکر اسباب کی وجہ سے نہ چل سکی اور تحریری سوالات کے جواب بھی صرف مسلم لیگ کی طرف سے حاصل ہوئے۔ جمعیت کی طرف سے باوجود چند مرتبہ یاددہانی کے کوئی جواب نہ آیا۔ اس تمام کاوش و تحقیق کے بعد رسالہ تنظیم المسلمین لکھا گیا جس میں کانگریس کے مہالک پر نظر فرما کر اس کی شرکت کو مسلمانوں کے لئے ممنوع قرار دیا۔ مگر کانگریس سے منقطع ہو کر اگر مسلمان منتشر و پراگندہ ہو جاویں تو یہ اُن کی سیاسی موت تھی اس لئے ضرورت ہوئی کہ اُن کو خود منظم ہو کر رہنے کا مشورہ دیا جائے مگر

---

(۱)...... کفار تمہارے برباد کرنے میں کوئی فروگزاشت نہ کریں گے اور جو کچھ ان کے دلوں میں پوشیدہ ہے وہ اس سے بھی بڑا ہے ۱۲ منہ۔

ملک کی موجودہ مسلم جماعتوں نے یا تنظیم مسلمین کا اہتمام نہ کیا یا وہ اہتمام کامیاب نہ ہوا اب بجز مسلم لیگ کی کوئی ایسی جماعت ملک میں نہ تھی جس کو مسلمانوں کی جمہوری طاقت حاصل ہو اس لئے اس کی شرکت وحمایت کی رائے دی گئی پھر چونکہ مسلم لیگ نہ کوئی علماء کی جماعت ہے نہ خاص دینداروں کی اس لئے اس کی قیادت سے بھی جو کچھ دینی مضرتوں کا اندیشہ تھا اس کا حل یہ تجویز فرمایا کہ مسلمانوں میں عموماً اور زعماء لیگ میں خصوصاً تبلیغ احکام کی پوری جدوجہد کی جائے جس سے ان کی تنظیم شریعت کے موافق اور اس کی مساعی اسلامی مفاد کے ماتحت ہو جاویں اس کے لئے ایک مجلس علماء بنام ''دعوۃ الحق'' قائم فرمائی جس کے وفود مختلف اوقات اور مختلف مقامات میں زعماء لیگ اور عام مسلمانوں میں تبلیغ کا کام انجام دیتے رہے اور خود حضرت اقدس نے متعدد خطوط تبلیغی مسٹر جناح اور دوسرے زعماء کے نام لکھے جن کے جواب میں اُن حضرات نے احکام دینیہ کی اہتمام کا ارادہ ظاہر فرمایا حضرتؒ اکثر حسرت کے ساتھ فرمایا کرتے تھے کہ اگر علماء متفق ہو کر اس تبلیغ کی طرف لگ جاتے تو کچھ بعید نہ تھا کہ مسلم لیگ چند روز میں دینداروں کی جماعت ہو جاتی لیکن افسوس کہ اس کام میں میں متفرد ہی رہا اس کا اتنا ہی اثر ہوا جتنا انفرادی کوشش کا ہو سکتا تھا۔ حضرت اقدس کی یہ تمام تحریرات متعلقہ سیاسیات جس میں مستقل رسائل بھی ہیں کچھ اشتہارات و مکتوبات وملفوظات بھی منتشر طور پر موقت رسائل میں شائع ہوتے رہے، جن کا جمع کرنا ہر ایک کے لئے آسان نہیں تھا اور چونکہ یہ تحریرات درحقیقت مسلمانوں کی سیاسیات و اجتماعیات کے لئے نہایت صحیح و بے خطر اصول ہیں۔ ضرورت ہوئی کہ اس سیاسی طوفان کے زمانہ میں اُن کا مجموعہ یکجا شائع کر دیا جائے۔ جس کے دو مقصد ہیں ایک عام کہ مسلمان ایسے حالات میں افراط و تفریط کے درمیان حدود شرعیہ کو ہر حال میں پیش نظر رکھیں اور جو راہ عمل حضرت اقدس نے تجویز فرمایا ہے وہ اگر دل کو لگے اُس کو قبول فرمائیں۔

دوسرا خاص کہ حضرت اقدس کے منتسبین و متعلقین کو حضرتؒ کا مسلک پوری طرح

معلوم ہو جاوے وہ کسی مغالطہ کا شکار نہ ہوں، اس لئے اس ناکارہ نے کافی محنت اٹھا کر ان تمام رسائل و مضامین کو جمع کیا۔ ان میں سے اکثر مطبوع و شائع شدہ ہیں اور بعض وہ بھی ہیں جن کے مسودات خانقاہ تھانہ بھون میں محفوظ ہیں مگر ہنوز شائع نہوئے تھے۔ اس کی تفصیل ہر مضمون کے شروع میں لکھ دی گئی ہے۔

ایک اہم گزارش

آخر میں عرض ہے کہ مضامین متعلقہ سیاسیات مندرجہ مجموعہ ہذا کا مطالعہ ہر شخص کو پارٹی بندی کی نظریہ سے علیحدہ ہو کر محض آخرت کے پیش نظر کرنا چاہئے اور دیانت اور غور و فکر کے ساتھ مطالعہ کرنے کے بعد جو راہ عمل اختیار کریں اختیار ہے لیکن ذیل کے دو کلمے جو دو مقدس بزرگوں کے ارشاد اور متفق علیہ مضامین پر مشتمل ہیں اپنے ہر عمل اور ہر سعی میں ان کو پیش نظر رکھیں ان میں ایک ملفوظ ہی قطب عالم سیدی وسندی حضرت شیخ الہند نور اللہ مرقدہ کا اور دوسرا ملفوظ ہے سیدی و مرشدی حضرت حکیم الامت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا۔

ملفوظ اول

سیدی حضرت شیخ الہند قدس سرہٗ قیدِ مالٹا سے تشریف لانے کے رمضان المبارک میں بعد تراویح ایک شب دارالعلوم دیوبند میں دارالافتاء کی چھت پر رونق افروز تھے اور مشتاقین و معتقدین کا مجمع تھا احقر بھی حاضر تھا۔ دوران گفتگو میں فرمایا کہ "مالٹا کی زندگی میں ہم نے تو ایک سبق یاد کیا ہے کہ ہر چیز کو برداشت کرلیا جائے لیکن مسلمانوں کے باہمی تفرقہ کو کسی حال گوارا نہ کیا جائے۔ بعینہ الفاظ صحیح یاد نہیں لیکن اس کا یقین ہے کہ مضمون یہی تھا۔

ملفوظ دوم

سیدی حضرت حکیم الامۃ قدس سرہٗ نے مختلف مجلسوں میں بار ہا فرمایا کہ اگر کسی مسئلہ میں کسی سے اختلاف ہو تو بدگمانی بدزبانی سے اجتناب کی پوری کوشش کرنا چاہئے۔ اس سے اختلاف حدود کے اندر رہتا ہے اور دائرہ خلاف و شقاق وسیع نہیں ہوتا۔ اس میں بھی لفظ بدگمانی و بدزبانی تو بعینہ یاد ہیں بقیہ الفاظ میں ممکن ہے کہ کچھ تغیر ہوا ہو مگر مضمون محفوظ ہے۔ انتہی۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو یہی دو کلمے مسلمانوں کی قومی و سیاسی سب الجھنوں کا حل ہیں۔ واللہ الموفق و المعین۔

نا کارۂ خلائق

بندہ محمد شفیع دیوبند عفا اللہ عنہ

۷ محرم ۱۳۶۵ھ

سیاسیاتِ حاضرہ کے متعلق

حضرت حکیم الامت قدس سرہٗ کا مسلک

ربیع الثانی ۱۳۳۹ھ میں عام مسلمانوں کی اطلاع اور غلط افواہوں کے ازالہ کے لئے حضرت اقدسؒ نے اپنا مسلک دربارہ سیاسیات شائع فرمایا تھا جس کی نقل اس وقت نہیں مل سکی غالباً رسالہ الامداد تھانہ بھون کے کسی پرچہ میں ہوگی اور اجمالاً رسالہ الروضۃ الناضرہ کے بیسویں مسئلہ میں بھی مذکور ہے یہ رسالہ اسی مجموعہ میں آگے آتا ہے پھر اس مسلک کی شرح رسالہ النور جمادی الاولیٰ ۱۳۳۹ھ میں شائع کی گئی ہے اور اسی سے اشرف السوانح جلد سوم میں ص ۱۶۱ میں منقول ہے وہ حسب ذیل ہے۔

احقر اشرف علی کی شائع شدہ مسلک کی مختصر اور ضروری شرح

(از اشرف السوانح جلد سوم ص ۱۶۱ تا ص ۱۶۴)

مبسملا و حامدا و مصلیا۔ آغاز ربیع الثانی سنہ رواں میں ایک اعلان بعنوان ''مسائلِ حاضرہ کے متعلق احقر اشرف علی کا مسلک'' شائع کیا گیا تھا اس میں ایک جملہ تھا کہ میں ان شورشوں کو ایک فتنہ سمجھتا ہوں میں اس کو مقصود کے لئے کافی سمجھتا تھا مگر بعضوں کو اس میں اِس وجہ سے غلط فہمی ہوئی کہ انہوں نے اس کا غیر واقعی مبنیٰ اپنی طرف سے مخترع کر لیا اس

کے ازالہ کے لئے اس جملہ کی مختصر شرح کرنے کی ضرورت ہے یہ دوسرا اعلان شائع کرتا ہوں اول چند مقدمات سمجھ لئے جاویں۔

(۱)...... مسائل بعضے قطعی ہوتے ہیں ان میں اختلاف کی کچھ گنجائش نہیں ہوتی بعضے اجتہادی وظنی ہوتے ہیں ان میں سلف سے خلف تک شاگرد نے اُستاد کے ساتھ مرید نے پیر کے ساتھ قلیل جماعت نے کثیر جماعت کے ساتھ واحد نے متعدد کے ساتھ اختلاف کیا ہے اور علمائے امت نے اس پر نکیر نہیں کیا ہے اور نہ ایک نے دوسری کو ضال اور عاصی کہا، نہ کسی نے دوسرے کو اپنے ساتھ متفق ہونے پر مجبور کیا، نہ اختلاف کے ہوتے ہوئے باہم بغض وعداوت ہوا، نہ مناظرہ پر اصرار کیا گیا۔ چنانچہ مشاجراتِ میں صحابہ کا اختلاف اور علیحدہ رہنے والوں کی علیحدگی کو سب کا جائز رکھنا معلوم ہے۔

(۲)...... ایسے مسائل اجتہادیہ ظنیہ میں اختلاف دو طرح سے ہوا ہے ایک دلائل کے اختلاف سے جیسے حنفی شافعی میں قرأت فاتحہ خلف الامام کے مسئلے میں دوسرے واقعات یا عوارض کے اختلاف سے جیسے امام صاحب اور صاحبین میں نکاح صائبات کے مسئلہ میں کہ جن کو تحقیق ہوا کہ وہ اہل کتاب میں سے ہیں انہوں نے اس نکاح کو جائز رکھا اور جن کو تحقیق ہوا کہ وہ اہل کتاب میں سے نہیں انہوں نے اس نکاح کو ناجائز رکھا مگر اس واقعہ کی تحقیق میں اختلاف ہوگیا کہ آیا وہ کتابی ہیں یا غیر کتابی اس لئے فتویٰ میں اختلاف ہوا، یا حنفی شافعی میں تعین سورت فی الصلوٰۃ کے مسئلہ میں۔ کہ شافعی نے نفس عمل کو منقول عن الشارع دیکھ کر اس کو جائز کہا اور امام صاحب نے عارض اعتقاد یا ایہامِ اعتقاد وجوبِ حالاً یا مآلاً پر نظر کر کے اس کو مکروہ فرمایا۔

(۳)...... حکم شرعی کا محل اور متعلق ہمیشہ معنون ہوتا ہے نہ کہ عنوان مثلاً کوئی شخص مغصوب زمین میں مسجد بنالے اور مالک قاضی اسلام کے اجلاس میں اُس کا مغصوب ہونا ثابت کردے اور قاضی غاصب کو اس مسجد کے انہدام اور زمین کی واپسی کا حکم دے دے تو

قاضی پر یہ اعتراض جائزہ نہ ہوگا کہ اس نے مسجد منہدم کرادی مسجد محض اُس کا نام ہے واقع میں وہ مسجد ہی نہیں۔ان مقدمات کے بعد سمجھنا چاہئے کہ تحریکاتِ حاضرہ کا خلاصہ اس وقت دوامر ہیں ایک تعاون جس کی نفی کا نام ترکِ موالات رکھا ہے دوسرا اتحاد ہندو مسلم۔ان دونوں میں دو دو درجے ہیں جن میں سے ایک ایک درجہ میں تو کسی کا اختلاف نہیں اور ایک ایک درجہ میں اس وقت علماء و عقلاء کا آپس میں اختلاف ہے۔

امر اول کا درجۂ اول:

وہ نوکریاں یا وہ لین دین کی صورتیں ہیں جو دلائلِ شرعیہ سے فی نفسہا ناجائز ہیں اور ان کے ناجائز ہونے پر ہمیشہ علماء فتویٰ دیتے چلے آئے ہیں۔اور وہی فتویٰ اب بھی باقی ہے مثلاً جن نوکریوں میں سود کی ڈگری دی جائے یا جس تجارت میں سود کا معاملہ ہو اسی طرح وہ دوستانہ معاشرت جو خاص مسلمانوں ہی کا حق ہے یا وہ علوم وفنون حاصل کرنا جو دین میں مضر ہیں سو ان میں واقعاتِ حاضرہ کو کچھ دخل نہیں اور نہ ان میں مسلم وغیر مسلم میں کچھ تفاوت ہے ان سے اختلاف حال میں احتجاج کرنا درحقیقت خلط مبحث اور بالکل بے ربط اور بے محل بات ہے۔

امر ثانی کا درجۂ اول:

وہ اتحاد ہے جس کا حاصل عدم نزاع ہے یعنی دونوں فریق حدود کے اندر رہ کر اپنے اپنے فرائض مذہبی کو ادا کریں اور ایک دوسرے سے تعرض نہ کریں۔اور حقوق ہمسائیگی کی باہم رعایت رکھیں سو یہ درجہ فی نفسہ جائز ہے اور اب بھی اس کے جواز میں کسی کا اختلاف نہیں۔

امرِ اول کا دوسرا درجہ:

مباح اجارات وتجارات وتعلیمات واستعانات وتعلقات حاکمیت ومحکومیت کے ہیں۔

امرِ ثانی کا دوسرا درجہ:

وہ اتحاد ہے جس کی غرض ہندوستان کے لئے آزاد حکومت کا حاصل کرنا ہے اس وقت عقلاء وعلماء کا ان ہی دو درجوں میں اختلاف ہے پس بعضے تعاون کے اس درجہ کا جائز اور اتحاد کے اس درجہ کو ناجائز کہتے ہیں اور بعض اس کے بالکل بالعکس تعاون کے اس درجہ کو ناجائز اور اتحاد کے اس درجہ کو جائز کہتے ہیں یہ تعیین ہے محلِ اختلاف کی اب اس اختلاف کی حقیقت اور بناء سمجھئے یہ تعاون یا اتحاد شرعاً فی نفسہ نہ واجب ہے نہ حرام، شرعاً امور مباحہ سے ہے چنانچہ اہل علم پر ظاہر ہے یہاں تک تو کوئی اختلاف نہیں آگے بعض کی نظر تو اس عدم تعاون مع الحکومت اور اتحاد مع الہنود کے مصالح ومنافع ضروری التحصیل فی زعمہم پر پڑی اور وہ خلافت کمیٹی والے ہیں ان عوارض پر نظر کر کے انہوں نے ان دونوں امر کو واجب وجائز کہا۔ اور بعض کی نظر اس عدمِ تعاون اور اتحاد کے مضار ومفاسد دینیہ حالیہ ومآلیہ ضروری الاجتناب پر پڑی جن کی تفصیل خاص خاص تحریرات میں شائع بھی ہو چکی ہے ان عوارض پر نظر کر کے انہوں نے ان دونوں امر کو ممنوع کہا اور احقر کی بھی یہی رائے ہے اور اسی بناء پر اعلانِ اول میں اس کو فتنہ کہا تھا یہ حقیقت اور بناء ہے اس اختلاف کی۔ اب اس سے امور ذیل معلوم ہو گئے ہوں گے۔

ایک یہ کہ اس اختلاف کی یہ دونوں شقیں قطعی نہیں ہیں ظنی اجتہادی ہیں پس ان میں اختلاف کی گنجائش ہے گو کوئی چھوٹے درجہ کا طالب علم ہی کسی بڑے عالم کے ساتھ

اختلاف کرے محض اس اختلاف سے کسی فریق کو دوسرے فریق پر طعن ولعن یا سب وشتم یا لعنت وملامت یا تضلیل وتجہیل یا تفسیق وتکفیر یا جبر وتشدد وظلم وایذاء بالقول یا بالعمل یا کسی بزرگ کا اُس کو مخالف وبے ادب مشہور کر کے بدنام کرنا جائز نہیں (بحکم مقدمہ نمبر ا) البتہ منکرات شرعیہ پر انکار یا تقبیح یہ واجب ہے اور اس میں کسی مسلمان کا اختلاف نہیں دوسرا امر یہ معلوم ہوا کہ اس اختلاف کا منشاء دلائل کا اختلاف نہیں بعض واقعات وعوارض کا اختلاف ہے جس کی شرعی مثالیں مقدمہ نمبر ۲ میں مذکور ہو چکی ہیں اور ایک عرفی مثال اور معروض ہے، اختلاف دلائل کی مثال ڈاکٹری اور یونانی اصول کا اختلاف ہے اور اختلاف عوارض کی مثال دیوانی متحد الاصول طبیبوں کا اختلاف اس مریض کے باب میں ہے جو کمزور بھی ہے اور اس میں کسی مادۂ فاسدہ کا بھی غلبہ ہے۔ ایک طبیب نے اس پر نظر کی کہ جب تک مادہ کا تنقیہ نہ کیا جاوے گا قوت نہ آوے گی اس لئے مسہل تجویز کر دیا دوسرے طبیب نے اس پر نظر کی جب تک قوت کے بقاء کی تدبیر نہ کی جاوے گی مسہل ہی کا متحمل نہ ہوگا اس لئے مسہل کو منع کر دیا اب یہ دونوں اس پر متفق ہیں کہ مادہ کا تنقیہ بھی ضروری ہے اور قوت کا تبقیہ بھی ضروری ہے مگر پھر بھی عوارض کے سبب دونوں کی رائے میں اختلاف ہو گیا پس یہ اختلاف ان دونوں مسئلوں کا اسی قبیل سے ہے کہ منافع ومضار پر نظر پڑنا اس کا باعث ہو گیا۔

تیسرا امر

یہ معلوم ہوا کہ اس عدم تعاون کا نام جو بعض نے ترک موالات رکھ لیا ہے اس عنوان سے اس کا حکم جو اوپر مذکور ہوا بدل نہ جائے گا (بحکم مقدمہ نمبر ۳) جیسا بعض نے یہ ترکیب کر رکھی ہے کہ قرآن مجید میں جو موالات کی ممانعت کی آیتیں آئی ہیں۔ اس عدمِ تعاون کو اُن میں داخل کر کے اختلاف کرنے والے فریق کو قرآن کا مخالف بتا کر عوام الناس کو اُس سے متوحش ومتنفر کرتے ہیں جس طرح عاملین مولد نے اپنی مجالسِ متعارفہ کا نام مجلسِ ذکر رسول اللہ صلی علیہ وسلم اور قیام کا نام تعظیمِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم رکھ کر اہل حق کی طرف سے

عوام کو بدگمان کر دیا کہ یہ ذکر و تعظیم رسول سے منع کرتے ہیں یا امتناع و امکان کے مسئلہ میں اس طرح بدنام کیا کہ یہ لوگ یوں کہتے ہیں کہ خدائے تعالیٰ بھی جھوٹ بول سکتا ہے پس ایسے ہی اس اصطلاح ترک موالات سے کام لیا جارہا ہے تو سمجھ لینا چاہئے کہ کوئی نام رکھ دینے سے حقیقت نہ بدل جاوے گی اس لئے حکم بھی نہ بدلے گا باقی ایسی ترکیبوں سے کام لینا اہل علم کی شان کے بالکل خلاف ہے۔ میں نے اپنے نزدیک ان مسائل اور اس اختلاف اور اپنے مسلک کی حقیقت بالکل صاف کردی ہے اگر اس پر بھی کسی کو بدنام کرنے کا شوق ہو تو اس سے زیادہ نہ کہونگا کہ فَصَبْرٌ جمیل واللہ المستعان علیٰ ما تصفون۔

والسلام

احقر اشرف علی

تھانہ بھون

جمادی الاولیٰ ۱۳۳۹ھ

الروضة الناضرة
فی
المسائل الحاضرة

(مرقومہ [1] نصف ربیع الاول ۱۳۴۰ھ منقول از اشرف السوانح جلد سوم ص ۱۶۹)

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْم

(نوٹ) یہ قلمی مضمون شرح کے انتظار میں ابھی تک شائع نہیں ہوا مگر اس کی نقل بہت سے اہل علم نے زمانہ تسویدی ہی میں کر لی تھی اب شرح بھی تیار ہے مگر سامان طباعت کا نہیں ہوا۔۱۲۔

بعد الحمد والصلوٰۃ۔ یہ ایک تحریر ہے جو جامع ہے جزئیات حاضرہ کے احکام کو اس کی ضرورت اس لئے ہوئی کہ اس کے قبل یا تو بعض مختصر مضمون بطور قول کلی کے شائع ہوئے جن میں جزئیات سے کافی تعرض نہ تھا اور یا زبانی یا خطی سوالات کے جواب منتشر طور پر مشہور ہوئے جن میں بوجہ عدم انضباط مجموعہ اجوبہ نا تمام نقل ہونے سے تغییر و تبدیل ہو گئی اس لئے ضروری جزئیات کے احکام یکجا جمع کر دینا مناسب معلوم ہوا مگر چونکہ اس میں اکثر اصطلاحاتِ علمی ہیں اس لئے غیر علماء کو علماء سے سمجھ لینے کی ضرورت ہوگی۔ اور اس کے دو جزو ہیں مسائل۔ دلائل۔ دونوں کو علی الترتیب لکھتا ہوں۔

واللّٰہ الموفق والمعین فی کل باب وھو الھادی الی الصواب

---

(۱)...... یہ رسالہ تحریکاتِ خلافت کے زمانہ میں تصنیف فرمایا تھا جس میں موجودہ سیاسیات کے شرعی اور فقہی احکام کی پوری تفصیل ہے مگر خالص علمی تحریر ہے عوام کے لئے شرح کی ضرورت تھی جو تیار ہے مگر اس مختصر مجموعہ میں اس کی گنجائش نہیں اس وقت اہل علم کے فائدہ کے لئے اسی پر اکتفاء کیا گیا ۱۲ محمد شفیع عفی عنہ دیوبندی۔

المسئلۃ الاولیٰ:

مدافعت کفار کی مطلقاً اہل اسلام سے اور خصوص سلطنت اسلامیہ سے جس میں خلافت وغیر خلافت اور جس میں سلطنت اسلامیہ واقعیہ وسلطنت اسلامیہ مزعومہ کفار سب داخل ہیں پھر خصوص شعائر اسلام سے جن میں مقاماتِ مقدسہ بالخصوص حرمین شریفین بھی داخل ہیں سب مسلمانوں پر فرض ہے۔ کبھی علی العین کبھی علی الکفایہ علی اختلاف الاحوال مگر اُس کی فرضیت کے کچھ شرائط ہیں جو کتب فقہ میں مذکور ہیں منجملہ اُن کے ایک شرط استطاعت بھی ہے اور استطاعت سے مراد استطاعت لغویہ نہیں۔ استطاعت شرعیہ ہے جس کو اس حدیث نے صاف کر دیا ہے۔

عن ابی سعید الخدریؓ عن رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم قال من رای منکم منکرا فلیغیرہ بیدہ فان لم یستطع فبلسانہ الحدیث رواہ مسلم مشکوٰۃ باب الا مربا لمعروف.

ظاہر ہے کہ استطاعت باللسان ہر وقت حاصل ہے پھر اس کے انتفاء کی تقدیر کب متحقق ہوگی اس سے ثابت ہوا کہ استطاعت سے مراد یہ ہے کہ اس میں ایسا خطرہ نہ ہو جس کی مقاومت بظنِ غالب عادۃً ناممکن ہو۔ اسی طرح ایک شرط یہ بھی ہے کہ اس دفاع کے بعد اس سے زیادہ شر میں مبتلا نہ ہو جائیں مثلاً کفار کی جگہ کفار ہی مسلط ہوں یا مرکب کافر و مسلم سے کہ مجموعہ تابع اخس کے ہوتا ہے کیونکہ اس صورت میں غایت ہی مفقود ہے اور وہ اخلاء[1] الارض من الفساد ہے۔ اور قاعدہ ہے۔ الشئی[2] اذا خلا عن الغایۃ انتفیٰ

(۱)......زمین کو فساد سے خالی کرنا۔

(۲)......جب کوئی شئی اپنی غرض اصلی سے خالی ہو جاوے تو وہ کالعدم ہے ۱۲ش

المسئلہ الثانیہ

اور اگر ایسا خطرہ ہو تو پھر وجوب تو ساقط ہو جائے گا۔ باقی جواز اس میں تفصیل ہے بعض صورتوں میں جواز بھی نہیں بعض میں جواز بلکہ استحباب بھی ہے اور مدار بناء جواز و عدم جواز یا استحباب کا اجتہاد اور رائے پر ہے پس اس میں دو اختلاف کی گنجائش ہے۔ ایک علمی کہ واقعات سے ایک شخص کے نزدیک عدم جواز کی بناء متحقق ہے اور دوسرے کے نزدیک جواز یا استحباب کی۔ دوسرا عملی کہ باوجود بناء جواز یا استحباب پر متفق ہونے کے ایک نے بنا بر عدم و جوب رخصت پر عمل کیا دوسرے نے بنا بر استحباب عزیمت پر عمل کیا ایک کو دوسرے پر ملامت کرنے کا حق نہیں۔ اور اگر کسی مقام پر تسلط مسلمان ہی کا ہو مگر وہ مسلمان کافر سے مسالمت رکھتا ہو تو اس کو تسلط کافر کہنا محل تامل ہے۔

المسئلۃ الثالثہ

بائیکاٹ یا نان کو اپریشن یہ شرعاً افراد جہاد میں سے نہیں دلائل میں ملاحظہ کیا جائے بلکہ مستقل تدابیر مقاومت کی ہیں جو فی نفسہ مباح ہیں اور بعض خطرات کی صورت میں مباح بھی نہیں رہتیں اور ممکن ہے کہ کوئی اپنے اجتہاد سے کسی مصلحت ضروریہ کے سبب ضروری بھی کہہ دے مگر وہ وجوب اجتہادی ہوگا دوسرے پر حجت نہیں اور اس سے اُس کو واجبات مقصودہ شرعیہ سے نہیں کہا جا سکتا اور مقتضیات کے اختلاف سے اس میں بھی مسئلہ ثانیہ کے جواز أو منعاً یا ایجاباً اختلاف ہو سکتا ہے نیز آئندہ دلائل میں جو قصہ ثمامہ کا مذکور ہے اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ بائیکاٹ نہ کرنے کو موالاۃ کہنا حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم پر موالاۃ کی تہمت لگانا ہے۔

المسئلۃ الرابعہ

موالاۃ حقیقی بمعنی دوستی قلبی ہر کافر سے مطلقاً حرام ہے اس میں ذمی و حربی محارب

مسالم سب برابر ہیں ویستوی[1] فیه الابیض والا سود.

المسئلۃ الخامسہ

موالات صوری بمعنی دوستی ظاہری یعنی ایسا برتاؤ جیسا دوستوں سے ہوتا ہے جس کو مدارات کہتے ہیں اپنی مصلحت ومنفعت مال یا جاہ کے لئے درست نہیں بالخصوص جبکہ ضرر دین کا بھی مظنون ہو تو بدرجہ اولیٰ یہ اختلاط حرام ہوگا ویستوی[2] فیہ ایضاً الا سود والابیض۔

المسئلۃ السادسہ

وہی مدارات مذکور دفع مضرت کے لئے جائز ہے اور معتبر ظن مضرت ہے نہ کہ توہم بعید

المسئلۃ السابعہ

اسی طرح توقع ہدایت کے لئے بھی مدارت کرنا درست ہے۔

المسئلۃ الثامنہ

اسی طرح ضعیف ہونے کی وجہ سے مدارات درست ہے۔

المسئلۃ التاسعہ

مواسات یعنی احسان ونفع رسانی اہل حرب کے ساتھ نا جائز ہے اور غیر اہل حرب کے ساتھ جائز ہے اور غیر اہل حرب میں مسالم اور ذمی دونوں آ گئے لیکن دو حالتیں مستثنیٰ ہیں ایک یہ کہ کسی خاص موقع پر حربی کے ساتھ احسان کرنے میں اہل اسلام کی مصلحت ہو یا اس

(۱، ۲)......اور اس میں گورے اور کالے یعنی انگریز اور ہندو وغیرہ سب برابر ہیں ۔۱۲ش

کے اسلام کی توقع ہو۔ دوسرے یہ کہ کوئی شخص کسی اضطراری احتیاج مثل جوع (۱) و عطش (۲) یا تردی (۳) یا ہدم (۴) سے مشرف (۵) علی الہلاک ہو۔

المسئلۃ العاشرہ

موالات۔ بمعنی نصر یعنی کفار کی مدد کرنا اگر اسلام کو مضر ہو علی الاطلاق ناجائز ہے خواہ اضرار کا قصد بھی ہو یا قصد نہ ہو مگر وہ فعل موضوع ہو اضرار کے لئے دونوں کا ایک حکم ہے۔

المسئلۃ الحادیۃ عشر

اور جس نصرت سے اسلام کو مضرت نہ ہو مگر وہ نفسہ فی (۶) ناجائز ہو اس میں بھی نصرت ناجائز ہے۔

المسئلۃ الثانیہ عشر

اور اگر وہ مضر اسلام بھی نہ ہو اور فعل بھی مباح ہو اگر بلا عوض ہے مواساۃ میں داخل ہو کر مسئلہ تاسعہ کا فرد ہے اور اگر بعوض ہے آگے مسئلہ رابع عشر میں اس کا حکم آتا ہے اور یہ بھی موالات حقیقی نہیں۔

المسئلۃ الثالثہ عشر

یہ حکم تو نصرت کا تھا اور موالات بمعنی استنصار اگر استخدام کے طور پر ہو یعنی وہ اہل اسلام کا بالکل تابع ہو اور احتمال غدر بھی نہ ہو جائز ہے اور اگر مساوات یا متبوعیت کے طور پر ہو

---

(۱)......بھوک، (۲)...... پیاس، (۳)......اوپر سے گر پڑنا، (۴)......مکان گر پڑنا، (۵)......قریب ہلاکت کے ہو۔ (۶)......جیسے شراب وقمار وغیرہ میں کافر کی امداد کرنا۔

جیسا اس وقت اکثر ایسا ہی ہو رہا ہے یا احتمال غدر ہو بوجہ احتمال ضرر اسلام ناجائز ہے اور اس متبوعیت سے استنصار اضطراری مستثنیٰ ہی یعنی جہاں (۱) مسلمان محکوم ہوں۔

المسئلۃ الرابعہ عشر

یہ تو موالات باقسامہا الحقیقیہ والصوریۃ کا حکم تھا۔ اب معاملات کا حکم سمجھئے کہ جن عقود میں کوئی ناجائز کام نہ کرنا پڑے کفار کے ساتھ درست ہیں خواہ ذمی ہوں یا حربی مسالم یا غیر مسالم اور ان سے وہ معاملات مستثنیٰ ہیں جو نصاً منہی عنہ ہیں جیسے غیر کتابی سے نکاح کرنا باقی دوسرے معاملات درست ہیں مثلاً ان کی نوکری کرنا ان کو نوکر رکھنا اُن سے قرض لینا اُن کے پاس رہن رکھنا۔ ہدیہ دینا اُن سے کچھ خریدنا اُن کے ہاتھ کوئی چیز بیچنا باستثناء بعض اشیاء کے بعض مواقع میں جن کی تفصیل دلائل میں ہے اور مواد مذکورہ مسئلہ عاشرہ و حادیہ عشر بھی اس سے مستثنیٰ ہیں۔ اور بافضاء (۲) بعید ان معاملات کو بمعنی مناصرۃ و معاونت غیر جائز کہنا محض بلا دلیل ہے ورنہ فقہاء ان معاملات کو جائز نہ فرماتے اور راز اس میں یہ ہے کہ ان معاملات سے مقصود اپنی مصلحت ہے حالاً یا مآلاً نہ کہ کفار کی یا اگر ان کی مصلحت بھی ہے تو وہ اسلام کو مضر نہیں جو معاملات کسی درجہ میں اعانت غیر کے افراد بن سکتے ہیں فقہاء نے خود ان میں سے بہت مواد کو جائز فرمایا ہے اور یہ تو اعانت ہی نہیں گو دوسرے کا نفع لازم آجاوے

المسئلۃ الخامسۃ عشر

اس وقت گاڑھا اور ولایتی کپڑا پہننے کا سوال اکثر ہوتا ہے، اگر اس کی بناء مقاطعت سے، تب تو اس حکم کا مسئلہ ثالثہ و رابعہ عشر میں گزر چکا ہے اور اگر اس سے قطع نظر ہے تو دونوں

---

(۱)...... اسی طرح مسلمان کفار کے ہاتھ میں قیدی ہوں شرح سیر کبیر جلد ۳ میں اس استثنیٰ کی تصریحات موجود ہیں ۱۲۔ محمد شفیع عفی عنہ

(۲)...... سبب بعید ہونے کی وجہ سے۔

میں اباحت ہے مگر تشبہ نہ ہنود کے ساتھ جائز ہے نہ انگریزوں کے ساتھ۔

المسئلة السادسة عشر

مقاصد یا طریق میں جو منکرات و بدعات منضم ہوگئی ہیں ان کا قبح معلوم ہے مثلاً ایک لیڈر کا یہ مقولہ کہ ''زبانی جے پکارنیسے کچھ نہیں ہوتا بلکہ اگر تم ہندو بھائیوں کو راضی کرو گے بھائیو خدا کی رسی کو مضبوط پکڑو اگر ہم اس رسی کو مضبوط پکڑلیں گے تو چاہے دین ہمارے ہاتھ سے جاتا رہے مگر دنیا ہمیں ضرور ملے گی (مدینہ بجنور ۲۱ فروری ۳۰ء)

اور مثلاً یہ مقولہ اے اللہ ہم سے ایک نیک کام ہوگیا ہے کہ میں اور مہاتما گاندھی یقینی بھائی ہو گئے ہیں (فتح دہلی ۲۴ نومبر ۲۰ء اور مثلاً ایک عالم کا مقولہ'' خدا نے ان کو (گاندھی کو) ہمارے واسطے مذکر بنا کر بھیجا ہے قدرت نے ان کو سبق پڑھانے والا مدبر بنانیوالا بنا کر بھیجا ہے (فتح مذکور) از نور ص ۲۲۶ وص ۲۲۷۔ اور مثلاً مشرکین کو مساجد میں لے جا کر واعظ مسلمین بنانا۔ ان کے قدم کو شہر کی خاک پاک کرنے والا کہنا اُن کے جائے قدوم کو قصور بہشتی پر طعنہ زن کہنا، ان کو مسیحا کہنا، ان کو رحمت داد لکھنا، ان کی ثنا میں یہ کہنا کہ:

خاموشی از ثنائے تو حد ثنائے تست

گائے کی قربانی بند کرنے کا اہتمام کرنا قشقی لگوانا مشرک کی ٹکٹکی اپنے کندھوں پر اٹھا کر اس کی جے بولتے ہوئے مرگھٹ لیجانا ڈولہ سجا کر قرآن مجید کو رامائن کے ساتھ رکھنا، یہ کہنا کہ ہم ایسا مذہب بنانا چاہتے ہیں جو ہندو مسلمانوں کا امتیاز اٹھا دے گا۔ وغیرہ ذلک از خلت ا:۔ اگر کوئی ان قبائح کے سبب یا اور شرعی مانع کے سبب شرکت نہ کرے اُس کو کافر یا فاسق کہنا، اُس سے عداوت کرنا، اُس کی ایذاء کی فکر کرنا پھر ان منکرات پر نکیر نہ ہونا یا ایسے اہتمام سے نہ ہونا جس اہتمام سے تحریکات کی اشاعت کی جاتی ہے اور مصالح میں مفاسد و منکرات کے انضمام کا حکم یہ ہے کہ اگر وہ مصلحت واجب التحصیل نہ ہو تو اس کا چھوڑنا جائز تو

ہر حال میں ہے اور کبھی مستحب اور کبھی واجب بھی ہو جاتا ہے اور اگر واجب التحصیل ہوا اختلافاً یا اتفاقاً تو وہاں اُس واجب کو بلا عذر ترک نہ کریں گے۔ لیکن اختلافی میں یہ عدم جواز ترک اختلافی ہو گا مگر ان مفاسد پر ہر حال میں انکار کریں گے اور جس درجہ کا مفسدہ ہو گا اسی درجہ کا انکار واجب ہو گا اور اگر کوئی عذر ہو تو اعتقاداً اتفاق واجب ہو گا اور عقلاً معتقد عذر معذور ہو گا۔

المسئلۃ السابعۃ عشر

فروعِ اختلافیہ میں جب دونوں قولوں پر دلیل شرعی قائم ہو تو دونوں طرف احتمال صواب و خطا کا برابر رہے گا کسی جانب قائلین کا کثیر ہونا علامت صواب کی اور قلیل ہونا علامت خطا کی نہیں ہے اور اس کثرت کو اجماع کہنا یہ تو بالکل ہی اختراع ہے۔

المسئلۃ الثامنۃ عشر

جس عمل نافع میں نہ دنیوی ضرر ہو جس سے شرعاً معذور سمجھا جاتا ہے نہ دینی ضرر اس میں تقاعد کرنا خلاف حمیّت ہے، جیسے انگورہ کا چندہ کہ اعانت مسلمین و غازمین کا طاعت ہونا ظاہر ہے اور حکام نے تصریحاً اجازت بھی دے دی ہے اس میں ہرگز دریغ نہ کرنا چاہئے اور یہ احتمال کہ حکام دل سے پسند نہ کرنے گے وسوسۂ محضہ ہے جو موثر نہ ہونا چاہئے۔

المسئلۃ التاسعۃ عشر

اور جو شخص کسی قسم کی بھی سعی نہ کر سکے وہ دل سے دعا تو کیا کرے بلکہ اہل سعی بھی اصل سرمایہ اسی کو سمجھیں کیونکہ مفاتیحِ خزائن مقاصد رب حقیقی ہی کے ہاتھ میں ہیں

ما یفتح اللّٰہ للناس من رحمۃ فلا ممسلک لھا و ما

یمسک فلا مرسل له من بعده .

اللہ تعالیٰ لوگوں کے لئے جس رحمت (کے دروازے) کو کھول دیں اُس کا روکنے والا کوئی نہیں اور جس کو بند کر دیں اُس کو جاری کرنیوالا کوئی نہیں۔

المسئلۃ العشرون

جس میں میرا طرزِ عمل اور مشورہ مذکور ہے۔ان اعمال میں جو امور شرعاً منکر ہیں ان کو اعتقاداً اور عملاً واجب الترک جانتا ہوں اور جو مستحسن اتفاقی ہیں ان کو اعتقاداً تو حسن جانتا ہوں باقی عملاً جن پر قدرت ہے ان کو قابلِ عمل اور جن پر قدرت نہیں اُن میں اپنے کو معذور سمجھتا ہوں اور جو اختلافی ہیں اُن میں اپنی تحقیق پر عمل کرتا ہوں اور دوسری جانب کو بے محل ملامت[1] نہیں سمجھتا اور نہ ان میں کسی کو اپنے مسلک کی طرف دعوت دیتا ہوں البتہ کوئی مخلص خواہ واقع میں مخلص ہو خواہ اپنے کو مخلص ظاہر کرے اور میرا وجدان اُس کی تکذیب نہ کرے ایسا شخص اگر میرے مسلک کو دریافت کرتا ہے اور مجھ کو وجدان سے دو امر مظنون ہوں ایک یہ کہ متردد ہے دوسرے یہ کہ عمل کے لئے پوچھتا ہے کسی سے قیل وقال یا بحث و جدال نہ کرے گا اُس کو خاص طور پر بتلا دیتا ہوں۔باقی کسی کو خود کچھ نہیں کہتا اور دیانت اسی کو سمجھتا ہوں کہ جس شق کا حق ہونا محقق ہو اُسی کو اختیار کرے محض مال یا جاہ کی غرض سے اُس کو ترک نہ کرے ہاں شرعاً اکراہ کا درجہ ہو جاوے خواہ حکام سے یا عوام سے اُس وقت اکراہ کے مسائل پر عمل کر لے اور دوسری شق مختلف فیہ میں اختلاف والوں کی مخالفت یا اُن کے

---

(۱)......اور اگر کسی پر ملامت کی گئی ہے تو اُس کے کسی فعل منکر پر ملامت کی گئی ہے مثلاً کسی نے ہندوؤں کے اتحاد و اتفاق میں حد سے تجاوز کیا یا مجھ پر کوئی غلط اتہام لگایا یا محض اختلاف رائے فی المسائل کی وجہ سے اُس نے دوسرے فریق پر طعن تشنیع کی اور اُن کو فاسق و کافر بنایا ۱۲ منہ۔

حدیث مسلم فی تاویل شرط ولاء بریرةؓ للبائعین ما نصه والثانية والعشرون احتمال اخف المفسدتین لدفع اعظمها واحتمال مفسدة یسیرة لتحصیل مصلحة عظیمة اھ ص ٤٩٤ ج ١)

وعلى الثانية

فما فی العالمگیریة والثانی ان یرجوا لشوکة والقوة لاهل الاسلام باجتهاده اوباجتهاد من یعتقد فی اجتهاده ورائیه وان کان لا یرجو القوة والشوکة للمسلیمن فی القتال فانه لا یحل القتال لما فیه من القاء نفسه فی التهلکة (ص ١١٩ ج ٣)

وفی رد المحتار على القول المذکورا ولاً قوله لم یلزمه القتال یشیر الی انه لو قاتل حتی قتل جاز لکن ذکر فی شرح السیرانه لا بأس ان یحمل الرجل وحده وان ظن انه یقتل اذاکان یصنع شیئا بقتل او بجرح اوبهزم فقد فعل ذلک جماعة من الصحابة بین یدی رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم یوم احد ومدحهم على ذلک فاما اذا علم انه لا ینکی فیهم فانه لا یحل له ان یحمل علیهم لانه لا یحصل بحملته شئی من اعزاز الدین بخلاف نهی فسقة المسلمین عن منکر اذا علم انهم لایمتنعون بل یقتلونه فانه لا بأس بالاقدام وان رخص له السکوت لان المسلمین یعتقدون ما یأمرهم به فلا بد ان یکون فعله مؤثرا فی باطنهم بخلاف الکفار.

(صفحہ وجلد مذکور)

وعلی الثالثة

ما فی الدر المختار و عرفه، ابن الكمال با نه بذل الوسع فی القتال فی سبيل الله مبا شرة او معاونة بما ل اورأی اوتكثير سوا داو غير ذلک و فی رد المحتار كمداواة الجرحی و تهيئة المطا عم والمشارب ص ۳۳٦ ج ۳ و فی صحيح البخاری فی قصة ثمامة بن اثال فلما قدم مكة (يعنی بعد الاسلام) قال له قائل صبوت قال لا ولكن اسلمت مع محمد رسول اللّٰه صلی اللّٰه عليه وسلم ولا و اللّٰه لا تا تيكم من اليمامة حتیٰ حنطة حق يا ذن فيها النبی صلی اللّٰه عليه وسلم قال الحافظ فی الفتح زاد ابن هشام ثم خرج الی اليما مة فمنعهم ان يحملوا الی مكة شيئا فكتبو ا الی رسول اللّٰه صلی اللّٰه عليه وسلم انک تامر بصلة الرحم فكتب الی ثما مة ان يخلّی بينهم وبين الحمل اليهم ا ھ ص ۲۹ ج ۸ و فيه ايضا ص ٦٨ ج ۸ و كا نت قصة (يعنی ثمامة ۱۲) قبل و فدبنی حنيفة بزما ن فان قصته صريحة فی انها كا نت قبل فتح مكة اھ و فی الهد اية بعد المنع من بيع السلاح و الحد يد من اهل الحرب ولو بعد الموا دعة ما نصه وهذ اهوا لقياس فی الطعام والثوب الا انا عر فنا ه بالنص فانه عليه السلام امر ثمامة ان يمير اهله مكة وهم حرب عليه اھ .

و علی الرابعة

قوله تعالیٰ يا يها الذين اٰمنوا لا تتخذ وا اليهود و النصاریٰ

اولیاء و قولہ تعالٰی یا ایھا الذین اٰمنوا لا تتخذ وا عد و ی و عدو کم اولیا ء تلقون الیھم بالمو دۃ ط

و علی الخا مسۃ

قولہ تعالٰی ایبتغون عند ھم العزۃ و ان العزۃ للّٰہ جمیعاً .

و علی السادسۃ

قولہ تعالٰی الا ان تتقوا منھم تقا ۃ و قولہ تعالٰی فتری الذین فی قلو بھم مر ض یسارعون فیھم یقولون نخشیٰ ان تصیبنا دائرۃ

و علی السابعۃ

قولہ تعالٰی فا نت لہ تصد ی

و علی الثامنۃ

ماروی ابو دا ؤد ان النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم انزل و فد بنی ثقیف فی مسجد ہ اھ.

و علی التاسعۃ

قولہ تعالٰی لا ینھا کم اللّٰہ عن الذین لم یقاتلو کم فی الدین و لم یخر جو کم من دیار کم ان تبرّوھم و تقسطوا الیھم ا ن اللّٰہ یحب المقسطین انما ینھا کم اللّٰہ عن الذین قا تلو کم فی الدین و اخرجو کم من دیار کم و ظاھر و ا علی اخرا جکم ا ن تولو ھم ومن یتولھم فا ولٰئک ھم الظالمون.

فی العا لمگیر یة ولا بأ س بان یصل الرجل المسلم المشرک قریباً کان اوبعیداً محارباً کان او ذمیاً وارا د با لمحارب المستا من واما اذا کان غیر المستامن فلا ینبغی للمسلم ان یصله بشئی کذافی المحیط و ذکر القاضی الامام رکن الاسلام علی السفد ی اذا کان حربیاً فی دارا لحرب و کان الحال حال مسالمة و صلح فلا با س بان یصله کذا فی التتارخانیه ج ٦ ص ۲۳۲ من تتمة امداد الفتاوی و فی حاشیة العلا مة شیخزاده علی البیضا وی و ثانیها المعاشرة الجمیلة فی الدنیا بحسب الظاهرو ذلک غیر ممنو ع منه و قال علیه السلام فی کل ذات کبد رطبة اجر.

وعلی العاشرة و الحا دیة عشر

قوله تعالٰی و لا تعا و نو ا علی الا ثم والعدوان .

و علی الثالثة عشر

ما فی الدر المختار أود ل الذمی علی الطریق و مفاد ه جواز الا ستعانة با لکافر عند الحاجة و قد استعان علیه السلام بالیهو د علی الیهود فی ردالمحتار قوله: عند الحاجة اما بد ونها فلا لا نه لا یو من غدره قوله و قد استعان علیه الصلوٰة والسلام الخ ذکر فی الفتح ان فی سند ه ضعفا وان جماعة قالو الا یجوز لحدیث مسلم انه علیه الصلوٰة والسلام خرج الی بد ر فلحقه رجل مشر ک فقال ارجع فلن استعین بمشرک الحدیث وروی رجلان ثم قال و قال الشافعی رده علیه الصلوٰة

و السلام المشرک والمشرکین کا ن فی غزوة بدر ثم انه علیه الصلوٰة والسلام استعان فی غزوة خیبر بیهود من بنی قینقا ع و فی غزوة حنین بصفوان بن امیة وهو مشر ک فالردان کا ن لا جل انه کان مخیرا بین الا ستعانة وعد مها فلا مخالفة بین الحدیثین وان کا ن لا جل انه مشرک فقد نسخه ما بعده ج ۳ (ص ۳۳۶) و فی فتح القدیر ولا بأ س ان یستعان بالمشرکین علی قتال المشرکین اذا خر جوا طوعاً و یرضخ لهم و لا یسهم ولا یکون لهم رایة تخصهم الخ ج ۵ ص ۲۴۳ . وفی رد المحتار باب الجمعة فی معرا ج الدر ایة من المبسوط البلادالتی فی ایدی الکفار بلا د الاسلام لا بلا د الحرب لانهم لم یظهرو افیها حکم الکفربل القضاة والو لا ة مسلمو ن یطیعو نهم من ضرورة اوبد و نها و کل مصرفیها والٍ من جهتهم یجوز فیه اقامة الجمعة والا عیاد الخ ج ۱ ص ۸۴۲ و قدعرف اطاعة الصحابة والتابعین لیزید والحجا ج و اطاعة العلماء للتتار فی بغدادو فی تفسیر ابن جریر الا ان تتقوا منهم تقاة ط الا ان تکونوا فی سلطا نهم فتخا فو نهم علی انفسکم فتظهروا لهم الو لا یة با لسنتکم و تضمرو الهم العداوة ولا تتا بعو هم علی ما هم علیه من الکفر ولا تعینو هم علی مسلم بفعل ا ه. ازفرقان .

وعلی الرابعة عشر

ما فی الریاض جلس رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم و علی

ینزع للیھود کل دلو بتمرة حتی اجتمع له شئی من التمر (وفی الا جارة)

و فی ابن خلدون و ابن هشام استاجر رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم عبد اللّٰه بن اریقط الدؤلی و کان کا فراً (وفیه الاستیجار)

و فی المشکوة عن علی ان یهود یا کان یقال له فلا ن جبر کان له علی رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم د نا نیر فتقاضی النبی صلی اللّٰه علیه وسلم فقال له یا یهود ما عندی ما اعطیک الخ (وفیه القرض)

و فی صحیح البخاری قد رهن النبی صلی اللّٰه علیه وسلم درعاً له بالمدینة عند یهودی واخذشعیرًا له (وفیه الرهن وفی الروض الانف اهدی النبی صلی اللّٰه علیه وسلم الی ابی سفیان عجوة واستهداه ادماً فا هداه ابوسفیان و هو علی شرکه (و فیه الا هداء والا ستهداء) و فی المحیط اذا خرج للتجارة الی ارض العدو با ما ن فان کا ن امر لا یخاف علیه منه و کا نوا قو ماً یو فون بالعهد یعرفون بذلک وله فی ذلک منفعة فلا بأ س و فی الهند یة اذا اراد المسلم ان ید خل دار الحرب با مان للتجارة لم یمنع ذلک منه و کذلک اذا اراد حمل الا متعة الیهم فی البحر فی القنیة لایمنع من ادخال البغال و الحمیر و الثور والبعیر فیها فان کان خزا من ابر یسم او ثیا بارقاقامن القز فلا بأس باد خا لها الیهم ولا بادخال الصفرو الشبه الیهم لا ن هذا لا یستعمل للسلاح و فیها قال

محمد لابأس بان يحمل المسلم الى اهل الحرب ما شاء الا الكراع والسلاح (و فى هذه الروايات البيع والشراء منهم الا ما استثنى) وفى الهدايه من ارسل اجيراله مجو سيا او خادما الخ و فى فتاوى الا ما م طاهر البخارى مسلم آجر نفسه من مجوسى لا بأس به و فى الروض الا نف براء ملا عب الا سنة ارسل الى النبى صلى الله عليه وسلم انى قد اصا بنى و جع احسبه قال يقال له الد بيلة فا بعث الى بشئى اتدا وى به فارسل النبى صلى الله عليه وسلم بعكة عسل وامر ه ان يستشفى (من رسالة النور) و فى الدر المختار كتاب القضاء و يجوز تقلد ا لقضاء من السلطان العادل والجائر ولو كافراذكره مسكين وغيره الا اذا كان يمنعه عن القضاء بالحق فيحر م ا ه و فى الدر المختار و جاز بيع عصير عنب ممن يعلم انه يتخذ ه خمراً لا ن المعصية لا تقوم بعينه بل بعد تغيره و قيل يكره لا عا نته على المعصية الىٰ قوله بخلاف بيع امر د من يلوط به و بيع سلاح من اهل ا لفتنة لا ن المعصية تقوم بعينه و فى ردالمحتار عن النهرو علم من هذا انه لا يكره بيع ما لم تقم المعصية به كبيع الجارية المغنية والكبش النطوح والحمامة الطيارة والعصير والخشب ممن يتخذ منه المعازف و ما فى بلو غ الخانية من انه يكره بيع الا مر د من فاسق يعلم انه يعصى به مشكل والذى جزم به الزيلعى فى الحظر و الا باحة انه لايكره بيع جارية ممن يا تيها فى دبر ها او بيع غلامه من لو طى و هو الموافق لما مرو عندى ان ما فى الخانية محمول

علی کراهة التنزيه وهو الذی تطمئن اليه النفوس اذ لا يشكل انه وان لم يكن له معينا انه متسبب فی الا عانة ولم ارمن تعرض لهذا ه ج ۵ ص ۳۸۵ و فی صحيح البخاری عن عبد الرحمن بن ابی بکر ثم جا ء مشرک مشعان طويل بغنم يسو قها فقال النبی صلی اللّٰه عليه وسلم بيعا ام عطية قال لا بل ابيع فا شتری منه شاة ا ه (فرقان) قال العينیؒ کر ه اهل العلم ذلک (ای الاجارة من الکافر) الا للضرورة بشرطين احد هما ان يکون عمله فيما يحل لمسلم والا خران لا يعينه علی ما هو ضرر علی المسليمن و قال ابن حجر معاملة الکفار جائزة الا ما يستعين به اهل الحرب علی المسلمين ا ه.

وعلی الخامسة عشر

ما فی الثالثة والرابعة عشر

و علی السادسة عشر

کون قبح هذه الا مور ظاهر اً و فی الدر المختار باب الجنائز و تزجر النائحة ولا يترک ابتاعها لا جلها ای لا جل النائحة لان السنة لا تترک بما اقترن بها من البدعة ولا يرد الو ليمة حيث يترک حضور ها البدعة فيها للفارق بانهم لو ترکو ا المشی مع الجنازة لزم عدم انتظا مها ولا کذلک الوليمة لو جود من يا کل الطعام عن ابی السعود ج ا ص ۹۳۲.

وعلی السابعة عشر

تعامل علماء الا مة علی عدم ترکهم واحد امن الا قوال المجتهد

فیھا بھذا العذر و کثیر من مسائل الحنفیة شانه کذلک کنفا ذ قضاء القاضی ظاھرا و باطناً و اباحة الربو افی دار الحرب و عدم الترجیح بکثرة الا دلة و نحو ھا و لا یراد بالسواد الا عظم ھذه الکثرة و الا لوجب ترک اقوال ابی حنیفةؒ التی شانھا کذلک مثلا و اللازم منتف فکذا الملزوم و فی البراھین القاطعة عن التوضیح السواد الا عظم عامة المسلمین ممن ھو امة مطلقة والمراد بالامة المطلقة اھل السنة والجماعة وھم الذین طریقھم طریق الرسول علیه السلام و الصحابة دون اھل البدع اه فکان المراد بالسوادا لا عظم ھم اھل السنة والجماعة سواء کانوا متفقین او مختلفین فلا یجوز الخروج عن اتباعھم الی اتباع اھل البدع ولو باخذ قول بعض منھم وان کان ھذا البعض قلیلاً. وفی المنار و نور الانوار فی تعریف الا جماع اتفاق مجتھدین من امة محمد صلی اللّٰه علیه وسلم فی عصر واحد علی امر قولی اوفعلی والشرط اجماع الکل و خلاف الواحد مانع کخلاف الا کثر اه

و علی الثامنة عشر والتاسعة عشر و العشرین ظاھر غیر خفی.

تمت

اشرف علی عفی عنہ

تھانہ بھون

ربیع الاول ۱۳۴۰ھ

مُعَامَلَةُ[1] المُسْلِمِيْنَ فى مُجادلة غير المُسْلِمِيْن

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ملک ہندوستان میں دوسرے ملک کے رہنے والی ایک غیر مسلم قوم حکمران ہے اور اس کی رعایا میں دو جماعتیں ہیں ایک مسلم ایک غیر مسلم غیر مسلم رعایا نے اپنی ایک قومی سیاسی مجلس بنائی جس میں کچھ مسلمان بھی شریک ہو گئے اور حکمران قوم سے آزادی حاصل کرنے کے لئے ذیل کی تدبیر اختیار کیں۔

نمبر (۱) حکومت کی قانون شکنی کی جاوے گو وہ قانون فی نفسہ مباح ہی ہو یعنی اس کے ماننے سے کسی واجب کا ترک یا حرام کا ارتکاب لازم نہ آوے اور اگر اس پر حکومت تشدد کرے تب بھی مدافعت نہ کرے۔ نہ مقابلہ سے اور نہ قانون شکنی کے ترک کرنے سے۔ گو اس اصرار سے بعض اوقات ہلاکت تک کی بھی نوبت آجائے حالانکہ قانون شکنی سے بچ کر اپنی جان کی حفاظت کر سکتی تھی۔

---

(۱)......اس رسالہ کی تحریر کے وقت تک حضرت اقدس نے کسی جماعت کی شرکت جواز کے وعدم جواز کا مطلقاً فیصلہ نہیں فرمایا بلکہ معمولی احتیاط کی بنا پر جزئی سوالات اور اس کے مناسب جواب کی اور آخر میں اس رائے کو بتصریح ذکر فرمادیا ۱۲ محمد شفیع

نمبر (۲) حکومت سے معاملات میں مقاطعہ کیا جاوے یعنی نہ اُن کی نوکری کریں اگر چہ جائز ہی نوکری ہو اور اگر چہ دوسرے ذرائع معاش کے فقدان سے نوکری نہ کرنے سے کتنی ہی تنگی ہو۔ نہ اُس کی تعلیم گاہوں میں تعلیم حاصل کی جاوے اگر چہ وہ تعلیم مباح ہو اور نہ اُس کے ملک کی تجارتی اشیاء (خصوص پارچہ) خریدی جاویں۔

نمبر (۳) جن دوکانوں پر ایسی اشیاء کی تجارت ہوتی ہو ان پر پہرہ دار مقرر کئے جائیں کہ وہ خریداروں کو جس طرح بھی ممکن ہو روکیں۔ اول زبانی فہمائش سے۔ اگر اس سے نہ مانیں تو ان کے راستہ میں لیٹ جائیں تا کہ وہ مجبور ہو جائیں اور اگر خرید چکے ہوں تو ان کو واپسی پر مجبور کریں گو دوکاندار خوشی سے واپس نہ کرے۔ اسی طرح دوکاندار کو ایسی اشیاء کی تجارت بند کرنے پر مجبور کریں اگر وہ نہ مانے تو اس کو طرح طرح کی تدبیروں سے ضرر پہونچاویں دھمکیاں دیں۔ گو اس دوکاندار کے پاس اور کوئی ذریعہ معاش نہ ہو اور گو اس تجارت کے بند کرنے سے وہ اس کے اہل وعیال بھوکوں مریں۔

نمبر (۴) اپنے رہبروں کی گرفتاری وغیرہ کے موقعوں پر ہڑتال کرا دینا یعنی دوکانیں بند کرا دینا اگر چہ کسی کو دوکان بند کرنے سے فاقہ ہی کی نوبت آجاوے اور جو شخص ان مقاطعات واحتجاجات مذکورہ نمبر ۲ و ۳ و ۴ میں ان سے شرکت نہ کرے اس کو اذیت پہنچانے میں حتی کہ بعض اوقات موقع پا کر زدوکوب کرنے میں بھی دریغ نہ کریں۔

نمبر (۵) ان مذکورہ پہروں اور ہڑتالوں میں بے پردہ عورتوں سے مدد لینا اگر چہ وہ جوان اور زینت سے آراستہ ہوں یعنی ان کا دوکانوں پر بے حجابانہ بیٹھنا اور سڑکوں پر پھرنا یا خرید وفروخت سے روکنا ہڑتال وغیرہ کی ترغیب دینا اور اس مقصود کے

لئے اجنبی مردوں سے بے تکلف خطاب واختلاط کرنا اور ہاتھ جوڑ کر یا راستہ میں لیٹ لیٹ کر خریداروں کو مجبور کرنا جس سے بعضے غلبہ حیا سے اور اکثر غلبۂ شہوت سے متاثر ہوجاتے ہیں اور اس میں نگاہ اور قلب کا فتنہ تو یقینی ہے اور بعض اوقات اس سے آگے فحش افعال میں بھی ابتلاء ہوجاتا ہے۔

نمبر(۶) اگر کوئی گرفتار ہوجائے اُن میں سے بعضے لوگ جیل خانہ میں مقاطعہ جوعی کرتے ہیں یعنی کھانا نہیں کھاتے یہاں تک کہ مرجاتے ہیں اور قوم میں ان کے مدح کی جاتی ہے۔

نمبر(۷) وقتاً فوقتاً جلسے کئے جاتے ہیں جلوس نکالے جاتے ہیں ان میں تلبیسی تقریریں کی جاتی ہیں بعض اوقات کنواری بیاہی نوجوان عورتیں بھی تقریر کرتی ہیں خلاف شرع نظمیں پڑھی جاتی ہیں، باجا وغیرہ بجایا جاتا ہے۔

نمبر(۸) ان تحریکات کی غرض خود اس جماعت کے اقرار سے تو ایک ایسی حکومت کا قائم کرنا ہے جس میں عنصر غالب اس غیر مسلم جماعت کا ہوگا اور عنصر مغلوب جماعت مسلم کا مگر واقع میں یہ عنصر مغلوب بھی برائے نام ہی ہے اصلی غرض اُس غیر مسلم جماعت کا تسلط ہے جس سے شعائر اسلام اور جماعت مسلمین ذاتاً یا مذہباً بالکل فنا ہوجائیں چنانچہ خود اس حکومت کا نظام مجوزہ اور اس جماعت کے معاملات وواقعات اور تقریرات وتحریرات اس پر کافی گواہ ہیں چنانچہ تھوڑا ہی زمانہ گزرا کہ اس جماعت غیر مسلم نے عام مسلمانوں کو آزادی کی جدوجہد میں شریک کرنے اور ان سے مدد لینے کے لئے ایک قرارداد منظور کی تھی جس سے مسلمانوں کے مذہبی وقومی مصالح اور ملکی حقوق کا ایک حد تک تحفظ ہوتا تھا۔ چنانچہ اس قرارداد کی وجہ سے مسلمان بہت کچھ مطمئن ہوگئے تھے لیکن بعد میں اس جماعت نے اپنی دوسری خالص مذہبی وقومی مجلس اعظم کے ایماء وہدایت

کے موافق اس قرارداد کو منسوخ کر دیا۔ اس کاروائی سے ایک تو اس جماعت غیر مسلم کی نیت وارادہ کا اندازہ ہوتا ہے کہ وہ مسلمانوں کو اپنے زیر اثر اور مغلوب کر کے رکھنا چاہتی ہے اور یہ خطرہ یقینی ہو جاتا ہے کہ مسلمانوں کے مذہبی اور قومی معاملات میں اسلامی شریعت کے خلاف دست اندازی ہوا کرے گی جس کی مثال شاردا ایکٹ کی صورت میں پہلے سے موجود ہے۔ دوسرے اس جماعت غیر مسلم کے نقض عہد کی وجہ سے مسلمانوں کو آئندہ اُن کے کسی عہدہ و پیمان پر اعتماد نہیں ہو سکتا۔

نمبر (۹) ان تدابیر کی تجویز و تعلیم و تنقید کا علمبردار ایک ایسے غیر مسلم کو قرار دیا گیا ہے جس کا مطمح نظر صرف اپنی قوم کا مفاد ہے اور مسلمانوں سے اُس کو کوئی ہمدردی نہیں چنانچہ اس کے مقاصد میں سے گاؤ کشی کا انسداد خود اُس کے اقرار سے ثابت ہے جیسا کہ اخبارات میں مذکور ہے اور باوجود اس کے بعض مسلمان اُس غیر مسلم کے ایسے مطیع و معتقد اور محبّ ہیں کہ جو اُس کے منہ سے نکلتا ہے عمل میں بھی اس پر لبیک کہتے ہیں اور اس کے مقولہ کو قرآن و حدیث سے ثابت کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں اور اس کے محاسن نہایت جوش و خروش سے بیان کرتے ہیں اور کم سے کم ٹوپی ہی پہننے میں رغبت سے اس کے ساتھ تشبہ کرتے ہیں۔

نمبر (۱۰) اس جماعت غیر مسلمہ کے بعض احاد اپنی قوت بڑھانے کے لئے مسلمانوں کو شرکت کی اب بھی دعوت دیتے ہیں اور بعضوں کو اپنی قوت پر ایسا ناز ہے یا کسی مصلحت سے وہ قوت کا اظہار کرتے ہیں کہ وہ مسلمانوں کی طرف التفات بھی نہیں کرتے مگر بعضے مسلمان گو بہت ہی قلیل ہیں ان کی طرف بڑھتے ہیں پھر ان میں بعض مسلمان تو ظاہراً و باطناً ان کے تابع ہو کر اور بعض برائے نام زبان سے تو اپنے استقلال کے مدعی ہو کر مگر عملاً ان کے تابع ہو کر ان کے ساتھ شرکت کرتے ہیں۔

یہ مجمل صورت ہے واقعات کی اور تفصیل مشاہدات و مطالعہ اخبارات سے معلوم ہو سکتی ہے۔ اب ان واقعات کے متعلق سوالات حسب ذیل ہیں۔

(الف) آیا یہ افعال مذکورہ شرعاً جائز ہیں یا نہیں اور جماعت مسلمین کو ایسے افعال کا ارتکاب جائز ہے یا نہیں۔ بالخصوص جماعت غیر مسلم کے تابع ہو کر پھر خصوص جبکہ اس کا اثر کفر کی تقویت اور اسلام کا ضعف ہو جیسا واقعات نمبر ۸ و نمبر ۹ و نمبر ۱۰ سے ظاہر ہے۔

(ب) اگر افعال ممنوعہ کے ساتھ کچھ افعال مباح بھی ہوں تو ان افعال مباحہ کے شامل ہونے سے آیا افعال ممنوعہ بھی مباح ہو جاویں گے۔ یا مباح و غیر مباح کا مجموعہ غیر مباح رہے گا۔

(ج) ایسی حکومت جو مرکب ہو جماعت مسلمہ و غیر مسلمہ سے۔ کیا وہ حکومت اسلامی ہوگی یا غیر اسلامی خصوص جبکہ قرائن قطعیہ سے ثابت ہو کہ اس حکومت میں ہمیشہ مقصود مصالح سیاسیہ ہوں گے اور جب کبھی ان مصالح میں اور مذہب میں تصادم و تزاحم ہوگا وہ مصالح ہی مقدم ہوں گے اور مذہب کو یا ترک کر دیا جاوے گا یا اس میں تحریف کر کے ان مصالح پر منطبق کر دیا جاوے گا بلکہ اس حکومت میں جس قسم کے مسلمان حصہ پا سکتے ہیں خود ان کے حالات سے بھی ترجیح مصالح کی مذہب پر قریب قریب یقینی ہے جس کی تازہ نظیر امان اللہ خان کی حکومت کا رنگ ہے پھر غیر مسلم سے تو رعایت مذہب کی کیا توقع ہے۔ پس کیا ایسی حکومت کے لئے جو کہ مسلم و کافر میں مشترک ہو پھر مسلم بھی وہ جن کی حالت ابھی مذکور ہوئی کوشش کرنا جہاد ہے جس کی شرعی غرض اعلاء کلمۃ اللہ اور تقویت دین ہے۔ اور گو اب بھی حکومت غیر اسلامیہ ہے مگر کیا ان دونوں صورتوں میں کچھ فرق ہے یا نہیں کہ اب تو حکومت غیر اسلامیہ ہمارے اختیار سے نہیں اور وہ ہمارے اختیار سے ہوگی۔ نیز اس وقت کی حکومت غیر اسلامیہ اپنی رعایا کے مذہب کو قصداً ضرر نہیں پہنچاتی۔ اور وہ حکومت جو برائے نام مشترکہ اور در حقیقت غیر اسلامیہ ہوگی قصداً مذہب اسلامی کو ضرر پہنچاوے گی جس

کے شواہد مشاہد ہیں جو کہ روزانہ اخبارات میں بھی شائع ہوتے رہتے ہیں۔

(د) اگر کسی ایک عالم یا علماء کی کسی جماعت نے افعال مذکور میں شرکت یا موافقت کا فتویٰ دے دیا خواہ کسی غرض فاسد سے خواہ خلوص کے ساتھ اجتہادی غلطی و حقیقت ناشناسی سے یا فتویٰ کو تو افعال مباحہ کے ساتھ مقید کیا مگر مسلمانوں میں نظام نہ ہونے کی وجہ سے اور علماء میں قوت نہ ہونے کی وجہ سے یقینی ہو کہ وہ اُن قیود کے ہرگز متقید نہ ہونگے اور ضرور افعال غیر مباحہ کے مرتکب ہوں گی بہرحال کسی صورت سے ایسا فتویٰ کسی نے دے دیا مگر اسی کیساتھ بہت سے علماء اس فتوی میں متفق بھی نہ ہوں تو کیا سب مسلمانوں پر اس فتوے پر عمل کرنا واجب ہو جاتا ہے یا جس سے جس کو اعتقاد ہو اُس کے فتوے پر عمل کر سکتا ہے اور کیا چند علماء کا خواہ وہ کثیر یا اکثر ہی ہوں (گو یہاں ایسا نہیں ہے) اتفاق کر لینا اجماع میں داخل ہو جاوے گا جس کی مخالفت ناجائز ہوتی ہے۔

(ہ) جو شخص ان تدابیر کو خلاف شرع سمجھ کر اس میں شرکت نہ کرے اس پر ملامت کرنا یا طعن کرنا یا اس کو بدنام کرنا یا اس سے بڑھ کر اس کو کسی قسم کی مالی یا بدنی اذیت و مضرت پہنچانا جیسا کہ بہت مواقع پر ہوا جائز ہے۔

الجواب

(الف) یہ افعال شرعاً جائز نہیں اور مسلمانوں کو ایسے افعال کا ارتکاب جائز نہیں۔ خصوص جبکہ غرض بھی وہ ہو جو سوال میں مذکور ہے اس وقت تو دو قبح جمع ہو جائیں گے ایک باعتبار حقیقت کے دوسرا باعتبار غایت کے۔ چنانچہ ایک ایک کے متعلق لکھتا ہوں۔

نمبر(۱) حق تعالیٰ فرماتے ہیں ولا تلقوا بایدیکم الی التھلکۃ اور جس حالت میں اس قانون پر عمل کرنا شرعاً جائز ہو جیسا سوال میں مذکور ہے تو بلا ضرورت ایسی قانون شکنی کا انجام ہلاکت ظاہر ہے۔

نمبر (۲) یہ مقاطعہ بعض اوقات ترک واجب تک مفضی ہو جاتا ہے مثلاً کسی کے پاس بجز جائز نوکری یا کسی خاص تجارت کے دوسرا کوئی جائز ذریعہ معاش کا نہیں اور ادائے حقوق اہل وعیال کے لئے اس پر اکتساب واجب ہے تو اس مقاطعہ سے اس واجب کا ترک لازم آتا ہے۔ اور ترک واجب معصیت ہے اور جن مقاطعات میں اس واجب کا ترک بھی لازم نہ آتا ہو مگر حکومت سے عداوت لازم آتی ہے اور بلا ضرورت شرعیہ ضعیف کے لئے جائز نہیں کہ قوی کو اپنا دشمن بنا لے کہ اس میں بھی اپنے کو مصیبت میں ڈالنا ہے جس کی ممانعت آیت مرقومہ نمبر ا۔ میں گزری ہے اور یہ جب ہے کہ اس مقاطعہ کو واجب شرعی نہ سمجھا جاوے اور اس پر دوسرے کو مجبور نہ کیا جاوے۔ ورنہ واجب شرعی سمجھنا مصداق ہے۔ یحرفون الکلم عن مواضعہ کا اور مجبور کرنا ظلم و اکراہ ہے جس کی حرمت ظاہر ہے۔

نمبر (۳) یہ واقعہ بھی متعدد گناہوں پر مشتمل ہے ایک مباح فعل کے ترک پر مجبور کرنا کیونکہ بجز بعض خاص تجارتوں کے سب اشیاء کی خرید و فروخت کا معاملہ اہل حرب تک کے ساتھ بھی جائز ہے چہ جائے کہ معاہدین کے ساتھ۔

فی شرح السیر الکبیر ج ۳ باب ما یکره ادخله دارالحرب الا انه لا باس بذلک فی الطعام و الثیاب و نحو ذلک لما روی ان ثمامة بن اثال الحنفی اسلم فی زمن النبی صلی الله علیه وسلم فقطع المیرة عن اهل مکة وکانوا یمتارون ههنا فکتبوا الی رسول الله صلی الله علیه وسلم یسألو نه ان یاذن له فی حمل الطعام الیهم فا ذن له فی ذلک واهل مکة یو مئذ کا نو ا حر با لرسول الله صلی الله علیه وسلم فعرفنا انه لا با س بذلک الی قوله الا الکرا ع والسبی و السلاح.

دوسرے بعد اتمام بیع کے واپسی پر مجبور کرنا اور زیادہ گناہ ہے کیونکہ بدون قانون خیار کے یہ واپسی بھی شرعاً مثل بیع کے ہے جس میں تراضی متعاقدین شرط ہے۔

قال اللّٰہ تعالیٰ ولا تا کلوا اموا لکم بینکم با لباطل الا ان تکون تجارۃ عن تراض منکم

تیسرے نہ ماننے والوں کو ایذاء دینا جو کہ ظلم محض ہے چوتھے اہل وعیال کو تکلیف پہنچانا کہ یہ بھی ظلم ہے۔ پانچویں اگر اس کو واجب شرعی بتلایا جاوے تو شریعت کی تغییر و تحریف ہونا جس کا مذموم ہونا نمبر۲ میں گزر چکا ہے۔

نمبر(۴) اس میں وہی خرابیاں ہیں جو نمبر۳ میں مذکور ہوئیں اور اگر ان احتجاجات مذکور میں شرکت نہ کرنے پر ایذاء جسمانی کی بھی نوبت آ جاوے تو یہ گناہ ہونے میں اضراء مالی سے بھی اشد اور منافی اقتضائے اسلام کے ہے۔

قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم المسلم من سلم المسلمون من لسانہ ویدہ والمومن من امنہ الناس علی دمائھم و اموالھم (جمع الفوائد للترمذی و النسائی ولہ و للبخاری وابی داؤد بدل والمؤمن الی اخرہ والمھا جرالخ)

پھر ان مقاطعات پر مجبور کرنے میں یہ جابرین خود اپنے تسلیم کردہ قانون حریت کے بھی خلاف کر رہے ہیں، ورنہ کیا وجہ کہ اپنی آزادی کی تو کوشش کریں اور دوسروں کی آزادی کو سلب کریں۔

نمبر(۵) اس واقعہ کا نصوصِ حرمت زنا ومقدمات زنا کی منافی ہونا ظاہر ہے خصوص اس اعلان کے ساتھ جو کہ اس آیت کے عموم میں داخل ہے۔

ان الذین یحبّون ان تشیع الفا حشۃ فی الذین اٰمنوا لھم

عذاب اليم.

نمبر(۶) اس کا خودکشی اور حرام ہونا ظاہر ہے:

قال اللّٰہ تعالیٰ و لا تقتلوا انفسکم و فی الهدا یة کتاب الاکراہ فیأثم کما فی حالة المخمصة الی قوله فکا ن ابا حة لارخصة الخ و فی العنا یة فا متنا عه عن التنا ول کا متنا عه من تنا ول الطعام الحلال حتی تلفت نفسه او عضوه فکا ن اثما الخ

اس روایت سے معلوم ہوا کہ جان بچانا اس درجہ فرض ہے کہ اگر حالت اضطرار میں اندیشہ مر جانے کا ہو اور مردار کھانے سے جان بچ سکتی ہو اس کا نہ کھانا اور جان دیدینا معصیت ہے چہ جائیکہ طعام حلال کا ترک اور اس فعل کی مدح کرنے میں تو اندیشہ کفر ہے کہ صریح تکذیب ہے شریعت کی کہ شریعت جس فعل کو مذموم کہتی ہو یہ اس کو محمود کہتا ہے۔

نمبر(۷) قال اللّٰہ تعالیٰ و قد نزّل علیکم فی الکتاب ان اذا سمعتم اٰیات اللّٰہ یکفر بها و یستهزأ بها فلا تقعد و ا معهم حتی یخو ضوا فی حدیث غیره انکم اذًا مثلهم .

اس آیت سے صاف معلوم ہوا کہ ایسے جلسوں اور جلوسوں کی شرکت جس میں خلاف شریعت تقریریں ہوتی ہوں اور علی الاعلان احکام شرعیہ کی مخالفت کی جاتی ہو صریح گناہ ہے بالخصوص جبکہ ان کو مستحسن بھی سمجھا جاوے اور دوسروں کو بھی ترغیب دی جاوے۔

نمبر(۸) اس غرض کا مذموم ہونا ظاہر ہے اور ایسی غرض کو کامیاب بنانے کی کوشش کرنا صریح اعانت ہے معصیت کی یا کفر کی جس کی حرمت منصوص ہے۔

قال اللّٰہ تعالیٰ و لا تعا و نوا علی الا ثم والعدوان الآیة.

نمبر(۹) قال اللّٰہ تعالیٰ و لا تطع منهم اثما أو کفورا وقال

تعالیٰ یا ایھا الذین اٰمنوا لا تتخذ و ا بطا نة من دو نکم لا یا لونکم خبا لا ودّوا ما عنتم قد بد ت البغضاء من افوا ھھم و ما تخفی صد ور ھم اکبر قد بینا لکم الا یا ت ان کنتم تعقلون ھا انتم أولا ء تحبو نھم ولا یحبو نکم الا یا ت وقال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم اذا مدح الفا سق غضب الرب تعالیٰ واھتزله العرش رواہ البیھقی فی شعب الا یمان (مشکوٰۃ) وقال تعالیٰ و لا تر کنوا الی الذین ظلموا فتمسکم النار الآیة وقال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم من تشبه بقوم فھو منھم رواہ احمد وابو داؤد (مشکوۃ)

ان آیات واحادیث سے اس واقعہ کے اجزاء کا قبیح ومعصیت ہونا ظاہر ہے۔

نمبر(۱۰) فی شرح السیر الکبیر با ب الا ستعانة باھل الشرک و استعانة المشر کین با لمسلمین ج ۳ ما نصه ولابأس بأن بستعین المسلمون با ھل الشرک علی اھل الشرک اذا کا ن حکم الا سلام ھو ا لظاھر الی ان قال والذی روی ان النبی صلی اللّٰہ علیه وسلم رأی کتیبة حسنا ء قال من ھٰو لا ء فقیل یھود بنی فلا ن حلفاء ابن ابی فقال انا لا نستعین بمن لیس علی دیننا ۔ تاویله انھم کانوا اھل منعة و کانوا لایقاتلون تحت رایة رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم و عندنا اذا کانوا بھذہ الصفة فانه یکرہ الا ستعانة لھم الی قوله و انما کرہ ذلک لا نه کا ن عنه معه سبع مائة یھود بنی قینقا ع من

حلفائه فخشي ان يكونوا على المسلمين ان احسوابهم زلة قدم فلهٰذا ردّ هم و فيه بعد ذلك حديث الزبير حين كا ن عند النجاشي فنزل به عدو ه فا بلي يومئذ مع النجاشي بلاء حسنا الى قوله ان النجاشي كا ن مسلماً وبعد اسطر قلنا ان ظهر على النجاشي لم يعرف من حقنا ما كان النجاشي يعرف فا خلصنا لدعا ء الى ان مكن اللّٰه النجاشي اھ ملخصا.

اس روایت کا حاصل یہ ہے کہ کفار کے ساتھ ایسے معاملات میں شرکت کی (جبکہ اور کوئی امر شرعی مانع نہ ہو) شرط یہ ہے کہ وہ ہمارے تابع ہوں اور اگر وہ ہمارے تابع نہ ہوں خواہ متبوع ہوں یا دونوں قوت وعمل میں برابر ہوں تو ان کے ساتھ شرکت جائز نہیں جس کی وجہ بھی اسی روایت میں مذکور ہے کہ جب اُنہیں بھی قوت مستقلہ ہو تو شرکت میں اندیشہ ہے کہ جب مجموعی قوت سے انکا مقابل مغلوب ہو جاوے پھر وہ اپنی قوت سے مسلمانوں کو مغلوب کر سکتے ہیں اور اگر کہیں اس شرط کے خلاف ہوا ہے جیسے ایک غنیم کے مقابلہ میں نجاشی کی مدد حضرات صحابہ نے کی تو اس کی وجہ یا تو یہ ہے کہ نجاشی اس وقت مسلمان ہو گئے تھے یا یہ وجہ ہے کہ مسلمانوں کو حالت موجودہ میں کسی پناہ کی حاجت تھی اور نجاشی بہ نسبت اس غنیم کے مسلمانوں کے لئے زیادہ مفید تھے اس لئے اس موقع پر وہ شرط نہیں رہی یہ حاصل ہے روایت کا اب اس واقعہ کی حقیقت میں غور کرنے سے اس کا حکم اس روایت سے صاف ظاہر ہے وہ یہ کہ اگر مسلمان اس غیر مسلم طالب آزادی جماعت کے ساتھ شریک ہو جائیں تو یقیناً وہ مسلمانوں کے تابع نہیں ہیں بلکہ یا تو متبوع ہوں گے اور مسلمان ان کے تابع اور غالب یہی ہے اور یا دونوں برابر ہوں گے تو گو یہ احتمال بہت ضعیف ہے لیکن اگر ایسا بھی ہو تب بھی جواز شرکت کی جو شرط تھی کہ مسلمان متبوع ہوں وہ مفقود ہے اس لئے جواز بھی مفقود ہے اور جو وجہ عدم جواز شرکت کی روایت مذکورہ میں بیان

کی گئی ہے کہ مسلمانوں سے کام نکال کر پھر خود مسلمانوں پر غالب آنے کی کوشش کریں یہاں اس کا خطرہ یقینی ہے۔ یہ تفصیل تھی حرف الف کے جواب کی اب بقیہ جواب عرض کرتا ہوں۔

(ب) اصولیین وفقہاء کا مسئلہ مسلمہ ہے۔

ما اجتمع الحلال و الحرام الا و قد غلب الحرام

یعنی مجموعہ حلال وحرام کا حرام ہی ہوتا ہے اور یہی مسئلہ عقلی بھی ہے بلکہ اگر صرف جزو مباح ہی پر نظر کی جاوے مگر وہ ذریعہ ہو جائے کسی مقصود غیر مباح کا سو بقاعدہ شرعیہ مقدمۃ الحرام حرام خود وہ جزو مباح بھی غیر مباح ہو جاتا ہے اس سے اس سوال کا جواب معلوم ہو گیا کہ مباح کے انضمام سے مجموعہ مباح نہ ہوگا اور بعض صورتوں میں خود وہ مباح بھی مباح نہ رہے گا۔

(ج) اسی اصل مذکور حرف ب کے مقتضاء سے ایسی حکومت بھی غیر اسلامی ہوگی خصوص جبکہ اس میں وہ خطرات ہوں جو اس سوال میں لکھے گئے ہیں پھر اس کے لئے کوشش کرنا جہاد کیونکر ہو سکتا ہے اس کو اعلاءِ کلمۃ اللہ وتقویتِ دین کون کہہ سکتا ہے۔

فی جمع الفوائد: سئل النبی صلی اللہ علیہ وسلم عن الرجل یقاتل شجاعة و یقاتل حمیة (للقوم او الوطن مثلاً) و یقاتل ریاء ایّ ذلک فی سبیل اللّٰہ؟ فقال: من قاتل لتکون کلمة اللّٰہ هی العلیا فهو فی سبیل اللّٰہ (لستة الا ما لکا).

اور جن دونوں قسم کی حکومتوں میں سوال میں نہایت وضوح وتفصیل سے دو فرق دکھلا کر حکم کا فرق پوچھا گیا ہے فرق ظاہر ہے اور نمبر ۱۰ کے جواب میں روایت سے جو قصہ نجاشی کا لکھا گیا ہے وہ ایسے ہی فرق پر مبنی ہے اور ایسے ہی وصف فارق پر حضرت مولانا گنگوہی قدس سرہٗ نے اپنے ایک فتوی کو مبنی فرمایا ہے جو ذیل میں منقول ہے۔

وھی ھذہ چونکہ قدیم سے مذہب اور قانون جملہ مسیحی لوگوں کا یہ ہے کہ کسی کی ملت اور مذہب سے پرخاش اور مخالفت نہیں کرتے اور نہ کسی مذہبی آزادی میں دست اندازی کرتے ہیں اور اپنی رعایا کو ہر طرح سے امن وحفاظت میں رکھتے ہیں لہٰذا مسلمانوں کو یہاں ہندوستان میں جو کہ مملوکہ ومقبوضہ اہل مسیحی ہے رہنا اور اُن کا رعیت بننا درست ہے۔ چنانچہ جب مشرکین مکہ معظمہ نے مسلمانوں کو تکلیفیں اور اذیتیں پہنچائیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ملک حبشہ میں جو مقبوضہ نصاریٰ تھا بھیج دیا اور یہ صرف اس وجہ سے ہوا کہ وہ کسی کے مذہب میں دست اندازی نہ کرتے تھے۔

(از حصہ روئداد جلسہ ۵۲۔ مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور منعقدہ ۲۵ مارچ ۱۷ء)

و تقييد الفتوىٰ بالمذهب و الرعية اخرج اضرار بعضهم من ليس على ملتهم فى البلا د الشاسعة فما هو من اهل الحكومة ليس فى الملة و ما هو فى الملة ليس من اهل الحكومة .

اور اسی فرق کی تائید ایک دوسرے مسئلہ سے بھی ہوتی ہے جو کہ عقلی بھی ہے اور شرعی بھی وہ یہ کہ جہاں دونوں شقوں میں مفسدہ ہو مگر ایک میں اشد ایک میں اخف اشد سے بچنے کے لئے یا اس کو دفع کرنے کے لئے اخف کو گوارا کر لیا جاتا ہے۔

كما قالوا: من ابتلى ببليتين فليختر ا هو نهما . وقال النووى فى شرح مسلم فى حديث بر يرة ما نصه: والثانية والعشرون احتمال اخف المفسدتين لدفع اعظمهما واحتمال مفسدة يسيرة لتحصيل عظيمة علىٰ ما بينا فى تا ويل شرط الولا ء لهم اھ

(د) ایسا فتویٰ سب پر حجت نہیں ہر شخص کو جائز ہے کہ جس عالم سے عقیدت ہو اس کے فتویٰ پر عمل کرے بلکہ حالات مذکورہ سوالات پر نظر کر کے تو جواز شرکت کا فتویٰ دینے والوں کے قول میں اگر تاویل ہی کر دی جاوے غنیمت ہے مثلاً یہ کہ اُن کی نیت نیک

ہوگی اور ان مفاسد پر نظر نہ ہوگی اور اس کو اجماع تو کسی طرح کہہ ہی نہیں سکتے۔

فی نور الانوار و اھل الاجماع من کان مجتھدا صالحا الخ والشرط اجتماع الکل و خلاف الواحد مانع کخلاف الاکثر اھ و انظر الی بعض اقوال بعض المجتھدین خالفوا فیھا الجم الغفیر من العلماء ولم یطعن فیھم بمخالفة الاجماع ومبناہ مانعیة خلاف الواحد۔

(۵) اوّل تو اگر جانبین میں صواب وخطاء کا برابر بھی احتمال ہوتا تب بھی مسائل اجتہادیہ میں کسی ایک شق کو صواب سمجھنا اور دوسری شق کے اختیار کرنے پر ملامت کرنا مصداق ہے و من یتعد حدود اللّٰہ فقد ظلم نفسہ کا اور یہاں تو اجوبہ مذکورہ پر نظر کر کے جانب منع راجح ہے پھر تو شریک نہ ہونے والے پر کسی قسم کی بدگمانی یا بدزبانی کرنے کا بدرجہ اولیٰ کسی کو حق نہیں۔

واللّٰہ تعالیٰ اعلم و علمہ اتم واحکم۔

کتبہ اشرف علی عاشر صفر ۱۳۴۹ھ

نوٹ نمبر (۱) اس کے قبل دوبارہ مجھ سے ایک ایسی عبارت کے متعلق سوال کیا گیا جو میری طرف منسوب کر کے بدون میرے علم کے شائع کی گئی تھی اول بار اُس عبارت میں حوالہ بھی نہ تھا دوسری بار میں حوالہ تھا اب تیسری بار میں مستقل سوالات پیش کئے گئے چونکہ واقعات وحالات کے تبدل سے ہمیشہ جواب بدل جاتا ہے جس کا احتمال آئندہ بھی ہے اس لئے تینوں بار میں مختلف عنوان سے جواب دیا گیا گو معنوں میں تعارض نہیں پس جوابوں کے تخالف حقیقی کا شبہ نہ کیا جاوے اگر کچھ تخالف صوری ہے تو وہ سوالات کا ہے۔

نوٹ نمبر (۲) یہ تحریر بالا تو خاص سوالات کا جواب تھا جو واقعات کے تابع ہیں چونکہ میرے پاس کوئی موثوق بہ ذریعہ تحقیق واقعات کا نہیں اس لئے احتیاطاً میں نے اپنے لئے طریق عمل وہ تجویز کیا ہے جو ایک خادم دین جماعت نے ایک دینی درسگاہ کے لئے تجویز کیا ہے۔" وھو ھذا تبصرف یسیر "علماء امت و نیز لیڈران قوم باہم مختلف الرائے ہیں ہر ایک جماعت اپنے علم و تحقیق یا اغراض کے مطابق واقعات کو ملک کے سامنے پیش کر رہی ہے اور حالات بسرعت واقعات کے ساتھ تبدیل ہو رہے ہیں اس صورت میں کسی ایک واقعۂ خاص کو پیش نظر رکھ کر رائے قائم کرنا شرعی نقطہ نظر سے دشوار ہے اس لئے سیاسی مسائل میں جب تک کسی قطعی فیصلہ کی شرعی ضرورت داعی نہ ہو سکوت ہی مصلحت سمجھا گیا ہے پس اس درسگاہ کا جماعتی مسلک مختصر الفاظ میں ہمیشہ یہ رہا اور ہے کہ اس نے نہ اعلان حق میں کبھی دریغ کیا اور نہ عمل میں کبھی نمایش اور ہنگامہ آرائی کو دخل دیا اس کی جماعت جس طرح شورش پسند نہیں ہے اسی طرح کسی اثر سے متاثر ہو کر کتمانِ حق کرنے والی بھی نہیں ہے یہ اس کا قدیم جماعتی مسلک ہے جس پر کسی انفرادی یا شخصی عمل کی ذمہ داری نہ کبھی پہلے عائد ہوئی ہے نہ اب ہو سکتی ہے۔۲۴ ذی الحجہ ۴۸ھ و ۱۴ محرم ۴۹ھ۔

نوٹ نمبر (۳) چونکہ اس مضمون کی ایک معتد بہ مقدار ہوگئی اس لئے حسب معمول بمناسبت مضمون کے اس کا ایک لقب بھی تجویز کر دیا مُعَامَلَة المُسْلِمِين فی مجادلة غیر المُسْلِمِین ۔

اشرف علی عفی عنہ

صیانة المُسلِمین[1]
عن
خیانة غیر المسلِمین

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اما بعد الحمد و الصلوٰۃ فعن ابی ہریرۃؓ قال النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم المؤمن القوی خیر من المؤمن الضعیف و فی کل خیر الحدیث رواہ مسلم.

آج کل مسلمانان ہند جن پریشانیوں میں مبتلا ہیں ان میں دو طریق مشروع ہیں ایک ضعفاء کے لئے کہ سکوت محض سے کام لیں نہ حفاظت کا کوئی سامان کریں نہ مدافعت کا اہتمام کریں۔ دوسرا اقویاء کے لئے کہ حفاظت و مدافعت کی تدبیر کریں اپنے لئے بھی اور اپنے مسلمان بھائیوں کے لئے بھی۔ اور حدیث بالا سے جس طرح دونوں طریق کا جواز معلوم ہوتا ہے۔ اسی طرح دوسرے طریق کی ترجیح بھی معلوم ہوتی ہے اور حفاظت کا محل دو چیزیں ہیں۔ ایک دین اور اصل یہی ہے۔ دوسرے دنیا اس کی حفاظت کی فضیلت بھی مع فضیلت حفاظت دین کے اس حدیث سے ثابت ہے۔

---

(۱)...... یعنی مسلمانوں کو جو کسی بیوفا غیر مسلم قوم سے کچھ دنیوی یا دینی ضرر پہنچتا ہو یا پہنچنے والا ہو اس ضرر سے اپنی حفاظت کے لئے ایسے ذرائع بتلانے والا رسالہ جو شرعاً و قانوناً جائز ہوں ۱۲۔

من قتل دون ماله فهو شهيد و من قتل دون دمه فهو شهيد و من قتل دون دينه فهو شهيد ومن قتل دون اهله فهو شهيد (جمع الفوائد عن اصحاب السنن)

اور یہ امر تجربہ سے ثابت ہے کہ اکثر افراد حفاظت کے خصوص دوسروں کی مطلقاً حفاظت اور اپنی دنیا کی حفاظت کے افراد عادةً موقوف ہیں قوت اجتماعیہ اور اتفاق منظم پر اس لئے حفاظت کی ضرورت داعی ہوگی اجتماع و اتفاق و تنظیم مذکور کی طرف اور ہمارے بھائیوں میں یہ قریب قریب مفقود ہے اسی لئے ہر مسلمان بجائے خود اپنے کو تنہا دیکھ کر اپنے ضعف سے پریشان ہے ورنہ اہل باطل کے مقابلہ میں اہل حق کی پریشانی کا احتمال ہی نہیں ہوسکتا اور اگر کہیں برائے نام تنظیم ہے تو اس سے محض اغراض دنیویہ مقصود ہیں بلکہ اکثر تو دین کو ان اغراض میں مخل سمجھ کر قصداً اس سے اعراض کرتے ہیں ایسی بیچارگی کے وقت میں رحمت الٰہیہ نے دستگیری فرمائی کہ بعض بندوں کے قلوب میں ایسی تنظیم کی ضرورت اور عملی صورت القاء فرمائی جس سے دین اصالۃ اور دنیا تبعاً محفوظ رہ سکے۔ اس لئے ہم چند خدام اسلام نے اس تنظیم کی غرض سے ایک مجلس قائم کی اور چونکہ ہر عمل میں تحقیق حکم شرعی کی ضرورت ہے اس لئے اس کی دفعات کے متعلق فتویٰ شرعی بھی حضرت مولانا مولوی محمد اشرف علی صاحب مدظلہم العالی سے حاصل کیا جو ذیل میں منقول ہے اور چونکہ اس کی ضرورت ہر مقام پر عام ہے اس لئے دیگر اہل اسلام کے نفع کی غرض سے اس کو شائع بھی کیا جاتا ہے اگر مقامی مصلحت سے اس میں کہیں جائز کمی بیشی کر لی جاوے اس کا مضائقہ نہیں۔

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس بات میں کہ آج کل مسلمانان ہند جن پریشانیوں میں مبتلا ہیں اور آئندہ اس سے زیادہ مبتلا ہونے کا خطرہ ہے ان سے خود محفوظ رہنے اور دوسرے بھائیوں کو محفوظ رکھنے کے لئے ایک جماعت نے ایک مجلس قائم کرنے کا ارادہ کیا ہے جس کی دفعات حسب ذیل ہیں اب سوال یہ ہے کہ یہ دفعات شریعت مطہرہ کے

خلاف تو نہیں تا کہ ایسی دفعہ کو بدل کر شریعت کے موافق کر لیا جاوے۔ وہ دفعات یہ ہیں۔

نمبر (۱) احکام شرعیہ پر پورے اہتمام سے عمل کرنا اور جن اعمال پر قدرت نہ ہو ان میں معذوری ہے۔

نمبر (۲) دوسروں کو ان احکام کی اور ان کی پابندی کی تبلیغ کرنا۔

نمبر (۳) خصوص احکام ذیل جن کو خاص دخل ہے حفاظت مقصودہ میں وہ احکام یہ ہیں اسلام پر قائم رہنا۔ علم دین سیکھنا اور سکھلانا۔ قرآن مجید کا پڑھنا پڑھانا اللہ تعالیٰ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت درجہ عشق میں رکھنا۔ تقدیر پر ایمان لانا اور خدا تعالیٰ پر بھروسہ رکھنا۔ دُعا مانگنا نیک لوگوں کے پاس بیٹھنا اور جو ان میں گزر گئے ہیں ان کے اچھے حالات کی کتابیں پڑھنا یا سننا۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات کا پڑھنا یا سننا۔ مسلمانوں کے حقوق کا خاص خیال رکھ کر ادا کرنا۔ اپنی جان کے حقوق ادا کرنا۔ اس میں یہ بھی داخل ہے کہ حکام کا مقابلہ نہ کریں بلکہ تہذیب سے اپنی تکلیف کی اطلاع کریں اگر حسب مرضی انتظام نہ ہو صبر کریں اور اگر کسی مخالف کی طرف سے کوئی شورش ہو تو حکام ہی کے ذریعہ سے اُس کی مدافعت کریں پھر خواہ وہ خود انتظام کر دیں خواہ تم کو انتقام کی اجازت دے دیں۔ نیز جان کے حقوق میں یہ بھی داخل ہے کہ ورزش کریں۔ حدود قانون کے اندر فن سپہگری سیکھیں نماز کی پابندی رکھنا۔ ضرورت کے مقام پر مسجد بنانا۔ کثرت سے اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنا۔ زکوٰۃ دینا نیز دوسرے نیک کاموں میں خرچ کرنا۔ روزے رکھنا۔ حج کرنا۔ اور اگر وسعت یا ہمت ہو روضہ شریف کی زیارت بھی کرنا۔ قربانی کرنا۔ اور اگر اس میں کوئی روک ٹوک کرے تو اس دستور العمل کو اختیار کریں جو ابھی اپنی جان کے حقوق میں مذکور ہوا۔ آمدنی اور خرچ کا انتظام رکھنا۔ نکاح سے نسل بڑھانا۔ دنیا سے دل نہ لگانا۔ گناہوں سے بچنا۔ صبر و شکر کرنا، صبر میں یہ بھی داخل ہے کہ جہاں شریعت کا حکم ہو وہاں مالی یا جانی کیسی ہی تکلیف ہو اس کی برداشت کرنا۔ مشورہ کے قابل امور میں مشورہ لینا، باہم محبت و

ہمدردی و اتفاق رکھنا۔ امتیاز قومی یعنی اپنا لباس اپنی وضع اپنی بول چال اپنا برتاؤ وغیرہ غیر مذہب والوں سے الگ رکھنا (ان اعمال کی تفصیل رسالہ حیوۃ المسلمین میں کی گئی ہے جو قابل ملاحظہ ہے)۔

نمبر(۴) طریق عمل احقر کے ذہن میں یہ ہے کہ جس جگہ جس جماعت کو گو وہ قلیل ہی ہو توفیق ہو ایک مجلس بنا کر ان احکام پر عمل کرنے اور کرانے کی کوشش شروع کردیں۔

نمبر(۵) سہولت نظم کے لئے اس مجلس کا کوئی لقب بھی تجویز کرلیا جاوے مثلاً صیانۃ المسلمین یا اور کچھ اور باقاعدہ اس کے کچھ عناصر بھی مقرر کردیئے جاویں جن کی خدمت کا کوئی معاوضہ نہ ہوگا۔

نمبر(۶) یہ عناصر تین قسم کے ہوں گے ایک ارکان یہ وہ لوگ ہوں گے جن کا مشورہ مجلس کے ہر کام کے لئے شرط ہوگا اور رکن کا چندہ گزار ہونا شرط نہیں۔ دوسرے معین یہ چندہ گزاروں کا لقب ہوگا۔ تیسرے عامل یہ اُن لوگوں کا لقب ہوگا جو نہ مشیر ہیں نہ چندہ گزار بلکہ محض بلا معاوضہ اپنی خدمات مجلس کے لئے وقف کرتے ہیں اور مجلس کی طرف سے جو خدمت اُن کے سپرد کی جاوے وہ اس کو حسبۃً للہ بجا لاتے ہیں ان تینوں عناصر کا تعلق باضابطہ ہے۔ چوتھے محبین جو محض خیر خواہی و دعا میں مشغول ہیں اور کوئی مناسب رائے خیال میں آتی ہے اس کی اطلاع مجلس میں کرتے ہیں اس طبقہ کا تعلق باضابطہ نہیں۔

نمبر(۷) طبقہ ارکان میں سے ایک شخص کو اس مجلس کا صدر تجویز کیا جاوے جس کا انتخاب ارکان کے اتفاق سے ہوگا۔

نمبر(۸) ارکان کا عدد بہت زیادہ نہ ہونا چاہئے بلکہ ہر مقام پر ایسا عدد ہو جن کا اجتماع مشورہ کے لئے سہل ہو خواہ وہ مقامی ہوں یا بیرونی ہوں مگر ضرورت کے وقت بسہولت جمع ہوسکتے ہوں۔ اور بقیہ تین طبقوں کی تعداد کی کوئی حد نہیں۔

نمبر(۹) جدید رکنیت کے لئے قدیم ارکان کی متفقہ منظوری شرط ہے جس میں وہ مختار ہیں اور بقیہ تین عناصر کی خدمات کا قبول کر لینا ارکان کے ذمہ لازم ہے۔ الالمانع شرعی مفوض الی رأیھم۔

نمبر(۱۰) ایک شخص دو خدمتیں لے کر دو طبقوں میں بھی شمار کیا جاسکتا ہے۔

نمبر(۱۱) کوئی شخص خود رکنیت کی درخواست نہ کر سکے گا بلکہ ارکان سابق خود اس سے رکنیت کی درخواست کریں گے اور معین اور عامل خود درخواست کر سکتے ہیں اُن کی درخواست پر اُن کو ایک فارم دیا جائے گا جن میں اُن کو اپنا نام ونشان اور وعدہ خدمت لکھنا ہوگا جس کا نقشہ ارکان تجویز کر سکتے ہیں اور یہ سب فارم مجلس میں محفوظ رہیں گے اور محبین خود بھی درخواست کرسکیں گے اور اُن سے بھی درخواست کی جاسکتی ہے مگر یہ سب زبانی ہوگی اور اگر کسی جانب سے بھی خاص درخواست نہ ہو تب بھی ہر مسلمان سے عام درخواست اس وقت کی جاتی ہے کہ نیک مشوروں سے اور دعا سے اس مجلس کی مدد فرماتے رہیں۔

نمبر(۱۲) صدر اور رکن کا تقرر جیسے اتفاق ارکان سے ہوا تھا اسی طرح ان کا عزل بھی اتفاقِ ارکان سے ہوگا۔

نمبر(۱۳) اور صدر اور رکن کا استعفاء کسی کی منظوری پر موقوف نہیں لیکن ان کا احسان ہوگا اگر دو ہفتہ قبل اطلاع دیدیں۔

نمبر(۱۴) باستثناء وقتی کاموں کے کوئی کام بدون مشورہ نہ کیا جاوے۔

نمبر(۱۵) مشورہ کے لئے صدر اور تین مشیروں کا اجتماع کافی ہے۔ اگر صدر کو کچھ عذر ہو وہ وقتی مشورہ کے لئے کسی رکن کو اپنا قایم مقام بنا دے اور اگر صدر سفر میں ہو خود ارکان کسی کو صدر کا قایم مقام بنالیں۔

نمبر(۱۶) اگر اہل شوریٰ میں اختلاف ہو جاوے تو جس جانب صدر کی رائے ہو

قطع نظر اقلیت یا اکثریت سے اس کو ترجیح ہوگی اور اگر اہل شوری اور صدر میں اختلاف ہو جاوے تو احتیاط کے پہلو کو ترجیح دی جاوے گی یعنی اگر امر متنازع فیہ ایک رائے میں نافع محض غیر متحمل الضرر ہو اور دوسری رائے میں نہ نافع ہو نہ مضر تو نافع والی رائے کو ترجیح ہوگی اور اس کام کو کر لیا جاوے گا اور اگر ایک رائے میں مضر ہو اور دوسری رائے میں نافع مگر غیر ضروری تو مضر والی کو ترجیح ہوگی اور کام کو ترک کر دیا جائے گا اور اگر ایک رائے میں مضر ہو اور دوسری رائے میں نافع اور ضروری اور صرف یہ اختلاف اہم واشد ہے تو صدر کی رائے کو ترجیح ہوگی۔

نمبر (۱۷) کوئی کام خلاف شرع نہ کیا جائے گا نہ کوئی رائے خلاف شرع قبول کی جاوے گی اگر جواز وعدم جواز میں تردد ہو علماء سے استفتاء کیا جائے گا اگر انتخاب مفتی میں اختلاف ہو جاوے یا علماء کے فتاوے میں اختلاف ہو جاوے تو صدر کے تجویز شدہ مفتی کا فتویٰ معمول بہ ہوگا لیکن جس رکن کو اس میں شرح صدر نہ ہو وہ عمل پر مجبور نہ کیا جائے گا اس کو سکوت کی اور اس کام میں شریک نہ ہونے کی اجازت دی جاوے گی مگر مناقشہ کی اجازت نہ ہوگی۔ اسی طرح کوئی کام خلاف قانون بھی نہ کیا جائے گا۔

نمبر (۱۸) اس مجلس میں شریک ہونے کے لئے کسی پر اصرار نہ کیا جاوے بہتر تو یہ ہے کہ ترغیب بھی نہ دی جاوے لیکن اگر کسی مقام پر اس میں مصلحت ہو تو ترغیب میں مخاطب کی طیب خاطر و انشراح قلب سے تجاوز نہ کیا جاوے۔ صرف مجلس کے اعزاز و مقاصد کی خصوصی یا عمومی اطلاع دی جاوے جو شخص خود یا جائز ترغیب سے شرکت کرے اس کو شریک کر لیا جاوے۔

نمبر (۱۹) اس مجلس کی طرف سے کچھ مخلص واہل مبلغ بھی مقرر کئے جائیں کہ وہ احکام شرعیہ کی عموماً اور احکام مذکورہ نمبر (۳) کی خصوصاً اشاعت کریں اور یہ تبلیغ بہ خطاب عام ہوگی اور اس تبلیغ میں غیر مسلموں کو اسلام قبول کرنے کی بھی ترغیب دیا کریں اور مناظرہ

وغیرہ کسی سے نہ کریں۔ اگر کوئی خود درخواست کرے اُس کو مناظرین کا پتہ بتلا دیں۔

نمبر (۲۰) اس مجلس کی طرف سے کچھ فہیم و سلیم رضا کار بھی مقرر کئے جائیں کہ ان کا کام تبلیغ بہ خطاب خاص ہوگا مثلاً نمازوں کے وقت مشغولین غافلین کو نرمی اور محبت سے نماز کا یاد دلانا۔ کوئی شخص خلاف شرع کام کرتا ہوا یا اُس کا ارادہ کرتا ہوا دیکھا جاوے جیسے بدکاری یا شراب خواری یا قمار بازی اس کو نرمی سے شرعی وعیدیں یاد دلا کر سمجھا دینا لیکن اگر اس سے کوئی نہ مانے تو پھر اس پر مسلط ہو جانا یا کسی طرح سے زور دینا خواہ سختی سے خواہ ہاتھ جوڑ کر یا رستہ میں لیٹ کر یہ مناسب نہیں بلکہ جب ناصح کی باضابطہ حکومت نہ ہو ایسا کرنا اکثر مضر ہو جاتا ہے۔ اسی طرح سے اگر یہ رضا کار کسی پر ظلم ہوتا ہوا دیکھیں۔ مثلاً کوئی شخص ایک مباح معاملہ کر رہا ہے جیسے کپڑا خریدنا یا بیچنا اور دوسرا اس کو معاملہ نہ کرنے پر مجبور کر رہا ہے تو یہ رضا کار اس مظلوم کی مدد کریں لیکن صرف مدافعت کی حد تک رہیں ظالم سے انتقام نہ لینے لگیں۔ اسی طرح راستہ میں کسی حاجتمند کا بوجھ اُٹھوا دینا کسی کو سوار ہونے میں مدد دیدینا۔ کسی پیاسے کو پانی پلا دینا۔ کسی انجان کو راستہ بتلا دینا۔ دو شخص لڑتے ہوں اُن میں صلح کرا دینا یہ سب رضا کاروں کی خدمات ہیں اور اس مظلوم یا حاجتمند میں یہ نہ دیکھا جائے کہ یہ اپنے مذہب کا ہے یا دوسرے مذہب کا۔ سب کی مدد کرنا چاہئے۔ رضا کاری کی یہ شرائط ہیں اسلام عقل بلوغ ذکورت۔ طالب علمی میں مشغول نہ ہونا خواہ علم معاش ہو خواہ علم معاد ہو۔ کسی کا ماتحت یا ملازم نہ ہونا۔

نمبر (۲۱) ان مبلغین اور رضا کاروں کی کوئی امتیازی علامت بھی ہو تو قرین مصلحت ہے۔

نمبر (۲۲) یہ مبلغین اور رضا کار سب صدر مجلس کے ماتحت ہوں گے کوئی کام بدون اُس کی اجازت کے نہ کرسکیں گے۔

نمبر (۲۳) یہ رضا کار روزانہ اور مبلغین ماہانہ صدر کے پاس یا صدر جس کو اپنی

نیابت میں اس کام کے لئے منتخب کردے اس کے پاس جمع ہو کر اپنی کارگزاری کی اطلاع دیا کریں اور آئندہ کے لئے مناسب احکام حاصل کیا کریں اور ارکان مجلس کا جلسہ کم از کم ماہانہ ہوا کرے جس میں ضروری مشورے طے ہوا کریں۔

نمبر (۲۴) ان مبلغین ورضا کاروں کی مالی خدمت کے لئے کچھ چندہ کا انتظام بھی کیا جاوے مگر اس میں شرعی حدود کا اہتمام واجب ہے اگر چندہ کم ہو کام مختصر پیمانہ پر کیا جاوے اور جن رضا کاروں کو دلچسپی ہو ان کو ورزش وغیرہ بھی سکھلائی جاوے۔

نمبر (۲۵) اگر مجلس میں ایسے حضرات شریک ہو جائیں جو مسلمانوں کی دوکان کھلوانے کا انتظام کر سکیں تو مجلس اس خدمت کو بھی اپنی فرائض میں داخل کر لے۔

نمبر (۲۶) اور اگر مجلس میں ایسے حضرات شریک ہو جائیں جو مسلمانوں کی تکالیف کا چارہ کار یا ان کے حقوق آئین اور تہذیب کے حدود میں رہ کر گورنمنٹ سے طلب کر سکیں تو مجلس اس خدمت کو بھی اپنے فرائض میں داخل کرے۔

نمبر (۲۷) وقتاً فوقتاً مجلس کی کارگزاری مع حساب چندہ شائع ہونا چاہئے۔

نمبر (۲۸) اس کارگزاری کی عام روئداد بھی اور اس کی جزئیات وقتیہ خاص طور پر زبانی بھی حکام رس حضرات کے توسط سے حکام کو پیش کرتے رہیں تا کہ کسی مخالف کو بدگمانی پیدا کرنے کی گنجائش نہ ہو۔

نمبر (۲۹) اس مجلس کا مرکزی مقام دہلی ہوگا اور دوسرے مقامات پر اہل مقام کو اختیار ہے خواہ مستقل طور پر اپنے یہاں ایسی مجالس قائم کریں خواہ اس مرکزی مجلس کی شاخیں بناویں اور شاخ بنانے کی صورت میں مرکز اور شاخوں کے باہمی تعلقات وحقوق و شرائط کے متعلق زبانی مشورہ کر لیا جاوے۔

نمبر (۳۰) شعبۂ تبلیغ کے تحت میں مفید رسالے بھی حسب ضرورت وحسب وسعت وقتاً فوقتاً خرید کر مجلس میں محفوظ رہیں گے اور ایک خاص وقت میں عام مسلمانوں کو وہاں آکر

مطالعہ کی اجازت ہوگی اور اگر وسعت ہو تو ایسے رسائل چھپوا کر یا خرید کر عام مسلمانوں میں شائع بھی ہو جایا کریں گے۔ مگر مجلس کے سرمایہ سے کوئی اخبار نہ خریدا جاوے گا۔ اگر کوئی مالک اخبار بلا معاوضہ بھیج دیا کرے یا ارکان یا غیر ارکان بطور خود خرید کر خواہ مجلس میں داخل کر دیں خواہ بطور خود مطالعہ کر کے استحضار واقعات سے مشورہ میں کام لیں اس کی اجازت ہے۔ مگر ہر حالت میں یہ وصیت کی جاتی ہے کہ محض اخبار میں کسی واقعہ کے درج ہونے سے بدون اذنِ شرعی کوئی اثر نہ لیں۔

نمبر (۳۱) چونکہ مذکورہ بالا کارگزاریوں کے لئے ضبط کی بھی ضرورت ہوگی اس لئے مجلس میں ایک فہیم مستعد محرر کا مقرر کرنا بھی ضروری ہے جس کی خدمت کی نگرانی صدر کے یا جس کو صدر تجویز کر دیں اس کے ذمہ ہوگی اسی طرح دفتر کے لئے ایک مکان کی بھی ضرورت ہوگی اور یہی مکان انعقاد مجلس کے بھی کام آوے گا۔

(نوٹ) یہ مجلس خالص مذہبی ہے۔ سیاسیات سے اس کا کوئی تعلق نہیں نہ کسی کی مدافعت میں نہ مخالفت میں اور محکومین کا حکام سے اپنا جائز حق حدود قانون میں مانگنا سیاست نہیں جیسا جائز ملازمت کی درخواست کو کوئی شخص سیاست نہیں کہہ سکتا۔

الجواب

یہ سب دفعات بالکل شریعت کے ایسے موافق ہیں کہ دلائل کی بھی حاجت نہیں۔لیکن چونکہ اس مجموعہ کی ضرورت اجتہادی ہے اس لئے اگر باوجود اعتقاد ان کے استحسان کے ان کو عمل میں لانے سے کسی کو دلچسپی نہ ہو اور وہ اپنے لئے ذوقاً یکسوئی کو اسلم سمجھے اور اس مسلک کو پسند کرے جس کو احقر نے رسالہ معاملۃ المسلمین کے نوٹ نمبر۲ میں اپنے لئے طریق عمل تجویز کیا ہے اُس پر اس مجلس کی شرکت کے لئے اصرار نہ کیا جاوے چنانچہ خود مجلس مسئول عنہ کی دفعہ نمبر ۱۸ میں بھی اس کی تصریح کی ہے۔اب اس جواب کو اس دُعا پر ختم کرتا ہوں۔

اللّٰھم اجعل ھٰذہ الجَمَاعَۃ صیَانۃ
وحمَایَۃ للمُسلمین عن
کل خیانۃ و نکایۃ من غیر
المُسْلمین

کتبہ اشرف علی
۲۴ ربیع الاول۔الاغر الاجل ۱۳۴۹ھ

المَانعيّة عَن بَعض الجَامعيّة

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اخبار استقلال دیو بند بابت ۲۰ ستمبر ۳۶ء ۳ رجب ۵۱ھ کے صفحہ ۵ میں یہ خبر پڑھ کر کہ طلبہ دار العلوم دیو بند نے ایک ایسے شخص کا اسٹیشن پر پرعظمت استقبال واحترام کیا۔ نیز بعض اکابر دار العلوم نے اس کی فرودگاہ پر جا کر اس سے ملاقات کی اور اس کی معیت میں جلسہ گاہ میں آئے جس سے عام مسلمانوں پر جو اثر ہو سکتا ہے ظاہر ہے (جو علاوہ غیر مسلم ہونے کا احکام اسلام کی اہانت وانہدام کی سعی کرتا ہے۔ چنانچہ اخبار الامان دہلی ۲۱ ستمبر ۳۶ء ۴ رجب ۵۵ھ کے صفحہ ۳ میں اس شخص کا ہندو مسلم کی باہمی ازدواج کے متعلق تمام ہندوستان کے لئے عام قانون بنانے پر زور دینا مذکور ہے اور یہ محض ایک نمونہ ہے (وللکافرین امثالها) اس قدر صدمہ ہوا کہ اُس کی برداشت کی بجز اس کے کوئی صورت نہیں کہ میں آج ہی سے اپنے کو ایسے حضرات کی زیارت وصحبت سے محروم کر دوں کیونکہ ان تعلقات سے اُس صدمہ کی تجدید ہوگی جس کا تحمل میری ہمت سے خارج ہے اور اگر ایسے طلبہ کو یہاں آنے سے منع کر دیا جاوے تو میں اس کو اپنی اعانت علی الراحت سمجھ کر ممنون ہوں گا پس مقصود اس تحریر سے اپنے خاص ضعف کا علاج ہے نہ کہ تقوی کا دعوی بقول ایک حکیم کے۔

زاہد نداشت تاب جمال پری رُخاں
کنجے گرفت و ترس خدا را بہانہ ساخت

اس طرح میں ایسے حضرات کو جو دونوں طرف خصوصیت کا تعلق رکھنا چاہتے ہیں

مشورہ دیتا ہوں کہ وہ اس خیال کو بالکل دل سے نکال دیں۔ یہ برزخیت یا جامعیت دینی و دنیوی مصالح کے بالکل خلاف ہے۔ اسلم یہی ہے کہ ایسا تعلق ایک ہی طرف رکھیں خواہ ضعفاء سے خواہ اقویاء سے اور سہل یہ ہے کہ مجھ کو چھوڑ دیں۔ باقی عام اسلامی تعلقات یا ضابطہ کے معاملات اس سے مستثنیٰ ہیں اسی طرح دارالعلوم سے جو بلا واسطہ تعلق ہے اس پر بھی اس بے تعلقی للعارض کا کوئی اثر نہیں یہ عوارض تو انشاء اللہ تعالیٰ بہت جلد فاما الزبد فیذهب جفاء کا منظر ثابت ہوں گے اور دارالعلوم اپنی ذات و برکات میں واما ما ینفع الناس فیمکث فی الارض کا مظہر رہے گا۔ اخیر میں یہ دُعا بھی کرتا ہوں اور یہی دُعا چاہتا بھی ہوں۔

اللّٰهُمّ اجعلنا جميعًا كمَا تحب و ترضى. واجعل اٰخر تنا خيراً من الا ولٰى

۵/رجب ۵۵ھ

خط خاص

السّلام علیکم۔ آپ کو یاد ہوگا کہ آپ کی زبانی مجھ کو یہ پیام دیا گیا تھا کہ ہم طلبہ میں کانگریسی اثر نہیں پھیلاتے کیا یہ کانگریسی اثر نہیں۔ کیا ان کی شرکت اور طلبہ کو سختی سے نہ روکنا اس کا سبب قریب و موثر نہیں پھر قول و فعل میں تطابق کہاں یہ اس لئے ظاہر کیا گیا کہ اب تو اس اعلان میں مجھ کو معذور سمجھا جائے گا آپ اس اعلان کو کسی منظر عام پر چسپاں کر دیجئے۔

اشرف علی

۵/رجب ۱۳۵۵ھ از تھانہ بھون

سوال و جواب ملقب به
تنبیه المسلمین علی تمویه العالم المخالط بالمشرکین

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین مسائل ذیل ہیں۔

(۱) زید ایک مذہبی عالم اور پیشوائے دین ہے وہ ایک ایسی جماعت میں شریک ہوتا ہے اور عام مسلمانوں کو شریک کرنا چاہتا ہے۔

(الف) جس کے مسلم اور غیر مسلم (مشرک یا دہری) شرکاء میں (جن کا مجموعہ بقاعدہ عقلیہ جماعت غیر مسلمہ ہے) ایک بڑی تعداد ایسے اشخاص کی ہے جو اشتراکیت (سوشیلزم) کی حامی اور بلالحاظ احکام شریعت ملک میں اقتصادی مساوات قائم کرنے کے حامی اور عملاً کوشاں ہیں۔

(ب) وہ جماعت اپنے سیاسی اقتدار اور آئینی قوت سے ایسے احکام وقوانین نافذ کرتی ہے جن کے ذریعہ سے وارثت تملیک اوقاف اور ذاتی حقوق ملکیت کے متعلق شریعت اسلامی کے احکام کی خلاف ورزی ہو۔

(ج) جس زمین کا حق ملکیت بروئے قانون شریعت و مقامی رواج ایک مسلمان کو حاصل ہے۔ یہ جماعت اس کی پیداوار کے منافع کو اس مسلمان کی مرضی کے

خلاف غیر مسلم کا شتکار کے حق میں کلاً یا جزاً چھوڑنا چاہتی ہے اور زمیندار اور کاشتکار کے درمیان اس پیداوار یا اس کی قیمت کی تقسیم کے متعلق جو معاہدہ ہے یا ہوسکتا ہے اس کے نفاذ کو اپنے آئینی احکام سے وہ جماعت روکتی ہے۔

(د) اس جماعت کے احکام اور طرز عمل سے وقفی اراضیات یا ان کی پیداوار و آمدنی خلافِ منشاء واقف اور بلا مرضی متولی کلاً یا جزاً کا شتکاروں کے حق میں چھوڑ دی جاوے بغیر کسی ایسے قدرتی نقصان کے جو پیداوار میں کسی غیر معمولی کمی کا باعث ہوا ہو اور اسی طرح اس جماعت کے فعل یا ترکِ فعل سے اوقاف اسلامی کا کاروبار کلاً یا جزاً بند ہوتا ہو۔ بحالیکہ کاشتکار ایک مقررہ یا قرار یافتہ جنسی یا نقدی لگان اس اراضی کا سالہا سال سے دیتے رہے ہوں اور اس جماعت کی رخنہ اندازی نہ ہونے کی صورت میں آئندہ بھی دیتے رہنے کے لئے تیار ہوں۔

(ہ) اس جماعت کا صدر اور قائد جس کے اشاروں اور احکام پر یہ جماعت اپنا کام چلاتی ہے صاف الفاظ میں اس کا اعلان کر چکا ہو کہ اراضیات کا حقِ ملکیت کا شتکاروں کی طرف بغیر کسی معاوضہ کے منتقل ہونا چاہئے۔

(۱) ایسی جماعت کے ساتھ جو عالم اشتراک عمل کرے یا دوسرے مسلمانوں کو اس کے ساتھ اشتراک عمل پر آمادہ کرے وہ گنہگار اور احکام شریعت کی خلاف ورزی کے جرم میں شریک سمجھا جائے گا یا نہیں۔

(۲) شرکت کے بعد اگر ان مفاسد کے روکنے پر ایسا عالم اس جماعت کو مجبور نہ کر سکے تو اس کے لئے کیا حکم ہے اور مسلمانوں کو اس کا اتباع کرنا چاہئے یا نہیں۔

(۳) یہ جماعت اگر سود، منشیات، زنا کاری اور دیگر مذہبی جرائم کے فوری انسداد کے لئے احکام نافذ کر دینے کا قانونی حق رکھتی ہو اور نہ کرے تو ایک لمحہ کے لئے بھی اس جماعت کی شرکت اور اس کے ساتھ اشتراک عمل کسی مسلمان کے لئے جائز ہے یا نہیں

اور جو عالم اس میں شریک ہو کر ایسے انسداد کا فوری حکم جاری نہ کرا سکے وہ اس جماعت کی شرکت پر شرعی مجرم ہوگا یا نہیں۔

(۴) وہ جماعت مسلمانوں کے مذہبی معاملات و نزاعات کے تصفیہ کے لئے (جیسے کہ ہبہ شفعہ، طلاق، مہر وغیرہ) اسلامی قوانین کا نفاذ اور اسلامی عدالتوں کا تقرر کر سکتی ہے لیکن نہیں کرتی۔ اس کی شرکت یا اس میں شریک ہو کر فوراً ان چیزوں کے لئے اس جماعت کو مجبور نہ کرنا اور پھر بھی نہ کرے تو اُس کو نہ چھوڑنا شرعاً کیسا ہے اور ایسے عالم کے پیچھے نماز جائز ہے یا نہیں۔ جو دانستہ ان خلاف ورزیوں کا مرتکب ہوتا رہے۔

الجواب:

ان سوالوں کا جواب اس قدر ظاہر ہے کہ لکھنا تحصیل حاصل معلوم ہوتا ہے لیکن محض ایقاظِ نائمین کے درجہ میں نہایت مختصر لکھتا ہوں اس جماعت کے جو اغراض و مقاصد و اعمال سوال میں مذکور ہیں ان کا خلاف دین اور ضلالت محضہ ہونا ظاہر ہے جیسے مساوات مبطلہ احکام شریعت اور ابطال احکام وراثت و تملیک و اوقاف و حقوق ملک خاص و حقوق شرعیہ زمیندار اور حقوق وقف یا مستحق کا حق غیر مستحق کے لئے ثابت کرنا یا جن منکرات کے انسداد پر قدرت ہو اُن کا انسداد نہ کرنا یا جن احکام شرعیہ کے انفاذ پر قدرت ہو ان کو نافذ نہ کرنا ظاہر ہے کہ یہ سب ضلال محض ہیں جس کی کسی مسلمان کو اجازت نہیں نہ ارتکاب کی نہ مرتکب کے ساتھ شرکت اور اس کی اعانت کی نہ قدرت ہوتے ہوئے سکوت و تسامح کی اور نہ عجز کے وقت رضاء کی نہ دوسروں کو ان افعال کی طرف یا اُن کے فاعلین کے ساتھ تعلق رکھنے کی طرف دعوت دینے کی اور اگر کوئی شخص ایسے جماعت کے ساتھ شرکت کی دعوت دے خواہ جاہل ہو وہ خواہ عالم صریح ان نصوص کے خلاف کر رہا ہے۔

قال اللّٰہ تعالیٰ

ولا تعاو نوا على الا ثم وا العدوان .

وابو سعيد رفعه من رأى منكم منكر ا فليغيره بيده فان لم يستطع فبلسانه فان لم يستطع فبقلبه و ذلک اضعف الايمان المسلم واصحاب السنن .

(ابن مسعود) رفعه ان اول ما د خل النقص على بنى اسرائيل كا ن الرجل يلقى الرجل فيقول هذا اتق اللّٰه و د ع ما تصنع فانه لا يحل لک ثم يلقاه من الغد و هو حاله فلا يمنعه ذلک ان يكون اكيله وشربيه و قصيده فلما فعلوا ذلک ضرب اللّٰه قلوب بعضهم على بعض ثم قال لعن الذين كفرو امن بنى اسرائيل الى فا سقون الحديث لا بى داؤد والترمذى .

جرير بن عبداللّٰه رفعه ما من رجل يكون فى قوم يعمل فيهم بالمعا صى يقدرون على ان يغيروا عليه ولا يغيرون الا اصا بهم اللّٰه بعقاب قبل ان يموتوا . لا بى داؤد .

عريس بن عميرة الكندى رفعهٗ اذا عملت الخطيئة فى الا رض كان من شهد ها فا نكرها كمن غاب عنها . ومن غاب عنها فرضيها كان كمن شهد ها لا بى داؤد .

جابر رفعه. اوحى اللّٰه الى ملک من الملائكة ان اقلب مدينة كذا و كذا على اهلها قال ان فيها عبد ک فلان لم يعصک طرفة عين قال اقلبها عليه فا ن وجهه لم يتمعر فى سا عة قط (للا و سط بلين يعنى لم يغضب لله (الروايات كلها فى جمع الفوائد)

وعن ابی هريرة مر فوعاً و من دعا الی ضلالة كا ن عليه من الاثم مثل آثام من تبعه لا ينقص ذلک من آثامهم شيئا . رواه مسلم .

عن انس مر فوعاً العلماء امنا ء الرسل على عباد اللّٰه ما لم يخالطوا السلاطين فاذا فعلو اذلک فقد خافوا المرسل فا حذ رو هم و اعتزلوهم (تخريج العراقی لاحاديث الا حياء عن العقيلی فی الضعفاء كتاب العلم الباب السادس واورده السيوطی عن الحاكم عن انس مرفوعا وزادفيه بعد مالم يخا لطوا السلاطين و يد خلو ا فی الدنيا قال السيوطی الحديث ليس بموضوع اِلٰی قوله و له شواهد لمعنا ه كثيرة صحيحة و حسنة فوق الاربعين و يحكم له بالحسن (اللآلی المصنوعة كتاب العلم قلت انظرالی قوله عليه السلام فا حذ رو هم واعتز لو هم.

اور ایسے غیر محتاط عالم کے متعلق اسلامی قانون یہ ہے کہ اگر اسلامی حکومت ہوتو اس کوفتویٰ دینے سے ممانعت کر دی جاتی ہے۔

كمافی الدر المختار وغيره كتاب الحجر بل يمنع مفت ماجن يعلم الحيل البا طلة كتعليم الردة لتبين من زوجها او لتسقط عنها الزكوٰة فی ردا لمحتار قوله كتعليم الردة الخ و كا لذی يفتی عن جهل شر نبلا ليه عن الخا نية.

بلکہ یہ عالم مذکور فی السوال اس مفتی ماجن مذکور فی الکتاب بھی احق بالمنع ہے کیونکہ اس ماجن کا فتوی حدود قانون کے اندرتو ہے کسی تاویل سے ہے۔ یا ناواقفی سے ہےاوراس

مسئول عنہ کا تو صریح گمراہی ومخالفت نصوص کی دعوت ہے اور یہ نفع خاص ان ہی غلط مسائل کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ مطلق ہے کما ھو ظاھر۔ پس ایسے عالم سے تمام مسائل میں فتویٰ لینے سے قطع تعلق ہی کر دینا چاہئے۔

الا بضرورة شديدة کہ کسی مقام پر کوئی ثقہ مفتی نہ ہو كما فى ردالمختار ايضاً تحت قوله يمنع لان المفتى لو افتى بعد الحجر و اصاب جا زاه

اور ایسے عالم کے پیچھے نماز پڑھنا بلا ضرورت مکروہ ہے۔ کیونکہ اگر ان امور کا ارتکاب کسی شبہ وتاویل باطل سے ہے تو بدعت ہے ورنہ فسق اور دونوں کی امامت مکروہ ہے صرح بہ فی کتب الفقہ اور ضرورت یہ ہے کہ اور کوئی امام اہل نہ ہو لیکن یہ سب احکام مذکورہ فتویٰ قادر کے لئے ہیں اور عاجز معتزل کے لئے صبر کا حکم ہے۔

ابن عمر سمعت الحجاج يخطب فذ كر كلا ما . انكرته فا ردت ان اغيره فذكرت قول النبى صلى الله عليه وسلم لا ينبغى للمومن ان يذل نفسه قلت يا رسول الله كيف يذل نفسه قال يتعرض من البلاء لما لا يطيق للبز ارو الكبير و الا وسط. (ابو امامه) رفعه اذا را يتم امرا لا تستطيعون غيرهٗ فا صبروا حتى يكون الله هو الذى يغيرهٗ . للكبير يضعف (لكن الحكم ثابت بالقطعيات) كذافى جمع الفوائد و لنعم ما قيل فى الصبرو التفويض فى مثل هذه الرزا يا و البلا يا و قد خرج حين تفا ول بعض الصلحا ء

صبر را باحق قرین کرد ای فلاں — آخر و العصر را آگہ بخواں

صد ہزاراں کیمیا حق آفرید — کیمیائے ہمچو صبر آدم ندید

(الی قولہ)

قوم دیگر مر شنا سم زاولیا — کہ دہاں شاں بستہ باشداز دعا

(یعنی للنفس)

حسن ظنی بردل ایشاں کشود — کہ نپو شنداز غم جامہ کبود

ہرچہ آید پیش ایشاں خوش بود — آب حیواں گردداز آتش بود

(ثم قال)

پس چرا گو ید دعا الا مگر — درِدُعا بیند رضا ئے داد گر

(دفتر سوم مثنوی قصہ لقمان و بھلول)

کتبہ

اشرف علی

۲۰/ج ۲ ۵۶ھ

سوالات[1] از جمعیۃ العلماء ہند دہلی

حامدا و مصلیا و مسلما ......ان سوالات میں ابتدائی چند سوالات تو وہ ہیں جو ہماری طرف سے ہیں جن کا مقصد صرف یہ ہے کہ حالت حاضرہ کے متعلق کوئی رائے قائم کرنے سے پہلے پوری طرح حالات و واقعات کا علم ہو جاوے۔ اور بعد کے چند سوالات وہ ہیں جو دوسرے لوگ جمعیت علماء ہند کے متعلق کیا کرتے ہیں جن کا واقعی جواب جمعیت علماء ہی دی سکتی ہے کہ ان کو واقعات و حالات کی زیادہ خبر ہے۔

ابتدائی سوالات

(الف) جمعیت علماء کے نزدیک مذہبی حیثیت سے کانگریس میں مسلمانوں کی شرکت کیوں ضروری ہے اور کانگریس سے علیحدگی میں کیا ضرر ہے۔

(ب) کانگریس میں مسلمانوں کا داخلہ جس صورت سے انفرادی غیر منظم اور غیر مشروط طریقہ پر اس وقت ہو رہا ہے اور مسلم نشستوں کے لئے کانگریس خود براہ راست امیدوار تجویز کرتی ہے کیا اس سے اسلام اور مسلمانان ہند کو خطرہ نہیں۔ اگر ہے تو اس خطرہ سے بچنے کی کیا صورت ہے۔

---

(۱)...... جب کانگریس میں مسلمانوں کے بلا شرط داخلہ کے خطرناک عواقب تقریباً سامنے آ گئے تو اُس سے مسلمانوں کو مطلقاً روکنے کی رائے قوت کے ساتھ اس کا تقاضا پیدا ہوا۔ مگر حسب معمول پھر بھی مزید احتیاط کے لئے ملک کی دو مسلمان سیاسی جماعتوں سے ضروری سوالات کر کے حالات کی پوری تحقیق فرمائی۔ جمعیۃ العلماء کی طرف سے باوجود بار بار یاددہانی کے کوئی جواب نہ ملا مسلم لیگ کی طرف سے جوابات وصول ہوئے یہ دونوں قسم کے سوالات مع جواب مسلم لیگ خانقاہ تھانہ بھون میں محفوظ ہیں وہاں سے نقل کی گئی ۱۲ محمد شفیع دیوبندی عفی عنہ

(ج) مسلم لیگ سے جمعیۃ العلماء کو کیوں اختلاف ہے جبکہ وہ مسلمانوں کو منظم کر رہی ہے اور اس کا مقصد بھی آزادی کامل کی تحصیل ہے جیسا کہ اس سال لکھنو کے اجلاس میں اُس نے اعلان کر دیا ہے۔

(د) اگر مسلم لیگ میں کچھ مفاسد اور منکرات شرعیہ موجود ہیں تو کیا یہ صورت ممکن نہیں کہ جمعیت علماء مسلم لیگ میں شریک ہو کر اس کو مخلص اور فعال لوگوں سے بھر دے۔ اور مسلمانوں کی تنظیم کو مکمل مفاسد و منکرات سے پاک کر دے۔

(ہ) کیا مسلم لیگ اور جمعیۃ علماء کے تصادم سے مسلمانوں میں تشتت و افتراق پیدا نہیں ہوتا اور کیا یہ تشتت مضر نہیں؟ اگر ہے تو جمعیۃ علماء نے اس ضرر کے انسداد کے لئے کوئی صورت اختیار کی ہے یا نہیں۔

(نوٹ) یہ سوال (ہ) مسلم لیگ والوں سے بھی کیا گیا ہے۔

دوسروں کے شبہات واعتراضات

(۱)...... کانگریس کے ساتھ مل کر جو آزادی ہندوستان کو حاصل ہوگی اس کا انجام ایک حکومت مشترکہ کا قیام ہے جس میں عنصر کفر غالب اور عنصر اسلام مغلوب ہوگا ایسی حکومت اسلامی حکومت یقیناً نہ ہوگی تو اس کے لئے جد و جہد کرنا مسلمانوں کے ذمہ کس دلیل سے واجب ہے نیز اس کی کیا ضمانت ہے کہ ہندو انگریزوں کو ہندوستان سے بالکل بے دخل کرنا چاہتے ہیں اور ان کے ساتھ میں مسلمانوں پر حکومت کرنا نہیں چاہتے۔ کانگریس کے اقتدار سے اس وقت ہندوؤں کے حوصلے جس قدر بڑھنے لگے اور مسلمانوں پر بازاروں۔ دیہاتوں، ملازمتوں، سرکاری محکموں میں جو مظالم وہ برپا کرنے لگے ہیں جمعیت علماء نے اُن کے انسداد کی کیا تدبیر سوچی ہے اور اس کے لئے کوئی عملی قدم اٹھایا ہے یا نہیں۔؟

(۲)......کانگریسی وزارتوں نے زمینداروں کی اراضی کا شتکاروں کی مملوک بنادینے کی جو تجویز سوچی ہے یقیناً صریح ظلم ہے اور جو لوگ کانگریس میں شریک نہیں وہ سب کے سب اس ظلم میں شریک ہیں پھر اس سے بچنے کی جمعیت علماء نے کیا تدبیر کی اور کونسا عملی قدم اٹھایا ہے۔

(۳)......کانگریس میں بندے ماترم کا گیت گایا جاتا ہے جو مضامین شرکیہ پر مشتمل ہے اور قومی جھنڈے کو سلامی دی جاتی ہے جو قریب بہ شرک ہے کانگریسی مسلمان بھی بندے ماترم کی گیت کے وقت کھڑے ہو جاتے ہیں اور قومی جھنڈے کو سلامی دیتے ہیں کیا ان افعال میں شرکت کرنا گناہ نہیں؟ اگر ہے تو جمعیۃ علماء نے مسلمانوں کو اس کے متعلق کیا ہدایت کی اور اس پر اور اسی قسم کی دوسری منکرات پر صدائے احتجاج بلند کی یا نہیں۔

(۴)......صدر کانگریس اور اُس کی ہم خیال جماعت جو اشترا کیت کی حامی اور مذہب اور خدا کی دشمن ہے اُن کی تقریر خدا اور مذہب کے خلاف شائع ہوتی رہتی ہے جمعیت علماء نے ان کے خلاف کوئی صدائے احتجاج بلند کی یا نہیں اور مسلمانوں کو ایسے کافروں کی تعظیم وتکریم سے روکا ہے یا نہیں۔

(۵)......کانگریس کے ساتھ جو آزادی حاصل ہوگی اس کی کیا ضمانت ہے کہ اُس میں مسلمانوں کے مذہبی وسیاسی حقوق کی پوری طرح حفاظت ہوگی جبکہ کانگریس اور اس کے ذمہ داران کے مذہب اور حقوق کا نام لینا بھی جرم سمجھتے اور اُس کو فرقہ پرستی قرار دیتے ہیں۔ نیز جمعیت علماء نے کانگریس کے ساتھ تعاون کرکے مسلمانوں کو مذہبی اور سیاسی حقوق کے تحفظ میں اس وقت تک کیا کام کیا ہے۔

(۶)......جمعیت علماء نے اچھوت قوموں میں تبلیغ اسلام کے لئے کوئی عملی قدم اٹھایا ہے یا نہیں جس کی مذہباً وسیاسۃً سخت ضرورت ہے اور ان کے اسلام میں داخل ہو جانے کی بھی قوی امید ہے۔

سوالات[1] از مسلم لیگ

(۱)...... آپ کے نزدیک کانگریس میں مسلمانوں کی شرکت سیاسی حیثیت سے کیوں مضر ہے اور اس سے علیحدگی کیوں ضروری ہے۔ اکثر لوگ پوچھتے ہیں تو ہم ناواقفیت کے سبب جواب نہیں دے سکتے۔

(۲)...... کیا بدون کانگریس کے تعاون کے ہندوستان کو آزادی مل سکتی ہے۔ اگر مل سکتی ہے تو اُس کی جو صورت آپ کے ذہن میں ہو اس کو واضح فرمایا جاوے۔

(۳)...... کیا کانگریس سے مسلمانوں کی علیحدگی آزادئ ہندوستان کے مسئلہ میں باعث تعویق وتاخیر نہ ہوگی۔

(۴)...... کیا مسلم لیگ تمام مسلمانوں کو یا اُن کی زیادہ تعداد کو کانگریس سے روک سکتی ہے۔ بظاہر یہ امر مستبعد ہے کانگریس میں پہلے ہی سے مسلمان بہت ہیں اور جب سے وزارت قبول کر کے وہ برسرِ اقتدار ہوئی ہے زیادہ تعداد اُس میں شریک ہو رہی ہے۔ پس اگر مسلم لیگ نے تھوڑے سے مسلمانوں کو کانگریس سے روک لیا تو کیا نفع کی امید ہے۔ جب کہ زیادہ حصہ اُس میں شریک ہوگا۔

(۵)...... کیا مسلم لیگ کے زیادہ تر ارکان انگریزوں کے حامی اور اندرونی طور پر اُن کے بہی خواہ ہیں اور کیا بقول سر اکبر حیدری مسلم لیگ ایک برطانوی زہر ہے (مدینہ اخبار ۱۳ دسمبر ۳۷ء) اگر نہیں تو اس اعتراض کا اطمینان بخش جواب کیا دیا جاوے۔

(۶)...... مخالفین کی طرف سے کہا جاتا ہے کہ مسلم لیگ ایک بے عمل جماعت

---

(۱)...... یہ سوالات بھی مولانا ظفر احمد صاحب نے حضرت کے حکم سے لکھے اور آپ کی اصلاحات کے بعد بھیجے گئے ۱۲۔

ہے کانگریس کی طرح اس نے کوئی عملی قدم اب تک نہیں اٹھایا۔ نہ مسلمانوں کے فائدے کے لئے کوئی کام کیا اور اس وقت کانگریس کے مقابلہ پر جو جد وجہد الیکشن لڑانے میں صرف کر رہی ہے مسلمانوں کو اس سے کوئی فائدہ نہیں بلکہ انگریزوں کا نفع ہے کہ کانگریس کی قوت کمزور ہو کر آزادی ہندوستان کا مسئلہ تعویق میں پڑ جائے اس اعتراض کا کیا حل ہے۔

(۷)...... مسلم لیگ نے اب تک مسلمانوں کی تنظیم اور اُن کی مذہبی و تمدنی و اقتصادی ترقی کے لئے کیا طریق عمل اختیار کیا اور اس کے لئے کونسا عملی قدم اٹھایا یا آئندہ کیا ارادہ اور ذہن میں اس کی کیا صورت ہے۔

(۸)...... اگر کسی وقت ہر طرح سے اطمینان حاصل کر کے مسلم لیگ کو کانگریس میں شامل ہونے کی ضرورت ہوئی تو کیا مسلم لیگ کو توڑ کر اُس میں شامل ہونے کی رائے ہے یا مسلم لیگ کو قائم رکھ کر مسلمانوں کے اقتدار کو برقرار رکھتے ہوئے شرکت کی رائے ہے۔

(۹)...... اگر علماء مسلم لیگ کا ممبر بننا چاہیں تو کیا اُن کو بھی الیکشن ہی کے ذریعہ مسلم لیگ کا کوئی درجہ حاصل ہوگا جس سے اُن کو مسلم لیگ کے اجلاس اور مجلس عاملہ وغیرہ میں اپنی رائے پیش کرنے کا حق ہو یا اگر وہ اس ذریعہ کو پسند نہ کریں تو اُن کو بدوں اس ذریعہ کے بھی ایسا درجہ مل سکے گا۔

(۱۰)...... مسلم لیگ میں علماء کی وقعت کس درجہ کی ہوگی اور بصورتِ اختلافِ علماء کسی مسئلہ مختلف فیہا کو کس طرح طے کیا جائے گا۔ کیا اس کے لئے کوئی قاعدہ ذہن میں ہے۔

(۱۱)...... جمعیت علماء ہند دہلی اور مسلم لیگ کے تصادم سے جو مسلمانوں میں تشتت وافتراق پیدا ہو رہا ہے لیگ نے اُس کے ضرر کو محسوس کیا ہے یا نہیں اگر کیا ہے تو اس ضرر کے انسداد کی کوئی صورت باہمی اتفاق کی سوچی ہے یا سوچنے کی ضرورت ہے یا

نہیں۔

نوٹ:　　یہ سوال جمعیت علماء دہلی سے بھی کیا گیا ہے۔

(۱۲)...... مسلم لیگ نے اچھوت قوموں میں تبلیغِ اسلام کی ضرورت کو محسوس کیا ہے یا نہیں (جو نہ صرف مذہباً بلکہ سیاستۂ بھی نہایت اہم ہے) اگر کیا ہے تو اس کے لئے عملی قدم اٹھایا گیا ہے یا نہیں اور اس کا نتیجہ کیا ظاہر ہوا گر اب تک نہیں کیا تو آئندہ کیا رائے ہے۔

جواب از جانب زعمائے مسلم لیگ

سوال نمبر (۱)...... بحث یہ ہے کہ مسلمان اجتماعی حیثیت سے کانگریس کے ساتھ تعاون کریں یا انفرادی حیثیت سے کانگریس میں داخل ہو جائیں ہمارے خیال میں سیاسی حیثیت سے مسلمانوں کی انفرادی شرکت اس لئے مضر ہے کہ مسلمان اقلیت میں ہونے کی وجہ سے کانگریس میں ہمیشہ اس قدر کم تعداد میں رہیں گے کہ کانگریس کے مسلک اور عمل پر ان کی رائے کا کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ نیز مسلمان ارکان کی تعداد کم ہونے کی وجہ سے مسلمان آل انڈیا کانگریس کمیٹی اور ورکنگ کمیٹی میں کانگریس کے واقعی با اختیار ادارے میں شاذ و نادر ہی منتخب ہوسکیں گے کانگریس کی ان دونوں با اختیار کمیٹیوں میں اس وقت تک مسلمانوں کا جو تناسب رہا ہے اس سے یہ اچھی طرح ثابت ہو رہا ہے کہ یہ اندیشہ بالکل صحیح ہے۔ غالباً آل انڈیا کانگریس ورکنگ کمیٹی کے اکیس ارکان میں سے صرف دو مسلمان ہیں اور آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے تقریباً تین سو ارکان میں سے سات یا آٹھ مسلمان ہیں۔ انتخاب مخلوط نشستوں کا یقین نہیں۔ کانگریس میں ہندو ووٹروں کی تعداد زیادہ ہے اسی صورت میں کبھی توقع نہیں کی جاسکتی کہ مسلمان با اختیار کمیٹیوں میں اتنے ہوسکیں گے کہ وہ کانگریس کے فیصلوں

اور طرزِ عمل پر کوئی اثر ڈال سکیں۔ اس سلسلہ میں کانگریسی خیال کے مسلمان کہتے ہیں کہ مسلمانوں کو چاہئے کہ کثیر تعداد میں کانگریس کے ممبر بنیں اور اس طرح کانگریس پر قبضہ کر لیں۔ یہ خیال بالکل غلط ہے۔ ہندو مسلمانوں کے مقابلہ میں باعتبار تعداد میں آگے ہیں اور ہندو عورتیں بھی کانگریس کی ممبر بنتی ہیں اور اس میں شریک ہوتی ہیں مسلمان عورتیں اگر ممبر کبھی بن جائیں تو پردے کی وجہ سے شریک نہیں ہو سکتیں۔ مسلمان زیادہ سے زیادہ یہ کر سکتے ہیں کہ اپنی ساری آبادی کو کانگریس کا ممبر بنوا دیں۔ ہندو بھی یہی کریں گے اس صورت میں ہندو مرد اور عورتیں مل کر مسلمان مرد ممبروں سے تقریباً پانچ گنے ہو جائیں گے اور کانگریس کی ہر کمیٹی کا فیصلہ انہیں کی رائے پر منحصر ہوگا۔ مسلمان کبھی یہ توقع نہیں کر سکتے کہ ان کی کوئی تجویز کانگریس میں منظور ہو سکے گی۔ ممکن ہے کہ یہ کہا جائے کہ ان چار صوبوں کی کانگریس میں جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے یعنی صوبہ سرحد، پنجاب، سندھ اور بنگال، کی ہر کمیٹی میں مسلمانوں کی اکثریت رہے گی۔ یہ ٹھیک ہے۔ مگر دشواری یہ ہے کہ کانگریس کے نظام میں دونوں کو موجودہ انگریزی نظام حکومت کی طرح صوبجاتی خود اختیاری حاصل نہیں ہے۔ کانگریس اسی وجہ سے کہ چار صوبوں میں مسلمانوں کو با اختیار اکثریت نہو صوبجاتی خود اختیاری کے خلاف ہے اور مرکزی وحدانی طرز انتظام پر مُصر ہے۔ کامل آزادی کے مسلک میں متفق نہ ہونے کے باوجود مسلمانوں اور کانگریس کے درمیان یہ مسلسل اختلاف رہا ہے۔ مسلمان اپنی اکثریت کے صوبوں میں جو بات طے کریں گے وہ مرکزی وحدانی طرز حکومت ہونے کی صورت میں کانگریس یعنی آل انڈیا کانگریس کے اجلاس کانگریس کمیٹی اور ورکنگ کمیٹی میں نامنظور ہو جائینگی۔ جہاں مسلمان ارکان کا تناسب چوتھائی سے زیادہ کبھی ہو ہی نہیں سکتا۔ اگر مسلمان اس طرح کانگریس میں شریک ہو گئے تو ان کی یہ حیثیت ہوگی کہ ان کی موجودگی میں ان کے مفاد کے خلاف فیصلے ہوں گے اور آئینی اصول کے مطابق ان کو اکثریت کے فیصلوں کو ماننا پڑے گا اور اس کے باوجود کہ وہ سکوت کریں یا اختلاف کریں وہ

ان مخالف فیصلوں کے ذمہ دار تصور کئے جاویں گے اور کانگریس کے باہر بھی ان کو اختلاف کا کوئی حق نہ رہے گا۔ لیکن اگر مسلم لیگ کے ماتحت اپنی علیحدہ سیاسی تنظیم کریں تو وہ ہندوستان میں ایک دوسری طاقت ہونگے جو تعداد کے اعتبار سے کم ہو مگر دوسری حیثیتوں سے اکثریت کے مقابلہ میں زیادہ طاقتور ہو سکتی ہے۔ یقیناً ہندوؤں اور مسلمانوں کے اشتراک اور اتحاد کے بغیر ہندوستان کا آزاد ہونا بظاہر ممکن نہیں۔ لیکن یہ ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کا مشترکہ مفاد اور مقصد ہے لہٰذا مسلمانوں کو ہندوؤں سے ملنے کی جتنی طلب ہے اتنی ہی ہندوؤں کو بھی ہونی چاہئے۔ لہٰذا اگر کانگریس اخلاص کے ساتھ ہندوستان کی آزادی کی طالب ہو تو اس کو مسلم لیگ کے جائز مطالبات طے کرنے پڑیں گے اور ہر اہم معاملہ میں مسلمانوں سے سمجھوتہ کرنے پر مجبور ہوگی۔ انفرادی حیثیت سے کانگریس میں شرکت سے مسلم اقلیت ہندو اکثریت میں گم ہو جاتی ہے۔ اور جداگانہ تنظیم کی صورت میں مسلمانوں کی اجتماعی قومی انفرادیت قائم رہتی ہے۔ کانگریس میں شریک ہو کر مسلمان جو بات کہیں وہ اکثریت کی طاقتور آواز سے دب جائے گی۔ اور جو بات مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے کہیں وہ جداگانہ ہونے کی وجہ سے ساری دنیا میں سنی جائے گی۔ کانگریس میں شریک ہو کر مسلمان اپنے خاص مفاد کے لئے کوئی جداگانہ عمل نہ کر سکیں گے اور جداگانہ اسلامی تنظیم کے ماتحت ہر عمل ان کے اختیار میں ہوگا۔

جواب نمبر (۲)...... کانگریس کے تعاون کے بغیر یا دوسرے الفاظ میں ہندوؤں کے تعاون کے بغیر مسلمان یقیناً ہندوستان کو آزاد نہیں کرا سکتے۔ لیکن یہ کیا ضروری ہے کہ کانگریس کا تعاون انہیں شرائط پر حاصل کیا جائے جو کانگریس پیش کرے یعنی ہر مسلمان چار آنہ کا ابتدائی ممبر بنے اور انفرادی حیثیت سے بلا مسلم فساد کے تحفظ کی شرائط منوائے ہوئے کانگریس میں داخل ہو کر اپنی اسلامی حیثیت کو گم کر دے اور محض ہندوستانی رہ جائے اسی طرح کیوں نہ ہو کہ مسلمان مسلم لیگ کے ماتحت اپنی تنظیم کریں اور مسلمانوں کی

انجمن مسلم لیگ اور ہندوؤں کی انجمن کانگریس کے درمیان تمام مشترکہ مفاد کے حصول کے لئے اور نیز آزادی حاصل کرنے کے لئے بشرائط اس قسم کا معاہدہ اتحاد ہو جیسا دو حلیف قوموں کے درمیان ہوتا ہے۔ اہم معاملات کے تصفیہ کے لئے کانگریس کی مجلس عاملہ اور مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کے اجلاس ہوں اور ان اجلاسوں میں جو فیصلے ہوں ان پر دونوں انجمنیں اور دونوں قومیں کاربند ہوں کیا انگریزوں اور فرانسیسیوں نے اپنی اپنی قومی انفرادیت کو مٹائے بغیر جرمنوں کے خلاف جنگ نہیں کی۔ کانگریس کا تعاون حاصل کرنے کی دوسری اور مسلمانوں کے حق میں بہتر صورت ہے۔ اگر مسلمان مسلم لیگ کو مستحکم اور مضبوط کرلیں اور کانگریس میں شریک نہ ہوں تو یقیناً کانگریس اس طریقہ پر مسلمانوں سے اتحاد کرنے پر مجبور ہوگی۔

جواب نمبر (۳)...... کانگریس میں مدغم ہونے کے بعد جب مسلمان یہ دیکھیں گے کہ اُن کی رائے اور آواز بے اثر ہے اور وہ اپنے قومی مفاد کے خلاف ہندوؤں کے پیچھے پیچھے چلنے پر مجبور ہیں تو آزادی حاصل کرنے کا جذبہ اُن کے دلوں میں سرد ہو جائے گا اور آزادی کی تحریک بعد جنگ مسلمانوں کی ہمت اور عمل سے اسی طرح محروم ہو جائے گی جس طرح کہ انگریزی حکومت ہندوستان کے تحفظ کے لئے جنگوں میں ہندوستانیوں کے طبعی جوشِ مدافعت وطن اور جوشِ ملک گیری سے محروم ہے۔ اور صرف روپیہ دے کر اُن کو لڑنے پر آمادہ کرتی ہے۔ لہٰذا اس طرح حصول آزادی میں تعویق اور تاخیر زیادہ ہوگی۔ لیکن اگر مسلم لیگ میں مسلمان رہے اور کانگریس میں ہندو رہے اور دونوں کے درمیان اس طرح اتحاد قائم ہوا جیسا کہ دونوں کے درمیان ہوتا ہے اور مسلمانوں کو اس کا اطمینان ہو گیا کہ ان کی اسلامیت اور قومی انفرادیت محفوظ ہے اور آزاد ہندوستان میں وہ بھی آزاد قوم کی حیثیت سے رہیں گے تو مسلمان اپنے مفاد کے لئے اور ہندو اپنے مفاد کے لئے حلیفوں کی حیثیت سے خالص وطنی آزادی کے جذبہ سے جنگ کریں گے۔ یہ جنگ جس قسم کی بھی ہو زیادہ طاقتور ہوگی اور اس سے آزادی جلد حاصل ہو سکے گی۔

جواب نمبر (۴)...... یقیناً مسلم لیگ مسلمانوں کو کانگریس میں شریک ہونے سے روک سکتی ہے اور اس کے باوجود کہ کانگریس برسر اقتدار اور اُس کی وزارت قائم ہے تجربہ سے ظاہر ہو گیا ہے کہ کانگریس کی حکومت قائم تھی مسلم لیگ نے کانگریس کے مقابلہ میں پانچ الیکشن لڑے اُن میں سے چار میں مسلم لیگ کامیاب ہوئی اور صرف ایک بجنور میں ناکامی ہوئی اس ناکامی کی وجہ بھی حافظ ابراہیم صاحب کا ذاتی اثر اور مسلم لیگ کو کام کرنے کی کم مہلت تھی۔ نیز یہ کہ ابھی تک مسلم لیگ کی تنظیم مکمل اور طاقتور بھی نہیں ہے پھر تاریخی تجربہ یہ بھی بتارہا ہے کہ اقوام کی اکثریت اپنے مفاد اور وجود کے تحفظ کے حق میں رہتی ہے۔ حکومت کے مؤید صرف وہ لوگ ہوتے ہیں جن کے مفاد براہ راست حکومت سے وابستہ ہوں۔ مثال کے طور پر کانگریس کی سابقہ تحریکات کو لے لیجئے۔ انگریزوں کی حکومت قائم تھی۔ ہزار ہا ہندو ملازم سرکار تھے زمیندار، خطاب یافتہ اور ٹھیکیدار اور اجارہ دار وغیرہ تھے مگر قوم کی آواز وہی سمجھی گئی جو کانگریس کے پلیٹ فارم سے بلند ہوئی حکومت کے مؤید ہندوؤں یا ہندوستانیوں کی تائید ہندوستانیوں یا ہندو قوم کی تائید نہیں سمجھی گئی۔ لہٰذا جو لوگ ذاتی اغراض کے لئے یا کانگریس کے اقتدار سے مرعوب ہو کر مسلم مفاد کیخلاف کانگریس میں شریک ہوں گے وہ بھی انگریزی حکومت کے پرستار ہندوؤں کی طرح بے اثر ہو کر رہ جائیں گے نیز یہ کہ جب مسلم لیگ کا نظام مضبوط ہو جائے گا اور یہ ناممکن ہو جائے گا کہ کوئی مسلمان انفرادی حیثیت سے یا کانگریس کی طرف سے کھڑا ہو کر مجالسِ واضعانِ قانون کا ممبر منتخب ہو سکے اور مسلم رائے عامہ کانگریس کا ممبر ہونا عیب اور مسلم لیگ کا ممبر ہونا اچھا سمجھنے لگے گی تو کوئی مسلمان کانگریس کا ممبر بننا پسند نہ کرے گا اور اس طرح مسلم لیگ مسلمانوں کو کانگریس میں جانے سے روک دے گی۔ اور بالفرض اگر کوئی چھوٹی سی بے اثر جماعت کانگریس میں رہی بھی تو کانگریس کی نظر میں اس کی کوئی وقعت نہ ہوگی چنانچہ ۲۹ء سے ۳۵ء تک یہی ہوا۔ کانگریس ہندوؤں اور مسلمانوں کے فرقہ وارانہ معاملات کے متعلق کانگریسی مسلمانوں سے کوئی گفتگو نہیں کرتی تھی۔ بلکہ ہر معاملہ میں ان کو نظر انداز کر کے کانگریس کو مسلم لیگ اور مسلم

کانفرنس سے رجوع کرنا پڑتا تھا۔ آخر میں یہ بھی بتا دینا ضروری ہے کہ کانگریس میں مسلمانوں کی بڑی تعداد ہرگز شریک نہیں۔ اس قسم کے تمام اعلانات جھوٹے اور بے بنیاد ہیں۔ بعض چند افراد ہیں جو کانگریس میں شریک ہیں۔

جواب نمبر (۵)...... اکتوبر ۳۷ء سے مسلم لیگ میں مکمل انقلاب ہوا۔ کامل ذمہ دار حکومت کے بجائے پورا استقلال یا پوری خود مختاری مطمح نظر قرار پایا ہے، محدود رکنیت کی جگہ دو جنس کی شرط پر رکنیت عام کی گئی ہے گو اب مسلم لیگ کانگریس سے زیادہ جمہوری انجمن ہے، ابتداء سے انتہا تک جتنی کمیٹیاں بنیں گی۔ اور جتنے عہدے دیئے جائیں گے وہ انتخاب کے ذریعہ ہوں گے اس صورت میں انگریزوں کے خوشامدیوں کے دخل کا مسلم لیگ میں کوئی امکان نہیں۔ لیکن بالفرض اگر عام مسلمان انگریزوں کے حامی واقع ہوئے ہیں اور وہ ایسے لوگوں ہی کو منتخب کرنا چاہتے ہیں جو انگریزوں کے حامی ہیں تو اس کو کون روک سکتا ہے مگر یہ واقعہ کے خلاف ہے مسلم لیگ تمام موجودہ ارکان کی میعاد رکنیت فروری میں ختم ہو جائے گی۔ نئے انتخابات میں ہر امیر اور غریب کو عام ممبر بننے کے وقت اس عہد نامہ پر دستخط کرنے پڑیں گے کہ وہ کامل آزادی کا طالب ہے اس کے بعد وہ انتخاب میں آئے گا۔ اس کے بعد بھی اگر وہ منافقت کرے اور دل میں انگریزوں کا حامی رہے تو اس پر کسی کو قابو نہیں، جیسے کوئی شخص توحید و رسالت وغیرہ کا اقرار کرے ہم اس کو مسلمان ماننے پر مجبور ہیں اس کے دل میں کیا ہے، اس پر سوال کرنے کا ہمیں کوئی حق نہیں اس طرح کے منافق لوگ خود کانگریس میں بھی موجود ہیں اور کانگریس اُن کو اندر آنے سے نہیں روک سکتی۔ سر اکبر حیدری نے مسلم لیگ کو جو برطانوی زہر کہا ہے اس کے معنی بالکل اور ہیں۔ کیا سر اکبر حیدری نے حیدر آباد میں کانگریس قائم کرنے کی اجازت دے دی ہے، اور کیا وہ کانگریس کو تریاق سمجھتے ہیں۔ ہر ہندوستانی ریاست سیاسی تحریکات کو اپنی حدود کے اندر داخل ہونے سے روکتی ہے خواہ وہ قومی ہو یا فرقہ وارانہ صاف بات ہے حیدر آباد میں مسلمانوں کو سیاسی استیلاء حاصل ہے وہاں مسلمانوں کے حقوق مفاد اور آزادی خطرہ میں نہیں حکومت انجمن سے کہیں زیادہ

طاقتور ہوئی ہے، حیدر آباد میں مسلم حکومت موجود ہے اس صورت میں یقیناً وہاں مسلم لیگ کی کوئی ضرورت نہیں اور اگر حیدر آباد میں مسلم لیگ قائم کی جائے گی تو بجائے سیاسی انجمن کے خالص فرقہ وارانہ انجمن بن کر رہ جائے گی جو حکومت اور ہندوؤں کے درمیان تصادم کا باعث ہوگی۔

جواب نمبر (۶)...... غلط ہے کہ مسلم لیگ بے عمل جماعت ہے مسلم لیگ ابتداء یعنی ۱۹۰۷ء میں اس غرض سے قائم ہوئی تھی کہ برطانیہ سے ہندوستان کو جو مراعات ملیں اُن میں سے مسلمانوں کو پورا حصہ دلائے اور نیز مزید مراعات حاصل کرنے میں اکثریت کے ساتھ تعاون کرے۔ چنانچہ اس نے یہ کیا کہ کانگریس نے ہندوستان کے لئے سیاسی اختیار حاصل کرنے کی جب کوئی تحریک شروع کی مسلم لیگ نے اُس کی تائید کی مسلم لیگ اور کانگریس کے متحدہ مطالبہ پر مانٹگو، جیمسفورڈ اصطلاحات ہندوستان کو دیگئی۔ اور مسلم لیگ کے ذریعہ مسلمانوں کی اجتماعی قوت کو محسوس کر کے کانگریس ۱۹۱۶ء میں فرقہ وارانہ معاملات میں مسلم لیگ سے سمجھوتہ کرنے پر مجبور ہوئی۔ جو ۱۹۳۵ء تک بلاتغیر جاری رہا۔ چونکہ مسلم لیگ کے اغراض و مقاصد ابتداءً محض ہندوستان کے اندرونی سیاسی امور تک محدود تھے اس لئے جب جنگ عظیم ہوئی اور خلافت اور اماکن مقدسہ کا مسئلہ سامنے آیا تو انہیں مسلمانوں نے جو مسلم لیگ کے بانی اور رکن تھے۔ خلافت کمیٹی قائم کی۔ خلافت کمیٹی نے جو کچھ کیا اُس سے دُنیا واقف ہے۔ عملاً اگر غور سے دیکھا جائے تو خلافت کمیٹی حقیقت میں مسلم لیگ کا شعبہ امورِ خارجہ تھا۔ ۱۹۲۹ء سے جب نہرو رپورٹ کا فتنہ اٹھا نئے دستور موسومہ قانون حکومت ہند ۳۵ء کے بننے تک مسلم لیگ نے ہندوستان کی سیاسی اختیار کی ترقی اور اس میں مسلمانوں کے حق کے تعین میں جو کچھ کیا اس قانون کے اندر موجود ہے۔ البتہ یہ صحیح ہے کہ مسلم لیگ نے کانگریس کے ساتھ مل کر سول ڈس اومی ڈینس یعنی قانون کے خلاف ورزی نہیں کی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کے معاملہ میں کانگریس نے مسلم لیگ کو اطمینان نہیں دلایا تھا بلکہ مسلمانوں کے علی الرغم سول نامتابعت شروع کردی گانگریس

کی یہ سول نا متابعت کس مقصد کے لئے تھی یہ مسئلہ اختلافی ہے۔ ہندو کہتے ہیں کہ یہ کامل آزادی حاصل کرنے کے لئے کی گئی مگر یہ غلط ہے واقعہ یہ ہے کہ جب وائسرائے نے نہرو رپورٹ منظور کرنے سے انکار کر دیا جو مسلمانوں کے مفاد کے لئے سخت مضر تھی تو کانگریس نے اس ضد میں سول نا متابعت شروع کر دی مسلمان اس سول نا متابعت کو اپنے خلاف ہندوؤں کی طرف سے اس بات کا مظاہرہ سمجھتے تھے کہ ہندوستان میں اصل طاقت ہندوؤں کی ہے اور مسلمان قابل اعتبار بھی نہیں ہوتا۔ اور مسلمانوں کا یہ خیال صحیح تھا۔ چنانچہ ثبوت میں پنڈت جواہر لال نہرو کا یہ متکبرانہ قول پیش کیا جا سکتا ہے کہ ہندوستان میں صرف دو طاقتیں ہیں ایک کانگریس دوسری برطانوی حکومت۔ یہ کہ مسلم لیگ جو کانگریس سے الیکشن لڑ رہی ہے اس سے مسلمانوں کو کوئی فائدہ نہیں ہے مخلصین کی طرف سے مسلم لیگ پر ایک بے مغز اعتراض ہے اگر یہ عہد لے کر مجلسِ واضعانِ قانون کا ممبر منتخب کرنا مسلمانوں کے لئے مفید نہیں ہے کہ وہ مسلمانوں کے حقوق و مفاد کا تحفظ کرے گا جن کے وہ آئین مر وجہ کی رو سے مستحق ہیں جو تسلیم کرنا پڑے گا کہ مسلمانوں کو مجالسِ واضعانِ قانون میں بھیجنا ہے مسلمانوں کے حق میں مفید نہیں مسلم لیگ صرف اس غرض کے لئے الیکشن میں جد و جہد کر رہی ہے کہ صرف اُن لوگوں کو بھیجے جو ہندوستان کے سیاسی اختیار کی ترقی کے ساتھ مسلمانوں کے مذہبی، تمدنی اور سیاسی حقوق کی پوری حفاظت کرے۔ اس کے برخلاف کانگریس اُن مسلمانوں کو کونسل میں بھیجنا چاہتی ہے جو خاص مسلم حقوق کے تحفظ کے خلاف کانگریس کی اطاعت کریں اگر یہ بات کہ مسلمان کسی عہد کے ساتھ مجالس واضعانِ قانون میں جائیں۔ اس قدر غیر اہم ہے کہ اس سے مسلمانوں کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا تو کانگریس اپنے قدیم دستور کے خلاف اس مرتبہ الیکشن لڑانے پر اس قدر کیوں مُصر ہے کہ اس کو کمزور ہونا منظور اور کمزور ہو کر آزادیٔ ہندوستان کی تحریک کو تعویق میں ڈالنا منظور مگر مسلم لیگ کے مقابلہ میں الیکشن لڑانا ضرور۔ واضح رہے کہ اس معاملہ میں کانگریس کا عمل جارحانہ ہے کہ مسلم لیگ کا اس اعتراض کا صرف حل یہ ہے کہ کانگریس اور مسلم لیگ دونوں کا مطمح نظر کامل آزادی

مفاد عامہ کے کاموں میں مسلم لیگ کی پارٹی کانگریس کی کوئی مخالفت نہیں کرتی۔ البتہ مسلم اقلیت کے حقوق و مفاد کا تحفظ اس کا اضافی عمل ہے۔ لہٰذا کانگریس کو مسلم لیگ کے مقابلہ میں کوئی الیکشن نہ لڑنا چاہئے پھر نہ وہ کمزور ہوگی اور نہ آزادی کی تحریک (اگر کہیں اس کا وجود ہے) تعویق میں پڑے گی۔

جواب نمبر (۷)...... مسلم لیگ نے اکتوبر ۱۹۳۷ء سے قبل ہندو اکثریت کے اپنے جارحانہ اقدامات کے مقابلہ میں مدافعت کر کے مسلمانوں کی دینی، مذہبی، اجتماعی، سیاسی اور اقتصادی تنظیم کی حفاظت کی ہے اکتوبر ۱۹۳۷ء سے اُس کا نیا دور شروع ہوا ہے اب وہ عام مسلمانوں کو مسلم لیگ کی تنظیم میں داخل کر کے مسلمانوں کے اجتماعی اور سیاسی خلفشار کو ختم کرنا چاہتی ہے رائے عامہ کی تربیت کر کے ہندوستان کے مسلمانوں کو آزادیِ کامل اور آزاد ہندوستان میں مسلم اور دوسری اقلیتوں کے لئے جمہوری تحفظ یعنی اکثریت کے فرقہ وارانہ جبر واستبداد کے امکان کے انسداد کے مقصد پر ہم خیال کرنا چاہتی ہے اور ان مقاصد کے حصول کے لئے جس طاقت کی ضرورت ہے وہ تنظیم کے ذریعہ پیدا کر رہی ہے اسی غرض کے لئے ہر ہر شہر قصبے اور موضع میں مسلم لیگ قائم کی جارہی ہے ہر عام مسلمان کو اُس کا رُکن بنایا جارہا ہے نوجوانوں کی ایک بہت بڑی جمعیت بھرتی کی جارہی ہے۔ اقتصادی خوشحالی کے لئے مسلمان دستکاروں کے ہاتھ کی بنی ہوئی چیزوں کے رواج کی کوشش ہے، سود منسوخ کرانا مدِ نظر ہے اور مسلم لیگ کا جو ارادہ ہے وہ اس کے سالانہ اجلاس کی قراردادوں سے مفصل معلوم ہوگا۔

جواب نمبر (۸)...... اگر کانگریس سے سمجھوتہ ہوگیا اور اکثریت کے جبر واستبداد کا کوئی خطرہ نہ رہا۔ مسلم لیگ اُس وقت بھی قائم رہے گی۔ اور اشتراکِ عمل مسلم لیگ اور کانگریس کے درمیان ہوگا۔ مسلمان منتشر ہو کر کانگریس میں کبھی شریک نہ ہوں گے مسلم لیگ کی یہ قطعی رائے ہے۔

جواب نمبر (۹)...... اگر علماء مسلم لیگ کے ممبر بننا چاہیں تو اُن کو الیکشن کے ذریعہ مسلم لیگ کی با اختیار کمیٹیوں میں آنے سے گریز کی کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی۔ یہ تو بہترین صورت ہے لیکن خاص حالات میں بہت ہی مقتدر علماء کے لئے جو الیکشن کے ذریعہ نہ آسکیں ایک صورت اور بھی ہے جس کو انگریزی میں کواپشن کہتے ہیں یعنی وہ بطریق اضافہ آسکتے ہیں۔

جواب نمبر (۱۰)...... مسلم لیگ میں دینی امور کے متعلق علماء کی رائے کو وہی وقعت حاصل ہوگی جو اب تک مسلمانوں میں اُن کی رائے کو حاصل رہی ہے ان معاملات میں اگر علماء کے درمیان کوئی اختلاف ہو تو اس کے لئے وہی طریقہ اختیار کیا جائے گا جو حدیث و قرآن کی رو سے صحیح ہو۔

جواب نمبر (۱۱)...... یقیناً مسلم لیگ نے جمعیۃ العلماء اور مسلم لیگ کے تصادم کو ضرور محسوس کیا ہے اور اس کے انسداد کی اُس کے ذہن میں یہ صورت ہے کہ جمعیۃ العلماء اور مسلم لیگ کے درمیان تقسیم عمل ہو جائے یعنی خالص دینی امور کا انصرام جمعیۃ العلماء اپنے ذمہ لیلے اور مذہبی تمدنی سیاسی اور دوسرے شعبہائے حیات کے انصرام میں شرکت کے لئے حضراتِ علماء مسلم لیگ میں بحیثیت مسلمان شریک رہیں۔

جواب نمبر (۱۲)...... بیشک راجپوتوں اور غیر مسلموں میں تبلیغ اسلام مسلم لیگ کے نزدیک ایک اہم فریضہ ہے اور سیاسی حیثیت سے بھی یہ بہت ضروری ہے مگر اس اہم اسلامی خدمت کے اہل صرف حضرات علماء ہیں۔ بدنصیبی سے مسلم لیگ کو ان کا پورا تعاون حاصل نہیں رہا ہے اس لئے وہ اس خدمت سے قاصر رہی ہے۔ اگر علماء اس کام کو شروع کریں تو مسلم لیگ ان کے ساتھ پورا تعاون کرے گی۔

نوٹ: یہ جوابات جناب نواب محمد اسمٰعیل خانصاحب ایم ایل اے بیرسٹر صدر مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ و سید حسن ریاض صاحب و دیگر اراکین کے مشورہ سے تحریر کئے

گئے ہیں۔

سید ذاکر علی جوائنٹ سیکریٹری مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ
صوبہ متحدہ

۲۵ دسمبر ۱۹۳۷ء

نقل اشتہار مطبوعہ رمضان ۱۳۵۶ھ

منجانب:...... محمد بشارت اللہ خانصاحب امروہوی

سوالات:

کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ آج کل سہارنپور میں اسمبلی کی ایک نشست کے لئے دو امیدوار کھڑے ہوئے ہیں۔ ایک مولوی منفعت علی صاحب وکیل جن سے جناب خود ذاتی طور پر بھی واقف ہیں اور دوسرے چودھری ظفر احمد صاحب جو مولوی صاحب سے قابلیت میں ہر طرح سے کم ہیں اور مولوی صاحب موصوف ہی کی برادری کے ہیں۔ مولوی منفعت علی صاحب مسلم لیگ کی طرف سے کھڑے ہوئے ہیں۔ اور دوسرے صاحب کانگریس کی طرف سے۔ بعض مولوی صاحبان یہ فرماتے ہیں کہ کانگریس کے امیدوار کو ووٹ دینا ضروری بلکہ واجب ہے اور نجات اُخروی کا مدار بھی کانگریس ہی کے امیدوار کو ووٹ دینے میں بتاتے ہیں اور مسلم لیگ کے امیدوار کو ووٹ دینا ناجائز اور موجب عذاب بتاتے ہیں۔ لہٰذا سوال یہ ہے۔

۱۔ جناب کے نزدیک کانگریس کے امیدوار کو ووٹ دینا جائز بھی ہے یا نہیں؟

۲۔ اور کیا مسلم لیگ کے امیدوار کو ووٹ دینا جائز ہے؟

اور چونکہ مولوی منفعت علی صاحب سے جناب ذاتی طور پر بھی واقف ہیں اس لئے اگر خلاف مصلحتِ نہ ہو تو اس سے بھی مطلع فرمائیں کہ آپ مولوی صاحب موصوف کو اسمبلی کی ممبری کے لئے موزوں اور مناسب خیال فرماتے ہیں یا نہیں۔ اگر ایسے دیندار لوگ اسمبلی میں جاویں تو مسلمانوں کی نمایندگی بہت بہتر طریق سے ہو کیا ہمارا یہ خیال صحیح ہے؟ والسلام

الجواب:

مبسملاً و حامداً و مصلیاً۔ اس سوال کے دو جز ہیں ایک عام کہ مسلم لیگ و کانگریس میں سے کسی کے امیدوار کو ممبری کا ووٹ دینا جائز و مفید اور کسی کے لئے ناجائز اور مضر دوسرا خاص ایک صاحب کے متعلق کہ ان کو ووٹ دینا میرے نزدیک بہتر ہے یا نہیں۔ سو پہلے جزو کے متعلق تو کانگریس کے حالات کا معلوم ہونا کافی ہے جو یقیناً اس آیت کے مفہوم میں داخل ہے۔

یا ایھا الذین امنو الا تتخذوا بطانۃ من دونکم لا یألو نکم خبا لا ۝ ودوا ما عنتم قد بد ت البغضاء من افواھھم وما تخفی صد ورھم اکبرہ

(ترجمہ اے ایمان والو نہ ٹھیراؤ بھیدی اپنے غیر کو وہ کمی نہیں کرتے تمہاری خرابی میں ان کی خوشی ہے تم جس قدر تکلیف پاؤ، نکلی پڑی ہے دشمنی ان کی زبان سے اور جو چھپا ہے ان کے جی میں سو اس سے زیادہ)۔

اس لئے موجودہ حالت میں جزم و یقین کے ساتھ میری رائے ہے کہ جو شخص کانگریس کی موافقت میں ممبری کا ساعی ہے وہ مسلمانوں کا خیر خواہ نہیں ہوسکتا اور اُس کی

موافقت اور اس کے لئے سعی کرنے کو میں اہلِ اسلام کے لئے مضر سمجھتا ہوں۔ رہی مسلم لیگ جماعتی حیثیت سے تو اس میں کوئی وجہ مضرت و عدم جواز نہیں معلوم ہوتی۔ اب صرف اشخاص کے حالات پر حکم دائر ہوگا پس اگر کوئی شخص دیندار تجربہ کار مسلمانوں کا خیر خواہ مسلم لیگ کی طرف سے ممبری کا امیدوار ہو تو بلاشبہ اس کو ووٹ دینا جائز بلکہ افضل و بہتر ہے اور یہ کہنا کہ کانگریس کو ووٹ دینا موجب ثواب اور مسلم لیگ کو موجب عذاب ہے۔ محض دعویٰ بے دلیل بلکہ خلافِ دلیل اور سخت جسارت و بیبا کی ہے جس سے توبہ واجب ہے۔

یہ پہلے جزو کا جواب تھا اور دوسرے کے متعلق یہ جواب ہے کہ مولوی منفعت علی صاحب وکیل سے احقر کو ذاتی واقفیت حاصل ہے وہ ایک دیندار تجربہ کار خوش فہم نیک نیت، قانون دان، مسلمانوں کے سچے خیر خواہ و ہمدرد مسلمان ہیں اُن کو ووٹ دینا میرے نزدیک ہر طرح افضل و بہتر ہے۔

واللہ العالم و ھو المستعان

کتبہ اشرف علی عفی عنہ

۲۵ ررمضان المبارک ۱۳۵۶ھ

علماء کے لئے مشورہ

نقل تحریر قلمی جو مولانا عبد الکریم صاحب مدظلہ کے قلم سے ہے مگر حضرت اقدس کی اصلاحات اُس پر ثبت ہیں۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اہل علم کا کسی سیاسی جماعت میں باقاعدہ شامل ہونا تو مضرت ومفسدہ دینیہ سے خالی نہیں۔ لیکن اُن کے لئے اس کی سخت ضرورت ہے کہ اشاعت [1] احکام دینیہ کے لئے ایک جماعت بناویں جو نہایت مستعدی اور کامل خلوص وتواضع کے علاوہ نہایت دلسوزی وشفقت کے ساتھ مسلمانوں کو احکامِ دین کا پابند بنانے کی سعی کرے کیونکہ زیادہ تباہی مسلمانوں کی اسی وجہ سے ہے کہ وہ دین سے دور ہو گئے ہیں۔

اس قسم کی جماعت کے لئے حضرت اقدس کے سوا کسی سے سعی کی امید نہیں۔ لیکن نظم ونسق کا کام الجھن سے بھی خالی نہیں نیز اس جماعت کے لئے مصارفِ کثیرہ کی ضرورت ہے اور اس کا انتظام بدون تحریکِ چندہ دشوار ہے اس واسطے یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ کوئی معتمد عالم بالکل حضرت اقدس کی منشاء کے موافق خانقاہ سے الگ خود اسی قصبہ میں یا دوسری جگہ (جیسی مصلحت ہو) جماعت قائم کریں اور اُن ناظم صاحب کی امداد ونگرانی کے واسطے خاص حضرت سرپرستی فرماویں اور حضرت والا مدفیوضہم اس جماعت پر اعتماد کا اعلان فرمادیں۔ اس طرح انشاء اللہ نفع بے حد ہوگا اور حضرت مدظلہم کی طبیعت پر بار بھی نہ ہوگا۔ انتہیٰ۔

---

(۱)...... خط کشیدہ الفاظ حضرت کے قلم سے لکھے ہوئے ہیں۔ ۱۲ محمد شفیع

تنظیم المسلمین

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

سوال:

سیدی مولائی دام مجدکم۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ آج کل ہندوستان میں دو سیاسی جماعتیں ہیں۔ ایک کانگریس اور دوسری مسلم لیگ۔ کانگریس کا یہ دعویٰ ہے کہ وہ ملک کی واحد نمایندہ جماعت ہے اور ہر شخص کو بلاتفریق مذہب وملت اس جماعت کا ممبر ہونا چاہئے اور اس جماعت کے ہوتے ہوئے کسی دوسری سیاسی جماعت میں شریک نہیں ہونا چاہئے اور سب یکجا ہوکر ملک کو آزاد کرائیں۔ مسلم لیگ خالص مسلمانوں کی جماعت ہے اور اس کا نصب العین بھی ملک کو آزاد کرانا ہے مگر اس کا یہ دعویٰ ہے کہ مسلمانوں کے کچھ خاص ایسے حقوق ہیں کہ جن کے تحفظ کے لئے اس جماعت کا علیحدہ نظام وقیام ضروری ہے اور واقعہ یہ ہے کہ دونوں جماعتیں سیاسی ترقی میں تو ایک دوسری کی شرکت میں کام کرسکتی ہیں مگر کانگریس میں مدغم ہوکر وہ خاص حقوق محفوظ نہیں رہ سکتے کانگریس کا شروع سے مسلمانوں کے ساتھ کیا رویہ رہا اس کے متعلق تو مفصل بحث کتاب موسومہ ''آزادی کی جنگ'' مؤلفہ عبدالوحید خان صاحب میں درج ہے جو غالباً حضرت والا کی نظر سے بھی گزری ہے۔ بعد کے بھی کچھ واقعات یہ ظاہر کررہے ہیں کہ کانگریس میں چونکہ ہنود کی کثرت ہے وہ رام راج قائم کرنا چاہتے ہیں اور کانگریس کی اصل غرض یہ ہے کہ ہندوستان کا محافظ انگریز رہے اور زیرسایہ برطانیہ دفتری حکومت ہندو کے ہاتھ میں آجاوے اور اُن کو یہ خوف ہے کہ ایشیا کی

اسلامی سلطنت حملہ آور ہو کر اسلامی حکومت قائم کرے گی اس کے متعلق مسلمان کتنا ہی اطمینان دلادیں مگر اُن کا یہ خوف دور نہیں ہوسکتا۔ چنانچہ ہندی زبان ولباس کے رواج دینے میں بے حد کوشاں ہیں اور اپنا ہی اقتدار حاصل کرنے کی فکر میں ہیں۔ ملک میں اس وقت آئینی لڑائی ہے جس میں جملہ معاملات کثرت رائے پر طے ہوتے ہیں اور اس وقت کانگریس کی مرکزی جماعت ومجلسِ انتظامیہ میں مسلمانوں کی تعداد بہت ہی قلیل ہے ان کانگریسی مسلمانوں کی یہ کیفیت ہے کہ مسلمانوں کے خاص حقوق کے تحفظ کے سوال کو فرقہ پرستی سمجھتے ہیں اور مسلمانوں کے احتجاج پر یہ حجت پیش کرتے ہیں کہ اگر مسلمان کثرت کے ساتھ کانگریس میں شریک ہوجاویں تو ہنود کی ذہنیت میں تبدیلی پیدا کرسکتے ہیں اور دوسری چیز جو پیش کرتے ہیں۔ وہ مخلوط انتخاب ہے اُن کی یہ حجت ہے کہ جب تک جداگانہ انتخاب ہے ایک مذہب والا دوسرے مذہب والے سے بے نیاز ہے جس میں اتحاد کی امید نہیں اگر انتخاب مخلوط ہوجاوے تو ہندو مسلمان ایک دوسرے کے جذبات کے احترام کرنے پر مجبور ہوں گے لیکن اس کی تردید میں چند واقعات ہیں ہندو مسلمانوں کی آبادی کا تناسب ایسا ہے کہ مسلمان تو مجبور ہوسکتا ہے مگر ہندو کو ضرورت نہیں ہے چنانچہ دو چار جگہ ڈسٹرکٹ بورڈ و میونسپلٹی کے انتخابات مخلوط ہوئے اور مسلمان اُن نشستوں سے کہ جن پر پہلے سے منتخب ہوئے تھے محروم ہوئے بعض جگہ تو اس خیال سے کہ کہیں مسلمان نہ ہوجاوے سرکاری آدمی کو منتخب کیا۔ علاوہ ازیں خود کانگریس میں مسلمان انتخاب میں نہیں آسکے اور یہ سب اس وجہ سے ہے کہ ہندو کی کثرت ہے اور مخلوط انتخاب میں مسلمانوں کا صحیح نمائندہ کبھی منتخب نہیں ہو سکتا اور کثرت کی بناء پر ایسے قوانین بھی پاس ہوسکتے ہیں جو مسلمانوں کے حقوق کے منافی ہوں مگر موجودہ شکل میں گورنر وگورنر جنرل کو ایسا قانون مسترد کرنے کا حق ہے۔

مسلم لیگ کی قیادت اس وقت مسٹر محمد علی جناح کے ہاتھ میں ہے گو مسٹر محمد علی جناح آبائی شیعی ہیں مگر غیر متعصب ہیں اور گو کوئی متقی شخص نہیں لیکن سیاست میں بہترین شخص

سمجھے جاتے ہیں اس کے کانگریس والے بھی معترف ہیں اور یہ بھی مانتے ہیں کہ وہ سرکاری آدمی نہیں ہیں ملک وقوم کی آزادی کے لئے اُن کے دل میں درد ہے اسی لئے گورنمنٹ کے مقابلہ میں بھی اور کانگریس میں بھی انہوں نے ہمیشہ مسلمانوں کے لئے آواز بلند کی۔ مسٹر محمد علی موصوف کے خلاف یہ بھی غلط پروپیگنڈا ہے کہ وہ جاہ پسندی کے لئے یہ سب کام کررہے ہیں۔ اگر وہ جاہ پسند ہوتے تو کبھی کسی خطاب یا کسی عہدہ کی اپنے لئے کوشش کرتے جس کا ملنا بہت سہل تھا مگر انہوں نے کبھی بھی اس کی خواہش نہیں کی۔ بہر حال کلمہ گو ہیں برعکس اس کے جو مسلمان کانگریسی یہ حجت پیش کرتے ہیں کہ وہ شیعی ہیں تو کانگریس کا صدر تو غیر مسلم ہے۔ نیز صدارت مسٹر محمد علی جناح کی ملک نہیں ہے بلکہ وہ اس بات پر آمادہ ہیں کہ عامۃ المسلمین اپنا دوسرا صدر منتخب کرلیں۔ اہم سوال اس وقت علماء کی رائے کا ہے۔ بعض حضرات کانگریس کی شرکت کو ترجیح دیتے ہیں اور دوسرے حضرات مسلم لیگ میں شریک ہونے پر زور دیتے ہیں اور جو حضرات کانگریس کو ترجیح دیتے ہیں بجز ایک دو صاحب کے وہ سب بھی اس بات پر متفق ہیں کہ مسلمانوں کے نظام کی ضرورت یقینی ہے مگر کچھ شرائط کے ماتحت کانگریس میں شریک ہونا چاہئے۔ مسٹر محمد علی موصوف بھی کانگریس سے تصفیہ کرنے پر آمادہ ہیں اُن کی صرف اس قدر خواہش ہے کہ مسلمان اپنی جگہ پر منظم رہیں اور حکومت و آزادی کے لئے کانگریس کے دوش بدوش کام کریں اور اس وجہ سے کہ اگر حسب سابق آیندہ کانگریس کی کثیر جماعت مسلمانوں سے بدعہدی کرے تو مسلمانوں کو اس وقت دوبارہ تنظیم کی ضرورت نہ پیش آوے۔ حضرات علماء کی اس اختلاف رائے کی وجہ سے عوام کو رائے قائم کرنا مشکل ہے اس لئے دریافت طلب ہے کہ حضرت اقدس کے نزدیک دونوں مذکورہ بالا جماعتوں میں سے مسلمانوں کو کس جماعت میں شرکت اختیار کرنا چاہئے۔

یہ ظاہر کردینا بھی ضروری ہے کہ مسلم لیگ میں گو مذہبی حالت کے اعتبار سے کچھ کمی ہے مگر اصلاح کی بہت قریب توقع ہے اور یہ اصلاح عوام کے ہاتھ میں ہے اور عوام کی

اصلاح حضرات علماء کی جدوجہد پر منحصر ہے تو اس ترتیب سے مسلم لیگ کی اصلاح گویا علماء کے ہاتھ میں ہے۔

خادم منفعت علی
ممبر مسلم لیگ سہارنپور
معروضہ ۵ر فروری ۳۸ء

جواب:

مکرمی ۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ ۔ چونکہ اس کے متعلق دوسرے مقامات سے بھی سوالات آتے ہیں اس لئے مناسب معلوم ہوا کہ یہ جواب بعنوان کلی لکھ دیا جاوے تاکہ دوسرے جزئی سوالات پر بھی منطبق ہو سکے اور تمام سوالات کا جامع جواب ہو جاوے اور اسی لئے اس جواب کا ایک مستقل ومناسب لقب بھی تجویز کر دیا گیا اب وہ جواب عرض کرتا ہوں۔

الجواب و منه الصدق والصواب ولقبته بتنظيم المسلمين

قَالَ اللّٰه تعالٰی وَاعتصمُوا بحبْل اللّٰه جميْعًا وَلا تفرقوا الآية
بعد الحَمدُ وَالصَّلوة

احقر اشرف علی مدعا نگار ہے کہ سب کو معلوم ہے کہ آج کل ہندوستان میں مفاد ملکی کے نام سے ایسی سیاسی جماعتیں جو تنظیم وتعیم کی جامع ہوں دو ہیں۔ ایک کانگریس دوسری مسلم لیگ اور دونوں اپنی اپنی طرف شرکت کی دعوت دیتی ہیں۔ اور نافعیت میں ایک کو

دوسرے پر ترجیح دینے میں اہل الرائے اختلاف رکھتے ہیں اور اسی کی تحقیق کے لئے مدت سے متردد ین کی طرف سے شرکت کے متعلق مختلف عنوانات سے سوالات کا سلسلہ جاری ہے۔ اب تک چونکہ دونوں کے واقعات کا کافی علم نہ تھا اس لئے جواب کی بناء زیادہ تر سائلین کے بیان پر ہوتی تھی اور احیاناً جواب کے کچھ حصہ میں ثقات کی روایات کا بھی کچھ دخل ہوتا تھا اور بعض اوقات بغرض مزید تحقیق خود سائل سے بھی واقعات کی تنقیح کی جاتی تھی اور ان بناؤں کے اختلاف سے مختتم جواب نہ ہوسکتا تھا جس سے ممکن ہے کہ سائل کو شفائے تام نہ ہوتی ہو اور اس صورت میں یقیناً ایسے جوابوں سے طریق عمل کا اخذ کرنا جو سوال سے اصل مقصود تھا دشواری سے خالی نہ تھا اس لئے سخت ضرورت تھی کہ واقعات کی مزید تعیین و تبیین کی جاوے جس کے لئے مختلف [1] ذرائع اختیار کئے گئے۔ جس میں خاص اہتمام کے بعد بحمد اللہ تعالیٰ اتنی ضروری کامیابی ہوگئی جس سے انشاء اللہ تعالیٰ شافی جواب پیش کرنا ممکن ہوگیا اور آج آپ کا خط اس جواب کے پیش کرنے کا محرک ہوگیا۔ یہ چند سطریں اسی جواب کی حکایت ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ اس میں تو کوئی شک وشبہ کی گنجائش نہیں کہ فضاء حاضر میں مسلمانوں کو شدید استحکام کے ساتھ منظم ہونے کی سخت ضرورت ہے اور ان کے

---

(۱)......جن کی تفصیل علاوہ ذاتی مطالعہ حالات کے یہ ہے کہ اولاً جمعیۃ العلماء کے ذمہ دار ارکان کو مدعو کیا گیا کیونکہ یہ حضرات کانگریس کے حالات سے بخوبی واقف ہیں اور ان سے شرکت کانگریس کی مضرت ومنفعت پر گفتگو کی گئی۔ پھر یہ اہتمام کیا گیا کہ ایک تاریخ میں ارکان جمعیۃ علماء اور ارکان مسلم لیگ کو جمع کر کے بالمشافہ دونوں سے گفتگو کی جائے۔ مگر بعض عوارض کی وجہ سے اس میں کامیابی نہ ہوئی۔ تو اس کا بدل یہ کافی سمجھا گیا کہ جمعیۃ العلماء اور مسلم لیگ دونوں سے معاملاتِ حاضرہ کے متعلق کچھ ضروری سوالات کئے گئے یہ سوالات دونوں جگہ روانہ کردیئے گئے اور ۳۱ دسمبر تک جواب طلب کیا گیا۔ پھر مسلم لیگ کی طرف سے تو ۵ جنوری کو جواب موصول ہوگئے اور جمعیۃ علماء کی طرف سے باوجود درمیان سے یاد دہانی کے اور مہلت میں کافی وسعت کردینے کے بھی آج تک کہ ایک ماہ سے زیادہ مدت گزرگئی ہے جواب موصول نہیں ہوئے ۱۲ مولانا ظفر احمد صاحب۔

تمام منافع و مصالح کی حفاظت اور تمام مضار و مفاسد سے صیانت اسی تنظیم پر موقوف ہے مگر اس کے ساتھ ہی ہر مسلمان پر یہ بھی واجب التسلیم والعمل ہے کہ وہ تنظیم حسب قدرت بالکل احکام شرعیہ کی موافق ہو (جو آیت پیشانی میں اعتصام بحبل اللّٰہ کی لاتفرقوا پر تقدیم سے بھی ظاہر ہے) سو اگر اس وقت ملک میں اس صفت کی کوئی منظم جماعت موجود ہوتی یا اس کا ہونا متوقع قریب ہوتا تو جواب واضح تھا لیکن موجودہ حالت میں افسوس اور نہایت افسوس ہے کہ ایسی جماعت کا نہ تحقق ہے نہ قریب توقع اس لئے بجز اس کے چارہ کار نہیں کہ موجودہ جماعتوں میں سے کسی جماعت میں داخل ہوں اور اس میں قواعد شرعیہ کی رو سے جو نقص ہو اس کی اصلاح کریں اور اگر ان میں ایک کی اصلاح آسان اور دوسری کی دشوار ہو تو بہ قاعدہ عقلیہ ونقلیہ من ابتلی ببلیتین فلیختر أھو نھما (جس کی مآخذ کثیرہ میں سے ایک ماخذ حدیث بریرہ میں یہ ارشاد نبوی ہے:۔

(اعتقیھا و اشترطی لھم الولاء علی ما قررہ النواوی فی شرحہ لصحیح مسلم)

اس میں داخل ہو جائیں جس کی اصلاح آسان ہو۔ سو اس کے متعلق جہاں تک تفحص بلیغ کے ساتھ تحقیق کی گئی مذکورہ و مسئولہ دونوں جماعتوں میں اُن کی موجودہ حالت پر نظر کر کے مسلم لیگ کے نقائص کا رفع کرنا سہل ہے اور کانگریس کی اصلاح متعسر بلکہ متعذر ہے جس کے وجوہ کا خلاصہ وہی ہے جو آپ نے لکھا ہے کہ مسلم لیگ خالص کلمہ [1] گویوں کی جماعت ہے اور کانگریس میں عنصر غالب غیر مسلمین کا ہے اور جو شخص اسلام کو حق جانتا ہو اس کو

(۱)......اور ان کا متقی نہ ہونا جیسا سوال میں ظاہر کیا گیا ہے حالت موجودہ میں مانع نصرت نہیں ہوسکتا اس کی متفق علیہ نظیر ترک کی سلطنت ہے کہ وہ بھی متقی نہ تھے مگر صرف اس بناء پر کہ مخالفینِ اسلام کی مدافعت کرتے تھے تمام اہل حق علماء و مشائخ نے (جن میں ہمارے اکابر بھی ہیں بلکہ سب میں پیش پیش رہے ہیں) ہر موقع پر اُن کی نصرت کو دینی فریضہ سمجھا۔۱۲ منہ۔ یؤیدہ مافی شرح السیر ص ۲۴۱ ج ۳

شریعت کے قریب لانا بہ نسبت اُس شخص کے جو اسلام کو حق نہیں جانتا ظاہر ہے کہ سہل ہے۔ نیز مسلم لیگ کے اعلانات جیسے لیگ کا مینوفسٹو وغیرہ اور کانگریس کے معاملات اس کے شاہد ہیں۔ رسالہ آزادی کی جنگ کو جس کا آپ نے سوال میں حوالہ دیا ہے میں نے بھی دیکھا ہے واقعی اُس میں ان معاملات کی تفصیل اچھی طرح کی گئی ہے۔ منصف مزاج کے لئے اس کا مطالعہ میرے خیال میں کافی ہے۔ پس اس اصل کی بناء پر شرح صدر کے ساتھ میری یہ رائے قائم ہوئی ہے کہ مسلمانوں کو اطمینان و توکل کے ساتھ مسلم لیگ میں داخل ہو جانا چاہئے پھر اُن میں جو اہل قوت واہلِ اثر ہیں ان کو اپنی قوت واثر سے اس کی اصلاح کی کوشش کرنا چاہئے اور جو اہل قوت نہیں وہ اہل قوت کو وقتاً فوقتاً یاد دہانی کر کے تقاضے کے ساتھ ان سے اصلاحِ مطلوب کی درخواست کرتے رہیں اور اصلاح کے طریقوں میں علماء محققین سے مدد لیتے رہیں جو علماء اس میں شریک ہوں اُن سے تو علمی و عملی دونوں قسم کی امداد حاصل کریں اور جو اس میں کسی مصلحت یا عذر سے باضابطہ شریک نہ ہوں ان سے صرف علمی مدد لیں یعنی ان سے واقعات ظاہر کر کے احکامِ شرعیہ معلوم کرتے رہیں اور ان کے موافق مسلم لیگ کی حالت کو درست کرتے رہیں۔ اور مسلم لیگ میں جو معاملات پیش آویں اُن کے متعلق اگر علماء میں اختلاف ہو تو جو علماء کسی جماعت میں باضابطہ شریک نہ ہوں اُن سے استفتاء کیا جائے اور اُن میں بھی اگر اختلاف ہو تو شرعاً دونوں شقوں میں گنجائش سمجھی جاوے اور دونوں شقوں میں سے مدبروں کے نزدیک جو مصلحت ہو اس پر عمل کیا جاوے اور جو علماء باضابطہ کسی جماعت میں شریک نہ ہوں وہ بھی بیکار نہ رہیں بلکہ وہ اس سے اہم خدمت میں مشغول رہیں اور وہ خدمت بندگانِ خدا کو احکام شرعیہ کی تعلیم و ترغیب دینے کی ہے جو مشترک طریقہ ہے حضراتِ انبیاءِ کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کا۔ بلکہ پہلی قسم کے علماء کو بھی جتنا وقت مسلم لیگ کی خدمت سے بچے اس اشاعت احکام میں حصہ لینا ضروری ہے پس اس تفصیل سے باقاعدہ تقسیم عمل (جو آیت و ما کان المؤمنون لینفروا کافة فلو لا نفر من کل فرقة منهم طائفة لیتفقهوا فی الدین سے بھی ماخوذ ہے) سب کو اپنے کام میں مشغول ہو جانا چاہئے۔

پھر اس کے بعد انشاء اللہ تعالیٰ وعدہ الٰہیہ **ان اللّٰہ لا یضیع اجر المحسنین** (سورہ ہود) **وانا لا نضیع اجر المصلحین** (سورہ اعراف) کا ظہور ہوگا اور اس کی بھی ضرورت ہے کہ بہیئتِ مذکورہ اس تنظیم کو ہمیشہ ہمیشہ مستقلاً جاری و باقی رکھیں کیونکہ اس کے ثمرہ کی تو ہمیشہ ہی حاجت ہے۔ یہ تو خلاصہ ہے اپنے انتظام کا باقی دوسروں کے ساتھ معاملہ سو اس انتظام کے بعد اگر کانگریس مسلم لیگ سے صلح کی طرف مائل ہو تو حسب ارشاد **وان جنحوا للسلم فاجنح لہا** اُس سے اصولِ شرعیہ کے موافق تیقظ و تدبر کیساتھ اہل تجربہ و اہل علم و اہل فہم کے مشورہ سے صلح رکھیں اُس کو کمزور نہ کریں اور نہ کانگریس میں مدغم کریں کہ یہ شرع اور تجربہ دونوں کے اعتبار سے نہایت مضر ہے اور بالفرض اگر مسلم لیگ کی اصلاح کے قبل یا بعد اور کوئی جماعت مسلمہ منظمہ صاحبِ قوت صاحب اثر تیار ہو جاوے۔ اس صورت میں مسلم لیگ اور وہ جماعت دونوں اتحاد و اشتراک کے ساتھ کام کریں تا کہ مسلمانوں میں افتراق و تشتت نہ ہو۔ اور ان سب حالات میں **قولاً و فعلاً و حالاً و تقریراً و تحریراً** موافق و مخالف ہر ایک کے ساتھ اخلاقِ اسلامی کو اپنا شعار رکھیں جیسا ارشاد ہے **و قل لعبادی یقولوا التی ھی احسن** و غیر ھا من الا یا ت خلاصہ دستورالعمل یہ ہے کہ از خود نہ کسی سے آویزش کی ضرورت نہ آمیزش کی ضرورت۔ رضائے حق کو مطمح نظر رکھ کر اپنے کام میں لگے رہیں اور اس رضا کی شرط یہ ہے کہ ہر کام میں اس کا پورا لحاظ رکھیں کہ کوئی امر خلاف شرع نہ ہونے پاوے یہی عبدیت کی روح اور حیاتِ مسلم کی اصل الاصول ہے اور اس استقلال و استقامت کے ساتھ ہی دُعا و ابتہال کو اصل وظیفہ و تدبیر سمجھیں اور پھر نصرتِ حق کے منتظر رہیں اب اس تحریر کو بزرگوں کی ایک نافع وصیت اور دو جامع دُعاؤں پر ختم کرتا ہوں یہ دُعائیں بھی ورد رکھنے کے قابل ہیں خصوصاً بعد نماز۔

وصیت:

کار کن کار بگذر از گفتار
کاندریں راہ کار باید کار

دُعائے اول:......

اللّٰهم أرنا الحق حقًا وار زقنا اتباعه و أرِنا الباطل باطلا و ازقنا اجتنا به.

دُعائے ثانی:......

اللّٰهم انصر من نصر دين محمد صلى الله عليه وسلم واجعلنا منهم واخذل من خذل دين محمد صلى الله عليه وسلم ولا تجعلنا منهم.

نوٹ:

نمبر(۱): اس جواب میں میں نے اپنے مزید اطمینان کے واسطے احتیاطاً اپنی جماعت کے متعدد محقق علماء سے بھی مشورہ کرلیا ہے ان سب نے بھی اس سے اپنی موافقت کا اظہار فرمایا۔

نمبر(۲) یہ جواب مسلم لیگ کی موجودہ حالت پر ہے اگر خدانخواستہ حالات بدل جائیں تو حکم بھی بدل جائے گا۔

نمبر(۳) جو صاحب اس مضمون کو شائع کرنا چاہیں اس کا خلاصہ شائع نہ کریں بلکہ بجنسہ پورا مضمون شائع کریں۔ خلاصہ کرنے میں بہت سی فروگزاشتیں اور نیز غلط فہمیاں ہو جاتی ہیں۔ اور اگر کسی کو کسی کے شائع کردہ مضمون میں کچھ کمی بیشی کا شبہ ہو تو تھانہ بھون کے ماہوار رسالہ النور بابت ماہ ذیقعدہ ۵۶ھ سے مقابلہ کرلیں کہ اُس رسالہ میں میرا یہ مضمون بعینہ پورا چھپا ہے۔ والسلام خیر ختام

مقام تھانہ بھون

۹/ ذی الحجہ ۱۳۵۶ھ مطابق ۱۰/ فروری ۳۸ھ

ضمیمہ تنظیم المسلمین

عرض ضروری باطلاع معذوری

بعد الحمد و الصلوٰۃ حضرات ناظرین السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ سیاسیاتِ حاضرہ کے متعلق ایک فتویٰ مسمّٰی بہ تنظیم المسلمین زمانہ قریب میں میری جانب سے شائع ہو چکا ہے اور اس سے میرا مسلک واضح ہو چکا ہے۔ مگر پھر بھی روزانہ ہر ڈاک میں اس کے متعلق برابر خطوط آتے رہتے ہیں جن میں مختلف عنوانات سے سوالات ہوتے ہیں۔ چونکہ میں بوجہ ضعف کے ہر جزئی کا مفصل جواب دینے سے قاصر ہوں اور بغیر تفصیل کے غلط فہمی کا اندیشہ ہے۔ جیسا کہ روزمرہ کا مشاہدہ ہے۔ نیز اس فتویٰ میں نہایت احتیاط کے ساتھ اس قدر قیود و حدود کی رعایت کی گئی ہے کہ ان میں غور کرنے سے یا کسی عالم کو مطالعہ میں شریک کر لینے سے تقریباً تمام ضروری سوالات کا جواب اس سے حاصل ہو جاتا ہے۔ مثلاً

نمبر (۱) ہر تنظیم حسب قدرت شرع کے موافق ہونا ضروری ہے۔

نمبر (۲) جس جماعت میں داخل ہوں اس کی اصلاح کی کوشش کریں اور اس میں منکر پر نکیر کرنا بھی آ گیا۔

نمبر (۳) جو شخص اسلام کو حق جانتا ہو اس کی اصلاح بہ نسبت غیر مسلم کے سہل ہے۔

نمبر (۴) اصلاح اس تفصیل سے کی جاوے کہ اہل قوت اپنی قوت سے اور غیر

---

(۱)...... یہ ضمیمہ حضرت اقدسؒ کے قلم مبارک کا لکھا ہوا قلمی مسودہ تھا جو اب تک شائع نہ ہو سکا تھا اصل مسودہ خانقاہ میں محفوظ ہے ۱۲ محمد شفیع دیوبندی عفی عنہ

اہل قوت اُن اہل قوت کو آمادہ کرنے سے اور علماء سے علمی و عملی امداد حاصل کرنے سے کام لیں۔

نمبر (۵) تمام علماء احکام کی تبلیغ میں مشغول رہیں کہ تقسیمِ خدمات کے قاعدہ سے یہ ان کا اصلی فرض ہے۔ اہل سیاست سے اس کی توقع فضول ہے۔ جیسا اس کا عکس۔ البتہ اہلِ سیاست تدابیرِ سیاست کے جواز و عدم جواز کے حکم میں علماء کے محتاج ہیں۔

نمبر (۶) غیر اسلامی جماعت کے ساتھ اصول شرعیہ کے موافق صلح کا مضائقہ نہیں لیکن ان میں مدغم نہ ہوں۔

نمبر (۷) اگر کوئی دوسری اسلامی جماعت پیدا ہو جاوے اس کی ساتھ اتحاد رکھیں۔

نمبر (۸) اگر ایسی سیاسی جماعت متقی نہ ہو مگر اسلام کی حفاظت اور مخالفین اسلام کی مدافعت اس کا مقصود مشترک ہو جیسا اس وقت زیادہ غرض تنظیم سے یہی ہے کہ جو متعصبین آزادی ہند کے بعد ہندوستان سے اسلام کو مٹانا چاہتے ہیں ان کے مقابلہ میں اس کی حمایت کریں تا کہ اسلام اپنے اصول و شعائر کے ساتھ ہندوستان میں باقی رہے گو اس جماعت کے احاد میں اختلافِ مذہب بھی ہو۔ اور اس وقت کی فضا پر نظر کر کے بظاہر اسباب اس کی ضرورت ہے کہ اس مقصود کے حاصل کرنے کے لئے باہمی اختلاف کو بجائے خود رکھ کر سب کلمہ گو جمع ہو جاویں تو متقی نہ ہونا ایسی حالتِ اختلاف میں مانع تعاون نہیں (تنظیم المسلمین کا حاشیہ ملاحظہ ہو) البتہ اس میں یہ شرط ضرور ہے کہ اس تعاون میں جو اختلاط ہو وہ مضر دین نہ ہو اور اس کی اسلم صورت یہ ہے کہ عوام الناس ایسے لوگوں سے مذہبی گفتگو نہ کریں نہ سنیں یہ کام علماء پر چھوڑ دیں البتہ اپنے ہم عقیدہ کی علمی و عملی اصلاح خاص ملاقاتوں میں لطف و اخلاق سے کرتے رہنا بلا خطر مناسب بلکہ واجب ہے تا کہ وہ بھی تقویٰ کے ساتھ موصوف ہو جاویں (تنبیہ متعلق نمبر ۵ و نمبر ۸) حاصل اس تقسیمِ خدمات کا یہ ہے کہ

زعماء کا کام یہ ہے کہ مسلمانوں کو من حیث القوم مٹنے نہ دیں اور علماء کا کام یہ ہے کہ مسلمانوں کو من حیث المذہب بگڑنے نہ دیں۔ تو ایک جماعت میں جن خاص اوصاف کی کمی اس کے فرض میں مخل ہے اس کمی کو دوسری جماعت میں دیکھ کر خود اس جماعت کو بیکار سمجھنا محض ناحقیقت شناسی و ناتجربہ کاری ہے۔ ہر کسے را بہر کارے ساختند۔

نمبر (۹) ہر حال اور ہر عمل میں اصل مطمح نظر رضائے حق کو رکھیں کہ حقیقی کامیابی اسی پر موقوف ہے

نمبر (۱۰) فتویٰ ۱۳۵۶ھ کے ختم اور ۱۹۳۸ء کے آغاز کا لکھا ہوا اس وقت کی حالت کی بنا پر ہے اگر حالات بدلیں گے حکم بھی بدل جاوے گا جیسا ظاہر ہے۔

یہ مجمل نقشہ ہے اس فتویٰ کا مع بعض توضیحات کے پس ان واقعات کی بنا پر عرض کرتا ہوں کہ آئندہ بجائے مجھ سے خطاب کرنے کے میرا وہ فتویٰ مذکور جس میں میرا مسلک شائع ہو چکا ہے ملاحظہ فرمالیں پھر بعد ملاحظہ جن حضرات کو اس پر اطمینان ہو وہ اس کو تسلیم کرلیں اور جن کو اطمینان نہ ہو وہ دوسرے علماء سے تحقیق فرمالیں اور مجھ کو میرے عذر پر نظر فرما کر قیل و قال سے معاف فرماویں اہلِ اطمینان اطمینان کے سبب اور غیر اہلِ اطمینان دوسرے بزرگوں سے مراجعت کے امکان کے سبب۔ البتہ مجھ کو بھی حالات کی اطلاع کردی جاوے تو نہایت احسان ہے مگر اس کے جواب کے منتظر نہ رہیں۔ اس اطلاع سے ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ اطلاع ملنے پر اور تفتیش کرنے کے بعد اگر پہلی تحقیق بدلے گی تو عام فتوی کے ذریعہ دوسرا حکم شائع کردیا جاوے گا۔

والسلام خیر ختام

کتبہ الاحقر اشرف علی التھانوی عفی عنہ

۲۱ رجب ۱۳۵۸ھ

الطریق الامم[1] فی شرائط اتحاد الامم

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

بعد الحمد والصلوٰۃ آج کل کانگریس کے ساتھ بعضے مسلمانوں کا اتحاد مسئلہ زیر بحث ہو رہا ہے حالانکہ جس ہیئت سے یہ اتحاد ہو رہا ہے وہ محلِ بحث نہ ہونا چاہئے کیونکہ اس کے مفاسد بیّن اور مشاہد ہیں جن کا اقتضاء شرعی قواعد سے ظاہر ہے کہ اگر یہ اتحاد فی نفسہ جائز بھی ہوتا تب بھی بوجہ لزومِ مفاسد کے ناجائز ہوتا جیسا کہ بہت سے فروع اسی اصل پر مرتب ہیں حتی کہ مباح سے بڑھ کر مستحبات تک پر اس عارض لزوم مفاسد بلکہ ایہام مفاسد کے سبب بھی عدم جواز کا حکم کر دیا جاتا ہے، لیکن یہاں تو اس عارض کے علاوہ بعض ضروری شرائط کے فقدان کے سبب یہ اتحاد فی نفسہ بھی ناجائز ہے اور ان شرائط میں شرطِ اعظم یہ ہے کہ اس میں اسلام کا حکم غالب ہو اور غیر مسلم قوم حکمِ اسلام کے تابع رہیں جیسا کہ سیرِ کبیر وغیرہ کتبِ مذہب میں یہ شرط مصرّح ہے مگر اس میں بعض اہل علم نے جو اس اتحاد کے حامی ہیں ایک نئی ایجاد یہ کی کہ جب احکامِ فقہ میں اس کی گنجائش نہیں پائی تو بعض روایاتِ حدیثہ سے استدلال کرنا شروع کیا۔ اور اس کو نئی ایجاد کئی وجہ سے کہا گیا۔ ایک اس لئے کہ یہ ایک قسم کا اجتہاد ہے۔ جس کا بوجہ فقدانِ اوصاف اجتہاد ہم کو حق نہیں۔ دوسرے اس لئے کہ وہ روایات ہنوز محتاجِ توثیق ہیں جس سے تعرض نہیں کیا گیا۔ تیسرے اس لئے کہ ان روایات میں خود ایسے قیود ہیں جو مانعِ استدلال ہیں چونکہ دوامر سابق کا بار اثبات مستدلین کے ذمہ ہے اس لئے ہم اس کے تو منتظر ہیں البتہ امرِ ثالث میں قیود کے ہم مدعی ہیں اس لئے وہ روایت مع القیود جس کو ایک ثقہ عالم نے سیرت ابن ہشام سے اور اس روایت کے متعلق ایک درایت روض الانف سے نقل کر کے میرے پاس بھیجی بعینہ ان کی

---

(۱)......بالفتح الوسط کذافی القاموس ای المستقیم۔

عبارت میں ذکر کرتا ہوں وھی ھذہٖ۔

یہاں آکر میں نے سیرت ابن ہشام کی مراجعت کی اس میں یہ عبارت ہے۔

وان على اليهود نفقتهم و على المسلمين نفقتهم وان بينهم النصر على من حارب اهل هذه الصحيفه الى ان قال وانه ماكان بين اهل هذه الصحيفة من حدث او اشتجار يخاف فساده فان مردّه الى الله عزوجل والى محمد رسول الله صلى الله عليه وسلم (سيرت ابن هشام على هامش الروض الانف ص ١٧ ج ٢.)

عہد نامہ کے شروع میں یہ الفاظ ہیں۔

هذا كتاب من محمد النبى صلى الله عليه وسلم بين المؤمنين والمسلمين من قريش و يثرب ومن تبعهم فلحق بهم وجاهد معهم: انهم امة واحدة من دون الناس الخ (ص ١٦) درمیان میں ہے وان المؤمنين بعضهم موالى بعض دون الناس وانه من تبعنا من اليهود فان له النصر والاسوة غير مظلومين ولا متناصرين عليهم. (ص ١٧)

ان عبارات سے صاف ظاہر ہے کہ معاہد کے دو فریق مسلمین اور یہود ہیں لیکن اول متبوع ثانی بطور تابع (كما دل عليه من تبعنا من اليهود) اور سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بطور ایک حاکم مسلمہ فریقین کے ہیں گویا یہ معاہدہ اس نوع کا ہے جو اہل اسلام اور ذمیین میں ہوتا ہے لیکن اس وقت کے احوالِ خصوصی کی وجہ سے ذمیین کے ساتھ بالکل ویسا معاملہ نہیں ہوسکتا تھا جو اس کے بعد ان کے حق میں قرار پایا۔ اس لئے سہیلی نے اس جگہ ابوعبید کا یہ جملہ نقل کیا ہے۔

قال ابو عبيد فى كتاب الاموال: انما كتب رسول الله صلى الله

علیہ وسلم ھذا الکتاب قبل ان تفرض الجزیۃ واذکان الاسلام ضعیفا قال و کان للیھود اذذاک نصیب فی المغنم اذا قاتلوا مع المسلمین کما شرط علیھم فی ھذا الکتاب النفقۃ معھم فی الحروب (الروض ص ۱۷)

روایت سے ثابت نہیں ۔ یہاں تک کہ مقصود کی تقریر تو ہوگئی ۔اس کے بعد ضمیمہ کے طور پر مناسبتِ مقام مسلم لیگ کے ساتھ اتحاد کا حکم بھی لکھتا ہوں خصوص اس وجہ سے بھی کہ بعض حضرات کانگریس کے مفاسد کے جواب میں اکثر اہل مسلم لیگ کے بعض اعمالِ دینیہ کی کوتاہیاں پیش کر کے بطور الزام کے ان کوتاہیوں کو اس کے ساتھ اتحاد کرنے کے جواز سے مانع قرار دیتے ہیں حالانکہ کہاں اصل ایمان کا فقدان، کہاں فروع اعمال کا نقصان ۔تو ایک کا قیاس دوسرے پر محض فاسد اور قیاس مع الفارق ہے خصوص جبکہ اس دوسرے نقصان کی اصلاح کی توقع بھی قریب ہو چنانچہ اس کی کوشش شروع بھی ہوگئی ہے (اللہ تعالیٰ سے میں بھی دُعا کرتا ہوں اور دوسرے مسلمان بھائیوں سے بھی دُعا چاہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ اس کوشش کو کامیاب فرمادے) پس اس قیاس کے جواب کے لئے اول تو اس کے فساد کا ظہور ہی کافی ہے کما ذکر مگر تبرعاً اس کے متعلق ایک مذہبی روایت بھی شرح سیر سے نقل کرتا ہوں وہی ہٰذہ۔

و فی شرح السیر:

و لا بأس بان یقاتل المسلمون من اھل العدل مع الخوارج المشرکین من اھل الحرب لانھم یقاتلون الآن لدفع فتنۃ الکفر . فھٰذا قتال علی الوجہ الما موربہ و ھو اعلاء کلمۃ اللّٰہ تعالیٰ بخلاف ما سبق فالقتال ھنا ک لاظھارما ھو مائل عن طریق الحق و ھا ھنا لا ثبات اصل الطریق اھ ص : ۱۴۲ ج: ۳

اور ظاہر ہے کہ اہل مسلم لیگ کی کوتاہیاں خوارج کی بد دینی کے درجہ تک تو نہیں پھر جب کفار کے مقابلہ کے لئے خوارج کے ساتھ اشتراک عمل جائز ہے تو مسلم لیگ کے ساتھ بدرجہ اولیٰ جائز ہوگا۔ پس اس تحریر سے کانگریس اور مسلم لیگ کی حقیقت اور حکم میں صاف فرق ظاہر ہو گیا اگر اس پر بھی کوئی شخص اپنے قیاس فاسد پر اصرار کرے تو تفریحاً و تبرکاً اس کے سامنے مولانا رومیؒ کا ارشاد ملخصاً پیش کر دیا جاوے۔

بود بقالے مراُو را طوطئے　　　خوش نوا وسبز و گویا طوطئے

خواجہ روزے سوئے خانہ رفتہ بود　　　بردکاں طوطی نگہبانی نمود

گربۂ بر جست ناگہ از دُکان　　　بہر موشے طوطیک از بیم جاں

جست از صدر دکان سوئے گریخت　　　شیشہ ہائے روغن با دام ریخت

از سوئے خانہ بیامد خواجہ اش　　　بردکاں بنشست فارغ شادو خوش

دید پر روغن دکان و جاش چرب　　　برسرش زدگشت طوطی کل زضرب

روز کے چندے سخن کوتاہ کرد　　　مرد بقال از ندامت آہ کرد

بعد سہ روز و سہ شب حیران و زار　　　بردکاں بنشستہ بد نومیدوار

باہزاراں غصہ و غم گشت جفت　　　کائے عجب ایں مرغ کے آید بگفت

ناگہانے جولقیئے می گذشت　　　باسرِبے مو بسان طاس و طشت

طوطی اندر گفت آمد درزماں　　　بانگ بروے زد بگفتش درعیاں

کزچہ اے کل باکلاں آمیختی　　　تو مگر از شیشہ روغن ریختی

از قیاسش خندہ آمد خلق را　　　کو چو خود پنداشت صاحب دلق را

امید کہ باوجود مختصر ہونے کے یہ تحریر انشاء اللہ تعالیٰ طالب منصف کے لئے کافی ہو جاوے گی۔ والعلم المحیط عند اللہ، و نسئلہ تو فیقہ و ھداہ

کتبہ اشرف علی

لثلثی شہر شوال ۱۳۵۷ھ

العدل مع اھل العدول

(متضمن بر)

تصحیح و تنقیح و توضیح

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

قَالَ اللّٰهِ تَعَالیٰ: کُوْنُوْا قَوَّامِیْنَ لِلّٰهِ شُهَدَاءَ بِالْقِسْطِ وَلَا یَجْرِمَنَّکُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰی اَنْ لَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی الآیۃ

وقال تعالیٰ: وَلَا تَقْفُ مَالَیْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ الآیۃ۔

ان آیتوں میں حکم ہے کہ کسی کے ساتھ اگر اختلاف یا خلاف بھی ہو عدل سے اس حالت میں بھی تجاوز کرنا جائز نہیں نیز بلا دلیل صحیح کوئی دعویٰ کرنا جائز نہیں۔ اس حکم کے تحت میں ایک واقعہ عرض کرتا ہوں کہ ۲۹؍ ذیقعدہ ۱۳۵۷ھ کو ڈاک سے میرے پاس ایک صاحب کا خط جس میں کاتب صاحب کا نام اور نشان نہ لکھا تھا مع ایک حصہ نقیب اخبار کے آیا جس میں مضمون خطاب مسلم لیگ کے متعلق ایک اعتراض تھا اور اصل اعتراض کے ساتھ خط میں بہت سی بدزبانیاں اور بدگمانیاں بھی جمع کر دی تھیں۔ اعتراض تو مجھ کو الحمدللہ کبھی ناگوار نہیں ہوتا بلکہ اگر اس کی بناء صحیح ہو تو میں اس کو رہنمائی سمجھ کر ممنون ہوتا ہوں البتہ اگر اس کی بناء فاسد ہو یا بناء کی صحیح ہوتے ہوئے لہجہ طعن و تشنیع کا ہو وہ طبعاً ضرور گراں ہوتا ہے مگر اس حالت میں بھی صحتِ بناء کی صورت میں اس کے جواب بالمثل کو اور فسادِ بناء کی صورت میں نفس جواب کو فضول سمجھ کر نظر انداز کر دینے کا معمول ہے۔ البتہ نفس واقعہ کی تحقیق کو تدیّن کا مقتضا سمجھ کر ضروری سمجھتا ہوں چنانچہ اسی اصل پر جو اعتراض اخبار میں بزیرِ عنوان شدید غلطی لکھا ہے

صرف اس کی حقیقت لکھتا ہوں وہ یہ کہ مضمون خطابِ مسلم کے دو حصے ہیں ایک خود میرے قلم کا لکھا ہوا وہ میرے خیالات کا آئینہ ہے یہ حصہ صفحہ ۴ سطر ۵ تک ہے دوسرا حصہ اس کے بعد سے آخیر تک کا وہ میرے ایک عزیز کا لکھا ہوا ہے چنانچہ حدِ مشترک پر اس کی تصریح بھی کر دی گئی ہے اس عبارت میں اس اجمال کی تفصیل اپنے بعض اعزہ سے سہل اور آسان عبارت میں لکھوا کر بھی پیش کرتا ہوں الخ اور جس مضمون پر اعتراض کیا ہے وہ اس دوسرے حصہ میں ہے۔ سو وہ میرا لکھا ہوا ہی نہیں گو میری فرمائش سے لکھا گیا ہے مگر ظاہر ہے کہ ایسی فرمائش میں ایک ایک حرف تو بتلایا ہی نہیں جاتا اجمالی عنوان سے مشورہ دے دیا جاتا ہے پس اس کو حرفاً حرفاً میری طرف منسوب کرنا واقع کے خلاف ہے پس ضروری جواب تو اس سے ہو گیا مگر میں نے تبرعاً ان عزیز سے بھی دریافت کیا سو انہوں نے یہ جواب دیا کہ مجھ کو جن ذرائع سے اس کا علم ہوا تھا میں ان کو موثوق بہا سمجھا لیکن پھر بھی اس پر اصرار نہیں اگر وہ ذرائع فی الواقع موثوق بہا نہیں تو اس روایت کے نقل کرنے پر افسوس کرتا ہوں اور آئندہ مزید احتیاط کی جاوے گی یہ ان عزیز کا جواب ہے جو ہر طرح قابل قبول ہے۔ اب صاحبِ اخبار کو بھی خیر خواہی سے مشورہ دیتا ہوں کہ جیسا ان عزیز نے حق کو تسلیم کیا اسی طرح صاحبِ اخبار پر بھی بروئے تدیُّن واجب ہے کہ انہوں نے بھی جو بعضے واقعات خلافِ اُصولِ شرعیہ لکھ دیئے ہیں گو بطورِ نقل ہی سہی وہ ان کی تلافی شائع کر دیں۔ آگے ان کو اپنا فرضِ منصبی ادا کرنے نہ کرنے کا اختیار ہے۔ میں نے اپنا حقِ خیر خواہی ادا کر دیا اور کاتبِ خط صاحب چونکہ اپنے بیان سے عالم معلوم ہوتے ہیں ان کی خدمت میں تو اتنا عرض کرنا بھی غالباً بے ادبی سمجھا جائے گا اس لئے ان کا معاملہ آخرت میں تو حق تعالیٰ کے سپرد کرتا ہوں اور دُنیا میں اس عرض پر ختم کرتا ہوں۔

بدم گفتی و خورسندم عفاک اللہ نکو گفتی جواب تلخ می زیبد لب لعل شکر خارا

کتبہ الاحقر اشرف علی التھانوی عفی عنہ

۳۰ رذی یقعدہ ۱۳۵۷ھ

اعلامِ نافع

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

بعد الحمد وصلوٰۃ احقر اشرف علی تھانوی مدعا نگار ہے کہ مولوی مظہر الدین صاحب مرحوم کے واقعہ کے بعد سے اخبارات سے برابر معلوم ہوتا رہا ہے کہ مختلف حضرات کے پاس قتل کے دھمکی کے خطوط آرہے ہیں یہ فعل کسی منظّم جماعت کا ہے یا افراد کا اس کا تو علم خدا کو ہے مگر جب یہ وبا چل رہی تھی تو میں اس سے کیسے بچ سکتا تھا چنانچہ ۱۵ اپریل ۱۹۳۹ء کی ڈاک سے ایک خط جس میں کاتب کا نام و پتہ نہ تھا میرے نام بھی مضمون ذیل کا پہنچا۔ لفافہ پر مہر مئو ناتھ بھنجن ضلع اعظم گڑھ کے ڈاکخانہ کی ۱۳ اپریل کی ہے اور تھانہ بھون کے ڈاک خانہ کی مہر ۱۵/اپریل کی ہے اور اندر خط میں کاتب میں ۱۵ اپریل لکھی ہے میرا ہی کیا ہر مسلمان کا عقیدہ ہے کہ مقدرات بدلا نہیں کرتے لہٰذا جو ہونے والا ہے ہو کر رہے گا اور نہ ہونے والا نہ ہوگا۔ اس لئے اس خط سے بحمدِ اللہ مجھ پر کوئی معتد بہ اثر نہیں ہوا اور نہ اس سے بچنے کے لئے مجھ کو کسی بیان کے شائع کرنے کی ضرورت تھی مگر اس سے مجھے یہ شبہ ہو گیا کہ بعض لوگوں کو مسلم لیگ کے متعلق میرے مسلک کی نسبت کچھ غلط فہمی ہو رہی ہے تو اگر اس خط میں کاتب کا نام ونشان ہوتا تو خصوصیت کے ساتھ تفہیم ممکن تھی اب عام عنوان سے جواب دیتا ہوں۔ ذیل میں اول اس خط کو نقل کرتا ہوں پھر اپنا جواب نقل کرونگا۔

نقل خط:

مولوی اشرف علی تھانوی۔ تاریخ ۱۵ اپریل ۱۹۳۹ء۔ یہ بات بہت تشویش اور

ہمارے لئے شرم کی ہے کہ کانگریس جمعیۃ العلماء احرار اور مؤمن کانفرنس کی تمام کوششوں کے باوجود مسلم لیگ کا فتنہ ملک میں پھلتا جاتا ہے اور آپ نے علماؤں کے خلاف مسلم لیگ کے موافق فتویٰ دیا ہے جس سے بہت اثر ہے ۔لیکن اب ہماری پارٹی مسلم لیگ کے مولویوں اور بددین لیڈروں کو مزا چکھانے کیلئے تیار ہوکر میدان میں آگئی ہے اس لئے آپ کو بھی یہ تاکیدی نوٹس دیجاتی ہے کہ ایک مہینہ کے اندر اندر مسلم لیگ سے اپنا فتویٰ واپس لے لو اور حضرت امیر الہند مولانا حسین احمد صاحب مدنی مدظلہ کا مسلک قبول کرلو اور کانگریس کی حمایت کرو ورنہ یقین اور پورا یقین رکھو کہ مظہر الدین الامان والا کی طرح سے تم کو بھی تمہاری خانقاہ میں چھرے سے ذبح کردیا جائے گا ۔یہ قسمیہ اور ایمانا اطلاع بھیجی جاتی ہے کہ ایک مہینہ کی مدت غنیمت جاننا ایک مہینہ تمہارے بیان کی انتظاری کرکے ہمارا آدمی روانہ ہوجائے گا جو پستول یا چھرے سے تم کو ختم کردیگا پھر مردود جینا کی باری ہوگی اور بدعتی مولوی حامد بدایونی کی یہ چٹھی کوئی دھمکی نہیں ہے

فقط کانگریس زندہ باد اور جمعیۃ العلماء زندہ باد۔

جواب:

معلوم ہوتا ہے کہ کاتب خط نے میرے اس فتویٰ میں جو مسلم لیگ کے متعلق ہے جس کا لقب تنظیم المسلمین ہے غور نہیں کیا جس کی وجہ سے بلا دلیل بلکہ خلافِ دلیل اسکو مسلم لیگ کی حمایت مطلقہ سمجھ لیا حالانکہ اس میں ذیل کی قیود کی تصریح ہے اول اس کو اس جماعت پر ترجیح دی ہے جس میں غالب عنصر غیر مسلمین کا ہے ملاحظہ ہو تنظیم المسلمین شائع شدہ منجانب دفتر رسالہ النور تھانہ بھون کالم ۲ سطر ۴۵ عبارت ذیل سو اس کے متعلق جہاں تک تفحصِ بلیغ کے ساتھ تحقیق کیا گیا مذکورہ و مسئولہ دونوں جماعتوں میں ان کی موجودہ حالت پر نظر کر کے مسلم لیگ کے نقائص کا رفع کرنا سہل ہے اور کانگریس کی اصلاح متعسر بلکہ متعذر ہے الخ دوسری اسلامی منظّم و صاحبِ قوت و صاحبِ اثر جماعتوں پر اگر موجود ہوں ترجیح نہیں دی تھی

تنظیم المسلمین میں اس کی بھی تصریح ہے۔

ملاحظہ ہو کالم ۳ سطر ۳۱ عبارت ذیل:

اور بالفرض اگر مسلم لیگ کی اصلاح کے قبل یا بعد اور کوئی جماعت مسلمہ منظمہ صاحب قوت وصاحب اثر تیار ہو جاوے اس صورت میں مسلم لیگ اور وہ جماعت دونوں اتحاد اشتراک کے ساتھ کام کریں تا کہ مسلمانوں میں افتراق وتشتت نہ ہو......الخ

دوسرے اس میں مسلم لیگ کے نقائص کو تسلیم کر کے اسکی اصلاح کا سب کو خصوص علماء کو مشورہ دیا ہے ملاحظہ ہو کالم ۳ سطر ۸ عبارت ذیل:

پھر اُن میں جو اہل قوت و اہل اثر ہوں ان کو اپنی قوت واثر سے اس کی اصلاح کی کوشش کرنا چاہیے اور جو اہل قوت نہیں وہ اہل قوت کو وقتاً فوقتاً یاددہانی کر کے تقاضے کے ساتھ اُن سے اصلاح مطلوب کی درخواست کرتے رہیں اور اصلاح کے طریقوں میں علماء محققین سے مدد لیتے رہیں......الخ

اور خود بھی اس کی اصلاح کا برابر سلسلہ رکھتا ہوں چنانچہ عام رسائل بھی اور خاص ذمہ داروں کے نام خطوط بھی جاتے رہتے ہیں۔ ابھی لیگ کے اجلاس پٹنہ میں اپنے عزیزوں اور دوستوں کا ایک مختصر وفد اسی کام کیلئے بھیجا پھر ۱۲ فروری ۱۹۳۹ء کو چند عزیزوں کو اسی کام کے لئے دہلی روانہ کیا۔ غرض جتنا مجھ سے ہو سکتا ہے لیگ کے ذمہ دار حضرات کو برابر دین کی تبلیغ کر رہا ہوں اگر میرے ساتھ سب مسلمان خصوص علماء بھی مل کر ان حضرات پر زور دیتے اور ان کو نماز روزہ اور وضعِ اسلامی اور تمام دینی شعائر کی پابندی پر مجبور کرتے تو اب تک مُسلم لیگ حقیقی معنی میں مُسلم لیگ ہو جاتی ہاں یہ ضرور ہے کہ میں نے ان حضرات سے آویزش کو مناسب نہیں سمجھا کہ جلسے کرتا اور ان کے مقابلہ میں ان کی کوتاہیوں کو برملا بیان کرواتا کہ اس کو میں مضر سمجھتا ہوں اس طریقہ سے دوسرے کو ضد ہو جاتی ہے جو طریقہ

میں نے اختیار کیا وہ دیر طلب ضرور ہے مگر اس کا اثر انشاء اللہ دیرپا ہوگا۔ پھر ان احتیاطوں کیساتھ میں نے وہ فتویٰ قبل اشاعت اپنی دیوبندی جماعت کے علماء کو بھی دکھلایا تھا جس کی پسندیدگی پر سب نے اتفاق کیا تھا۔ جیسا کہ تنظیم المسلمین مذکور کے کالم ۳ سطر ۴۵ نوٹ نمبر (۱) میں اسی وقت اس کا اظہار بھی کر دیا گیا تھا مگر میں نے اس وقت اس میں ان حضرات کا نام ظاہر نہیں کیا تھا کہ شاید وہ اپنی مصلحت کے خلاف سمجھیں صرف فیما بینی و بین اللہ ان سے اپنا اطمینان کر لیا تھا چنانچہ ان میں سے بعض صاحبوں کی تصدیق کے بعض اقتباس یہ ہیں حضرت والا مدظلہم کا مضمون اصول وقواعد کی روشنی میں نہایت مطرد و منعکس اور جملہ شقوق واحتمالات پر حاوی ہونے کے لحاظ سے قریب بحصرِ عقلی ہے نیز اصل موضوع لب و لہجہ اور طرزِ ادا کے اعتبار سے نہایت معتدل واقع ہوا ہے کافی تحقیق کے و تفتیشِ احوال کے بعد بلا خوف لومۃ لائم نہایت محتاط طریقہ سے جس رائے کا اظہار فرمایا ہے انصافاً اس سے انحراف وانکار کی گنجائش نہیں بہر حال حضرت والا دامت برکاتہم کا مضمون میرے نزدیک اہل اسلام خصوصاً اہلِ علم کے لئے ایک بصیرت عطا کرتا ہے اور اس کی اشاعت بھی مناسب ہے الخیر یہ ہے واقعہ مگر میں اب بھی اس پر آمادہ ہوں کہ اگر علماء سے اس کارروائی کے خلاف شرع ہونے کا فتویٰ حاصل کر کے مجھ کو اطلاع کر دی جائے میں اس میں انصاف اور تدیّن سے غور کر کے شرحِ صدر کے بعد اپنے فتویٰ سے رجوع کر لوں گا جیسا کہ میرا ہمیشہ سے معمول رہا ہے رسالہ ترجیح الراجح کا سلسلہ اسکی دلیل ہے اور یہی کلام ہے کانگریس کی حمایت میں جس کو میں اب تک بحالت موجودہ اسلام اور اہلِ اسلام کیلئے سخت مضر سمجھتا ہوں لیکن اگر دلیلِ شرعی اس کے خلاف واضح ہو جائے میں اپنی رائے بدلنے کیلئے تیار ہوں اور یہی صحیح طریقہ بھی ہے کسی کی غلطی پر مطلع کرنے کا۔ باقی اگر تخویف سے کسی نے اپنے ضمیر کے خلاف کوئی رائے بھی ظاہر کر دی یہ عقلاً بھی مفید نہیں ہوسکتا کیونکہ ہر شخص سمجھے گا کہ یہ رائے دل سے نہیں تو اس سے مقصود بھی حاصل نہیں ہوگا اس لئے یہ طریقہ محض عبث اور عقل وشرع دونوں کے خلاف ہے یہ سب تنقیح اس وقت ہے جب حقیقت کو سمجھنا اور حق کا اتباع کرنا

مقصود ہوا اور اگر یہ نہیں تو پھر بجز قیامت کے دن کے اس کے فیصلہ کی کوئی صورت نہیں، باقی میں اس پر قادر نہیں کہ محض مخلوق کے راضی کرنے کے لئے حق تعالٰے کو ناراض کردوں اور دنیا کے متاعِ قلیل کے لئے آخرت کے نفع وضرر کو نظر انداز کردوں۔ والسلام و اللّٰہ الھادی الیٰ سوَاء السبیُل۔

جمعیۃ علماء ہند کے دعوت نامہ ۱۹۳۵ء پر حضرت اقدس کا جواب

۱۹۳۹ء میں جمعیۃ العلماء ہند کا جو اجلاس دہلی میں ہوا تھا۔ اس کا دعوت نامہ حضرتؒ کی خدمتِ عالیہ میں بھی آیا تھا۔ اور اس دعوت نامہ کے ساتھ ناظم صاحب کا ایک خط بھی تھا۔ حضرتؒ نے اس کا خود جواب عنایت فرمایا تھا۔ اور اس کی نقل رکھ لینے کو مجھے حکم دیا تھا چنانچہ ناظم صاحب جمعیۃ کا اصل خط اور حضرت کے جواب کے نقل میرے پاس محفوظ ہے جو درج ذیل کی جاتی ہے جس سے حضرتؒ کا مسلک پوری طرح واضح ہو جائے گا۔ اور وہی آج تک ہمارا مسلک ہے۔ والسلام محمد شبیر علی عفی عنہ

الجمعیۃ المرکزیہ العلماء الہند بازار بلیماران دہلی نمبر ۴۷

حضرت اقدس زاد اللہ مجدکم۔ السلام علیکم۔ دعوت نامہ ارسال خدمت ہے اگر سفر کا تحمل نہ ہو تو حضرت کسی کو بطور نمائندہ روانہ فرمادیں۔ معاملات کی اہمیت حضور کے پیش نظر ہے۔

من یدکم الا حقر الفقیر احمد سعید کان اللّٰہ لہ.

۲۶ فروری ۱۹۳۹ء

جواب:

السلام علیکم ورحمۃ اللہ آپ کا دعوت نامہ آیا۔ میرا عذرِ سفر تو آپ کو معلوم ہی ہے اس

لئے خود تو حاضری سے قاصر ہوں۔ اگر دعوت نامہ کچھ پہلے آتا تو ممکن تھا کہ اس کے متعلق کچھ خط و کتابت کر کے کسی کو بھیجنے کا انتظام کرتا۔ اب عینِ وقت پر اس کا انتظام بھی مشکل ہے۔ اس لئے شرعی حیثیت سے صرف اپنی ایک رائے کا اظہار کرتا ہوں جس کے متعلق مولانا کفایت اللہ صاحب سے زبانی گفتگو بھی ہو چکی ہے اور اب تو واقعات نے مجھ کو اس رائے پر بہت ہی پختہ کر دیا ہے اور وہ یہ ہے کہ مسلمان کا خصوصاً حضراتِ علماء کا کانگریس میں شریک ہونا میرے نزدیک مذہباً مہلک ہے۔ بلکہ کانگریس سے بیزاری کا اعلان کر دینا نہایت ضروری ہے علماء کو خود مسلمانوں کی تنظیم کرنا چاہیے تاکہ ان کی تنظیم خالص دینی اصول پر ہو اور مسلمانوں کو کانگریس میں داخل ہونا اور داخل کرنا میرے نزدیک ان کی دینی موت کا مترادف ہے۔

والسلام

اشرف علی

دفع بعض الشبهات علیٰ السیاسیات من الاٰیات

حامداً و مصلیاً۔ اس وقت عام طور سے علماء حق پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ سیاساتِ حاضرہ میں مسلمانوں کی قیادت کیوں نہیں کرتے۔ اور اس کی بناء ایک غلط مقدمہ ہے وہ یہ کہ سیاسیات ایک حصہ ہے شریعت کا تو علماءِ شرائع کو ماہرِ سیاسیات ہونا ضروری ہے سوخود اس مقدمہ میں معترضین کو ایک خلط ہو گیا ہے وہ یہ کہ سیاسیات کے دو حصے ہیں ایک سیاسیات کے احکام شرعیہ یہ بیشک شریعت کا جزو ہے اور کوئی عالم اس سے ناواقف نہیں چنانچہ ابوابِ فقہیہ میں سے کتاب السیر ایک مستقل اور مبسوط جزو ہے جس کی درس و تدریس

پر دوام والتزام ہے اور دوسرا حصہ سیاسیات کا اس کی تدابیرِ تجربیہ ہیں جو ہر زمانہ میں حالات وواقعات اور آلات وغیرہ کے تغیر وتبدل سے بدلتی رہتی ہیں اور یہ حصہ شریعت کا جزو نہیں اور علماء کا اس میں ماہر ہونا ضروری نہیں اگر اس میں کوئی عالم ماہر ہو اس کی مہارت کے دوسرے ذرائع ہیں جن کا حاصل تجربہ ومناسبتِ خاصہ ہے لیکن اوپر جو عرض کیا گیا کہ سیاسیات کا یہ حصہ یعنی تدابیر تجربیہ شریعت کا جزو نہیں اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ حصہ شریعت سے مستغنی ہے اور اس کے استعمال کرنے والوں کو علمائے شریعت کی طرف رجوع کرنے کی حاجت نہیں اگر کسی کا ایسا خیال ہے محض غلط ہے۔ کوئی واقعہ اور کوئی عمل اور کوئی تجویز اور کوئی رائے دنیا میں ایسی نہیں جس کے جواز وعدم جواز میں شریعت سے تحقیق کرنے کی ضرورت نہ ہو گو وہ شریعت کا جزو نہ ہو تو جزو نہ ہونے سے تابع نہ ہونا لازم نہیں آتا۔ اس کی بالکل ایسی مثال ہے جیسے فن طب میں سیاسیات بدنیہ یعنی اصلاح احوال بدن کی تدابیر مدون کی گئی ہیں اور مطب میں ان ہی تدابیر کی مشق کرائی جاری ہے مگر علماءِ شرائع کے لئے ان تدابیر میں ماہر ہونا کسی کے نزدیک بھی لازم نہیں اور نہ یہ عدمِ مہارت اس کے حق میں نقص ہے البتہ ان تدابیر کے جواز وعدم جواز شرعی کی تحقیق ان کا فرضِ منصبی سمجھا جاتا ہے بس جو معاملہ سیاسیاتِ بدنیہ بالباء یعنی طب کے ساتھ بلانکیر کیا جاتا ہے کہ حاملانِ تدابیرِ طبیہ کی جدا جماعت سمجھی جاتی ہے اور حاملان احکام شرعیہ یعنی ان تدابیر کے جواز وعدم جواز کی تحقیق کی جدا جماعت سمجھی جاتی ہے۔ دوسری جماعت کو پہلی جماعت کے فرائض پر مجبور نہیں کیا جاتا اور نہ ان فرائض سے بے خبری کو ان کے حق میں نقص سمجھا جاتا ہے۔ اسی طرح سیاستِ مدنیہ بالمیم یعنی نظامِ ملکی کے ساتھ معاملہ کرنا لازم ہے کہ تدابیر نظام کی جدا جماعت سمجھی جاوے اور ان تدابیر کے شرعی احکام کی جدا جماعت سمجھی جاوے اور دوسری جماعت کو پہلی جماعت کے فرائض پر مجبور نہ کیا جاوے اور نہ ان فرائض کے علم وعمل کے فقدان کو ان کے حق میں نقص سمجھا جاوے اور طریقِ عمل میں دونوں جماعتوں کے فرائض کو اس طرح جمع کیا جاوے کہ پہلی جماعت سے تدابیر کی تحقیق کریں اور دوسری جماعت سے احکام شرعیہ کی، اسی طرح

جہاں نظامِ مذکور فرض ہو جاوے خود دوسری جماعت بھی پہلی جماعت سے تدابیر دریافت کریں اور بشرطِ جوازِ شرعی ان پر عمل کریں اور پہلی جماعت دوسری جماعت سے جواز و عدم جواز کی تحقیق کریں اور بعد ثبوت جواز ان پر عمل کریں۔

کماسیأتی فی الا ستدلال الاٰتی من استر شاد الملوک من الانبیاء علیهم السلام و اطاعتهم لهم و ارشادهم للملوک و موافقتهم لهم فی النظام .

یہ معنی ہیں دونوں جماعت سے کام لینے کے اور دونوں جماعت کے بالاتفاق کام کرنے کے البتہ (۱) اگر کسی وقت کوئی جماعت اہل سیاست کی ایسی نہ ہو کہ علماء سے احکام پوچھ کر عمل کیا کریں جیسا اس وقت غالب ہے تو اس وقت علماء ایسی جماعت کے پیدا ہونے کے منتظر نہ رہیں ورنہ محبان دنیا دینی مقاصد کو تباہ کر دیں گے بلکہ وہ خود اپنے میں سے ایسی جماعت بناویں جو علماً و عملاً سیاست و شریعت کے جامع ہوں۔ مگر یہ حکم کچھ سیاست مدنیہ کے ساتھ خاص نہیں بلکہ سیاست بدنیہ یعنی طب بلکہ اسباب معاش میں سے جتنے فرض کفایہ ہیں مثل تجارت و زراعت سب کا یہی حکم ہوگا۔ البتہ جس چیز کا ضرر دین میں قریب ہو اس میں دخل اصلاحی کا وجوب ایسی چیز میں دخل اصلاحی کے وجوب سے اقوی و اکد ہوگا جس کا ضرر دین میں قریب نہ ہو۔ اور ان سب مقاصد کی اصلاح کے لئے خصوص حفاظت دین کے لئے جماعت کا انتظام کرنا ہر حال میں مشروط ہوگا استطاعت کے ساتھ یہ تو ایک تحقیقِ کلی ہے اس سے آگے کچھ جزئیات ہیں جس میں کلام کچھ متفق علیہ کچھ مختلف فیہ اپنے محل میں مبسوط و مضبوط ہے ان میں ایک مسئلہ استطاعت کا بھی ہے اور یہ مسئلہ یعنی عدمِ لزوم علم بالنظام لعلم الاحکام ہر چند کہ بدیہی جلی ہے اور اگر خفی بھی ہوتا تب بھی طبی مثال سے تنبیہ کے بعد جلی ہو گیا اور اس بداہت کے سبب محتاج اثبات بالدلیل نہیں مگر میں تبرعاً بعض آیات سے اُس کو

---

(۱)...... (یہ مضمون ''البتہ سے ...... استطاعت کا بھی ہے'' تک بعد میں بڑھایا گیا ہے ۱۲)

زیادہ منور کئے دیتا ہوں وہ آیات سورۂ بقرہ کی ہیں۔

الم تر الی الملأمن بنی اسرائیل من بعد موسی الی قوله فلما فصل طالوت بالجنود قال ان اللّٰه مبتلیکم بنهر...... الخ

جس کے ترجمہ کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات کے (بہت) بعد (کما نقله اهل السیر) قوم جالوت کے ظالمانہ تسلط سے تنگ آکر) بنی اسرائیل کے ممتاز لوگوں نے اپنے ایک نبی سے (جن کا نام شمویل ہے) عرض کیا کہ ہمارے لئے ایک بادشاہ مقرر کر دیجئے ہم اس کے ساتھ (مل کر قومِ جالوت سے) جہاد کریں انہوں نے (کچھ گفتگو کے بعد جواب دیا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے طالوت کو بادشاہ مقرر کیا اخیر قصہ میں یہ ہے کہ) طالوت لشکر کو لے کر چلے اور فرمایا اللہ تعالیٰ تمہارا ایک نہر سے امتحان کرنے والے ہیں (پھر جالوت کے قتل پر اور حضرت داؤد علیہ السلام کو نبوت و سلطنت عطاء ہونے پر قصہ ختم ہو گیا) ان تینوں سے اثبات مدعا کی تقریر یہ ہے کہ قرآن مجید میں نص۔ ہے کہ بنی اسرائیل نے باوجود اُن میں ایک نبی کے موجود ہونے کے (خواہ اُن کا نام یوشع ہو کما قاله قتادة یا شماعون هو کما قاله السدی یا شمویل هو کما علیه الا کثر بہر حال اذ قالو النبی لهم میں اُن کا نبی ہونا مصرح ہے) اُن نبی سے یہ نہیں کہا کہ آپ ہمارے قائد بنئے بلکہ اس مقصود کے لئے ایک مستقل بادشاہ مقرر کرنے کی درخواست کی سو اگر نبی کافی سمجھے جاتے تو ایسی درخواست کیوں کی جاتی اور اگر شبہ ہو کہ یہ بنی اسرائیل کی غلطی تھی تو اس غلطی پر اُن نبی نے متنبہ کیوں نہیں فرمایا کہ میں کافی ہوں بلکہ بادشاہ مقرر کرنے کا انتظام شروع فرما دیا اور اگر کوئی جسارت کر کے یہ کہنے لگے کہ اُن نبی سے بھی لغزش ہو گئی تو پھر اللہ نے اس غلطی پر تنبیہ کیوں نہیں فرمائی بلکہ اُس درخواست کو بلا نکیر قبول فرما لیا اس سے صاف معلوم ہوا کہ خود ہر نبی کے لئے بھی سیاسیات میں تجربہ و مناسبت لوازم میں سے نہیں تا بہ دیگراں از علماء و مشائخ چہ رسد پس مدعا بحمد اللہ باصرح واوضح وجوہ ثابت

ہوگیا بلکہ مفسرین کی نقل سے معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل کے لئے سنۃ اللہ زیادہ یہی رہی کہ

کان قوام امر ھم بالملوک وھم کا نوا یطیعون الا نبیاء کذا فی التفسیر المظھری تحت قولہ تعالیٰ: ابعث لنا ملکا و کثیر من التفا سیر و فی المظھری ایضا قولہ اتا ہ اللّٰہ الملک جمع اللّٰہ تعالیٰ لہ الا مرین و لم یجتمعا قبل ذلک بل کان الملک فی سبط و النبوۃ فی سبط ا ھ

اور طالوت کے باب میں جو بسطۃ فی العلم والجسم آیا ہے اس کی تفسیر میں معرفۃ الامور السیاسیۃ وجسامۃ البدن منقول ہے کذا فی روح المعانی۔ لیکن اس سنت کی اگر کثرت بھی نہ ہو ایک نبی کے تجربہ ومناسبت فی السیاسۃ کی نفی بھی اثبات مدعا کے لئے کافی ہے کیونکہ کسی نبی میں کسی نقص کا ہونا جائز نہیں اس سے ثابت ہوگیا کہ ایسے تجربہ ومناسبت کا نہ ہونا نقص نہیں وھو المطلوب۔ اگر شبہ کیا جاوے کہ بعض اقوال پر طالوت بھی نبی تھے۔

کما فی التفسیر المظھری تحت قولہ تعالیٰ بسطۃ فی العلم: قیل: اتا ہ الوحی حین اوتی الملک و فیہ ایضا تحت قولہ تعالیٰ قال ان اللّٰہ مبتلیکم اما بو حی اللّٰہ تعالیٰ ان کا ن نبیا و اما بار شاد نبیھم

تو نبی کے ہوتے ہوئے غیر نبی کا انتخاب ثابت نہ ہوا۔ جواب ہے یہ کہ ہمارا مدعا اس پر موقوف نہیں بلکہ نبی کے موجود ہوتے ہوئے اُن سے یہ کام نہ لینا اثبات مدعا کے لئے کہ کمالِ نبوت کے لئے کمالِ سیاسی لازم نہیں کافی ہے۔ اب ایک ضعیف سا استبعاد رہ گیا جس کا درجہ محض ایک وحشت عنوانیہ سے زیادہ نہیں جس کا منشاء ذہن میں عرفِ عامیانہ کا استیلاء ہے حقیقتِ حکیمانہ پر وہ یہ کہ امور سیاسیۃ کا علم بوجہ اپنے آثار نافعہ کے کمال ہے تو اُس کا فقدان نقص ہوگا پھر حضرات انبیاء وورثۃ الانبیاء کے لئے کیسے جائز ہوسکتا ہے۔ جواب ظاہر ہے کہ اگر یہ نقص ہوتا تو انبیاء کے لئے کیسے تجویز کیا جاتا اور لم اس کی یہ ہے کہ کمال اور

نقص متناقض نہیں کہ کمال کا رفع نقص کے وضع کو مستلزم ہو بلکہ متضاد ہیں دونوں کا رفع اور درمیان میں واسطہ کا ہونا جائز ہے چنانچہ بعثت عامہ کمال ہے مگر اس کا عدم بھی نقص نہیں ورنہ بجز حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے جمیع انبیاء کا نقص لازم آوے گا۔ نعوذ باللہ منہ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو باوجود کمال جامعیت اور سیاست میں بھی ماہریۃ کے غزوۂ احزاب میں حفرِ خندق کی تدبیر حضرت سلمان رضی اللہ عنہ سے حاصل ہوئی۔

كما فی كتب الحديث والسير فی حاشية الكشمهينی على البخاری: با ب التحريض على القتال على قوله خرج الى الخندق برمزه ولم يكن اتخاذ الخندق من شان العرب ولكنه من مكائد الفرس اشاربذلک سلمان الفارسی قال يا رسول كنا بفارس اذا حوصرنا خندقنا علينا فامر بحفره و عمل فيه نبقستر غيبا للمسلمين اھ.

قصہ تابیر میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد انتم اعلم با مور دنیا کم ایسے ہی تجارب پر محمول ہے اور راز اس کا یہ ہے کہ ایسے تجارب و تدبیر اپنی ذات میں دنیوی امور ہیں گو مباح ہوں عارض سے دین ہو جاتے ہیں اس لئے ان کا نہ جاننا کسی درجہ میں کمال مقصود میں قادح نہیں۔

ولنختم المقالة على دعاء الوقاية عن الضلالة فی كل حالة .

۱۴؍ربیع الثانی ۱۳۵۹ء

تنبیہ ضروری:

مضمون بالا میں جو بعض حالات میں علماء کو سیاست میں حصہ لینے کا مشورہ دیا گیا ہے اس سے مراد وہ صورت نہ سمجھی جاوے جو اس وقت بعض علماء نے اختیار کی ہے اس سے دین کو کوئی فائدہ نہیں بلکہ اصولِ شرعیہ و تجربہ سے اس کا بھی ایک خاص طریق ہے جس کے نافع ہونے کی امید غالب قریب بہ یقین ہے اور وہ خاص طریق ایک عزیز کی تحریر میں نظر پڑا مفید سمجھ کر اس کو بالفاظہٖ نقل کرتا ہوں۔ یکم رجب ۱۳۵۹ھ۔

بعد الحمد والصلوٰۃ اس پر بھی نظر ضروری ہے کہ زمانہ موجودہ میں ہندوستان میں جو سیاست جاری ہے اور بعض علماء اس میں بحیثیت لیڈر کے حصہ لے رہے ہیں یہ کہاں تک صحیح ہے۔ سو ہندوستان میں موجودہ سیاست کا حاصل یہ ہے کہ گورنمنٹ کے قانون کے ماتحت رہ کر اپنے حقوق کی حفاظت کی جاوے کیونکہ ہندوستانی ابھی اپنے اندر اتنی طاقت نہیں پاتے کہ انگریزوں کے چلے جانے کے بعد وہ اپنی حفاظت بیرونی حملوں سے کر سکیں اسی لئے سب سیاسی جماعتیں زبان سے آزادی کامل کا مطالبہ کرتی مگر عمل کے وقت معلوم ہوتا ہے کہ سب زیرِ سایہ برطانیہ آزادی کا مطالبہ کرتے ہیں۔ لہٰذا موجودہ سیاست کے لئے ضروری ہوا کہ گورنمنٹ کے تمام قوانین پر بھی عبور ہو اور انگریزوں کی طبیعت اور مزاج سے بھی پوری واقفیت ہو اور یہ بات پیدا ہوتی ہے ان میں گھل مل کر رہنے سے اور ظاہر ہے کہ علماء ان سب باتوں سے ناواقف ہیں تو یہ اگر سیاست میں بحیثیت لیڈر کام کریں گے تو ان کی ناواقفی کے سبب مسلمان کو بجائے نفع کے نقصان پہنچے گا۔ پھر تجربہ اس پر بھی شاہد ہے کہ عام سیاسی لیڈر مصالحِ ملکی کو دین پر مقدم رکھتے ہیں۔ اور جب مصلحت اور مذہب میں تعارض ہوتا ہے تو مذہب میں بعید سے بعید تاویل کرنے میں دریغ نہیں کرتے چنانچہ علماءِ مذکورین بھی اس میں مبتلاء ہو رہے ہیں اور ان کی تاویل چونکہ برنگ دین ہوتی ہے اس لئے

وہ عام مسلمانوں کو زیادہ غلطی میں مبتلاء کرتی ہے۔ لہٰذا اس وقت طریق کار یہ مفید ہوسکتا ہے کہ سیاسی جماعت علیحدہ ہو اور مذہبی علیحدہ اور مذہبی جماعت اپنا اصلی کام تبلیغ کا اس طرح انجام دے کر مسلمانوں کی سیاسی جماعت کی نگرانی کرے کہ یہ سیاسی جماعت مسلمانوں کے حقوق کا گورنمنٹ سے مطالبہ کرتے وقت شریعت کے خلاف عمل نہ کر بیٹھے اور چونکہ موجودہ زمانہ میں سیاسی جماعت مذہبی جماعت سے پوچھ کر عمل کرنے کی عادی نہیں رہی اس لئے علماء کے ذمہ تھا کہ خود اس جماعت کے پاس پہنچتے اور احسن طریق سے تبلیغ کرتے ہیں مگر افسوس بجائے اس کے یہ ہو رہا ہے کہ علماء مسلمانوں کی مخالف جماعت میں داخل ہو کر مسلمان جماعت کے لیڈروں کا مقابلہ کرتے ہیں جس سے ان لیڈروں کو بھی علماء کا مقابلہ کرنے کی جرأت ہوتی ہے اگر علماء اپنا اصلی کام تبلیغ ہی رکھتے اور اصل سیاست یہی تھی کہ مسلمانوں کو سچا مسلمان بنا دیا جاوے تو آج جس وقار اور عظمت کے کھونے کی علماء شکایت فرماتے ہیں اس عظمت اور وقار میں چار چاند لگ جاتے اور ثواب آخرت تبلیغ کا اور حفاظت دین کا مزید براں۔ لہٰذا اس زمانہ میں موجودہ طریقہ پر علماء کا سیاسی لیڈری کی حیثیت سے سیاست میں شریک ہونا میرے نزدیک سخت مضر ہو رہا ہے جیسا عرض کیا گیا کہ اس طرز میں لیڈروں کو مقابلہ کا موقع دینے سے علماء کی وقعت اور عظمت مسلمانوں کے دلوں سے نکلی جا رہی ہے جو مسلمانوں کے دین کو ہمیشہ کے لئے مضر ہو رہی ہے اور اگر یہ حضرات تبلیغ فرما کر لیڈروں کو سنبھالتے تو اس طرز میں شرعی طریقہ پر ہندوستان میں مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت بھی ہوتی اور علماء کی عظمت بھی بڑھتی اور ہم خرما و ہم ثواب کا مصداق ہوتا۔

اللّٰهم ارنا الحق حقا وارزقنا اتباعه وأرِنا الباطل باطلا وارزقنا اجتنابه.

تم التنبيه و هو كضمية رسالة دفع بعض الشبهات

اضافہ [1] بر رسالہ رفع الشبہات عن السیاسیات

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فصل سی و ششم:

متعلق بعض مقامات رسالہ دفع بعض الشبہات عن السیاسیات (میرا یہ رسالہ الفرقان بریلی بابت ماہ ربیع الثانی ۱۳۵۹ھ میں مع شرح بعض مقامات کے شائع ہوا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ میرے رسالہ میں ایک احتمال کا حکم صراحۃً ذکر کرنے سے رہ گیا۔ چونکہ وہ شرح میرے اعتقاد کے موافق ہے اس لئے میں اس کو ملخصاً رسالہ میں اب بڑھائے دیتا ہوں۔ اور اس کے ساتھ بعض معاشی نظائر بھی لکھے دیتا ہوں۔ اور شائقین بسط الفرقان میں ملاحظہ فرمائیں اور اضافہ کا موقع رسالہ کے اس عبارت کے بعد ہے۔ یہ معنی ہیں دونوں جماعتوں سے کام لینے کے اور دونوں جماعتوں کے بالاتفاق کام کرنے کے۔ وہ اضافہ یہ ہے۔

البتہ اگر کسی وقت کوئی جماعت اہل سیاست کی ایسی نہ ہو کہ علماء سے احکام پوچھ کر عمل کیا کرے جیسا اس وقت غالب ہے تو اس وقت علماء ایسی جماعت کے پیدا ہونے کے منتظر نہ رہیں ورنہ محبانِ دنیا دینی مقاصد کو تباہ کر دیں گے بلکہ وہ خود اپنے میں سے ایسی جماعت بنا دیں جو علماً و عملاً سیاست و شریعت کے جامع ہوں مگر یہ حکم کچھ سیاست مدینہ کے ساتھ خاص نہیں بلکہ سیاستِ بدنیہ یعنی طب بلکہ اسبابِ معاش میں سے جتنے فرض کفایہ ہیں

---

[1] ......منقول از ترجیح الراجح شائع شدہ در رسالہ النور ماہ صفر ۱۳۶۰ھ

مثل تجارت وزراعت سب کا یہی حکم ہوگا۔ البتہ جس چیز کا ضرر دین میں قریب ہو اس میں دخل اصلاحی کا وجوب ایسی چیز میں دخل اصلاحی کے وجوب سے اقویٰ واکد ہوگا جس کا ضرر دین میں قریب نہ ہو۔ اور ان سب مقاصد کی اصلاح کے لئے خصوص حفاظتِ دین کے لئے جماعت کا انتظام کرنا ہر حال میں مشروط ہوگا استطاعت کے ساتھ۔ یہ تو ایک تحقیقِ کلی ہے اس سے آگے کچھ جزئیات ہیں جن میں کلام کچھ متفق علیہ کچھ مختلف فیہ اپنے محل میں مبسوط و مضبوط ہے ان میں ایک مسئلہ استطاعت کا بھی ہے۔ یہ اضافہ ختم ہوا۔ آگے عبارت سابقہ بعینہا باقی ہے۔ اور یہ مسئلہ الیٰ آخر الرسالہ۔

ملفوظ بمقام لکھنؤ ۱۵ ستمبر ۱۹۳۸ء

ایک تذکرہ پر فرمایا۔ میں نے جو اعلان شائع کیا ہے اس میں مسلم لیگ کی حمایت کی ہے مگر صاف طور پر لکھ دیا ہے کہ کانگریس اور مسلم لیگ دونوں جماعتیں قابل اصلاح بلکہ واجب الاصلاح ہیں۔ ہاں مسلم لیگ نسبۃً کانگریس سے اچھی اور بہت اچھی ہے۔ لہٰذا اس میں اصلاح اور درستی کی نیت سے شریک ہونا چاہئے۔ میں کانگریس کو اندھے کے مشابہ سمجھتا ہوں اور مسلم لیگ کو کانے کے مشابہ۔ اور ظاہر ہے کہ اندھے پر کانے کو ترجیح ہوگی۔ مثلاً اگر کسی کو نوکر رکھنے کی ضرورت ہو اور اتفاقاً دو نوکر ملیں ایک اندھا ایک کانا اب فرمایئے وہ کس کو نوکر رکھے گا اندھے کو یا کانے کو یقیناً کانے ہی کو ملازم رکھے گا بس اسی بناء پر میں مسلم لیگ کا حامی ہوں جس زمانہ میں کانگریس مسلم لیگ سے مفاہمت کی گفتگو کر رہی تھی میں نے ایک خط مسلم لیگ کے صدر مسٹر محمد علی جناح کو اس مضمون کا لکھا تھا کہ مفاہمت میں چونکہ مسلمانوں کے امورِ دینیہ کی حفاظت نہایت اہم اور بہت ضروری ہے اس لئے شرعیات میں آپ اپنی رائے کا بالکل دخل نہ دیں بلکہ علمائے محققین سے پوچھ کر عمل فرمائیں۔ انہوں نے نہایت شرافت وتہذیب سے جواب لکھا اور اطمینان دلایا کہ اسی

ہدایت کے مطابق عمل کیا جاوے گا۔

مجلس دعوۃ الحق

بعد الحمد والصلوٰۃ یہ مخلصین کی ایک جماعت ہے جس کے انعقاد کا داعیہ ہندوستان کی فضاء دیکھ کر مسلمانوں کی فلاحِ دین و دنیوی کی غرض سے بعض اہل اللہ کے قلوب میں پیدا ہوا ہے اس کے مقاصد حسب ذیل ہیں۔

(الف) تنظیم المسلمین و تعلیم المسلمین میں عوام و خواص کو تنظیم و تبلیغ کی ہدایت کی گئی ہے اس کے لئے ایک مرکز قائم کرنا (جس کا محل ابھی زیر غور ہے) اور تنظیم و تبلیغ کو وسیع پیمانہ پر ہندوستان میں پھیلانا۔

(ب) مسلم لیگ کے لیڈروں کو دینداری کی طرف متوجہ کرنا۔ کیونکہ مسلم لیگ کو اس وقت مسلمانوں میں بڑی حد تک مرکزی شان حاصل ہے اس کے لیڈروں کی اصلاح سے بہت کچھ عوام کی اصلاح متوقع ہے۔

(ج) مسلم لیگ کی مجلسِ عاملہ کے ارکان کے پاس ان کے جلسوں میں یا خاص اوقات میں چند مخلصین کا وفد بھیجتے رہنا جو یہ بات اُن کے ذہن نشین کر دے کہ مسلمانوں کو ہمیشہ اتباعِ احکامِ آلٰہیہ سے ہی کامیابی اور ترقی حاصل ہوئی ہے۔ محض اسباب ظاہرہ یا دیگر اقوام جیسا مظاہرہ مسلمانوں کے لئے ہرگز کافی نہیں۔

(د) مسلم لیگ کی مجلسِ عاملہ کو شعائرِ اسلامیہ کی پابندی کی تبلیغ کرنا اور اُن سے درخواست کرنا مسلم لیگ کے ہر ممبر پر قانونی طور سے شعائرِ اسلامیہ کی پابندی کو لازم کیا جائے کہ اس پر کامیابی موقوف ہے اور قلب اہلِ اسلام کا انجذاب بھی اسی سے ہوگا جو تنظیم کی بنیاد ہے۔

تصدیق:

مجھے اس مجلس کے اصول و مقاصد سے کامل دلچسپی و اتفاق ہے بلکہ میرا دل چاہتا ہے کہ اس کام کو جلد از جلد کیا جائے میں نے بھی اس مجلس کے ایک حصہ کا یعنی دس روپیہ ماہوار کا وعدہ کیا ہے اور اس کی کامیابی کے لئے دل سے دُعاء بھی کرتا ہوں والسلام۔

احقر اشرف علی تھانوی عفی عنہ

بقلم خود ۱۸؍رمضان ۱۳۵۷ھ

مسلم لیگ کے دعوتی خط پر

حضرت حکیم الامتؒ کا جواب

(منقول از خاتمۃ السوانح)

وفات سے صرف تین ماہ قبل بھی جبکہ ضعف و مرض کی کافی شدت تھی مسلم لیگ کی پوری پوری رہبری فرما گئے اور بالکل اسلامی نظریہ کے مطابق اس کی صورت یہ ہوئی کہ آل انڈیا مسلم لیگ کا گزشتہ سالانہ اجلاس جو ۲۳/اپریل ۴۳ء بمقام دہلی نہایت اعلیٰ پیمانہ پر منعقد ہوا تھا اس کی اطلاع دے کر ارکانِ مسلم لیگ نے بایں الفاظ دعوت شرکت دی تھی کہ آپ سے استدعاء ہے کہ اس موقع پر خود دہلی تشریف لا کر اپنے ارشادات سے مجلس کو ہدایت دیں تو بہت بہتر ہو۔ لیکن اگر حضور تشریف نہ لا سکیں تو اپنے نمائندہ کو بھیج کر مشکور فرمائیں اور دعاء فرمائیں کہ اللہ پاک اس اجتماع کے رعب سے غیر مسلمان کے دلوں کو مسحور کر دے اور ہمارا مطالبہ پاکستان منوا دے تا کہ سلطنت اسلامی قائم ہو سکے۔

اس کے جواب میں حضرت اقدس نے بطور پیغام کے ذیل کا ہدایت نامہ ارقام فرمایا۔

جواب:

از ناکارہ آوارہ، ننگ انام اشرف برائے نام بخدمت ارکان مسلم لیگ نصر ہم اللہ و نضر ہم اللہ۔

السلام علیکم۔ لیگ کے عزائم معلوم کر کے اس آیت پر عمل کی توفیق ہوئی:

قل بفضل اللّٰہ و برحمتہٖ فبذٰلک فلیفرحوا۔

لیکن اگر اس کے ساتھ ہی عذر نہ ہوتا تو اس آیت پر بھی عمل ہوتا انفروا خفافا و ثقالا ۔ لیکن عذر کے سبب اس رخصت پر عمل کی اجازت مل گئی۔

لیس علی الضعفاء ولا علی المرضی ولا علی الذین لایجدون ما ینفقون حرج اذا نصحوا للّٰہ ورسولہ.

لیکن اس کے ساتھ ہی اس آیت کا شرف حاصل ہوگیا کہ اپنی دو کتابوں کا پتہ دیتا ہوں جو انشاء اللہ تعالیٰ قیامت تک آنے والی نسلوں کے لئے پیامِ عمل ہے۔ ایک حیات المسلمین شخصی اصلاح کے لئے۔ دوسری صیانۃ المسلمین جمہوری نظام کے لئے ان کے مضامین اپنے موضوع میں گو رنگین نہیں مگر سنگین ہیں جس میں وہی فرق ہے جو ذوق و غالب کے اشعار میں اور حکیم محمود خاں اور حکیم محمد صادق خاں کے نسخوں میں۔ اور نمائندہ وہ کام نہ کر سکتا جو یہ کتابیں کر سکتی ہیں مگر عمل شرط ہے جیسے اعلیٰ درجہ کا ماء اللحم بوتلوں میں بھرا ہوا قیمتی ہے مگر نتیجہ خیز نہیں یہ نفع اس کا اس وقت ظاہر ہوگا جب حلق سے اُترے گا۔ ورنہ بدون عمل یہ سب کوشش اس کا مصداق ہوگی نشستند و گفتند و برخاستند باقی دُعاء ہر حال میں خصوص ان تاریخوں میں زیادہ اہتمام سے جاری رکھوں گا۔ بقول کسی شاعر کے۔

لا خیل عندک تھدیھا و لا مال

فلیسعد النطق ان لم یسعد الحال

نوٹ:...... میں دونوں کتابیں اگر یہاں مل گئیں تو ۲۲ر اپریل کو ڈاک سے ہدیۃً روانہ کروں گا ورنہ دہلی میں کسی کتب خانہ تجارتی سے تلاش کی جائیں۔ والسلام

بعد تحقیق معلوم ہوا کہ حیاۃ المسلمین بلا قیمت جا سکتی ہے سو اس کا نسخہ روانہ کر رہا ہوں۔ نیز یہ معلوم ہوا کہ صیانۃ المسلمین یہاں نہیں ہے۔ لہٰذا وہاں تلاش کرالی جائے۔ اھ۔

احقر اشرف علی

تھانہ بھون۔ ربیع الثانی ۱۳۶۲ھ

شریعت اسلامیہ

میں غیر مسلموں کے ساتھ معاملات

تاریخ تالیف ——— ۲۸/ذی الحجہ ۱۳۵۰ھ (مطابق ۱۹۳۱ء)

مقامِ تالیف ——— دارالعلوم دیوبند

غیر مسلموں کے ساتھ معاملات کے حدود و قیود کیا ہیں؟ اور اس سلسلہ میں مسلمانوں میں کیا کیا کوتاہیاں پائی جاتی ہیں؟ اس موضوع کی شرعی حیثیت پر حضرت مفتی صاحب مدظلہم نے آج سے چالیس سال پہلے یہ رسالہ تحریر فرمایا تھا، اُس وقت متحدہ ہندوستان میں مسلمانوں کا ہندوؤں سے اکثر سابقہ پڑتا رہتا تھا اور ان معاملات میں بہت بے اعتدالیاں ہوتی تھیں، حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس رسالہ میں کفار کے ساتھ معاملات میں اعتدال کا راستہ واضح فرمادیا ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ و کفیٰ و سلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ

امابعد! اصل مقصد سے پہلے یہ بتلا دینا ضروری ہے کہ دنیا کے تمام موجودہ مذاہب میں صرف اسلام ہی کو حق تعالیٰ نے یہ امتیازی شان عطا فرمائی ہے کہ اس کی ہر بات معتدل ہے، نہ اس میں عام مذاہب کی طرح تعصب سکھایا گیا ہے، کہ حق بات ہو یا ناحق، اپنی قوم ہی کی حمایت کی جائے، جیسا کہ بہت سی اقوام کا دستور العمل ہے، نہ اس میں چھوت چھات کی لغو تعلیم ہے کہ اپنے سواء دوسری قوموں سے ایسا برتاؤ کیا جائے، جو عام جانوروں کے ساتھ بھی کوئی شریف الطبع انسان گوارا نہیں کرسکتا جیسا کہ ہندوؤں کا مذہب ہے اسی طرح اتنی آزادی اور بے قیدی بھی نہیں کہ مذہب، مذہب ہی نہ رہے، نہ اس کی کچھ حدود و قیود ہوں، اور نہ حلال و حرام کی کوئی تفصیل ہو، نہ کفر و اسلام اور مسلم و غیر مسلم کا کوئی امتیاز رہے۔

بلکہ اسلام کی شریعت کو حق تعالیٰ نے ایک ایسا معتدل قانون بنایا ہے جس میں ہر چیز کا پورا انتظام ہے، عقائد و عبادات اور معاشرت و معاملات کے ہر پیش آنے والی صورت کے لئے حدود مقرر ہیں، جن سے تجاوز ممنوع ہے، شفقت و رحمت اور حسنِ معاشرت و حسن اخلاق کا برتاؤ اسلام میں اتنا عام ہے کہ اپنی قوم اور ہم مذہب مسلمانوں سے گزر کر عام کفار کے ساتھ بھی یہی معمول ہے بلکہ ان سے بھی آگے تمام جانداروں کے ساتھ حسن معاملہ کی سخت تاکید ہے۔

حدیث میں ہے :

فی کل ذات کبدٍ رطبة اجر

یعنی ہر جاندار کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنے میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے اجر ہے،

اور بخاری کی صحیح حدیث میں مذکور ہے کہ ایک شخص کی مغفرت حق تعالیٰ نے صرف اس بنا پر کر دی، کہ اس نے پیاسے کتے کو پانی پلایا تھا، شریعت نے اس کو جائز نہیں رکھا کہ کسی معاہد کافر کو "اے کافر" کہہ کر خطاب کیا جائے، جس سے اس کو تکلیف ہو۔

لو قال لیھودی او مجوسی یا کافر یأثم ان شق علیه کذا فی القنیة (عالمگیری ص:۳۵۹، ج:۵) اگر کسی مسلمان نے یہودی یا مجوسی کو یا کافر کہہ کر خطاب کیا اور اس کو ناگوار ہوا تو گنہ گار ہوگا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے معاملات جو اپنے مخالفین کے ساتھ رہے ہیں، وہ اس کے لئے شاہد عدل ہیں، عین اس وقت جب کہ کفار مکہ نے سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہر طرح پریشان کر کے حرم مکہ اور وطن مالوف سے نکلنے اور ہجرت کرنے پر مجبور کر دیا تھا، اور آپ مدینہ طیبہ میں رونق افروز ہو چکے تھے، ان کی بداعمالیوں کی نحوست اس صورت میں ظاہر ہوئی کہ مکہ معظمہ میں سخت قحط پڑا، قریش مکہ اور عام باشندے بھوکوں مرنے لگے، رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی اطلاع ہوئی، تو پانسو دینار کفار قریش کے سردار ابوسفیان اور صفوان بن امیہ کے پاس فقراء مکہ میں تقسیم کرنے کے لئے بھیج دیئے، سیر کبیر میں امام محمدؒ نے اس موضوع پر ایک مستقل باب رکھا ہے جس میں بہت سے واقعات اس قسم کے تحریر فرمائے ہیں، یہ واقعہ بھی اس میں مذکور ہے۔

(شرح سیر کبیر ص:۶۹، ج:۱)

یہ موقع اس کا نہیں کہ اس قسم کے واقعات کا استیعاب کیا جائے، نمونۂ چند

باتیں عرض کی گئیں، جن سے یہ معلوم ہوگیا کہ اسلام نے غیر مسلموں کے ساتھ شفقت و رحمت اور رواداری اور ایثار کی جو تعلیم دی ہے، وہ دنیا کے موجودہ مذاہب میں صرف اسی کا طرہ امتیاز ہے۔

لیکن اس کے ساتھ اس معتدل قانون اور شریعتِ حقہ نے یہ بھی جائز نہیں رکھا کہ خدا تعالیٰ کے دوست اور دشمن، مسلم و کافر سب ایک پلہ میں تولے جائیں، اسلام و کفر کا کوئی امتیاز نہ رہے، بلکہ مؤمن کامل کی یہ علامت قرار دی، کہ اس کی محبت و عداوت خداوند عالم کی محبت و عداوت کے تابع ہو، جس کو خدا تعالیٰ محبوب رکھتا ہے، وہ اسکے نزدیک بھی محبوب ہو، اور جس کو خداوند عالم مبغوض رکھتا ہے، اس سے اس کو بھی بغض ہو، اس کا اعلان حضرت ابراہیم علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کی زبان پر اس طرح فرمایا گیا ہے:

کفرنا بکم و بدا بیننا و بینکم العداوۃ و البغضاء ابداً حتی تؤمنوا باللہ وحدہٗ.

ہم منکر ہوئے تم سے اور کھل پڑی ہم میں اور تم میں دشمنی اور بیر ہمیشہ کو یہاں تک کہ تم یقین لاؤ اللہ اکیلے پر۔

حدیث میں ہے:

من احب للّٰہ و ابغض للّٰہ و اعطیٰ للّٰہ و منع للّٰہ فقد استکمل الایمان.

جس نے اللہ کے لئے محبت رکھی، اور اللہ ہی کے لئے دشمنی، اللہ کے لئے دیا، اور اللہ ہی کے لئے دینے سے رک گیا، اس نے اپنا ایمان کامل کرالیا۔ (رواہ ابوداؤد وترمذی بحوالہ مشکوٰۃ)

اور اسی بغض کے اظہار کے لئے کفار کے ساتھ ان کی وضع قطع اور صورت

وسیرت خاصہ میں مشابہت پیدا کرنے کو شریعت نے ناجائز قرار دیا ہے۔

حدیث میں ہے:

من تشبہ بقوم فھو منھم (اخرجہ السخاوی فی المقاصد الحسنہ و حسنہ)

جس نے کسی قوم کی مشابہت اختیار کرلی، وہ اسی قوم میں سے سمجھا جائے گا۔

نیز کفار کے ساتھ بلاضرورت اختلاط اور معاملات کی شرکت کو بھی منع کیا گیا ہے۔ قال اللہ تعالیٰ:

و لا ترکنوا الیٰ الذین ظلموا فتمسکم النار

اور مت جھکو ان کی طرف جو ظالم ہیں، پھر تم کو بھی لگے گی آگ۔

اور اس کو پسند کیا گیا ہے کہ کفار و فجار سے اظہار کراہت و ناراضی کیا جاوے فتاویٰ عالمگیری میں ہے:

و یلقی الکافر و المبتدع بوجہ مکفھر و تکرہ المصافحۃ مع الذمی الخ

کافر اور مبتدع سے ناگواری کے ساتھ ملے اور ذمی کے ساتھ مصافحہ مکروہ ہے۔ (کتاب الکراہیۃ عالمگیری باب ۱۴، ج:۵، ص:۳۶۰)

معاملات کفار میں تعلیمات اسلام کا خلاصہ

الغرض شریعت اسلام کے معتدل قانون نے کفار و غیر مسلم لوگوں کے ساتھ نہ تو ایسا چھوت چھات کا برتاؤ روا رکھا جیسا ہندوؤں میں ہے کہ جس کو کوئی عقل مند شریف الطبع انسان کسی دوسرے انسان کے لئے پسند نہیں کرسکتا، اور نہ ایسا خلط ملط اور بے

ضرورت اشتراک معاملات کو پسند کیا، جس سے برادرانہ تعلقات کا اظہار ہو، اور خداوند عالم کے نافرمان دشمنوں کا کوئی فرق اس کے فرمانبردار بندوں سے باقی نہ رہے، اسی بنا پر شریعت نے غیر مسلموں کے ساتھ خرید و فروخت اور معاملات کو اصل سے جائز رکھا ہے، ان کے ہاتھوں اور برتنوں اور کپڑوں پر جب تک کسی نجاست کا تیقن یا ظن غالب نہ ہو جائے، اس وقت تک طہارت ہی کا حکم دیا ہے، لیکن ساتھ ہی بلاضرورت شدیدہ اس کو پسند نہیں کیا گیا۔ عالمگیری میں ہے:

۱ ...... لا بأس بان يكون بين المسلم و الذمى معاملة اذا كان مما لا بد منه. كذا فى السراجية

(عالمگیری کتاب الکراہیۃ باب: ۱۴، ج: ۵، ص: ۳۵۹۔ مصری)

مسلمان اور ذمی (کافر) کے درمیان کوئی معاملہ ہو اس میں کوئی حرج نہیں جبکہ ایسا کرنا ضروری ہو، دوسری کوئی صورت نہ ہو۔

نیز عالمگیری باب مذکور میں ہے:

۲ ...... يكره الاكل و الشرب فى اوانى المشركين و مع هذا لو اكل او شرب فيها قبل الغسل جاز، و لايكون آكلاً و لا شارباً حراماً و هذا اذا لم يعلم بنجاسة الاوانى فاما اذا علم فانه لا يجوز ان يشرب و ياكل منها قبل الغسل. (عالمگیری ص: ۳۵۸، ج: ۵)

کفار کے برتنوں میں ان کو دھونے سے پہلے کھانا پینا مکروہ ہے، لیکن دھونے سے پہلے اگر ان میں کھا پی لیا، تو جائز ہے، اس صورت میں حرام کھانے والا اور حرام پینے والا نہ ہوگا، لیکن یہ جب ہے جب کہ ان برتنوں کی ناپاکی کا علم نہ ہو اور اگر اس کا علم ہو، تو دھونے سے پہلے ان میں کھانا پینا جائز نہیں۔

اور بدائع الصنائع کتاب السیر میں ہے:

۳...... ولا بأس بحمل الثياب و المتاع و نحو ذالک اليهم (اهل الحرب) لانعدام معنى الامداد و الاعانة و علىٰ ذالک جرت العادة من تجار الامصار انهم يدخلون دار الحرب للتجارة من غير ظهور الرد و الانكار عليهم الا ان الترک افضل لانهم يستخفون بالمسلمين و يدعونهم الىٰ ما هم عليه فكان الكف و الامساک عن الدخول من باب صيانة النفس عن الهوان و الدين عن الزوال .

(بدائع کتاب السیر ص: ۱۰۲، ج:۷)

اس میں کوئی حرج نہیں ہے کہ کپڑے اور سامان دارالحرب برآمد کیا جائے، اس میں کفار کی امداد اور اعانت (جو شرعاً ممنوع ہے) لازم نہیں آتی، اس لئے کہ مسلمان تجار کی یہ عادت شروع سے جاری ہے کہ وہ تجارت کے لئے دارالحرب جاتے ہیں، اور اس سلسلہ میں ان پر کوئی رد اور نکیر منقول نہیں ہے، لیکن ایسی تجارت نہ کرنا افضل ہے، اس لئے کہ دارالحرب کے کفار مسلمانوں کو کمتر سمجھتے ہیں، اور انھیں اپنے طور طریقوں کی ترغیب دیتے ہیں، اس لئے دارالحرب نہ جانا، اپنے آپ کو بھی ذلت سے بچانا ہے، اور اس میں اپنے دین کی حفاظت بھی ہے۔

عالمگیری میں ہے:

۴...... الاكل مع المجوسى و مع غيره من اهل المشركين هل يحل ام لا و حكى عن الحاكم الامام عبد

الرحمن الكاتب انه ان ابتلى به المسلم مرة او مرتين فلا بأس به و اما الدوام عليه فيكره.

(کذا فی المحیط ص:۳۵۹،ج:۵)

مجوسی یا دوسرے مشرکین کے ساتھ کھانا پینا حرام ہے یا نہیں؟ حاکم عبدالرحمٰن الکاتب سے منقول ہے کہ اگر مسلمان ایک دو دفعہ اس میں مبتلا ہو جائے، تو اس میں کوئی حرج نہیں، لیکن اس پر مداومت مکروہ ہے۔

اور شرح سیر کبیر میں امام محمدؒ سے منقول ہے:

۵...... لا بأس بان يوكل و يشرب في آنية المشركين و لكن يغسل ذالك قبل ان يؤكل فيها، لان الاواني لايلحقها نجاسة الكفر (الى قوله) الا ان المشركين لاينعمون غسل الاواني فينبغي للمسلمين ان يعيدوا الغسل ولايأتمن المشرك على ذالك (الى قوله لما روى عن ابى ثعلبة الخشنيؓ انه قال يا رسول الله انا نأتي ارض المشركين افناكل في آنيتهم قال فان لم تجدوا منها بدا فاغسلوها ثم كلوا فيها.

(شرح سیر کبیر ج:۱،ص:۹۹)

مشرکین کے برتنوں میں سے کھانے پینے میں کوئی حرج نہیں، لیکن استعمال کرنے سے پہلے یہ برتن دھو لئے جائیں، (جائز اس لئے ہے کہ) چونکہ برتنوں میں کفر کی نجاست سرایت نہیں کرتی، لیکن چونکہ مشرکین اچھی طرح برتن نہیں دھوتے اس لئے مسلمانوں کیلئے مناسب یہ ہے کہ ان برتنوں کو دوبارہ دھو لیا جائے، اور اس میں مشرکین پر اعتماد نہ کیا جائے۔۔۔۔۔اس باب میں حضرت ابو ثعلبہ خشنیؓ سے ایک حدیث بھی

مروی ہے، آپ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا اے اللہ کے رسول! ہم مشرکین کی سرزمین میں جاتے ہیں کیا ہم ان کے برتنوں میں کھانا کھا سکتے ہیں؟ آپؐ نے فرمایا اگر اس کے علاوہ کوئی چارہ نہ ہو، تو پہلے ان کو دھوڈالو، پھر ان میں کھاؤ (پیو)

نیز سیر کبیر میں مشرکین و کفار کے ہدایا قبول کرنے کے متعلق روایات مختلفہ حدیث کی نقل کرنے کے بعد یہ فیصلہ کیا ہے:

۶...... فبهذا تبين ان للاميـر رأياً في قبول ذالك لأن في القبول معنى التاليف و في الرد اظهار الغلظة و العداوة.

ماقبل کی اس تفصیل سے ثابت ہوا کہ اس بارہ میں امام اپنی صوابدید کے مطابق عمل کرے، (اس لئے کہ قبول ورد دونوں کے حق میں شرعی وجوہ موجود ہیں) قبول کرنے میں ان کو اپنے ساتھ جوڑنا ہے، اور لوٹانے دینے میں ان پر درشتی اور سختی کا اظہار کر دینا ہے۔

جس سے معلوم ہوا کہ معاملات کفار میں اگر تالیف کی نیت یا اس کا وجود محتمل نہ ہو، تو پھر بجز حالتِ اضطرار کے اظہار عداوت وغلظت ہی دستور العمل ہونا چاہئے۔

عبارات مذکورہ بالا سے ثابت ہوا کہ اصل مذہب اور تعلیم شریعت، معاملات کفار و مشرکین کے بارہ میں یہ ہے کہ بوقت ضرورت ان کے ساتھ معاملات خرید و فروخت، شرکت، ملازمت، اور تجارت جائز ہیں، اور ان کے ہاتھوں اور برتنوں کی چیزوں کا کھانا بھی بوقت ضرورت جائز ہے۔

لیکن عبارات مذکورہ ہی سے اس جواز کے لئے چند شرائط مستفاد ہوتی ہیں کہ اگر وہ شرطیں پائی جائیں، تو یہ معاملات جائز بلا کراہت ہیں، ورنہ مکروہ و ناجائز۔

۱:...... بلا ضرورت مسلمانوں کو چھوڑ کر کفار و مشرکین کے ساتھ معاملات نہ کئے جائیں جیسا کہ عبارت عالمگیری نمبر ۱ سے ظاہر ہوا۔

۲:...... جب تک مسلمانوں کے ہاتھوں اور برتنوں کی چیزیں کھانے پینے کے لئے ملیں، اس وقت تک غیر مسلموں کے ہاتھوں اور برتنوں کی چیزیں استعمال نہ کی جائیں، جیسا کہ عبارت سیر کبیر نمبر ۵، اور عبارت عالمگیری نمبر ۲ سے ثابت ہوا، نیز حدیث ابی ثعلبہ خشنیؓ سے بروایت سیر کبیر ثابت ہوا۔

۳:...... کفار و مشرکین کے ساتھ اس طرح معاملات نہ کئے جائیں، جس سے مسلمانوں کی ذلت ظاہر ہو، جیسا کہ بدائع کی عبارت نمبر ۳ سے ثابت ہوا۔

اب جب کہ ہندوستان کی موجودہ حالت اور واقعات و معاملات پر نظر کی جاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ:

۱:...... مسلمانوں نے ان تمام شرائط سے قطع نظر کر کے اس میں ایسا توسع اختیار کر لیا ہے کہ جو ان کے لئے دین اور دنیا دونوں میں مضر ثابت ہو رہا ہے، بلکہ بلا کسی ضرورت کے مسلمانوں کی دکانیں چھوڑ کر کفار و مشرکین سے معاملات کئے جاتے ہیں، اور اس کو قطعاً برا نہیں سمجھتے۔

۲:...... عام کفار کے اور بالخصوص ہندوؤں کے برتنوں اور ہاتھوں کی پکی ہوئی چیزیں استعمال کرنے میں ذرا احتیاط نہیں کی جاتی، بغیر کسی ضرورت کے ان کا استعمال کیا جاتا ہے، حالانکہ یہ معلوم ہے کہ ہندوؤں کے مذہب میں بعض نجاسات صرف پاک ہی نہیں، بلکہ مطہر سمجھی جاتی ہیں۔ جیسے گائے کا پیشاب اور گوبر وغیرہ، علاوہ ازیں تجربہ و مشاہدہ سے ہمیشہ ثابت ہوتا رہتا ہے کہ ان کے یہاں نجاسات سے پرہیز کرنے کا ذرا اہتمام نہیں، اسی طرح دوسرے طوائف کفار میں جو صفائی کا کچھ اہتمام بھی کرتے ہیں، مگر نجاست و طہارت ان کے یہاں

کوئی چیز نہیں۔

۳:...... ہندؤں کا طرز عمل بوقت معاملات جو کچھ مسلمانوں کے ساتھ ہوتا ہے وہ ایک مستقل ایسی چیز ہے کہ اگر شرعاً یہ معاملہ جائز بھی ہو، جب بھی کوئی شریف الطبع انسان اس کو گوارا نہیں کر سکتا کہ کتوں سے زیادہ ان کو نجس اور منجس سمجھتے ہیں، کتے ان کے برتنوں کو چاٹتے رہتے ہیں پرواہ نہیں کی جاتی اور مسلمان کا اگر سایہ بھی ان کے برتنوں پر پڑ جاتا ہے تو گھبرا اٹھتے ہیں، ان کے برتنوں کو ہاتھ لگانا تو بڑی چیز ہے، جس برتن کو مسلمان کا ہاتھ لگا ہو، اگر ہندو اس کو اپنا ہاتھ لگا دے، تو وہ اپنے کو نجس سمجھتا ہے، اور دھونا فرض سمجھتا ہے، اور یہ سب معاملات مسلمان اپنے سامنے دیکھتے ہیں، جو ایک بہت بڑی ذلت ہے، کاش مسلمان احساس کریں، قطع نظر جواز و عدم جواز سے شرافت و غیرت بھی کوئی چیز ہے۔
۔۔۔۔۔اور یہاں تو پہلے بحوالہ بدائع الصنائع نقل کر چکا ہوں، کہ شرعاً ایسا کوئی معاملہ کفار کے ساتھ اپنے اختیار سے جائز نہیں، جس میں مسلمانوں کی ذلت ہو، اور مسلمان کو کافر کے سامنے ذلت اختیار کرنا کیسے جائز ہو سکتا ہے، جب کہ شریعت نے بغیر اس مقابلہ کے بھی اپنے نفس کو ذلیل کرنا جائز نہیں رکھا۔ (۱)

حدیث میں ہے (**لاینبغی للمؤمن ان یذل نفسه**) ۔یعنی کسی مسلمان کے لئے جائز نہیں کہ اپنے آپ کو ذلیل کرے، اسی لئے فقہاء نے مسلمان کے لئے اس کو مکروہ فرمایا ہے کہ کافر کی ملازمت خدمت گاری پر کرے، جس میں اس کی ذلت ہو۔ کما فی خلاصہ الفتاویٰ من الاجارۃ۔ ص:۱۴۹، ج:۳۔

---

(۱)...... یہ رسالہ قیام پاکستان سے کافی عرصہ پہلے (آج کے) بھارت میں لکھا گیا تھا، اس لئے مضمون میں وہاں کے حالات کا بطور خاص ذکر ہے۔

المسلم اذا اجر نفسه من الكافر ليخدمه جاز و تكره قال الفضلى لايجوز فى الخدمة و ما فيه اذلال بخلاف الزراعة و السقى. انتهىٰ

مسلمان اگر کسی کافر کی ملازمت اس کی خدمت کے لئے کرے، تو یہ جائز لیکن مکروہ ہے، علامہ فضلی کہتے ہیں، کہ خدمت کے لئے ملازمت جس میں مسلمان کی ذلت ہو جائز نہیں ہے، البتہ زراعت اور کھیتی سیراب کرنے کے لئے ملازمت جائز ہے۔

اور مدخل ابن حاج میں اس موضوع پر ایک مستقل فصل رکھی گئی ہے۔

فصل : و يتعين ان لايشترى المسلم الدقيق من طواحين اهل الكتاب و لا يطحن عندهم لوجوه.

(احدها) ما تقدم من انه يعين اهل الكفر بذالك.

(الثانى) انه يترك اعانة اخوانه المسلمين.

(الثالث) ان اهل الكتاب يستعملون الصناع عندهم من المسلمين و فى ذالك ذلة للمسلم و عزة للكافر فيؤمر المسلم ان لايعمل عندهم و لايعينهم.

(الرابع) انهم لا يتحرزون من النجاسات و قد تقدم.

(الخامس) انهم يتدينون بغش المسلمين و قد تقدم ايضاً.

(السادس) انهم اذا شكروا سلعهم بالحسن و الجودة لايمكن الاطلاع على صدقهم بل الغالب عكسه بخلاف المسلمين فان الاسلام وازع و لتحسين الظن

بهم مجال.

(السابع) ما يفعله بعضهم من الصليب على باب الطاحون و في اركانها فينبغي للمؤمن ان ينزه حرمة الاسلام عن هذه الرذائل و اشكالها و قد استحكمت هذه الاشياء في هذا الزمان فصار عند اكثرهم لا فرق بين الشراء من المسلم و الكافر بل بعضهم يفضل معاملة اهل الكتاب على معاملة اخوانه المسلمين و يذكرون لذالك على زعمهم وجوهاً من الحجج لايقوم شئ منها على ساق و لاتقبل منهم لقيام الحجج الشرعية برد ذالك عليهم انتهى.

(مدخل ص:۴، ۱۷۴، ج:۴، مطبع مصطفیٰ البابی بمصر)

یہ لازم ہے کہ مسلمان اہل کتاب کی چکیوں سے آٹا نہ خریدے اور نہ ان کے ہاں پسوائے، اس کی متعدد وجوہات ہیں:

۱:...... اس طرح وہ اہل کتاب کا مددگار قرار پاتا ہے۔

۲:...... اس میں مسلمانوں کی اعانت سے احتراز بھی ہے۔

۳:...... اہل کتاب عام طور پر مسلمان کاریگر سے کام لیتے ہیں اس میں مسلمان کی توہین اور کافر کا اعزاز ہے، اس لئے مسلمان سے کہا جائے کہ وہ نہ ان کے ہاں کام کرے، اور نہ ان کی مدد کرے۔

۴:...... یہ لوگ عام طور پر ناپاکی سے بچاؤ نہیں کرتے۔

۵:...... اس بات کو دین سمجھتے ہیں کہ مسلمانوں کو دھوکہ دیا جائے۔

۶:...... اس لئے بھی کہ جب یہ لوگ اپنے سامان کی تعریف و خوبی بیان کرتے ہیں تو ان

کی سچائی کا گمان نہیں کیا جا سکتا بلکہ اس کے خلاف ہی کا گمان غالب ہے، اس کے برخلاف مسلمانوں کے حق میں ایسا اندیشہ نہیں کیا جا سکتا اس لئے کہ ان کا اسلام اس دھوکہ دہی سے مانع ہے اور ان کے حق میں حسن ظن کی گنجائش ہے۔

۷:......اس لئے بھی کہ بعض اہل کتاب چکی کے دروازہ پر اور اس کے گوشوں میں صلیب لٹکاتے ہیں، تو مسلمانوں کے لئے مناسب یہی ہے کہ اس قسم کے منکرات سے اسلام کی حرمت کو پاک رکھیں، اور یہ خرابیاں اس زمانہ میں اس قدر عام ہو گئیں کہ اکثر لوگ اب مسلمان اور کافر کے ساتھ معاملہ کرنے میں کوئی فرق محسوس نہیں کرتے، بلکہ بعض لوگ مسلمان بھائیوں کے مقابلہ میں اہل کتاب کے ساتھ معاملہ کرنے کو ترجیح دیتے ہیں، اور اس کے لئے اپنے زعم کے مطابق ایسی توجیہات و دلائل ذکر کرتے رہتے ہیں، جن میں سے کوئی بھی دلیل مضبوط بنیاد نہیں رکھتی اور شرعی دلائل کے مقابلہ ان کے ایسے دلائل کا قطعاً اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔

و فی اقتضاء الصراط المستقیم لابن تیمیةؒ و الموالاة و المودة و ان کانت متعلقة بالقلب لکن المخالفة فی الظاهر اعون علیٰ مقاطعة الکٰفرین و مباینتهم و مشارکتهم فی الظاهر ان لم تکن ذریعة او سبباً قریباً او بعیداً الیٰ نوع ما من الموالاة و المودة فلیس فیها مصلحة المقاطعة و المباینة مع انها تدعو الیٰ نوع ما من المواصلة کما توجبه الطبیعة و تدل علیه العادة ولهذا کان السلفؒ یستدلون بهذه الایات علی ترک الاستعانة بهم فی الولایات فروی الامام احمدؒ باسناد صحیح عن ابی موسیٰ قال قلت لعمرؓ ان لی کاتباً

نصرانیا قال مالک قاتلک اللّٰہ اما سمعت اللہ یقول ، یا ایھا الذین اٰمنوا لاتتخذوا الیھود و النصاریٰ اولیاء بعضھم اولیاء بعض. الا اتخذت حنیفاً قال قلت یا امیر المؤمنین لی کتابتہ و لہ دینہ قال لا اکرمھم اذ اھانھم اللّٰہ و لا اعزھم اذ اذلھم اللّٰہ تعالیٰ و لا ادنیھم اذ اقصاھم اللّٰہ . (اقتضاء ص: ۳۴ مطبوعہ مصر)

اور ابن تیمیہؒ کی کتاب اقتضاء الصراط المستقیم میں فرمایا کہ قلبی میل جول اور محبت (جو کفار کے ساتھ ممنوع ہے) کا تعلق اگرچہ قلب سے ہے لیکن ظاہری مخالفت کفار کے ساتھ قطع تعلق میں زیادہ مؤثر ہے، (اور یہ قطع تعلق مطلوب ہے) پھر ظاہری تعلق اگرچہ قلبی تعلق کا سبب قریب یا بعید نہ بن سکے، لیکن اس میں قطع تعلق کی مصلحت بھی حاصل نہیں ہوتی، بلکہ یہ ظاہری تعلق کچھ ربط اور میل ہی کی طرف مائل کرتا ہے، جیسا کہ انسانی طبیعت اور عادت کا تقاضا ہے، اسی لئے اسلاف ان آیات سے (جن میں کفار سے مودت و موالات کی ممانعت ہے) اس بات پر استدلال کرتے رہے ہیں کہ سلطنت و انتظام کے امور میں بھی ان سے مدد نہ لی جائے، جیسا کہ حضرت امام احمدؒ نے صحیح سند کے ساتھ حضرت ابو موسیٰؓ اشعری سے روایت کی ہے، وہ فرماتے ہیں میں نے حضرت عمرؓ سے ذکر کیا کہ میرا ایک نصرانی کاتب ہے، انھوں نے ناراضگی کا اظہار فرما کر کہا کہ کیا تم نے اللہ کا یہ فرمان نہیں سنا کہ ''اے ایمان والو! یہود و نصاریٰ کو اپنا دوست نہ بنایا کرو وہ آپس میں ایک دوسرے کے دوست ہیں۔'' تم نے کسی مسلمان کو کیوں نہ کاتب بنالیا؟ میں نے عرض کیا کہ مجھے اس کے لکھنے سے مطلب ہے، اور اس کا دین اسی کے لئے ہے انھوں نے فرمایا کہ جب اللہ نے ان کی اہانت کی ہے، تو میں ان کا اکرام نہیں کروں گا،

جب اللہ نے ان کو ذلیل کیا، تو میں ان کا اعزاز نہیں کروں گا، اور جب اللہ نے انھیں دور کر دیا ہے، تو میں ان کو قریب نہیں کروں گا۔

و ایضاً فی الاقتصاد ص: ۵۹ قد روی ابو الشیخ الاصبھانی فی شروط احل الذمة باسنادہ ان عمر کتب ان لا تکاتبوا اھل الذمة فیجری بینکم و بینھم المودة و لا تکنوھم الخ.... و فی موضع آخر تحت قولہ تعالیٰ "لست منھم فی شئ" و ذالک یقتضی تبرءہ منھم فی جمیع الاشیاء (اقتضاء ص: ۲۲)

نیز ابوالشیخ اصفہانیؒ نے شروط اہل الذمہ میں اپنی سند سے یہ روایت نقل کی ہے کہ حضرت عمرؓ نے (عاملوں کو) لکھ دیا تھا کہ اہل کتاب سے لکھنے کا کام نہ لیا کرو، اس لئے کہ اس طرح تم میں اور ان میں محبت قائم ہو جائے گی، (جو شرعاً ممنوع ہے) اور نہ ان کے لئے کنایہ کے الفاظ استعمال کرو، (اس لئے کہ یہ تعظیم و تکریم کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں،) ۔۔۔ایک اور جگہ آیتِ قرآنی "لست منھم فی شئ" کے ذیل میں فرمایا کہ کہ اس کا تقاضا یہ ہے کہ ان سے تمام امور میں احتراز کیا جائے۔

ان سب باتوں کے علاوہ ایک اور چیز قابل لحاظ ہے کہ اس وقت مسلمانوں کا عالمگیر افلاس اور فقر و فاقہ اور بے کاری بھی ایک ایسی چیز ہے جو ان کی دنیا کے ساتھ دین کو بھی تباہ کر رہی ہے وہ مجبور ہو کر ایسے ایسے کاموں میں پڑ جاتے ہیں، جن میں حلال و حرام کا امتیاز تو کیا ہوتا، خود ایمان کا رہنا دشوار ہو جاتا ہے، اسی کو صادق مصدوق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: (کاد الفقر ان یکون کفراً) (یعنی بعض اوقات فقر کفر کا سبب بن جاتا ہے) ہندوؤں نے تو چھوت چھات کے ذریعہ اپنی تجارت اپنے اندر محفوظ کر لی۔

مسلمانوں کی اقتصادی زندگی کو درست کرنے اور ان کو سخت پریشانیوں سے

نکالنے کی اگر کوئی آسان صورت اس وقت ہے، تو صرف یہی کہ مسلمان اپنی تجارت کا خود تحفظ کریں، دولت مند لوگ خود دکانیں کھولیں، اور ناداروں کو اپنے ساتھ لگائیں، اگر خرید وفروخت میں مسلمان اس کا اہتمام کریں کہ بلاضرورت شدیدہ غیر مسلموں سے معاملات نہ کریں تو بآسانی مسلمانوں کی یہ پریشانی رفع ہو سکتی ہے۔

تنبیہ

اس کے ساتھ یہ بات بھی قابل لحاظ ہے، اور قرآن وحدیث کی بے شمار نصوص سے ثابت ہے کہ صحبت کا ایک بڑا اثر تمام اشیاء میں ہوتا ہے، اس لئے جو چیزیں بزرگوں کے ہاتھوں میں رہی ہوں، یا انھوں نے استعمال کی ہوں، ان کو متبرک سمجھا جاتا ہے، اور ارباب بصیرت ان میں انوار وبرکات محسوس کرتے ہیں، ظاہر ہے کہ یہ اسی صحبت کا نتیجہ ہے جو ان اشیاء کو بزرگوں کے ساتھ رہی ہے، تو خوب سمجھ لیا جائے کہ جس طرح بزرگوں کی صحبت کے برکات استعمالی چیزوں میں ظاہر ہوتے ہیں، اسی طرح کفار وفجار کے ہاتھوں میں یا استعمال میں رہی ہوئی، چیزوں میں ایک روحانی تاریکی بھی ضرور ہوتی ہے جس کو ارباب بصیرت اکثر محسوس بھی کر لیتے ہیں۔

خلاصہ حکم

روایات حدیث وفقہ کے دیکھنے اور حالات موجودہ پر نظر ڈالنے سے ثابت ہوا کہ اس وقت باوجود اباحت فی نفسہا کے مسلمانوں کے لئے اپنی دکانیں چھوڑ کر غیر مسلموں سے سامان خریدنا ہرگز جائز نہیں، باقی ضرورت شدیدہ مستثنیٰ ہے۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

کتبہ

احقر محمد شفیع غفرلہ

خادم دارالافتاء دارالعلوم دیوبند

۲۸ رذی الحجہ ۱۳۵۰ھ

وقاية المسلمين عن ولاية المشركين

ملکی سیاست میں غیر مسلموں کے ساتھ اشتراکِ عمل کی شرعی حدود

تاریخ تالیف ——— ۱۳۶۴ھ (مطابق ۱۹۴۴ء)

مقامِ تالیف ——— دارالعلوم دیوبند

یہ رسالہ تحریک پاکستان کے زمانہ میں اُن سوالات کے جواب میں لکھا گیا جو مسلم لیگ اور کانگریس کی شرعی حیثیت سے متعلق برصغیر کے گوشہ گوشہ سے حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پاس آرہے تھے اُس وقت یہ دوبار" کانگریس اور مسلم لیگ کے متعلق شرعی فیصلہ" کے نام سے شائع ہوا۔

مگر حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس میں کافروں کے ساتھ مسلمانوں کے سیاسی تعلقات کے موضوع پر خالص فقہی حیثیت سے اصولی بحث فرمائی ہے اور اس میں موضوع کے تمام متعلقات پر سیر حاصل تحقیقی مواد کے ذریعہ مسئلہ کے ہر پہلو کو خوب واضح اور مدلل فرمادیا ہے۔

لہٰذا اس رسالہ کی حیثیت محض ایک وقتی مسئلہ کی نہیں بلکہ یہ غیر مسلموں کے ساتھ مسلمانوں کی داخلہ وخارجہ پالیسی کے لئے اہم شرعی دستور العمل ہے۔ اسی لئے حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ایماء پر اب اس کا نام بدل کر اس مجموعہ کا جز بنایا جارہا ہے عربی نام میں کوئی تبدیلی نہیں کی گئی۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الاستفتاء

کشمکش سے ہر گھر اختلاف کا آماجگاہ بنا ہوا ہے، اغیار تماشا دیکھ رہے ہیں؛ اور مسلمانوں کی جماعتیں آپس میں ٹکرا رہی ہیں، اور اس جنگ و جدل کا اثر مسلمانوں کے ہر شعبہ زندگی مذہب، معاشرت، اقتصاد، ملکی سیاست پر پڑ رہا ہے۔

جو مسلمان کسی پارٹی کے پیچھے لگے ہوئے نہیں اور یکسوئی کی زندگی گزارنا چاہتے ہیں ان کو ہر طرف کھینچا جا رہا ہے، ہم چند مسلمان بھی ایسی حالت میں حیران ہیں اس لئے حضرات علماء کی طرف رجوع کر کے اپنے لئے صحیح راہ عمل کی ہدایت چاہتے ہیں کہ خالص دینی اور مذہبی حیثیت سے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم ہمارے لئے کیا ہے، اس لئے موجودہ حالات کو پیش کر کے چند سوالات کئے جاتے ہیں۔ بینوا توجروا۔

حالات یہ ہیں:

کہ اس وقت ہندوستان کی ہر قوم مسلمان، ہندو، سکھ، اچھوت وغیرہ آزادی

ہندوستان کی جدو جہد پر متفق نظر آتی ہے، اس آزادی کے حصول کے لئے کوشش کرنے والی متعدد جماعتیں ہندوستان میں قائم ہیں، جن میں سے تعداد کے اعتبار سے بڑی جماعتیں دو ہیں، کانگریس اور مسلم لیگ ان کے سوا جو جماعتیں ہیں، یا تو ان کا موضوع بالذات اور بلاواسطہ آزادی ہند نہیں، یا وہ ان میں سے کسی ایک جماعت میں داخل و منضم ہیں، یا اس قدر قلت میں ہیں کہ ان کو کوئی قوم موجودہ آئین کے اعتبار سے مسلمانوں کا نمائندہ تسلیم نہیں کر سکتی، اس لئے حصولِ آزادی یا ملکی حقوق کے بارہ میں یہی دو جماعتیں قابل ذکر ہیں۔

کانگریس کے اصول میں ہے کہ ہندوستان کے بسنے والے خواہ کسی مذہب و ملت اور کسی قوم و برادری کے ہوں، وہ بلاشرط کانگریس میں داخل ہو جاویں، اور یہ سب مل کر ایک ہندوستانی وطنی قوم کی حیثیت سے آزادی طلب کریں، کانگریس سب کی نمائندہ ہو اور جو آزادی یا حقوق حکومت سے ملیں، وہ کانگریس کا حق ہوں، پھر مشترک طور پر سب اس کا استعمال کریں، لیکن ہندوستان میں بھاری اکثریت ہندوؤں کی ہے اگر مسلمان سب کے سب کانگریس میں داخل ہو جاویں، تب بھی ایک چوتھائی سے زائد نہیں ہو سکتے، اس لئے کانگریس میں مسلمان ہمیشہ ایک کمزور اقلیت میں رہیں گے، اور چونکہ کانگریس کا نظام جمہوری ہے جس میں حکومت اکثریت کی ہوتی ہے، اقلیت کو اس کا تابع ہو کر رہنا پڑتا ہے، اس لئے مسلمانوں کو اس میں ہندوؤں کا تابع ہو کر رہنا ناگزیر ہے، بلکہ بقول مولانا ابوالکلام آزاد صدر کانگریس و اچاریہ کرپلانی سکریٹری کانگریس گاندھی جی کی قیادت اور امامت کو تسلیم کرنا، اور ان کی اسکیم کے تابع چلنا لازمی اور لابدی امر ہے۔

ابوالکلام صاحب کے خطبہ کا ایک اقتباس:

ملاحظہ ہو مولانا ابوالکلام کا خطبہ صدارت اجلاس رام گڑھ کانگریس منعقدہ

۱۹۴۰ء جس کے الفاظ یہ ہیں کہ مسٹر گاندھی کی لیڈرشپ قیادت و امامت پر ایمان کامل کامیابی کی تین شرطوں میں سے ایک شرط ہے۔

کانگریس کا مؤقف

اوراچاریہ کرپلانی کہتے ہیں، یہ بھی سمجھ لینا چاہئے کہ کانگریس کی ہر اسکیم گاندھی ہی کے فلسفہ کے ماتحت چلائی جائے گی، یہ ہرگز ممکن نہیں کہ آپ کسی اصلاحی اسکیم کو کسی اور فلسفۂ زندگی کے اصول پر چلاسکیں، یہ گاندھوی فلسفۂ زندگی کسی اور فلسفۂ زندگی کا ماتحت نہیں بنایا جاسکتا، ملاحظہ ہو مدینہ بجنور ۱۷/ اگست ۱۹۳۹ء امرتا بازار پتریکا کلکتہ مؤرخہ ۱۸ اگست ۱۹۳۹ء۔

مسلم لیگ کا مؤقف

دوسری جماعت مسلم لیگ ہے یہ صرف مسلمانوں کی جماعت ہے اوراس کا اصول یہ ہے کہ مسلمان سب اس کے زیرعلم جمع ہوکر اپنی مستقل تنظیم کریں، اور جماعتی حیثیت سے ہندوؤں کے ساتھ کوئی معاہدہ کر کے جنگ آزادی میں حصہ لیں، حقوق آزادی میں مسلمانوں کا حصہ مستقل اور علیحدہ ہو، اس کا مطالبہ یہ ہے کہ مسلم اکثریت کے صوبوں میں مسلمانوں کو آزاد وخودمختار حکومت ملنا چاہئے اسی کا نام مطالبۂ پاکستان ہے۔

لیکن اس جماعت کے بڑے ذمہ دار لوگوں کے متعلق بھی دیندار مسلمانوں کو یہ شکایت ہے کہ یہ حضرات شریعت کے پابند نہیں، ان سے بھی یہ خطرہ ہے کہ حکومت و اختیارات مل جانے کے بعد خلافِ شرع قوانین نافذ کریں، اور دینیات سے بے پروائی اور تغافل ان کے اثر سے اور زیادہ ہوجائے، اب سوالات یہ ہیں:

تین سوال

۱......ان حالات میں کہ کانگریس میں غلبہ ہندوؤں کا ہے اور مسلمانوں کی اکثریت و

غلبہ کسی حال متوقع نہیں، مسلمانوں کا بلا شرط اس میں داخل ہو کر حصول آزادی کی کوشش کرنا، اور ان سے مدد لینا جائز ہے یا نہیں؟

۲:.......بحالات مذکورۃ الصدر مسلم لیگ کی حمایت و شرکت اور اس کے زیر علم آزادی کی کوشش جائز ہے یا نہیں؟

۳:.......مسلم لیگ کا مطالبۂ پاکستان یعنی مسلم اکثریت کے صوبوں میں ان کی آزاد و خود مختار حکومت اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ بینوا توجروا

احقر محمود راندیری　　احمد عبداللہ کاٹھیاواڑی　　یوسف مچلا (راندیر)

عبدالرحمٰن عمرجی　　اسمٰعیل ابوبکر (بمبئی)

اراکین مجلس دعوۃ الحق بمبئی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الجواب

الحمد للہ و کفیٰ و سلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ

ہندوستان کی سیاسی کشمکش اور اس کے طوفانی مدوجزر نے ایک زمانے سے مسلمانوں میں مختلف قسم کے سیاسی اور مذہبی سوالات پیدا کر رکھے ہیں، اہل فہم پر مخفی نہیں کہ معمولی امور یا جزوی اختلاف کو فتووں کا رنگ دے کر ان کو سیاسی اکھاڑوں کا کھیل بنانا کسی طرح زیبا نہیں کہ اس کی وجہ سے قسم قسم کے افراط وتفریط اور حدود شرعیہ سے تجاوز وغلو کے علاوہ خود فتویٰ کے اعتماد واحترام میں سخت خلل پڑتا ہے۔

اس فتویٰ کا سبب

لیکن پیش کردہ سوالات ایک حد تک اصول کی حیثیت رکھتے ہیں، جن پر مسلمانوں کی ملکی وسیاسی مساعی کی بنیاد رکھی جا سکتی ہے، اور جس کے صحیح یا غلط ہونے کا اثر ان کے تمام شعبہائے زندگی تک پہنچنے والا ہے، بالخصوص مذہب اور شعائر مذہب پر اس کا اثر سب سے زیادہ ہے، ادھر دیندار مسلمانوں کے سوالات واستفتاء اطراف و اکناف سے بکثرت آرہے ہیں، سب کا شافی جواب علیحدہ علیحدہ لکھنا دشوار ہو رہا ہے، اس لئے مناسب معلوم ہوا کہ ان مسائل پر کسی قدر مفصل بحث کر کے ایک منقح امر پیش کر دیا جاوے، جس میں عامۃ الورود سوالات کا بھی جواب ہو جاوے۔

واللہ ولی التوفیق

پہلے سوال کا جواب

ایک مسلمان (۱) کی کسی کافر کے ساتھ اتفاقی ملاقات و مصاحبت اس طرح کہ بازار میں ریل میں موٹر میں کچہریوں میں جمع ہو جاویں ظاہر ہے کہ نہ یہ کوئی معاہدہ ہے نہ اشتراک عمل نہ اس کے جواز و عدم جواز وغیرہ میں بحث، نہ سوال کا اس سے کوئی تعلق اسی طرح جائز معاملات بیع و شراء و اجارہ میں بھی اس وقت کوئی بحث نہیں۔

غیر مسلموں کے ساتھ سیاسی تعلق کی تین صورتیں

گفتگو اور سوال اس وقت اس میں ہے کہ مسلم و غیر مسلم کسی سیاسی و انتظامی معاملہ میں ایک دوسرے کے ساتھ متفق ہو کر کام کریں، حالاتِ موجودہ میں اس کی تین صورتیں ہیں۔

ایک یہ کہ مسلمان اور کفار کی دو جماعتوں میں محض صلح یا تجارتی معاملات وغیرہ کے متعلق کوئی معاہدہ ہو، استعانت و استمداد یا شرکت عمل کچھ نہ ہو۔

دوسرے یہ کہ مسلم جماعت اپنے جماعتی نظام و استقلال کو باقی رکھتے ہوئے کسی تیسری قوم کا مقابلہ کرنے کے لئے یا نظام حکومت وغیرہ بنانے کے لئے باہم معاہدہ کے ساتھ اشتراک عمل کرے۔

تیسرے یہ کہ مسلمان انفرادی طور سے بلا کسی شرط و معاہدہ کے کسی کافر قوم کے

(۱)...... مسلم و غیر مسلم کے مابین جائز و نا جائز معاملات رواداری اور برّ و اقساط کی حدود مصالحت و معاہدہ کے قوانین موالات تشبہ کی حرمت وغیرہ کی پوری تفصیل احقر کے رسالہ معاملات المسلمین باہل الکتاب و المشرکین میں مذکور ہیں، جو اسی مجموعہ ''جواہر الفقہ'' کا جزء بن کر شائع ہو رہا ہے، نیز سیدی حضرت حکیم الامت تھانوی قدس سرہٗ کے رسالہ الروضۃ الناضرۃ فی المسائل الحاضرۃ میں بھی ان مسائل کی تفصیل مذکور ہے، یہ رسالہ مجموعہ افادات اشرفیہ در مسائل سیاسیہ کے اندر شائع ہوا ہے۔ ۱۲

ساتھ شریک عمل ہو جاویں۔

پہلی صورت مصالحت بلا استعانت

اس کی شرعی حدود و شرائط

محض مصالحت بلا استعانت جس کو فقہی اصطلاح میں موادعت (۱) بھی کہا جاتا ہے، یہ اس وقت جائز ہے کہ صلح میں مسلمانوں کی مصلحت ہو اور مفاد اسلامی پیش نظر ہو، اور شرائط صلح خلاف شرع نہ ہوں۔ (شرح سیر ص:٦٦، ج:۴) آیت کریمہ (وان جنحوا للسلم فاجنح لها و توكل على الله) اس کے ثبوت کے لئے کافی ہے، اور آیت (فاقتلوا المشركين حيث وجدتموهم) سے ظاہری تعارض کا شبہ ہو سکتا تھا، اس کو جمہور مفسرین وفقہاء نے رفع فرما دیا ہے، چنانچہ امام ابوبکر جصاص نے احکام القرآن میں فرمایا ہے:

> و ما ذكر من الامر بالمسالمة اذا مال المشركون فحكم ثابت ايضاً و انما اختلف حكم الأيتين لاختلاف الحالين فالحال اللتى امر فيها بالمسالمة هى حالة قلة عدد المسلمين و كثرة عدوهم و الحال اللتى امر فيها بقتل المشركين و قتال اهل الكتاب حتى يعطوا الجزية ، هى حال كثرة المسلمين و قوتهم على عدوهم و قد قال (فلاتهنوا و تدعوا الى السَلم و انتم الاعلون و الله

(۱)...... موادعت کے معنی لغۃً متارکت کے ہیں، اور بجائے مصالحت کے اس لفظ کو اختیار کرنے کی حکمت شرح سیر کبیر میں یہ لکھی ہے کہ مومنین ومشرکین میں حقیقی مصالحت اور مسالمت تو ہو ہی نہیں سکتی، بلکہ معاہدہ ہو سکتا ہے، کما قال تعالیٰ الا الذين عاهدتم من المشركين شرح سیر کبیر ص:۶۲، ج:۴۔۱۲ منہ

معکم)فنھی (۱) عن المسالمة عند القوة علیٰ قھر العدو و قتلھم و کذالک قال اصحابنا . (احکام ص:۸۶،ج:۳)

اور یہ جو ذکر کیا گیا کہ جب مشرکین مائل بصلح ہوں تو صلح کر لی جاوے، یہ بھی ایک ثابت شدہ حکم ہے اور دونوں آیتوں یعنی آیت (وان جنحوا) اور آیت (فاقتلوا المشرکین) میں حکم کا اختلاف بوجہ اختلاف حالات کے ہے، تو جس حالت میں صلح کرنے کا حکم دیا گیا ہے، وہ حالت مسلمانوں کے ضعف وقلت کی اور کفار کی قوت اور کثرت کی ہے، اور جس حال میں قتل مشرکین واھل کتاب کا حکم دیا گیا ہے، وہ حالت مسلمانوں کی کثرت (غلبہ) وقوت کی ہے بمقابلہ کفار اور آیت کریمہ (**فلاتھنوا وتدعوا الی السلم و انتم الاعلون واللّٰہ معکم**) میں صلح کرنے سے منع فرمایا گیا، یہ اسی وقت ہے، جب مسلمانوں کو کفار پر غلبہ پانے کی قدرت حاصل ہو۔ (احکام القرآن)

اور اسی مضمون کی تائید میں اس سے پہلے ارشاد فرمایا ہے:

وقد کان النبی صلی اللّٰہ علیہ و سلم عاھد حین قدم المدینة اصنافا من المشرکین (۲) منھم النضیر و بنو قینقاع و قریظة و عاھد قبائل من المشرکین ثم کان بینه و بین قریش ھدنة الحدیبیة (الیٰ) و لم یختلف نقلة السیر و المغازی فی ذالک و ذالک قبل ان یکثر اھل

---

(۱)......علی الاطلاق صلح سے ممانعت نہیں ورنہ اہل نجران سے حضورؐ کیوں صلح فرماتے بلکہ قوت وغلبۂ اسلام کے وقت اس آیت مبارکہ میں اُس صلح سے ممانعت ہے جو سستی اور تکاسل سے ناشی ہو۔۱۲منہ
(۲) ھکذا بالاصل و لعل الصحیح "الیھود" ۱۲ منہ

الاسلام و یقوی اھلہ. (احکام ص: ۸۶، ج: ۳)

اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ میں تشریف فرما ہوئے تو بہت سے مشرکین بنونضیر، بنوقینقاع بنوقریظہ سے معاہدات فرمائے، پھر آپ کے اور قریش مکہ کے درمیان صلح حدیبیہ کا واقعہ پیش آیا اس میں مغازی اور سیر کے روایت کرنے والوں میں کوئی اختلاف نہیں، اور یہ اسی وقت کے واقعات ہیں، جب کہ اہل اسلام کو قوت حاصل نہ تھی۔

(احکام)

جصاص کے کلام میں جو کثرت وقلت پر حکم کا مدار رکھا گیا ہے، یہ واقعات نزول کی رعایت سے بطور تمثیل معلوم ہوتا ہے، اصل مقصود مصلحت مسلمین کی رعایت ہے، جیسا کہ ہدایہ وغیرہ میں مطلق مصلحت مسلمین کا لفظ موجود ہے، مبسوط میں ہے:

ان الامام نصب ناظراً و من النظر حفظ قوۃ المسلمین اولا و ربما یکون ذالک فی الموادعۃ اذا کانت للمشرکین شوکۃ. (مبسوط ج: ۱۰)

امام مسلمانوں کی مصالح کیلئے قائم کیا گیا اور مصلحت کی ایک فرد یہ بھی ہے کہ پہلے خود مسلمانوں کی قوت کی حفاظت کرے، اور یہ حفاظت بسا اوقات اس میں منحصر ہوتی ہے، کہ کفار سے صلح کر لی جاوے، جب کہ ان کو شوکت وقوت حاصل ہو۔

اور ہدایہ میں ہے:

اذا رأی الامام ان یصالح اھل الحرب او فریقا منھم و کان ذالک مصلحۃ للمسلمین فلاباس بہ.

جب امام (خلیفۃ المسلمین) یہ مناسب سمجھے کہ اہل حرب سے یا ان

کے کسی خاص فریق سے صلح کرلے، اور اس میں مسلمانوں کی مصلحت ہو، تو اس میں مضائقہ نہیں۔

نصوص مذکورہ سے ثابت ہوا کہ اگر مسلمانوں کی مصلحت و ضرورت صلح میں ہو، تو صلح کر لینا جائز ہے، نیز معلوم ہو گیا کہ صلح کے جواز میں یہ بھی شرط نہیں کہ مسلمان غالب ہی ہوں، بلکہ بعض فقہاء و مفسرین نے یہ شرط لگائی ہے کہ صلح جب جائز ہے کہ اہل اسلام ضعیف ہوں۔

لیکن یہ حکم صرف مصالحت و موادعت کا ہے، جس میں کافر قوم سے استمداد اور استعانت اور اشتراک عمل کی صورت نہ ہو، اور جہاں اشتراک عمل اور استعانت ہو، اس کا حکم دوسری صورت کے تحت میں آتا ہے۔

دوسری صورت مصالحت مع استعانت و اشتراک عمل

اس کی شرعی حدود و شرائط

جس میں کسی کافر قوم سے مصالحت و معاہدہ کیساتھ استعانت و استمداد اور اشتراک عمل بھی ہو، اس کے جواز کے لئے یہ شرط ہے کہ اگر مسلمان غالب اور کفار مغلوب ہوں، اور کفار مسلمانوں کے زیر علم قتال وغیرہ میں شریک ہوں تو جائز ہے، اور کفار کے غالب یا برابر ہونے کی صورت میں جائز نہیں۔

آیات قرآنیہ

۱:.....یآیها الذین اٰمنوا لاتتخذوا بطانة من دونکم لا یألونکم خبالاً.

۲:.....یآیها الذین اٰمنوا لاتتخذوا الیهود و النصاریٰ اولیاء بعضهم اولیاء بعض و من یتولهم منکم فانه منهم.

۳:.....یآیها الذین اٰمنوا لاتتخذوا الذین اتخذوا دینکم هزواً و لعباً.

۴:......بشر المنافقين بان لهم عذاباً اليماً الذين يتخذون الكافرين اولياء من دون المؤمنين۔

اور اسی مضمون کی دوسری آیات کثیرہ حسب تصریح ائمہ مفسرین (جو آئندہ عبارات میں آتی ہیں) اس پر شاہد ہیں کہ کفار سے استعانت جائز نہیں، البتہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل وارشاد سے اتنی گنجائش ثابت ہوتی ہے، کہ اگر کفار مغلوب وتابع اور مسلمانوں کے زیر علم ہوں، تو اشتراک عمل واستعانت جائز ہے۔

عہد رسالت میں بنی قینقاع اور ابن ابیؒ کے ساتھ مختلف معاملہ

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد وعمل میں مسئلہ کے دونوں پہلوؤں کی تصریح بوضاحت موجود ہے کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض قبائل کفار بنی قینقاع وغیرہ کو جہاد میں ساتھ ہونے کی اجازت دے دی، اور غزوۂ احد میں ابن ابی کے حلفاء کو شریک جہاد ہونے سے ان الفاظ سے منع کر دیا کہ انا لانستعين بمن ليس على ديننا۔ یعنی ہم ایسے لوگوں کی امداد نہیں لیا کرتے جو ہمارے دین پر نہ ہوں۔

اس کی وجہ یہی تھی کہ بنو قینقاع وغیرہ اسلام کے زیر علم اور تابع تھے، اور حلفاء ابن ابی مسلمانوں کے تابع ہو کر ان کے زیر علم جہاد کرنے پر آمادہ نہیں تھے، جیسا کہ آئندہ شرح سیر کی عبارات میں اس کی تصریح آتی ہے۔

مفسرین اور فقہاء کی تصریحات

امام ابوبکر جصاص رحمۃ اللہ علیہ کی تصریحات احکام القرآن میں آیات مذکورۃ الصدر کے ماتحت حسب ذیل ہیں:

قال تعالیٰ : یآیها الذین اٰمنوا لاتتخذوا بطانة من دونکم و قال لاتتخذوا الیهود و النصاریٰ اولیاء بعضهم اولیاء بعض و من یتولهم منکم فانه منهم. فنهی فی هذه الأیات عن موالاة الکفار و اکرامهم و امر باهانتهم و اذلالهم و نهی عن الاستعانة بهم فی امور المسلمین لما فیه من العز و علو الید و کذالک کتب عمرؓ الی ابی موسیٰ ینهاه ان یستعین باحد من المشرکین فی کتابة و تلا :لاتتخذوا بطانة من دونهم لایألونکم خبالاً. (احکام القرآن، ص: ۱۲۳، ج:۳)

حق تعالیٰ نے فرمایا: اے ایمان والو! تم غیروں کو اپنا بھیدی نہ بناؤ اور فرمایا کہ یہود نصاریٰ کو دوست نہ بناؤ، وہ آپس میں ایک دوسرے کے دوست ہیں، اور جو تم میں سے ان کے ساتھ دوستی کرے، وہ بھی انہیں میں شمار ہے، ان آیات میں حق تعالیٰ نے کفار کی دوستی اور ان کے اعزاز سے منع فرمایا ہے، اور ان کی اہانت و اذلال کا حکم دیا ہے، اور ان سے مسلمانوں کے (اجتماعی) کاموں میں امداد لینے سے منع فرمایا ہے، کیونکہ اس میں ان کی عزت اور برتری ہے، اسی طرح حضرت فاروق اعظمؓ نے ابوموسیٰ اشعری کو ایک خط لکھا جس میں ان کو اس سے منع فرمایا کہ وہ کتابت (پیشی) میں کسی مشرک سے امداد لیں، اور یہ آیت تلاوت فرمائی۔ (لاتتخذوا بطانة من دونکم لایألونکم خبالا).

نیز احکام القرآن ص:۴۴، ج:۲ میں آیات مذکورہ کے ماتحت ارشاد فرمایا:

و فی هذه الآیة دلالة علی انه لاتجوز الاستعانة باهل الذمة فی امور المسلمین من العمالات و الکتبة.

اس آیت (لاتتخذوا بطانة) میں اس کی دلیل ہے کہ مسلمانوں کے (اجتماعی) کاموں اور ملازمتوں میں کفار اہل ذمہ سے امداد لینا جائز نہیں۔

اور آیت کریمہ (یایها الذین اٰمنوا لاتتخذوا الذین اتخذوا دینکم هزوا ولعبا) الآیۃ کے تحت میں ہے:

فيه نهي عن الاستنصار بالمشركين لان الاولياء هم الانصار (الیٰ قوله) و قال اصحابنا لابأس بالاستعانة بالمشركين على قتال غيرهم من المشركين اذا كانوا متىٰ ظهروا كان حكم الاسلام هو الظاهر و اما اذا كانوا لو ظهروا كان حكم الشرك هو الغالب فلاينبغي للمسلمين ان يقاتلوا معهم. (جصاص ص:۵۴۴، ج:۲)

اس آیت میں ممانعت ہے مشرکین سے مدد حاصل کرنے کی، کیونکہ اولیاء (دوست) ہی انصار (مددگار) ہوتے ہیں، (اور دوست بنانا کفار کا حرام ہے) اور ہمارے ائمہ حنفیہ نے فرمایا ہے، کہ مشرکین کی ایک جماعت سے بمقابلہ دوسرے مشرکین کے امداد لینا اس شرط سے جائز ہے، کہ بوقت فتح غلبہ حکم اسلام کا ہو، اور اگر ایسی حالت ہو کہ بوقت فتح غلبہ اہل اسلام کا نہ ہو، بلکہ حکم شرک غالب ہو، تو مسلمانوں کو ان کے ساتھ مل کر جہاد کرنا جائز نہیں۔

نیز آیت کریمہ (بشر المنافقين بان لهم عذابا اليماً الذين يتخذون الكافرين اولياء من دون المؤمنين) کی تفسیر میں فرمایا ہے۔

و هذا يدل على انه غير جائز للمؤمنين الاستنصار

بالکفار علی غیرھم من الکفار اذا کانوا متی غلبوا کان حکم الکفر ھو الغالب و بذالک قال اصحابنا.

(جصاص ص: ۳۵۲، ج: ۲)

یہ آیت دلالت کرتی ہے، اس پر کہ مسلمانوں کے لئے ناجائز ہے کفار سے امداد لینا دوسرے کفار کے مقابلہ کے لئے جب کہ حالت ایسی ہو کہ بوقت فتح حکم کفر غالب ہونے کا خطرہ ہو۔

نیز آیت کریمہ (أیبتغون عندھم العزۃ) کی تفسیر میں فرمایا:

فتضمنت ھذہ الأیۃ النھی عن اتخاذ الکفار اولیاء و انصارا و الاعتزاز بھم و الالتجاء الیھم.

(جصاص، ص: ۳۵۲، ج: ۲)

یہ آیت مشتمل ہے کفار کو دوست اور مددگار بنانے اور ان سے قوت حاصل کرنے اور ان کی پناہ لینے کی ممانعت پر۔ (احکام القرآن)

یہ مسئلہ جہاد وقتال ہی کے ساتھ مخصوص نہیں

امام ابوبکر جصاص کی پہلی اور دوسری عبارت میں اس کی بھی تصریح ہوگئی کہ یہ مسئلہ صرف جہاد وقتال کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ مسلمانوں کے جماعتی کام اور امور دینیہ سب اس میں داخل ہیں کہ ان میں مشرکین و کفار سے استعانت و استمداد جائز نہیں۔

مفسر اعظم ابوالسعودؒ نے آیت (لایتخذ المؤمنون الکافرین اولیاء) کی تفسیر میں بھی اس کی توضیح فرمائی جس کے بعض الفاظ یہ ہیں:

نھوا عن موالاتھم (الی قولہ) او عن الاستعانۃ بھم

فی الغزو و سائر الامور الدینیة .

(تفسیر ابوالسعود ص:۲۲۶،ج:۱)

مسلمانوں کو کفار کی دوستی سے منع کیا گیا ہے، اور ان سے جہاد اور تمام امور دینیہ میں امداد لینے سے بھی منع فرمایا گیا۔

اس سے یہ شبہ بھی رفع ہو گیا کہ اس وقت کانگریس کی شرکت حقیقی معنی میں جہاد یا قتال نہیں، تو اس میں مشرکین سے استمداد و استعانت کو جہاد کی استعانت قرار دیکر ناجائز کیسے قرار دیا جاتا ہے، کیونکہ امام جصاص اور مفتی ابوالسعود کی تصریحات کے موافق یہ حکم جہاد اور جملہ امور مسلمین اور امور دینیہ پر حاوی ہے۔

اور حضرت امام محمد بن حسن رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب سیر کبیر اور اس کی شرح شمس الائمہ میں اس مسئلہ پر دو مستقل باب رکھے ہیں، پہلے باب کا عنوان الاستعانۃ باہل الشرک و استعانۃ المشرکین بالمسلمین ہے، یعنی مسلمانوں کا مشرکین سے یا مشرکین کا مسلمانوں سے امداد لینا، اس باب کے تحت میں فرماتے ہیں:

و لا بأس بان یستعین المسلمون باهل الشرک علی اهل الشرک اذا کان حکم الاسلام هو الظاهر علیهم لان رسول الله صلی الله علیه و سلم استعان بیهود بنی قینقاع علی بنی قریظة و لان من لم یسلم من اهل مکة کانوا خرجوا مع رسول الله صلی الله علیه و سلم رکبانا و مشاة الیٰ خیبر (الی قوله) فعرفنا انه لابأس بالاستعانة بهم و ما ذالک الا نظیر الاستعانة بالکلاب علی قتال المشرکین و الی ذالک اشار رسول الله صلی الله علیه و سلم ان الله لیؤید هذا

الدين باقوام لا خلاق لهم في الأخرة و الذي روى ان النبي صلى الله عليه و سلم يوم احد رأى كتيبة حسناء قال من هؤلاء فقيل يهود بني فلان حلفاء ابن ابى فقال انا لانستعين بمن ليس على ديننا تاويله انهم كانوا اهل منعة و كانوا لايقاتلون تحت رأية رسول الله صلى الله عليه و سلم و عندنا اذا كانوا بهذه الصفة يكره الاستعانة بهم. (شرح سیر، ص: ۱۸۶، ج: ۳)

اس میں کوئی مضائقہ نہیں کہ مسلمان بمقابلہ مشرکین کے کسی دوسرے فرقہ مشرکین سے امداد لیں، بشرطیکہ امداد دینے والے مشرکین پر حکم اسلام کا غالب ہو، کیونکہ رسول اللہ علیہ وسلم نے یہود بنی قینقاع سے بمقابلہ بنی قریظہ امداد لی، نیز مکہ کے بعض غیر مسلم غزوۂ خیبر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ پیادہ وسوار نکلے تھے، اس سے ہم سمجھے کہ کفار سے امداد لینا جائز ہے، اور یہ بعینہ ایسا ہے جیسے کفار کے مقابلہ میں کتوں سے امداد لے لی جاوے، اور رسول اللہ علیہ وسلم نے اسی طرف اشارہ فرمایا ہے اس حدیث میں کہ اللہ تعالیٰ اس دین کی تائید کبھی ایسی اقوام سے بھی فرمائیں گے، جن کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں، اور یہ جو روایت کیا گیا ہے، کہ نبی کریم صلی اللہ علی وسلم نے غزوۂ احد میں ایک پر شوکت لشکر دیکھ کر فرمایا کہ یہ کون لوگ ہیں عرض کیا گیا کہ یہود بنی قینقاع ہیں جو ابن ابیؔ منافق کے ساتھی ہیں، (آپ کی امداد کے لئے آرہے ہیں) آپ نے فرمایا کہ ہم ایسے لوگوں سے امداد نہیں لیا کرتے جو ہمارے ہم مذہب نہ ہوں، اس حدیث کی تاویل یہ ہے کہ یہ لشکر صاحب شوکت وقوت تھا، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زیر علم قتال کرنے کے لئے تیار نہ تھا، اور ہمارے

نزدیک جب جماعت کفار ایسی حالت میں ہو، تو ان سے امداد لینا جائز نہیں۔

فائدہ:..... شرح سیر کی عبارت مذکورہ سے واضح ہوگیا کہ کسی کافر قوم سے جہاد وغیرہ میں امداد لینا اس وقت جائز ہے، جب کہ یہ قوم خود ایسی صاحب شوکت نہ ہو، جس سے مسلمانوں کو اندیشہ ہو، نیز یہ بھی شرط ہے، کہ وہ ہمارے زیر علم شریکِ جہاد ہو، اس کا کوئی مستقل جھنڈا نہ ہو۔

محقق ابن ہمام نے فتح القدیر میں بھی اس کی تصریح بالفاظِ ذیل فرمائی ہے:

و لا بأس بان يستعان بالمشركين على قتال المشركين اذا خرجوا طوعاً و يرضخ لهم و لايسهم لهم و لايكون لهم رأية تخصهم .

(فتح القدیر، قسمۃ الغنیمۃ، ص:۳۲۸، ج:۴)

اس میں کوئی مضائقہ نہیں کہ مشرکین کی ایک جماعت سے بمقابلہ دوسری جماعت مشرکین کے امداد لی جاوے، جب کہ وہ اپنی خوشی سے ہمارے ساتھ نکلیں، اور مال غنیمت سے ان کو کچھ حصہ دیا جاوے، پورا حصہ مسلمانوں کے برابر نہ دیا جاوے، اور یہ بھی ضروری ہے کہ ان کا اپنا کوئی جھنڈا نہ ہو، بلکہ وہ مسلمانوں کے جھنڈے کے نیچے شریک قتال ہوں۔

شرح سیر میں دوسرا باب اسی مسئلہ سے متعلق اس عنوان سے رکھا ہے۔ (**قتال اهل الاسلام اهل الشرك مع اهل الشرك**) یعنی مسلمانوں کا مشرکین کے ساتھ ہوکر دوسرے مشرکین سے لڑنا، اس باب کے تحت میں ارشاد ہے:

(لا ينبغي للمسلمين ان يقاتلوا اهل الشرك مع

اهل الشرک) لان الفئتين حزب الشيطان و حزب الشيطان هم الخاسرون فلاينبغي للمسلم ان ينضم الى احدى الفئتين فيكثر سوادهم و يقاتل دفعاً عنهم و هذا لان حكم الشرک هو الظاهر و المسلم انما يقاتل لنصرة اهل الحق لا لاظهار حكم الشرک (ولاينبغي [۱] ان يقاتل احد من اهل العدل احدا من الخوارج مع قوم آخرين من الخوارج اذا كان حكم الخوارج هو الظاهر) لان اباحة القتال مع الفئة الباغية من المسلمين ان رجعوا الى امر الله ولايحصل هذا المقصود بهذا القتال اذا كان حكم الخوارج هو الظاهر.

(شرح سیر ص:۲۴۱، ج:۳)

مسلمانوں کے لئے جائز نہیں، کہ وہ مشرکین کی ایک جماعت سے قتال کریں کسی دوسری جماعت مشرکین کی ساتھ ہوکر، کیونکہ مشرکین کی دونوں جماعتیں شیطان کی پارٹیاں ہیں، اور شیطان کی پارٹی ناکام و نامراد ہے، اس لئے مسلمان کے لئے درست نہیں کہ وہ ان دونوں جماعتوں میں سے کسی ایک جماعت کے ساتھ منضم ہو جاوے، جس سے اس کی تعداد بڑھے، اور یہ کہ وہ ان کی طرف سے مدافعت کے لئے قتال کرے، اور یہ اس لئے کہ اس صورت میں حکم شرک غالب ہے، اور مسلمان جو جہاد کرتا ہے، تو اہل حق کی نصرت کے لئے کرتا ہے نہ کہ حکم شرک کو غالب کرنے کے لئے اور درست نہیں کہ کوئی اہل سنت مسلمان

(۱)...... عبارت مذکورہ میں لفظ لاینبغی سے کسی اہل علم کو اس معاملہ میں تسہیل کا شبہ نہ ہونا چاہئے، کیونکہ اس کے مقابلہ میں لفظ اباحۃ لا کر یہ بات صاف کردی گئی ہے کہ لفظ لاینبغی اس جگہ لایجوز کے معنی میں ہے۔۱۲منہ

کسی فرقۂ خوارج کے ساتھ بمقابلہ دوسرے فرقۂ خوارج کے قتال میں شریک ہو، جب کہ فتح کے وقت غلبہ خوارج کا ہوتا ہو، کیونکہ اس فرقہ باغیہ کے ساتھ قتال کی اجازت صرف اس صورت میں ہے، جب کہ قتال کا انجام رجوع الی الحق ہو، اور جب کہ قتل کے بعد بھی حکم خوارج ہی کا غالب رہے تو یہ مقصود حاصل نہیں ہوتا۔

اور حدیث وفقہ کے مشہور امام طحاوی رحمہ اللہ کی مشکل الآثار میں ہے:

هكذا حكمهم الان عند كثير من اهل العلم منهم ابوحنيفة و اصحابه يقولون لابأس بالاستعانة باهل الكتاب فى قتال من سواهم اذا كان حكمنا هو الغالب و يكرهون اذا كانت احكامنا بخلاف ذالك و نعوذ بالله من تلك الحال. (مشكل الأثار ، ص: ۲۴۰، ج:۳)

کفار اہل کتاب کا یہی حکم اب بھی بہت سے اہل علم کے نزدیک ہے، جن میں سے ابوحنیفہ اور ان کے شاگرد وغیرہ ہیں یہ حضرات فرماتے ہیں، کہ کفار اہل کتاب سے امداد لینا بمقابلہ دوسرے کفار کے جائز ہے، بشرطیکہ ان پر حکم ہمارا (اسلام کا) غالب ہو، اور اگر معاذ اللہ صورت اس کے خلاف ہو، (یعنی غلبہ کفار کا ہوتا ہو) تو استمداد کو منع فرماتے ہیں۔

مسئلہ زیر بحث پر آیاتِ قرآنیہ اور روایات حدیث کی نصوص صریحہ بقدر کفایت ذکر کر دی گئی، اور ان کے ضمن میں ائمہ مجتہدین اور علماء امت کی کچھ تصریحات بھی آ چکی ہیں۔

اس مسئلہ میں خود امام اعظم کا ایک فتویٰ

اب ہم اس مسئلہ کے متعلق خود امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا فتویٰ پیش کرتے

ہیں، جو امام محمد بن حسنؒ کے سوال کے جواب میں ارشاد ہوا ہے، مذہب حنفیہ کے مدون اول حضرت امام محمد بن حسن رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے استاذ امام الائمہ ابوحنیفہؒ سے سوال کیا کہ ''کیا مسلمان اہل حرب کے مقابلہ میں مشرکین سے امداد لے سکتے ہیں؟''

آپ نے ارشاد فرمایا کہ ''اس میں کوئی مضائقہ نہیں، بشرطیکہ حکم اسلام کا ظاہر و غالب ہو، کیونکہ اس طرح اہل حرب سے قتال کرنا، تو اعزاز دین کے لئے ہے، اور ان کے مقابلہ میں مشرکین سے استعانت ایسی ہے، جیسے لڑائی میں کتوں سے کام لیا جاوے'' امام محمدؒ کا یہ استفتاء اور امام اعظمؒ کا فتویٰ سیر صغیر کے حوالہ سے شمس الائمہ سرخسی نے مبسوط میں بالفاظ ذیل نقل فرمایا ہے:

و سألته عن المسلمين يستعينون باهل الشرك على اهل الحرب قال لابأس بذالك اذا كان حكم الاسلام هو الظاهر الغالب لان قتالهم بهذه الصفة لاعزاز الدين و الاستعانة عليهم باهل الشرك كالاستعانة بالكلاب۔

(مبسوط، ص:۱۳۸، ج:۱۰)

میں نے ابوحنیفہؒ سے سوال کیا کہ مسلمان بمقابلہ اہل حرب مشرکین سے امداد لے سکتے ہیں، یا نہیں؟ فرمایا امداد لینے میں کوئی مضائقہ نہیں بشرطیکہ حکم اسلام کا ان پر ظاہر و غالب ہو، کیونکہ ایسی حالت میں ان کفار کا قتال بھی اعزاز دین کے لئے ہوگا، اور کفار سے استعانت ایسی ہوگی، جیسے کتوں سے کام لے لیا جاوے۔ (مبسوط)

اور امام دار الہجرۃ حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے تلمیذ خاص جو مذہب مالکیہ کے مدونِ اول ہیں اپنی مشہور کتاب مدونہ کبریٰ میں فرماتے ہیں:

فقہ مالکی کی مشہور کتاب ''مدوّنہ'' کا اقتباس

قلت هل كان مالك يكره ان يستعين المسلمون بالمشركين فى حروبهم (قال) سمعت مالكا يقول بلغني ان رسول الله صلى الله عليه و سلم قال لن استعين بمشرك قال و لم اسمعه يقول فى ذالك شيئا قال ابن القاسم و لا ارى ان يستعينوا بهم يقاتلون معهم الا ان يكونوا نواتية او خداما فلا ارى بذالك بأساً.

(مدونه ص: ۴۰، ج: ۱)

میں نے دریافت کیا کہ کیا امام مالکؒ مسلمانوں کے لئے جہاد میں مشرکین سے امداد لینے کو منع فرماتے تھے، (ابن قاسم نے) کہا کہ میں نے امام مالکؒ کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ مجھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ حدیث پہنچی ہے کہ ہم مشرک سے امداد نہیں لیتے، بس یہ حدیث روایت فرمائی اس کے سوا کچھ اس بارہ میں نہیں فرمایا، ابن قاسم کہتے ہیں، کہ میں اس کو جائز نہیں سمجھتا کہ مسلمان کفار سے امداد لے کر دوسرے کفار سے قتال کریں، مگر اس صورت میں کہ کفار خدمت گاروں اور ملازموں کی طرح ہمارے ساتھ لگ جاویں، تو پھر کوئی مضائقہ نہیں۔ (مدونہ امام مالک)

عبارت مرقومہ سے ظاہر یہ ہے کہ امام ابن القاسمؒ نے استعانت بالمشرکین کی اسی شرط کے ساتھ اجازت دی ہے جو امام اعظم رحمہ اللہ کے کلام میں گزر چکی ہے۔ یعنی یہ کہ کفار مغلوب و مقہور خدام کی طرح ساتھ لگ جاویں، تو جائز ہے، ورنہ نہیں، اور مشائخ حنفیہ میں سے صاحب بدائع نے اس مسئلہ میں فرمایا ہے:

و لا ينبغي للمسلمين ان يستعينوا بالكفار على قتال

الکفار لانہ لایؤمن غدرھم اذالعداوۃ الدینیۃ تحملھم علیہ الا اذا اضطروا الیھم. (بدائع، ص: ۱۰۱، ج:۷)

اور مسلمانوں کیلئے درست نہیں کہ وہ کفار کے مقابلہ میں دوسرے کفار سے امداد لیں، کیونکہ ان کے غدر سے اطمینان نہیں ہوسکتا، کیونکہ ان کی مذہبی عداوت انہیں غداری پر آمادہ کرے گی۔ مگر اس صورت میں کہ مسلمان ان سے امداد لینے کے لئے مضطر ہوجائے۔ (تو جائز ہے)

حالت اضطرار کا حکم

صاحب بدائع کے کلام سے اتنی بات زائد معلوم ہوئی کہ اگر کسی وقت خدانخواستہ مسلمان کفار سے امداد لینے کے لئے مضطر ہوجاویں، تو بدون شرط غلبہ اسلام بھی استعانت واستمداد کرسکتے ہیں۔

اضطرار کے اصطلاحی معنی

لیکن اضطرار ایک شرعی اصطلاحی لفظ ہے اس کو اخباری محاورات پر محمول کر کے عام نہیں کیا جاسکتا، اضطرار کے معنی اس کے سوا نہیں کہ مسلمان کے لئے جان بچانے کا کوئی دوسرا راستہ باقی نہ رہے، ایسے حالات میں حسب تصریحات قرآن کریم اس کے لئے بہت سے محرمات حلال ہوجاتے ہیں، یہاں تک کہ شراب اور خنزیر بھی، اسی درجہ میں صاحب بدائع نے بلاشرط غلبۂ اسلام کے استعانت بالکفار کی اجازت دی ہے، اصول کلیہ کے علاوہ اضطرار کی یہ تفسیر دوسرے جزئیات فقہیہ سے بھی واضح ہے چنانچہ شمس الائمہ سرخسیؒ نے ان مسلمانوں کے لئے جو کفار کے ہاتھ میں قید ہوجاویں ان کو اپنی جان بچانے کے لئے قید کرنے والوں کے ساتھ مل کر دوسرے کفار سے قتال کی اجازت دی ہے، اور اس اجازت کی علت خود شمس الائمہؒ نے یہ بیان فرمائی ہے:

لانهم يدفعون الآن شر القتل عن انفسهم و قتل اولئک المشركين لهم حلال و لا بأس بالاقدام على ما هو حلال عند الضرورة بسبب الاكراه و ربما يجب ذالک كما في تناول الميتة و شرب الخمر.

(شرح سیر، ص:۲۴۲، ج:۳)

کیونکہ وہ اس وقت اپنی جانوں سے قتل کی مصیبت دور کرتے ہیں، اور ان مشرکین کا قتل کرنا ان کے لئے جائز ہے، اور ضرورت اکراہ کے وقت اس جائز فعل پر اقدام میں کوئی مضائقہ نہیں اور بسا اوقات اکراہ کی صورت میں یہ اقدام واجب ہو جاتا ہے، جیسے (بھوک پیاس سے مضطر ہو کر مرنے والے کے لئے) مردار کھا کر یا شراب پی کر جان بچانا۔

نیز اسیر ہی کے احکام میں اس کے بعد فرمایا ہے:

و ان كانوا في ضر و بلاء يخافون على انفسهم الهلاک فلا بأس بان يقاتلوا معهم المشركين اذا قالوا نخرجكم من ذالک. (شرح سیر ص:۲۴۳)

اور اگر وہ مصیبت و بلاء میں ہوں اپنی جانوں کی ہلاکت کا خوف ہو، تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں کہ ان مشرکین کے ساتھ مل کر دوسرے مشرکین سے قتال کریں، جب کہ یہ مشرکین یہ وعدہ کریں کہ ہم تمہیں اس بلاء سے نکال دیں گے۔

نیز اسکے بعد باب مذکور کے ختم پر نہایت واضح الفاظ میں تصریح فرما دی ہے کہ ضرورت واضطرار سے مراد جان کا خطرہ ہی ہے، الفاظ یہ ہیں: لاينبغي لهم ان يقاتلوا على هذا الاعند تحقق الضرورة بان يخافوهم على انفسهم الخ

(شرح سیر ص:۲۴۸، ج:۳)

اور چونکہ اس قتال کے جواز کی علت اپنی جان کا خطرہ ہے اسی لئے اس صورت میں کہ قیدی مسلمانوں کو جان کا خطرہ نہ ہو، اس قتال کی اجازت نہیں دی، چنانچہ اسی جگہ شرح سیر میں ہے:

(و لو قال اهل الحرب لاسراء فيهم قاتلوا معنا عدونا من المشركين و هم المشركون و هم لايخافونهم على انفسهم ان لم يفعلوا فليس ينبغي ان يقاتلوا معهم) لان في هذا القتال اظهار الشرك و المقاتل يخاطر بنفسه فلا رخصة في ذالك الاعلى قصد اعزاز الدين او الدفع عن نفسه .

(شرح سیر، ص: ۲۴۲، ج: ۳)

اور اگر اہل حرب نے ان مسلمانوں سے جو اہل حرب کے ہاتھ میں قیدی ہیں، کہا کہ تم ہمارے ساتھ مل کر ہمارے دشمن سے قتال کرو، اور وہ دشمن بھی مشرک ہے تو اگر مسلمانوں کو ان کے ساتھ مل کر قتال نہ کرنے میں اپنی جانوں کا خطرہ نہ ہو، تو ان کے لئے درست نہیں کہ ان کے ساتھ مل کر قتال کریں کیونکہ اس قتال میں کفر کی امداد ہے، اور مقاتلہ کرنے والا اپنی جان کو خطرہ میں ڈالتا ہے، جس کی اجازت صرف اعزاز دین یا اپنی جان بچانے کی غرض سے ہوسکتی ہے۔

شمس الائمہ کی تصریحاتِ مذکورہ جو بضمن تعلیل مذکور ہیں، ان سے اضطرار کے معنی بھی واضح ہو گئے کہ جان بچانے کی اور کوئی صورت نہ رہے، اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ دفع عن نفسہ سے اخباری محاورات کا دفاع مراد نہیں جیسا کہ مولانا ظفر احمد صاحب تھانوی کی تحریر پر تبصرہ کے ضمن میں ایک اہل علم نے سمجھ لیا ہے، اور پھر ان جزئیات کو مطلقاً اسیر و غیر اسیر سب مسلمانوں کے حق میں عام کر دیا، اس میں کئی وجہ سے غلطی ہوئی۔

اول تو یہاں عام دفاع و مدافعت مراد نہیں لے سکتے کیونکہ عن نفسہ کا لفظ (یعنی اپنی جان سے مدافعت کرنا) موجود ہے، اور اس کے قبل و بعد کی عبارتوں میں خود شمس الائمہؒ نے دفع قتل و ہلاکت وغیرہ کے الفاظ سے اس مضمون کو خود بیان فرمایا، اس سے کسی ادنیٰ وہم کی بھی گنجائش باقی نہیں رہی۔

دوسرے یہ حکم صرف اسیر کیلئے ہے، جس کی جان ہر وقت خطرہ میں ہے جیسا کہ خود اسی جزئیہ میں اسیر کی قید مذکور ہے۔

تیسرے اگر اس حکم کو اسیر و غیر اسیر کیلئے عام رکھیں، تو شرح سیر کی دو عبارتوں میں جو ایک ہی صفحہ میں مذکور ہیں، صریح تعارض ہو جاتا ہے، کہ اول تو استعانت اور قتال مع الکفار کے لئے حکم اسلام کا غالب ہونا شرط قرار دیا ہے، اور اسی صفحہ میں اس کے خلاف یہ حکم لکھا ہے۔

چوتھے جس مقصد کے ثبوت میں صاحب تبصرہ نے ان جزئیات سے استدلال کرنا چاہا ہے یعنی ہندوستان کے مسلمانوں کو ہنود کے ساتھ مل کر تیسری قوم سے قتال جائز ہو، یہ پھر بھی ثابت نہیں ہوتا کیونکہ ہندوستان کے دس کروڑ مسلمانوں کو اگر واقعات سے آنکھیں بند کر کے اسیر اور قیدی ہی کہہ دیا جائے، تو وہ اسیر انگریزوں کے ہوں گے، نہ کہ ہندوؤں کے بلکہ اس صورت میں تو ہندو بھی مسلمانوں کی طرح اسیر سمجھے جاویں گے، پھر ایک اسیر کی تہدید یا وعدہ وعید کا دوسرے اسیر پر کیا اثر ہو سکتا ہے، جس سے احکام شرعیہ میں فرق پڑ جائے۔

پانچویں ان جزئیات مذکورہ میں اسیر کی قید مذکور ہونے کے علاوہ خود شمس الائمہ نے دو ہی صفحے کے بعد اس کی جداگانہ تصریح بھی فرمادی کہ یہ احکام اسیر (قیدی) کے لئے ہیں، اور جو مسلمان کسی کافر حکومت میں ان کی اجازت سے داخل ہو، جس کو فقہی اصطلاح میں مستامن کہا جاتا ہے، اس کے یہ احکام نہیں، شمس الائمہ کے الفاظ یہ ہیں:

(و هذا خلاف ما اذا جاء هم قوم من المسلمين ليدخلوا دار الحرب فقال لهم ادخلوا و انتم آمنون فدخلوا و لم يشترطوا لهم شيئا) لان هناك مجيئهم على سبيل الاستيمان بمنزلة التصريح بالاشتراط على انفسهم ان لايغدروا بهم و لايوجد هذا المعنى فى حق الاسراء لانهم كانوا مقهورين فى ايديهم لا مستأمنين .

(شرح سیر، ص:۲۴۵، ج:۳)

بخلاف اس صورت کے کہ اہل حرب کے پاس مسلمانوں کی کوئی جماعت آئے تاکہ دارالحرب میں داخل ہو، اور اہل حرب ان سے یہ کہدیں کہ داخل ہوجاؤ، ہم تمہیں امن دیتے ہیں، اور یہ مسلمان دارالحرب میں بغیر اس کے کہ اہل حرب کے قانون واحکام کی پابندی کا عہد کریں، دارالحرب میں داخل ہوجاویں، کیونکہ اس جگہ ان کا امن طلب کرنے کے انداز سے آنا ہی گویا اس معاہدہ کی تصریح ہے کہ وہ ان کے ساتھ غدر نہ کریں گے اور یہ بات قیدی کے حق میں متحقق نہیں، کیونکہ وہ تو اہل حرب کے ہاتھ میں مقہور ہیں مستامن نہیں۔

کافروں کے ملک میں اجازت سے داخل ہونا بھی استیمان ہے

شرح سیر کی اس عبارت سے اس شبہ کا بھی جواب ہو گیا کہ ہندوستان کے مسلمانوں نے موجودہ حکومت سے کوئی عہد نہیں کیا، جس کی وجہ سے ان کو مستامن کہا جاسکے کیونکہ عبارت مرقومہ سے معلوم ہو گیا کہ کسی کافر قوم کی حکومت میں ان کی اجازت سے داخل ہونا اگرچہ کسی عہد و معاہدہ کا تذکرہ نہ آوے، یہ بھی ایک عملی معاہدہ اور استیمان ہے، اور اس طرح داخل ہونے والا مستامن ہے، اور یہ ظاہر ہے کہ کسی

ملک پر کفار کا تسلط کامل ہو جانے کے بعد ان کی زیر حکومت وسلطنت رہنا اور اپنے تمام امور وضروریات میں ان کی طرف رجوع کرنا، اور خوف کے وقت ان کی پناہ لینا خواہ طوعاً ہو، یا کرھاً بہرحال یہ بھی ایک عملی استیمان ہے، الغرض مسلم وغیر مسلم کے وفاق کی دوسری صورت یعنی اشتراک عمل اور استمداد واستعانت اس شرط سے جائز ہے، کہ غلبہ اسلام ومسلمین کا ہو، کفار غالب یا برابر ہوں، تو جائز نہیں، صرف اضطرار کی صورتیں جیسے قیدیوں کو درپیش آجاتی ہیں، اس شرط سے مستثنیٰ ہیں۔

تیسری صورت

اشتراک عمل بلا شرط ومعاھدہ

یہ صورت بالا جماع ممنوع ہے

مندرجہ بالا دوصورتوں یعنی مصالحت اور استعانت بشرطیکہ غلبۂ حکم اسلام کے سوا جتنی صورتیں کسی کافر قوم کے ساتھ اشتراک عمل کی ہیں وہ سب اس تیسری صورت میں داخل اور بتصریحاتِ قرآن وحدیث واجماعِ سلف وخلف ممنوع ہیں، گو درجات ممانعت حرمت وکراہت کے اعتبار سے مختلف ہوں۔

کفار کی متابعت وموالات حرام ہے

اور اصل یہ ہے کہ کفار اور کفر سے بغض وعداوت اور اظہار مخالفت اہم مقاصد اسلام سے ہے، اور اس کے مقابلہ میں کفار کی متابعت وموالات اور دوستانہ تعلقات حرام صریح اور مخالفت ومشابہت وغیرہ ممنوع وناجائز ہیں۔ صرف مصالحت اور اشتراک عمل کی وہ صورت جس میں غلبہ حکم اسلام کا ہو، یا معاملات اجارہ وتجارت کی اجازت دی گئی ہے باقی ہر قسم کا اختلاط واشتراک کفار کے ساتھ حرام وناجائز ہے۔

قرآن وحدیث کی نصوص صریحہ اس بارہ میں اس قدر ہیں کہ اگر جمع کیا جاوے تو ایک ضخیم کتاب ہو جاوے۔

چنانچہ امام حدیث حافظ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے اس موضوع پر ایک مستقل کتاب بنام اقتضاء الصراط المستقیم فی مخالفة اصحاب الجحیم لکھی ہے جو باریک ٹائپ کے دوسو سے زیادہ صفحات پر مشتمل ہے، اس جگہ چند آیات واحادیث پر بطور مثال اکتفاء کیا جاتا ہے۔

آیات قرآنیہ:

قال اللّٰہ تبارک و تعالیٰ قد کانت لکم اسوة حسنة فی ابراھیم و الذین معه اذ قالوا لقومھم انا بر آء منکم و مما تعبدون من دون اللّٰہ کفرنا بکم و بدا بیننا و بینکم العداوة و البغضاء ابدا حتیٰ تؤمنوا باللّٰہ وحدہ.

فرمایا اللہ تعالیٰ نے تم کو چال چلنی ہے، اچھی ابراہیم کی اور جو اس کے ساتھ تھے، جب کہا اپنی قوم کو ہم الگ ہیں تم سے اور جن کو تم پوجتے ہو اللہ کے سوا، ہم منکر ہوئے تم سے اور کھل پڑی ہم میں اور تم میں دشمنی اور بیر ہمیشہ کو جب تک تم یقین نہ لاؤ اللہ اکیلے پر۔

دوقومی نظریہ

اس آیت نے یہ بھی واضح کر دیا کہ کفر واسلام کی تفریق ایسی چیز ہے کہ جو لوگ نسلی طور پر پہلے سے ایک قوم تھے، ان کو اس تفریق نے دو جداگانہ قومیں بنا دیا، چہ جائیکہ مسلمانوں کی مستقل قوم کو کفار کے ساتھ ملا کر متحدہ قومیت کا تصور باندھا جاوے۔

و قال تبارک و تعالیٰ : و لاترکنوا الیٰ الذین ظلموا

فتمسکم النار و مالکم من دون اللہ من اولیاء ثم لاتنصرون. و قال تعالیٰ : یا ایھا الذین اٰمنوا لاتتخذوا بطانة من دونکم لایألونکم خبالاً. و قال تعالیٰ : و من یشاقق الرسول من بعد ما تبین له الھدیٰ و یتبع غیر سبیل المؤمنین نوله ما تولیٰ و نصله جھنم و ساء ت مصیراً . و قال تعالیٰ : و لا تتبع اھواء ھم و احذرھم ان یفتنوک عن بعض ما انزل اللہ الیک . و قال تعالیٰ : لئن اتیت الذین اوتوا الکتاب بکل اٰیة ماتبعوا قبلتک و ما انت بتابع قبلتھم . (ثم قال) و لئن اتبعت اھواء ھم من بعد ما جاء ک من العلم انک اذا لمن الظالمین.

نہ جھکو ان لوگوں کی طرف جنھوں نے ظلم کیا کہ (ان کی طرف مائل ہونے سے) تمہیں بھی آگ جہنم کی لگ جائے گی، اور اللہ کے سوا تمھارا کوئی مددگار نہیں، پھر تمہاری امداد نہ کی جاوے گی، اے ایمان والو! نہ بناؤ غیروں کو اپنا بھیدی، وہ تمھارے برباد کرنے میں کمی نہ کریں گے۔

فرمایا اللہ تعالیٰ نے: اور جو شخص رسول کی مخالفت کرے، اس کو ہدایت ظاہر ہونے کے بعد اور مسلمانوں کے راستہ سے الگ چلے ہم اس کو اسی کے حوالہ کر دیتے ہیں، اور جہنم میں داخل کرتے ہیں، اور جہنم برا ٹھکانا ہے، اور فرمایا اللہ تعالیٰ نے ان کی خواہشات کا اتباع نہ کرو، اور اس سے بچو کہ وہ اللہ کے نازل کئے ہوئے بعض احکام کے متعلق تمھیں کسی فتنہ میں ڈالدیں۔

اور اگر آپ اہل کتاب کے سامنے ہر نشانی پیش کر دیں تب بھی وہ آپ کے قبلہ کا اتباع نہ کریں گے، اور آپ بھی ان کے قبلہ کے تابع نہیں

اور اگر آپ ان کی خواہشات کا اتباع کریں گے، بعد اس کے کہ آپ کو علم الٰہی مل چکا تو آپ ظالمین میں سے ہو جائیں گے۔

احادیث نبویہ

اور احادیث صحیحہ معتبرہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات ہیں۔

من تشبہ بقوم فھو منھم۔

(رواہ ابوداؤد وقال ابن تیمیہ اسنادہ جید اقتضاء ص:۳۹)

جو شخص کسی قوم کے ساتھ مشابہت اختیار کرے وہ انہیں میں سے ہے۔

انا بریٔ من کل مسلم مقیم بین اظھر المشرکین۔

میں اس مسلمان سے بری ہوں، جو مشرکین کے درمیان (باختیار خود) مقیم ہو۔

ان الیھود و النصاریٰ لایصبغون فخالفوھم۔

(بخاری ومسلم)

یہود ونصاریٰ خضاب نہیں کرتے تم ان کی مخالفت کرو، یعنی خضاب کیا کرو۔

خالفوا المشرکین احفوا الشوارب و اعفوا اللحیٰ

(بخاری ومسلم)

مشرکین کی مخالفت کرو مونچھوں کو کٹواؤ اور داڑھیوں کو چھوڑو۔

خالفوا الیھود فانھم لایصلون فی نعالھم و خفافھم۔

(ابوداؤد)

یہود کی مخالفت کرو وہ اپنے جوتوں اور موزوں میں نماز نہیں

پڑھتے۔ (تم پڑھ سکتے ہو)

لایزال الدین ظاہراً ما عجل الناس الفطر لان الیھود و النصاریٰ یؤخرون . (ابوداؤد)

یہ دین ہمیشہ غالب رہے گا، جب تک لوگ افطار میں جلدی کرتے رہیں کیونکہ یہود و نصاری دیر کر کے افطار کرتے ہیں۔

آیات واحادیث مذکورہ اوران کی صدہا نظائر میں عامہ کفار ومشرکین کے ساتھ مخالطت ومشابہت اور مشارکت ومتابعت کو ناجائز قرار دیا ہے۔ اور کفر اور اہل کفر سے مخالفت کے اظہار کو ایک اہم مقصد قرار دیا ہے، ایسے افعال بھی حرام ہیں، جن سے موالات ومشابہت ظاہر ہوتی ہو، ان ہی آیات وروایات کے تحت میں عامۂ مفسرین و فقہاء نے ایسے افعال کو بھی داخل کیا ہے، جن سے کفار کی موالات ومتابعت یا مشابہت کا اندیشہ ہو، یا جو دوستانہ تعلقات اور خلط ملط و ربط ضبط کا ذریعہ بنیں۔

حضرت شیخ الہندؒ کا ارشاد گرامی

سیدی حضرت شیخ الہند قدس اللہ سرہٗ نے خطبۂ صدارت جمعیۃ العلماء میں اسی کو بالفاظ ذیل ارشاد فرمایا ہے:

”رہا یہ شبہ کہ موالات اور چیز ہے اور معاملہ اور چیز ہے آیت موالات کو منع کرتی ہے نہ معاملات کو، تو میں کہوں گا کہ ہاں موالات اور معاملہ میں مفہوم کے لحاظ سے فرق ضرور ہے، لیکن موالات کے مفہوم میں قربت اور نزدیکی پیدا کرنے والے تعلقات اور باہمی نصرت ومعاونت کے تمام ارتباطات لغوی معنی کے لحاظ سے داخل ہیں، پس تمام ایسے معاملے جن کی وجہ سے دشمن کے ساتھ میل جول ربط واتحاد بڑھے، ایسے معاملات جو ان کی معاندانہ طاقت کو بڑھائیں، ایسے تعلقات (فوجی ملازمت وغیرہ) جو

مسلمانوں کی ہلاکت اور شوکتِ اسلامیہ کے مٹانے میں دخل رکھتے ہوں، ایسے روابط جن کی وجہ سے انہیں موقع ملے کہ مسلمانوں کی رضامندی پر استدلال کرسکیں ایسے مراسم جن سے ان کے ساتھ محبت والفت کا اظہار ہوتا ہو، براہ راست یا بواسطہ موالات ممنوعہ محرمہ میں داخل ہیں۔'' (خطبۂ صدارت ۱۹۲۰ء)

یہ افعال و معاملات ایسے ہیں کہ کسی کافر قوم کے ساتھ مسلمان کے لئے جائز نہیں جن سے کوئی معاہدہ صلح یا اعانت واستعانت کا کسی خاص چیز میں ہو جاوے، ان کے ساتھ بھی صرف معاہدہ کی حد میں موافقت واشتراک جائز ہوگا، باقی امور میں وہ بھی عامہ کفار کے حکم میں رہیں گے، شرح سیر کبیر میں ان لوگوں کے بارہ میں جن سے مسلمانوں کی مصالحت ومواد عت ہو مذکور ہے۔

لانهم فى حكم المحاربين و ان تركوا القتال بسبب الموادعة الىٰ مدة (شرح سیر، ص: ۲۸۲، ج: ۳)

کیونکہ وہ بھی محاربین کے حکم میں ہیں، اگرچہ ایک مدت کیلئے موادعت کے سبب انہوں نے قتال چھوڑ رکھا ہے۔

خلاصۂ بحث

خلاصہ یہ ہے کہ کفار کے ساتھ مسلمانوں کے وفاق کی صرف دوصورتیں جائز ہیں، ایک محض مصالحت ومواد عت بلا اشتراک عمل یہ جائز ہے، بشرطیکہ اس میں مصلحت مسلمین ملحوظ ہو، اور شرائط صلح میں کوئی شرط خلافِ شرع نہ ہو۔

دوسرے استعانت اور مشارکت عمل یہ اس شرط سے جائز ہے کہ غلبہ حکم اسلام کا ہو، کفار محض تابع ہوکر ساتھ لگے ہوں۔ ان دوصورتوں کے علاوہ کسی غیر مسلم قوم کے ساتھ اختلاط اور جماعتی اشتراک کی کوئی صورت جائز نہیں، خواہ وہ صورت متابعت و مشابہت کہلائے یا موالات ومودت نام رکھی جائے یا کچھ اور۔

کانگریس کی شرکت کس صورت میں داخل ہے

مذکورۃ الصدر تینوں صورتوں کے احکام شرعیہ معلوم ہو جانے کے بعد اب یہ دیکھنا ہے کہ مسلمانوں کی شرکتِ کانگریس کس صورت میں داخل ہے، اور یہی چیز اس وقت سب سے زیادہ اہم ہے، سو کانگریس اور مسلمانوں کی اس میں شرکت کے مختلف ادوار کا مشاہدہ کرنے والوں اور پیش آمدہ حالات و واقعات کے دیکھنے سننے والوں پر مخفی نہیں کہ مسلمانوں کی شرکت کانگریس کے مختلف ادوار میں مختلف صورتوں پر رہی ہے، اول سے آخر تک ایک صورت نہیں رہی۔

کانگریس کے ساتھ اشتراک کا پہلا دور

تحریکاتِ حاضرہ کے ابتدائی دور میں جب کہ خلافت کمیٹی نہایت قوت و شوکت کے ساتھ ساتھ پیش پیش تھی، ہندو لوگ اہل اسلام کے پیچھے پیچھے لگے ہوئے تھے، اس وقت کی حالت یا تو پہلی صورت (یعنی مصالحت) میں داخل تھی، یا کم از کم دوسری صورت (یعنی استعانت) میں اور بلا شبہ جواز استعانت بالکفار کی شرط یعنی غلبۂ اسلام اس وقت موجود تھا، جنگ آزادی کا علم مسلمانوں کے ہاتھ میں تھا، ہندو ساتھ ہو گئے تھے۔

حضرت شیخ الہندؒ کی صراحت

جمعیۃ علماء ہند کا دوسرا سالانہ اجلاس جو ۱۳۳۹ھ اور ۱۹۲۰ء عیسوی میں بمقام دہلی شیخ العرب والعجم حضرت شیخ الہند قدس اللہ سرہٗ کے زیر صدارت منعقد ہوا ہے، اس کے خطبۂ صدارت کے ختم پر حضرت ممدوح کی اختتامی تقریر میں جو وفات سے صرف نو روز پہلے فرمائی ہے، یہ حقیقت بالکل صاف نمایاں ہے، جس کے الفاظ یہ ہیں:

”کچھ شبہ نہیں کہ حق تعالیٰ شانہ نے آپ کی ہم وطن اور ہندوستان کی

سب سے زیادہ کثیر التعداد قوم (ہنود) کو کسی نہ کسی طریق سے آپ کے ایسے پاک مقصد کے حصول میں مؤید بنایا ہے۔ اور میں ان دونوں قوموں کے اتفاق و اجتماع کو بہت ہی مفید اور منتج سمجھتا ہوں اور حالات کی نزاکت کو محسوس کر کے جو کوشش فریقین کے عمائد نے کی ہے اور کر رہے ہیں، اس کی میرے دل میں بہت قدر ہے کیونکہ میں جانتا ہوں کہ صورت حال اگر اس کے خلاف ہوگی، تو وہ ہندوستان کی آزادی کو ہمیشہ کے لئے ناممکن بنا دے گی، ادھر حکومت کا آہنی پنجہ روز بروز اپنی گرفت کو سخت کرتا جائے گا، اور اسلامی اقتدار کا اگر کوئی دھندلا سا نقش باقی رہ گیا ہے، تو وہ بھی ہماری بداعمالیوں سے حرف غلط کی طرح صفحۂ ہستی سے مٹ کر رہے گا، اس لئے ہندوستان کی آبادی کے یہ دونوں عنصر بلکہ سکھوں کی جنگ آزما قوم کو ملا کر تینوں اگر صلح و آشتی سے رہیں گے، تو سمجھ میں نہیں آتا کہ کوئی چوتھی قوم خواہ کتنی ہی بڑی طاقتور ہو ان اقوام کے اجتماعی نصب العین کو محض اپنے جبر و استبداد سے شکست کر سکے گی، ہاں یہ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں، اور آج پھر کہتا ہوں کہ ان اقوام کی باہمی مصالحت اور آشتی کو اگر آپ خوشگوار اور پائیدار دیکھنا چاہتے ہیں، تو اس کی حدود کو خوب اچھی طرح دلنشین کر لیجئے اور وہ حدود یہی ہیں کہ خدا کی باندھی ہوئی حدود میں ان سے کوئی رخنہ نہ پڑے، جس کی صورت بجز اس کے کچھ نہیں کہ اس صلح و آشتی کی تقریب سے فریقین کے مذہبی امور میں کسی ادنیٰ امر کو بھی ہاتھ نہ لگایا جائے، اور دنیوی معاملات میں ہرگز کوئی ایسا طریقہ اختیار نہ کیا جائے، جس سے کسی فریق کی ایذاء رسانی اور دل آزاری متصور ہو۔

مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اب تک بہت جگہ عمل اس کے خلاف ہو رہا ہے، مذہبی معاملات میں تو بہت لوگ اتفاق ظاہر کرنے کے لئے اپنے مذاہب کی حد سے گزر جاتے ہیں، لیکن محکموں اور ابواب معاش

میں ایک دوسرے کی ایذاءرسانی کے در پے رہتے ہیں۔

میں اس وقت جمہور سے خطاب نہیں کر رہا ہوں، بلکہ میری یہ گزارش دونوں قوموں کے زعماء (لیڈروں) سے ہے کہ ان کو جلسہ میں ہاتھ اٹھانے والوں کی کثرت اور زبانی تائید سے دھوکا نہ کھانا چاہئے کہ یہ طریقہ سطحی لوگوں کا ہے، ان کو ہندو مسلمانوں کے نجی معاملات اور سرکاری محکموں میں متعصبانہ رقابتوں کا اندازہ کرنا چاہئے، اگر فرض کرو ہندو مسلمان کے برتن سے پانی نہ پئے یا مسلمان ہندو کی ارتھی کو کندھا نہ دے تو یہ ان دونوں کے لئے مہلک نہیں، البتہ ان دونوں کی وہ حریفانہ جنگ آزمائیاں اور ایک دوسرے کو ضرر پہنچانے اور نیچا دکھانے کی وہ کوششیں جو انگریزوں کی نظروں میں دونوں قوموں کا اعتبار ساقط کرتی ہیں، اتفاق کے حق میں سم قاتل ہے، مجھے امید ہے کہ آپ حضرات میرے اس مختصر مشورہ کو سرسری نہ سمجھ کر ان باتوں کا عملی انسداد کریں گے۔"

(خطبۂ صدارت، ص:۱۸)

اس بصیرت افروز بیان میں مندرجہ ذیل امور کی صراحت ہے:

سیدی حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کا یہ بصیرت افروز بیان درحقیقت مسلمانوں کے لئے ایک محکم دستور ہے، جس میں ان کی سب سیاسی و مذہبی الجھنوں کا مؤثر علاج ہے، اس کے خط کشیدہ جملوں کو پھر بغور پڑھیئے جن میں امور ذیل کی تصریح ہے۔

الف:......آزادی ہند کے اصل علمبردار مسلمان تھے، پھر ہندوؤں نے تائید شروع کردی۔

ب:......اس تائید وحمایت کو بضرورتِ وقت غنیمت سمجھا گیا۔

ج:......ضرورتِ مذکورہ کی بناء پر دونوں قوموں میں مصالحت ہوئی۔

د:...... جوازِ صلح کے لئے شرائط یہ تھیں کہ:

۱:...... خدا کی باندھی ہوئی حدود میں اس مصالحت سے کوئی رخنہ نہ ڈالا جائے۔

۲:...... فریقین کے مذہبی امور میں کسی ادنیٰ امر کو بھی ہاتھ نہ لگایا جائے۔

۳:...... دنیوی معاملات میں صلح و آشتی و رواداری کو شیوہ بنایا جائے۔

۴:...... نجی معاملات اور سرکاری محکموں میں متعصّبانہ رقابتوں اور حریفانہ جنگ آزمائیوں سے اجتناب کیا جائے۔

اور جبکہ حضرت اقدسؒ کو شرائط مذکورہ کے خلاف بعض مسلمانوں کا حدود مذہب سے تجاوز معلوم ہوا، تو اسی بیان میں اس پر شدید نکیر فرمایا، اور ہدایت فرمائی کہ صلح و آشتی کا پائیدار رہنا اسی پر موقوف ہے کہ حدود و مذہب کو ہاتھ نہ لگایا جاوے۔

الغرض اگر حقیقت کو دیکھا جاوے، تو اس وقت مسلمان کانگریس میں شریک نہ ہوئے تھے، بلکہ کانگریسی ہندو مسلمانوں کے ساتھ تائید و حمایت میں کھڑے ہو گئے تھے، اور آزادی ہند کا مشترک مطالبہ پیش کرنے کے لئے دونوں قوموں میں مصالحت کی صورت پیدا ہوگئی تھی، جس کے شرائط سب شریعت کے مطابق اور حدود و مذہب کی حفاظت کے لئے بالکل کافی تھیں۔ اس لئے یہ توافق بین المسلمین والمشرکین مذکورۂ بالا تین صورتوں میں سے پہلی صورت یعنی مصالحت میں داخل تھا، بعد میں جب جلسہ جلوس اور مظاہروں میں دونوں قوموں کا اشتراک عمل ہوا، تو اس کو زیادہ سے زیادہ دوسری صورت یعنی استعانت میں داخل کہہ سکتے ہیں لیکن مطالبۂ آزادی کے اصل علمبردار اور کام کو چلانے والے مسلمان تھے، اس لئے غلبہ ان کا تھا، اور جوازِ استعانت کی شرط موجود تھی۔

بہر حال اس ہندو مسلم اتفاق و اشتراک کا پہلا دور اپنی اصل و بنیاد کے اعتبار سے حدودِ شرعیہ کے مطابق جائز و صحیح تھا، اس لئے علماء اہل حق میں سے کسی نے اس

وقت اصل مسئلہ میں اختلاف نہیں کیا، اور جن افعال پر کسی نے نکیر کیا، تو وہ ایسے افعال تھے کہ خود حضرت شیخ الہندؒ اور دوسرے علماء قائدین تحریک بھی اس پر نکیر میں شریک تھے، اور جن حضرات نے تحریک سے اختلاف کیا تو اس کی وجہ بھی اصل مسئلہ کا اختلاف نہ تھا، بلکہ اس بارہ میں رائے کا اختلاف تھا، کہ یہ تحریک غلبۂ اسلام کے لئے مفید و منتج ہوگی، یا معاملہ برعکس ہوگا۔

حضرت تھانویؒ کا موقف

سیدی حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ قدس سرہٗ نے جو اس تحریک سے اختلاف کیا تھا، ان کا اپنا بیان خود یہ ہے جو رسالہ شق الغین کے آخر میں شائع ہوا ہے۔

مسئلہ چہارم:...... حامیان کانگریس میں سے بعض حضرات اس اشتراک کو استاذی حضرت مولانا دیوبندی کا اتباع سمجھتے ہیں، اور بعض اصحاب اس اختلاف کو مثل اختلاف حنفی شافعی کے خیال کرتے ہیں، سو میرے نزدیک یہ دونوں خیال محض غلط ہیں، حضرت مولانا کا اشتراک مصالحت تھا نہ کہ متابعت یعنی اس وقت تحریکِ خلافت نہایت قوت پر تھی، جس سے حضرت مولانا کو قوی امید تھی، کہ حکم اسلام کا غالب ہوگا، اور ہم لوگوں کا خیال قرائن و وجدان سے اس کا عکس تھا، سو یہ اختلاف محض رائے کا اختلاف تھا، اور مثل اختلاف شافعی حنفی کے اجتہادی تھا، اس اشتراک میں متابعت کے شائبہ کا وہم بھی نہ تھا، یہی وجہ ہے کہ اگر کسی وقت کسی شعار اسلامی کے ضعف یا کسی شعار کفر کی قوت کا ذرا شبہ بھی ہوتا تھا، تو فوراً اس پر نکیر شدید فرماتے تھے، چنانچہ مشاہدہ متواترہ اس کا شاہد ہے بخلاف اس وقت کی حالت کے کہ اب کانگریس کی قوت سے کفر و شرک کا حکم غالب ہے، اسکی ہر تجویز سے موافقت و مداہنت کی جاتی ہے، اس وقت کا اشتراک بصورت ادغام بالکل متابعت ہے، جو کہ ناجائز ہے اس لئے مسلمانوں کو اپنی تقویت و

تنظیم مستقل لازم ہے تاکہ اس کے بعد جو اشتراک ہو، مصالحت ہو متابعت نہ ہو، خلاصہ یہ کہ اشتراک ایک لفظ مشترک ہے مگر اس کے دو فردوں کا یعنی مصالحت و متابعت کا حکم جدا جدا ہے پس حقیقی امتیاز کے بعد محض لفظی اشتراک سے اشتباہ نہ ہونا چاہئے۔ (بوادر النوادر، ص:۹۶۶)

الغرض سیدی حضرت شیخ الہند اور حضرت حکیم الامت (متعنا اللہ تعالیٰ بفیوضہما) کی تصریحات سے واضح طور پر ثابت ہو گیا کہ کانگریس کے ساتھ مسلمانوں کا اشتراک اپنے ابتدائی دور میں جائز مصالحت کی صورت سے تھا، جس کے فی نفسہ جواز میں کسی کو اختلاف نہ تھا، اسی طرح اس میں بھی کسی کو اختلاف نہ تھا کہ جس چیز سے اسلام و اہل اسلام کو ضعف یا مضرت پہنچے، اس سے علیحدگی لازم ہے، اسی واسطے شدھی سنگٹھن کے واقعات اور نہرو رپورٹ کے بعد عام اہل اسلام اور بالخصوص علماء و زعماء کانگریس سے کنارہ کش اور متنفر ہو گئے۔

شرکت کانگریس کا دوسرا دور

لیکن شدھی سنگٹھن کے واقعات کے بعد جب کانگریس نے لاہور میں نیا جنم لیا، اس میں تحریک کے بانی اور علمبر دار ہندو تھے، مسلمان ابھی ابھی ہندوؤں کی خیانت و غداری اور شدھی سنگٹھن کے المناک حوادث کی تلخی محسوس کر رہے تھے، اسلئے ہندوؤں کے ساتھ اس تحریک میں شریک ہونے سے جھجکتے تھے، پھر رفتہ رفتہ کچھ مسلمان بھی ان کے ساتھ جانے لگے، اس وقت چونکہ تحریک پر پورا قبضہ اور غلبہ ہندوؤں کا تھا، انہوں نے اس تحریک کو صرف ایک سیاسی تحریک کے بجائے خالص ہندو ذہنیت اور ہندوانہ خیالات اور طرز پر اٹھایا، اور یہ اصول بنا دیا کہ جو شخص کانگریس میں داخل ہو، وہ انفرادی اور شخصی حیثیت سے داخل ہو۔ کسی جماعت کا نمائندہ ہونے کی حیثیت سے کانگریس میں نہ لیا جائے گا، اس کا منشاء یہ تھا کہ مسلمانوں کی حیثیت کانگریس میں

ایک مستقل قوم اور جماعت کی نہ مانی جائے گی، بلکہ جس قدر افراد داخل کانگریس ہوں گے، وہ محض ہندوستانی ہونے کی حیثیت میں اپنے اعداد وشمار کے مطابق کانگریس کے حصہ دار ہوں گے۔ جس کا لازمی اثر یہ تھا، کہ مسلمان کانگریس میں نہایت کمزور اقلیت میں رہ کر ہمیشہ ہندو اکثریت کے تابع ومحکوم بنے رہیں۔ جیسا کہ جمہوری نظام مروجہ ہند کا اقتضاء ہے۔

یہی وجہ ہوئی کہ کانگریس میں شریک ہونے والے مسلمانوں میں خود اختلاف پیش آیا، علماء وزعماء کی ایک جماعت نے اس طرح بلاشرط داخلہ کانگریس کو مسلمانوں کے لئے مذہبی اور سیاسی حیثیت سے مضر سمجھا، اور بہت سے ماہرین سیاست مسلمان کانگریس سے علیحدہ ہوگئے۔ اب باقی ماندہ مسلمان جو کانگریس میں رہ گئے، وہ اور بھی زیادہ اقلیت وضعف کی حالت میں رہ گئے، اور ہندوؤں کو کانگریس کے سیاسی محاذ سے اپنے خالص ہندوانہ خیالات وتصورات کو بروئے کار لانے اور پورے ہندوستان پر ان کو مسلط کرنے کا موقع مل گیا۔

چنانچہ کانگریسی جھنڈے کو ہندوانہ سلامی اور بندے ماترم کا مشرکانہ ترانہ تو کانگریس کے آئین وشعار میں داخل کرلیا گیا۔

واردھا اسکیم، ودھیا مندر اسکیم، دیہات سدھار اسکیم کے نام سے ایسے قانون پورے ہندوستان کے لئے جاری کئے، جن کا سیاست اور آزادی کے مطالبہ سے کوئی تعلق نہیں۔ بلکہ ان سب کا خلاصہ ہندوستان کی ہر قوم مسلم وغیر مسلم کو ہندوانہ رنگ میں رنگنے اور ہندو طرز معاشرت اور مشرکانہ رسم ورواج کا عادی بنانے کے سوا کچھ نہیں، یہاں تک کہ ہندوستان کی زبان بھی بجائے اردو کے ہندی بنانے کی پیہم کوشش شروع کردی، اور دفتری زبان تو جہاں جہاں بس چلا بدل بھی ڈالی۔

مسلمانوں کی سب جماعتوں نے اس کے خلاف سخت احتجاج کیا، اور تمام اسلامی جماعتوں کی طرح جمعیۃ علماء ہند نے بھی ان اسکیموں کو شعائر اسلام کے مٹانے

اور اسلامی بنیادوں کو کھوکھلا کرنے والا اور مسلمانوں کو ہندوؤں میں جذب کرنیکا مرادف قرار دے کر اس کے خلاف احتجاج کیا، لیکن کانگریس نے ان تمام اختلافی احتجاجات کا ذرہ برابر اثر نہ لیا۔

ان اسکیموں کی حقیقت اور اسلام وشعائر اسلام کے لئے انتہائی مضر ہونا خود ان علماء وزعماء نے واضح کیا، جو کانگریس میں شریک تھے، اور بعض اب بھی شریک ہیں، ان میں سے چند حضرات کے کچھ کلمات ذیل میں درج ہیں۔ ان سے واقعات و حالات پوری طرح روشن ہو جائیں گے۔

جمعیۃ علماء ہند کا احتجاج واردھا اسکیم کے خلاف

جمعیۃ علماء ہند نے اپنے جلسہ منعقدہ مورخہ ۳، ۴، ۵، ۶ مارچ ۱۹۳۹ء میں ایک طویل قرارداد پاس کی، اس میں کہا کہ ہم کو افسوس ہے کہ واردھا اسکیم کے بنیادی اصول نمبر ۴ کی جو تشریح خود ڈاکٹر ذاکر حسین صدر واردھا کمیٹی نے اپنی رپورٹ اردو ایڈیشن رسالہ جامعہ ص: ۱۱۱، ۱۱۸، ۱۱۹ میں پیش کی ہے وہ بالکل مختلف چیز ہے، انھوں نے لکھا ہے کہ اس اسکیم کا آخری مقصد تعلیم یافتہ لوگوں کی ایک جماعت پیدا کرنا ہے، جس کا کلچر جس کا عقیدہ اور جس کے اعمال ایک ہی طرح کے ہوں، جو تمام مذاہب کے متعلق یہ عقیدہ رکھے کہ وہ سب سچے ہیں، اور ان کے درمیان کوئی فرق نہیں، نیز اہمسا کی صداقت پر ایمان ہو، اور اسی پر عمل بھی ہو۔

ظاہر ہے یہ اصول نہ صحیح ہے اور نہ عملی اس لئے کہ باشندگانِ ہند کے مختلف مذاہب اور رجحانات کو بالکل نظر انداز کر دیا ہے، مسلمانوں کے لئے یہ محال ہے کہ وہ اپنے اسلامی کلچر کو چھوڑ کر کسی متحدہ قوم کے اندر جذب ہو جائیں، اور اسلامی اور غیر اسلامی کلچروں کا کوئی امتیاز تسلیم نہ کریں۔ مسلمان دوسرے مذاہب کے ساتھ رواداری کا طرز عمل اختیار کرنے کے لئے تیار ہیں، مگر اس طرز عمل کے برعکس ایک بنا دینے

والے کسی ایسے نیشنل ازم (متحدہ قومیت) کا سبق پڑھایا جانے لگا، جو اسلامی تہذیب کی خصوصیات کو برباد کر دینے والا ہے تو یہ پالیسی نہ صرف سطحی بلکہ آئندہ کی تباہی کا باعث ہوگی۔ رپورٹ اجلاس جمعیۃ العلماء ص: ۵،۶ (از نظامنامہ جمعیۃ علماء اسلام)

دیہات سدھار اسکیم کے خلاف امارت شرعیہ کا احتجاج

مولانا ابو المحاسن محمد سجاد صاحب نائب امیر شریعت صوبہ بہار، صدر انڈی پنڈنٹ مسلم پارٹی، ممبر عاملہ جمعیۃ العلماء نے دیہات سدھار اسکیم کے خلاف ۲۳ اگست ۱۹۳۸ء کو دفتر امارت شرعیہ پھلواری شریف (پٹنہ) سے انریبل ڈاکٹر محمود وزیر کانگریس وزارت بہار کو ایک احتجاج نامہ ارسال کیا جس میں لکھتے ہیں:

''ان دونوں ادارات (مدھوبنی آشرم اور پھلواری شریف کیمپ جیل) میں جن مضامین کی تعلیم دیجائے گی وہ حسب ذیل ہیں، تاریخ گاؤں کی پنچایت دیہات کی زندگی، ستیا گرہ (سچائی) اور اہمسا (عدم تشدد کا مذہب) مہاتما گاندھی کی سوانح عمری خودنوشت (تلاش حق) اور مہاتما گاندھی کی تعلیم وغیرہ ہیں۔ اس خط کے ذریعہ اس اسکیم کے بدترین نقائص کی طرف آپ کو توجہ دلاتا ہوں، اور آپ سے مطالبہ کرتا ہوں، کہ وہ قابل اعتراض مضامین خارج کرنے کا اعلان کر دیں، آپ اور آپ کی حکومت نے اہمسا دھرم گاندھی جی کی سوانح عمری (تلاش حق) اور ان کی تعلیم کو خصوصیت کے ساتھ ہر قوم وملت کے لڑکوں کے لئے لازم قرار دیا ہے۔

یہ کس طرح جائز ہو سکتا ہے، کہ اہمسا دھرم، گاندھی جی کی تعلیمات اور ان کی سوانح عمری جو زیادہ تر ان کے مخصوص مذہبی معتقدات وتخیلات اور تلاش حق کی سرگردانیوں کی آئینہ دار ہیں، ہندوؤں کے لئے دل آویز اور بصیرت افروز ہو سکتی ہیں، لیکن یہ تمام چیزیں مسلمانوں کی مذہبی اخلاقی، تمدنی بنیادوں کو کھوکھلا کرنے والی ہیں، اس لئے مسلمان اس قسم کی تعلیم وتربیت ایک لمحہ کے لئے برداشت نہیں کر

سکتے، مسلمانوں کے مذہبی اور قومی رواجات کی بیخ کنی اس اسکیم میں نمایاں ہیں مسلمانوں میں بجائے اسلام از پھیلانے کے ہندوازم پھیلانے کا تہیہ کیا جارہا ہے۔''
امارت شرعیہ بہار آرگن نقیب نمبر ۱۴، جلد: ۶ (عصر جدید کلکتہ ۳ ستمبر ۱۹۳۸ء)

مسلمان کانگریسی اخبار مدینہ بجنور کا تبصرہ

اخبار مدینہ بجنور نے ۷ استمبر ۱۹۳۸ء میں بعنوان (گاندھی ازم اور مسلمان) لکھا ہے:

> اس خط کی نقل مولانا سجاد نے مولانا ابوالکلام کے پاس ارسال فرمائی ہے تاکہ وہ اپنی مخصوص ذمہ داریاں محسوس کرتے ہوئے اس کی طرف توجہ مبذول فرمائیں، اور اپنے اثرات کو کام میں لاکر نصاب تعلیم کی مذکورہ قابل اعتراض باتوں کے اخراج کے لئے کوشش عمل میں لائیں، ہمیں اب تک معلوم نہ ہوسکا کہ ان دونوں مقتدر اور محترم ہستیوں نے اس خط کا کیا جواب دیا، اور اب تک جواب دینے کی زحمت بھی گوارا فرمائی یا نہیں الخ

نیز اسی اخبار نے گاندھی مذہب کے سب سے بڑے شارح اچاریہ کرپلانی کی تحریر جو کانگریس کی موجودہ حقیقت کے بیان سے متعلق ہے، شائع کر کے اس پر تبصرہ لکھا ہے، جس کے چند جملے سوال میں نقل کئے گئے ہیں، وہ بھی قابل ملاحظہ ہیں۔

مولانا احمد سعید صاحب ناظم جمعیۃ علماء ہند کا ایک مقالہ

مولانا احمد سعید صاحب سابق ناظم جمعیۃ علماء ہند نے اپنی نظامت کے زمانہ میں سائمن کمیشن کے سلسلہ میں ایک مقالہ شائع کرایا تھا، جو ۱۴ جنوری ۱۹۳۸ء کے عصر جدید کلکتہ میں شائع ہوا ہے، اس کے چند جملے یہ ہیں:

''انگریز سے حقوق حاصل کرنے کا مطلب یہ ہے کہ انگریز کی جگہ ہندو کو وہی حق دیدیئے جاویں جو اب انگریز کو حاصل ہیں۔

(پھر فرماتے ہیں) ایسے سوراج کو سلام ایسی آزادی کو ڈنڈوت جس کا انجام

ہندو راج یا بنیوں کی غلامی ہو۔

(پھر فرماتے ہیں) ہندو بربریت اور غاصبیت نے مسلمانوں کی نظر میں آزادی کا مفہوم مشتبہ کر دیا ہے۔

(پھر فرمایا) اس کا (یعنی مسلمان کا) خیال ہے کہ جس کو آزادی کہا جاتا ہے، وہ درحقیقت ہندوؤں کی غلامی ہے، اور جس کو سوراج کہا جاتا ہے، وہ سامراج ہے"

اس قسم کے بہت سے بیانات ہیں، جو خود شرکاء کانگریس کی طرف سے شائع ہوئے، مگر افسوس و حیرت ہے کہ کانگریسی ہندوؤں نے مسلمانوں کے اس اجتماعی مطالبہ و احتجاج کا ذرہ برابر اثر نہ لیا، اور اپنی اسکیموں کا ایک شوشہ نہ بدلا پھر بھی یہ حضرات اسی طرح کانگریس میں شریک اور اس کی طرف مسلمانوں کو دعوت دینے اور اس کی حمایت کرنے میں سرگرم ہیں، اور یہ ظاہر ہے کہ اس طرح کی نکیر سے بتصریح حدیث عند اللہ بری نہیں ہو سکتے، حضرت عبد اللہ ابن مسعودؓ کی حدیث ترمذی ابوداؤد میں مذکور ہے۔

قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ و سلم لما وقعت بنواسرائیل فی المعاصی نھتھم علماء ھم فلم ینتھوا فجالسو ھم فی مجالسھم و اکلوھم و شاربوھم فضرب اللہ قلوب بعضھم ببعض فلعنھم علی لسان داؤد و عیسیٰ بن مریم ذلک بما عصوا و کانوا یعتدون. الحدیث (مشکوٰۃ) (۱)

(۱)...... فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ جب بنی اسرائیل نافرمانیوں میں پڑ گئے تو ان کے علماء نے ان کو منع فرمایا، وہ باز نہ آئے، پھر علماء ان کی مجالس میں اور کھانے پینے وغیرہ میں شریک رہے، تو اللہ تعالیٰ نے ان سب کے قلوب ایک جیسے کر دیئے اور حضرت داؤد اور عیسیٰ علیہ السلام کی زبانی ان پر لعنت بھیجی اور یہ اس لئے ہوا کہ انہوں نے نافرمانی کی اور حدود سے تجاوز کرنا ان کی عادت تھی۔

شرکتِ کانگریس کے پہلے اور دوسرے دور کا موازنہ

پہلا دور:

۱...... جنگ آزادی کے علمبردار اور تحریک پر قابو یافتہ مسلمان تھے، ہندو ساتھ لگ لئے تھے۔

۲...... مسلمانوں کی اپنی تنظیم بذریعہ خلافت کمیٹی مکمل تھی، اور جماعتی حیثیت سے اہل خلافت نے ہندوؤں سے صلح کی تھی۔

۳...... اس وقت مصالحت میں سب سے اہم چیز یہ تھی کہ محض ایک سیاسی مطالبہ (یعنی آزادی ہندوستان) میں اشتراک ہوگا، فریقین کے مذہبی امور میں سے کسی ادنیٰ امر کو ہاتھ نہ لگایا جاوے گا۔

۴...... شرکت کانگریس کی وجہ سے مسلمان کسی خلافِ شرع کام میں شرکت پر مجبور نہ تھے، بلکہ جو افعال خلاف شرع صادر ہوئے، وہ افراد و اشخاص کے ذاتی اعمال تھے، جیسے قشقہ لگانا وغیرہ کانگریس کی قرارداد نہ تھی، اور جب ان کے خلافِ شرع ہونے پر تنبیہ کی گئی تو مسلمان اس سے باز آ گئے۔

دوسرا دور:

۱...... جنگ آزادی کے علمبردار اور تحریک پر پورے قابو یافتہ ہندو ہیں مسلمان ساتھ لگ لئے۔

۲...... موجودہ کانگریس میں مسلمانوں کی مستقل قومیت ہی تسلیم نہیں اور نہ کوئی مطالبہ قومی اور مذہبی حیثیت سے کانگریس کے پلیٹ فارم پر سنا جا سکتا ہے، کانگریس

میں داخلہ انفرادی طور سے اور وہ بھی بلا شرط ہو سکتا ہے۔

۳:......اب کانگریس مسلمانوں کے مذہبی تمدنی، معاشرتی سب امور میں نہ صرف یہ کہ دخل دینا چاہتی ہے، بلکہ جبری طور سے شعائر اسلام کو مٹا کر ہندو رنگ چلانے کی سعی پیہم کر رہی ہے۔

۴:......اب خود کانگریس کے آئین اور جاری کردہ تجاویز میں ایسی چیزیں داخل ہیں جو نہ صرف معصیت بلکہ اصولِ شریعت اور شعائرِ اسلام کے سراسر خلاف ہیں، جیسے جھنڈے کی سلامی، مشرکانہ ترانہ اور ہندوانہ تعلیم وغیرہ کی اسکیمیں۔ اور مسلمانوں کو بوجہ اقلیت آئینی طور پر یہ اختیار ہرگز نہیں کہ اس میں تبدیلی کرا سکیں۔

مندرجہ بالا تفصیلات سے جس طرح یہ واضح ہو گیا کہ کانگریس کے ساتھ اشتراک کا پہلا دور جو حضرت شیخ الہندؒ کے عہد میں تھا، وہ ہندوؤں کے ساتھ ایک قسم کی مصالحت یا استعانت کی جائز صورت تھی، اسی طرح یہ بھی روشن ہو گیا کہ اس کے دوسرے دور میں یہ اشتراک محض مغلوبیت اور متابعت ہو گئی، اور وہ بھی ایسے امور میں جو شعائر اسلام کو ہدم کرنے والے ہیں، جس کو وہ حضرات بھی مذکورہ بالا بیانات میں تسلیم کر رہے ہیں، جو کانگریس کی شرکت کو نہ صرف جائز فرماتے ہیں، واجب تک کہنے سے دریغ نہیں کرتے۔ اور بڑی تلبیس یہ کی جاتی ہے کہ اس طرز عمل کو حضرت شیخ الہندؒ قدس سرہٗ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے، حالانکہ سابقہ تصریحات سے معلوم ہو چکا کہ اس موجودہ طرز عمل کو حضرت ممدوح کے طرز عمل سے کوئی دور کی بھی نسبت نہیں بلکہ دونوں میں کھلا ہوا تضاد ہے۔

کفار کے ساتھ اتفاق کی تین قسمیں جو اوپر مفصل ذکر کی گئی ہیں، ان میں معلوم ہو چکا ہے، کہ جب غلبہ اسلام کا نہ ہو، تو کفار سے استعانت بھی جائز نہیں چہ جائیکہ بلا شرط انفرادی طور پر کفار کی جماعت میں شامل ہو جانا، اور پھر شعائر کفر کے اظہار اور

شعائرِ اسلام کے مٹانے والی تجاویز نافذ کرنے کے باوجود اس میں شامل رہنا جو تیسری قسم کی بھی بدترین فرد ہے۔

خلاصہ

خلاصہ یہ ہے کہ اس وقت مسلمانوں کی شرکتِ کانگریس بلاشبہ ناجائز ہے، بچند وجوہ:

اول...... اس لئے کہ کانگریس میں ہندو غالب اور مسلمان مغلوب ہیں، اور ایسی حالت میں اگر ہندو بالفرض رواداری سے بھی کام کریں، اور اسلام کے خلاف تجاویز نافذ نہ کریں، جب بھی حسبِ تصریحاتِ مذکورہ ان سے اشتراکِ عمل جائز نہیں۔

دوم...... اس لئے کہ صورتِ موجودہ میں مسلمانوں کو طوعاً یا کرہاً ہندوؤں کی متابعت کرنا پڑتی ہے۔

سوم ...... اس لئے کہ ایسی متابعت و مشارکت حسب تصریح جمہور مفسرین و فقہاء و حضرت شیخ الہند نور اللہ مرقدہٗ موالات کفار کی حد میں داخل ہو جاتی ہے، جیسا کہ خطبۂ صدارت جلسہ جمعیت علمائے دہلی کے حوالہ سے اوپر آچکا۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

چند شبہات اور ان کا ازالہ

کہا جاتا ہے کہ حدیث میں آخر زمانہ کے متعلق خبر ہے کہ مسلمان رومی کفار سے صلح کریں گے، اور ان کے ساتھ مل کر کسی تیسری قوم کا مقابلہ کریں گے، اور کامیاب ہوں گے، اس سے بلاشرط ہندوؤں کے ساتھ مل کر انگریزوں کا مقابلہ کرنے کی اجازت نکالی جاتی ہے۔

یہ حدیث ابوداؤد کتاب الفتن میں حضرت ذی مخبرؓ سے مروی ہے، لیکن اول تو اس حدیث میں صلح کی نوعیت اور شرائط صلح کا کوئی تذکرہ نہیں کہ اس میں حکم اسلام کا حسب شرط غالب ہوگا، یا کیا صورت ہوگی، کیونکہ الفاظ حدیث صرف یہ ہیں:

ستصالحون الروم صلحاً امنا

یعنی تم رومیوں سے قابل اطمینان صلح کروگے۔

دوسرے یہ ایک خبر ہے، جو زمانہ فتن میں پیش آنے والے واقعات سے متعلق ہے، اس میں یہ کیا ضرور ہے کہ جو کچھ اس وقت کے مسلمان کریں، وہ صورت صحیح اور قابل تقلید ہو، بلکہ فتن کی احادیث میں تو عموماً وہ واقعات مذکور ہیں، جو شرعاً مذموم ہیں، مثلاً حدیث میں ہے کہ آخری زمانہ میں جھوٹ اور جھوٹی شہادتوں کی کثرت ہو جائے گی، راگ مزامیر عام ہوجائیں گے، اور اولاد والدین کی نافرمانی کرے گی، وغیرہ وغیرہ تو جس طرح ان احادیث سے جھوٹ اور مزامیر اور والدین کی نافرمانی کو جائز نہیں کہا جاسکتا، اس اشتراک عمل کو علی الاطلاق کیسے جائز کہا جاسکتا ہے، بالخصوص جب کہ دوسری احادیث صحیحہ میں اس کے لئے غلبۂ اسلام و مسلمین کی شرط بھی مذکور ہو، اور حدیث کے آخر میں فتح کے بعد پھر باہمی قتل وقتال اور اس میں عصابہ مسلمین کی شہادت مذکور ہے، اس سے آخری جہاد کا محمود ہونا معلوم ہوتا ہے، جو نقض صلح کے بعد ہوگا، لیکن اس سے پہلے کے واقعہ کے جواز پر کوئی استدلال نہیں ہوسکتا، علاوہ ازیں حدیث میں اس کی تصریح موجود ہے کہ مسلمانوں کی جماعت ہوگی، اور اپنے استقلال کو باقی رکھ کر رومیوں سے صلح کرے گی، اس سے کفار کی جماعت میں انفرادی طور سے بلاشرط داخلہ و ادغام کے جواز کا تو وہم بھی نہیں ہوسکتا۔

۲:...... بیان کیا جاتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت مدینہ کے بعد مدینہ کے بعض قبائل یہود سے اس پر صلح کی کہ دونوں قومیں متفق ہوکر دوسری اقوام کا مقابلہ کریں گی، اس سے موجودہ حالت میں ہندوؤں کے ساتھ اشتراک عمل کا جواز

بڑے شدومد سے ثابت کیا جاتا ہے۔

ہجرتِ مدینہ کے بعد قبائل یہود سے صلح کے شرائط

مگر افسوس ہے کہ اس واقعہ کی نقل اور اس سے استدلال میں کھلی ہوئی خیانت سے کام لیا گیا ہے، کہ جس کتاب اور جس جگہ سے یہ واقعہ نقل کیا جاتا ہے، اسی جگہ اسی کتاب میں وہ شرائط بھی مذکور ہیں، جن کی بناء پر یہ اشتراک ومصالحت جائز رکھی گئی، وہ یہ کہ وہاں قوت وغلبہ مسلمانوں کا تھا، یہ قبائل یہود تابع ہو کر ساتھ لگے تھے، اور وہ بھی اس طرح کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دونوں قوموں مسلم وغیر مسلم کے حکم مسلمہ فریقین تھے کہ کوئی اختلاف باہم پیش آوے، تو فریقین کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ ماننا پڑے گا۔

صلح نامہ

یہ پورا واقعہ اور معاہدہ جو اس سلسلہ میں لکھا گیا ہے، سیرت ابن ہشام میں بالفاظ ذیل منقول ہے:

هذا كتاب من محمد النبى صلى الله عليه و سلم بين المؤمنين و المسلمين من قريش و يثرب و من تبعهم فلحق بهم و جاهد معهم انهم امة واحدة من دون الناس (الى ان قال) او ان المؤمنين بعضهم موالى بعض دون الناس و انه من تبعنا من اليهود فان له النصر و الاسوة غير مظلومين و لا متناصرين عليهم (ثم قال) و انه ما كان بين اهل هذه الصحيفة من حديث او اشتجار يخاف فساده فان مرده الى الله عزوجل و الى محمد رسول الله صلى الله عليه و سلم۔

یہ معاہدہ ہے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے درمیان مؤمنین و مسلمین کے قریش اور اہل یثرب اور ان لوگوں کے جو ان کے تابع اور ان کے ساتھ ملحق ہوں، اور ان کے ساتھ جہاد کریں، یہ کہ وہ ایک جماعت ہیں، دوسرے لوگوں کے مقابلہ میں (الی قولہ) اور یہ کہ مسلمان آپس میں ایک دوسرے کے ولی اور دوست ہیں، بمقابلہ غیروں کے اور یہ کہ جو لوگ یہود میں سے ہمارے تابع ہو جاویں تو ان کی امداد کی جاوے گی نہ ان پر ظلم کیا جائے گا، نہ ان کے مقابل کی امداد کی جاوے گی، (پھر لکھا) اور جو اس عہد نامہ والوں کے درمیان کوئی اختلاف جھگڑا پیش آ جاوے، تو اس کا رجوع فیصلہ کیلئے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہوگا۔

اس صحیفۂ گرامی کے خط کشیدہ جملوں کو غور سے ملاحظہ فرمائیے کہ دو جگہ اس کی تصریح ہے کہ اصل قوت و غلبہ مسلمانوں کا تھا، خواہ تعداد بھی زیادہ ہو، جیسا کہ قبائل اوس وخزرج کے داخلِ اسلام ہو جانے سے ظاہر ہے، یا تعداد کم ہی ہو، کیونکہ اس زمانہ میں غلبہ کا مدار اکثریت تعداد پر نہ تھا، بہرحال یہود محض تابع ہو کر ساتھ لگ گئے تھے، اور تابع بھی ایسے کہ ہر اختلافی معاملہ کا حکم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ماننے پر مجبور تھے۔

کیا کانگریسی ہندو اب اسی طرح تابع ہو کر مسلمانوں کے پیچھے چلنے والے ہیں، یا وہ مسلمانوں کے کسی بڑے سے بڑے کو اپنا حکم تسلیم کر سکتے ہیں، یا اس کے برعکس کانگریسی مسلمان ان کے تابع ہیں، اور ان کے سرگروہ گاندھی کو طوعاً یا کرہاً حَکَم بنا رکھا ہے، پھر اس واقعہ کو ناتمام نقل کر کے اس کو کانگریس میں مدغم ہو جانے کی دلیل بنانا اور لفظ امۃ واحدۃ سے جو حسب تصریح لسان العرب اس جگہ توسعاً و مجازاً استعمال ہوا ہے، کانگریس کی مجوزہ متحدہ قومیت پر استدلال کرنا کس قدر ظلمِ عظیم ہے۔

حضرت گنگوہیؒ کے فتوے کی حقیقت۔

حامیان کانگریس اپنے استدلال میں ایک فتویٰ قطب عالم حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی قدس سرہٗ کا شرکت کانگریس کے جواز پر پیش کرتے ہیں، لیکن ان کے دعوے کی تردید کیلئے خود یہی فتویٰ کافی ہے، اس کے سوال و جواب کو پورا پورا پڑھنے کے بعد ہر سمجھ دار انسان اس سے موجودہ وقت کی کانگریس کے ساتھ موجودہ طرز کے اشتراک عمل کو ناجائز قرار دینے کے سوا کوئی نتیجہ نہیں نکال سکتا۔

سوال و جواب کی بعینہٖ نقل

اسلئے ہم وہ سوال و جواب بعینہٖ نقل کرتے ہیں تا کہ اہل بصیرت خود فیصلہ کرلیں، کہ اس فتوے سے موجودہ دور کی کانگریس میں یہ بلاشرط انفرادی داخلہ اور اس میں بیسیوں چیزیں مسلم مفاد اور اسلامی اصول کے خلاف رائج ہونے کے باوجود اس میں داخل رہنا جائز ثابت ہوتا ہے یا ناجائز۔ (منقول از نصرۃ الابرار ص:۱۳)

سوال سوم

ایک جماعت قومی مسمی بہ نیشنل کانگریس جو ہندو اور مسلمان وغیرہ سکنائی ہند کے واسطے رفع تکالیف وجلب منافع دنیاوی چند سال سے قائم ہوئی، اور ان کا اصل اصول یہ ہے کہ انہیں امور میں ہو جو کل جماعتہائے ہند پر مؤثر ہوں اور ایسے امر کی بحث سے گریز کی جاوے جو کسی ملت یا مذہب کو مضر ہو، یا خلاف سرکار ہو، تو ایسی جماعت میں شرکت درست ہے یا نہیں؟

سوال چہارم

سید احمد خان نیچری نے جو ایک جماعت ایسوسی ایشن قائم کی ہے اور لوگوں کو بذریعہ اعلان مطبوعہ ۸/اگست ۱۸۸۸ء یوں ترغیب دے رہا ہے کہ میری جماعت میں

بڑے بڑے ہندو ذی وجاہت مثل راجہ بنارس وغیرہ جو کانگریس کے برخلاف ہیں، شامل ہیں، ہر شخص جو داخل ہو، پانچ پانچ روپیہ چندہ ماہواری میرے نام علیگڑھ یا بنارس میں راجہ صاحب کے نام روانہ کیا کرے، وغیرہ وغیرہ اور اس کی مدد کے واسطے جابجا ایسوسی ایشنیں انجمن اسلامیہ کے نام سے لوگوں نے شہروں میں قائم کی ہیں، جو شخص ان کے ساتھ اتفاق کرنے سے برخلاف معلوم ہوتا ہے اس کے ساتھ طرح طرح کا فساد اور فتنہ برپا کر کے اس کو جبراً ملانا چاہتے ہیں، آیا ایسی جماعت میں مسلمانوں کو شامل ہونا، اور ان کی مدد کرنا شرعاً درست ہے یا نہیں، اور نیچری لوگ بدخواہِ اسلام ہیں یا نہیں؟

جواب [1] از حضرت گنگوہی قدس سرہٗ

اگر ہندو مسلمان باہم شرکت بیع و شراء و تجارت میں کر لیویں اس طرح کہ کوئی نقصان دین میں یا خلاف شرع معاملہ کرنا اور سود اور بیع فاسد کا قصہ پیش نہ آوے جائز ہے اور مباح ہے مگر سید احمد سے تعلق رکھنا نہیں چاہئے اگرچہ وہ خیر خواہی قوم کا نام لیتا ہے، یا واقع میں خیر خواہ ہو، مگر اس کی شرکت مآل کار اسلام و مسلمانوں کو سم قاتل ہے، ایسا میٹھا زہر پلاتا ہے کہ آدمی ہرگز نہیں بچتا پس اس کے شریک مت ہونا، اور ہنود سے شرکت معاملہ کر لینا، اور اگر ہنود کی شرکت سے اور معاملہ سے بھی کوئی خلاف شرع امر لازم آتا ہو، یا مسلمانوں کی ذلت واہانت یا ترقی ہنود ہوتی ہو، وہ کام بھی حرام ہے، جیسا کہ اوپر لکھا گیا، اسی طرح پر ہے اور بس۔

فقط بندہ رشید احمد گنگوہی عفی عنہ

---

(۱)......اس سوال پر رسالہ نصرۃ الابرار میں اور بھی علماء کے جوابات لکھے ہوئے ہیں، جو تقریباً حضرت گنگوہی کے جواب کے قریب قریب ہی ہیں، یہاں حضرت گنگوہی کے جواب پر اکتفاء کیا جاتا ہے کیونکہ استدلال اسی سے کیا جاتا ہے۔۱۲ منہ

اس سوال و جواب کے خط کشیدہ الفاظ کو مکرر پڑھ کر مندرجہ ذیل امور پر نظر ڈالئے:

۱......یہ فتویٰ ۱۳۰۶ھجری کا شائع شدہ ہے، جس سے معلوم ہوا کہ اس میں جس کانگریس کی شرکت کا سوال ہے، وہ اب سے تقریباً انسٹھ برس پہلے کی کانگریس ہے جب کہ اس کی بنیاد کسی انگریز کے ہاتھوں قائم ہوئی تھی، اور اپنے بالکل ابتدائی حالات میں تھی۔

۲......اس وقت کی کانگریس کے اغراض و مقاصد اس سے زائد نہ تھے کہ باشندگان ملک کی تکلیف کے ازالہ یا کسی خاص فائدہ کی تحصیل کے لئے حکومت کے سامنے کوئی درخواست پیش کی جائے، جیسے آج کل کسی محلّہ میں بسنے والے ہندو مسلمان مل کر میونسپل بورڈ میں محلّہ کی روشنی یا صفائی وغیرہ کے لئے کوئی مشترک درخواست دیں، نہ کسی حکومت کا مقابلہ تھا نہ کسی نئے نظامِ حکومت کی تشکیل و تجویز زیر بحث تھی نہ اقلیت و اکثریت کی جنگ تھی، اور ظاہر ہے کہ ایسی درخواستوں میں مسلمان اور ہندو کا اجتماع ایک نوع کی مصالحت و معاملہ کے سوا کوئی چیز نہ تھی۔

۳......اس وقت کی کانگریس کے اصول مقررہ میں سے تھا کہ کانگریس کسی ایسے امر میں بحث بھی نہ کرے گی، جو کسی مذہب و ملت کو مضر ہو۔

۴......اس وقت کی کانگریس کا یہ بھی اصول تھا کہ کسی ایسے امر میں بھی بحث نہ کرے گی، جو خلاف سرکار ہو۔

۵......حضرت گنگوہی قدس سرہٗ سے اس کانگریس کی شرکت کا سوال کیا گیا جس کی کیفیات و حالات اوپر معلوم ہوئے۔

۶......ایسی جماعت کے ساتھ بھی حضرت موصوف نے صرف شرکت معاملہ کی اجازت

دی جیسے بیع و شراء وغیرہ کی شرکت ہو نہ یہ کہ دونوں قوموں کے اتحاد و اشتراک سے کسی متحدہ قومیت کی بنیاد ڈالی جاوے، اور یہ شرکت معاملہ کی اجازت بھی شرائط ذیل کے ساتھ دی:

الف:......اس شرکت و معاملہ سے کوئی امر خلاف شرع لازم نہ آوے۔

ب:......اس میں مسلمانوں کی کوئی ذلت و اہانت نہ ہو۔

ج:......اس شرکت سے ہنود کو تقویت و ترقی نہ ہو۔

اور اگر ان شرائط میں سے کوئی شرط مفقود ہو، تو اس شرکت معاملہ کو بھی صراحۃً حرام قرار دیا ہے۔

اب اہل نظر سے یہ سوال ہے کہ:

۱:......کیا کانگریس اب بھی وہی ساٹھ برس پہلے کی کانگریس ہے، اور اس کے وہی اغراض و مقاصد ہیں یا وہ اپنے موجودہ آئین کی رو سے حکومت وقت کے خلاف حصول آزادی کی آئینی جنگ کی علمبردار اور نئی حکومت اور نئے نظام کا مطالبہ رکھتی ہے، جس کیلئے وہ ہندو مسلم کی ایک مشترک حکومت کے ایسے قوانین بنا رہی ہے جس میں مسلم قوم اپنی اقلیت کی بناء پر ہمیشہ کے لئے ہندوؤں کی غلام بنی رہے۔

۲:......اور کیا اب بھی کانگریس کا یہی طرز عمل ہے کہ وہ کسی ایسے امر سے بحث نہ کرے، جو کسی مذہب و ملت کو مضر ہو، اور اگر ایسا ہے تو کیا واردھا کی تعلیمی اسکیم اور دیہات سدھار اسکیم اور ودیا مندر اسکیم اور بندے ماترم کے مشرکانہ ترانے اور جھنڈے کی مشرکانہ سلامی میں مسلمانوں کی شرکت مذہب اسلام اور مسلم قوم کے لئے مضر نہیں جن کی کانگریس میں صرف بحث نہیں بلکہ تجویز پاس ہو کر نافذ ہو چکی ہے، اور باوجود تمام مسلمان جماعتوں کے احتجاج کے ان کا ایک شوشہ

بھی وہ بدلنے کے لئے تیار نہیں۔

۳:......اور کیا اب بھی کانگریس وہی ٹوڈیوں کی جماعت ہے جو خلاف سرکار کسی امر میں بحث کرنے کیلئے بھی تیار نہیں۔

اگر آج کانگریس کے یہ حالات نہیں رہے، جیسا کہ ہر آنکھوں والے پر روشن ہے تو پھر جو فتویٰ مذکورہ بالا حالات میں ایک جماعت کی شرکت معاملہ کے جواز کا دیا گیا تھا، اس کو آج کی مسلم کش، اسلام کی دشمن کانگریس پر منطبق کرنا کیا خیانت نہیں؟

احقر نے اسی تحریر میں جہاں ہندو مسلم وفاق کی تین صورتیں جائز و ناجائز رکھ کر یہ سوال کیا ہے کہ کانگریس کی شرکت ان میں سے کس صورت میں داخل ہے، وہیں واضح کر دیا ہے، کہ کانگریس کے ساتھ اشتراک عمل کو علی الاطلاق نہ کسی نے پہلے ناجائز کہا ہے نہ اب کوئی کہتا ہے۔ بلکہ اسکے حکم میں تفصیل ہے بدرجۂ مصالحت و معاملہ جس کو حضرت گنگوہیؒ کے فتوے میں شرکت معاملہ سے تعبیر کیا گیا ہے، بشرائط مذکورہ جائز ہے ناجائز صورت وہ ہے جو اس وقت رائج ہے، کہ کانگریس ایک مشترک حکومت مسلم و غیر مسلم کی بنانا چاہتی ہے، جس میں حکم اور فیصلہ کی قوت صرف اکثریت کے ہاتھ میں ہے، اور اقلیت کو اس کا تابع رہنا ناگزیر ہے، پھر اس میں ہندوؤں نے اپنی اسی اکثریت کی بناء پر حصول حکومت سے پہلے بھی ایسے قوانین و قواعد نافذ کرنا شروع کر دیئے جو بقول مولانا سجاد صاحب مرحوم اسلام کی بنیادوں کو کھوکھلا کرنے والے ہیں، اور در حقیقت ہدم اسلام کی تمہید ہیں نعوذ باللہ منہ۔

الغرض ہر ذی عقل جانتا ہے کہ فتویٰ کا مدار حالات پر ہوتا ہے، حالات بدلنے سے فتویٰ بھی بدل جاتا ہے، آج جب کہ کانگریس سر سے پیر تک بدل چکی ہے، وہ بجائے ایک درخواست کنندہ کے خود حاکم بننے لگی اور سراسر اسلام دشمنی پر اتر آئی، اس وقت کی کانگریس کے لئے حضرت گنگوہیؒ کا مذکورہ فتویٰ استدلال میں پیش کرنا انصاف

اور دیانت کا خون کرنا ہے، پھر اسی پر بس نہیں خود اس فتوے میں جن شرائط کی تصریح کے ساتھ شرکت معاملہ کی اجازت دی ہے، وہ شرائط اس وقت ایک ایک کر کے مفقود ہیں مگر فتویٰ پھر بھی وہی باقی ہو، عقل و دیانت سے کس قدر بعید ہے۔

فالیٰ اللّٰہ المشتکی و علیہ توکلت و الیہ انیب۔

دوسرے سوال کا جواب

کانگریس اور مسلم لیگ کی شرعی حیثیت

کانگریس کے جو حالات اور احکام پہلے سوال کے جواب میں ابھی مذکور ہوئے ہیں، ان سے واضح ہو چکا کہ اس میں ہندوؤں کا غلبہ بلکہ مکمل قبضہ ہے، اس لئے مسلمانوں کے مذہبی اور سیاسی حقوق برباد ہو رہے ہیں، اور مسلمانوں کا اس میں بلاشرط انفرادی داخلہ تحفظ حقوق کا کسی طرح ضامن نہیں ہو سکتا، اس بناء پر ضروری ہے کہ مسلمانوں کی کوئی منظم جماعت اس کے باطل منصوبوں کو پامال کرے، اور بحالت موجودہ ہندوستان میں مسلم لیگ کے علاوہ کوئی ایسی منظم اور با اقتدار جماعت نہیں ہے جس کو مسلمانوں کی اکثریت سے وہ قوت حاصل ہو، جس کو حکومت وقت اور ہمسایہ قومیں تسلیم کر سکیں۔

اس لئے تحریک آزادی اور مذہبی و سیاسی حقوق کی حفاظت کے لئے مسلمانوں کو

مسلم لیگ کے ساتھ تعاون کرنا ناگزیر ہے، رہا یہ سوال کہ بسا اوقات مسلم لیگ کے ارکان بھی قانون ساز مجلسوں میں اسلامی احکام کی پرواہ نہیں کرتے، سو کھلی بات ہے کہ اس کا تدارک عام طور پر مسلمانوں کے متوجہ ہونے اور زوردار طریقہ پر توجہ دلانے سے ہوسکتا ہے، بخلاف کانگریس کے کہ اس کے آئین میں مسلمانوں کی کوئی مذہبی اور قومی حیثیت ہی تسلیم نہیں، تو ان کے کسی مطالبہ کا کیا وزن ہوسکتا ہے، اور بار بار اس کا مشاہدہ بھی ہو چکا ہے۔

امور دینیہ میں فساق کی اعانت واستعانت بالاتفاق جائز ہے

علاوہ ازیں ائمہ اسلام اس پر متفق ہیں کہ کفار کے مقابلہ میں فساق و فجار اور نام کے مسلمانوں کی بھی حمایت و اعانت میں کوئی مضائقہ نہیں، اور جہاد وغیرہ امور دینیہ میں ان سے استعانت اور ان کی اعانت بلاخلاف جائز ہے۔ شرح سیر کبیر میں ہے:

و لاباس بان يقاتل المسلمون من العدل مع الخوارج المشركين من اهل الحرب لانهم يقاتلون الأن لدفع فتنة الكفر و اظهار الاسلام فهذا قتال على الوجه المامور به و هو اعلاء كلمة الله تعالىٰ .

شرح سیر: ۲۴۱، ج: ۳

اس میں کوئی مضائقہ نہیں کہ اہل سنت والجماعت مسلمان خوارج کے ساتھ مل کر کفار اہل حرب کا مقابلہ کریں کیونکہ خوارج اس وقت فتنہ کفر کے دفع کرنے اور اسلام کے اعزاز کے لئے قتال کرتے ہیں اس لئے یہ قتال بطریق مامور بہ واقع ہوا ہے، اور وہ طریق ہے اعلاء کلمۃ اللہ کا۔

نیز شمس الائمہ سرخسیؒ کی مبسوط میں ہے:

و كذلك ان كان فى بلاد الخوارج الذين اغار

علیهم اهل الحرب قوم من اهل العدل لم یسعهم الا ان یقاتلوا عن بیضة المسلمین و حریمهم لان الخوارج مسلمون ففی القتال یدفعون اهل الحرب عن المسلمین و دفع اهل الحرب عن المسلمین واجب علی کل من یقدر علیه فلهٰذا لم یسعهم الا ان یقاتلوهم. (مبسوط :۹۸،ج:۱۰)

اسی طرح وہ خوارج جن کے شہروں پر کفار اہل حرب نے حملہ کیا ہو اگر ان شہروں میں کچھ اہلسنت مسلمان بھی بستے ہوں، تو اس حملہ کفار کی حالت میں ان مسلمانوں کے لئے اس کے سوا چارہ نہیں کہ وہ جماعت مسلمین اور ان کے حریم سے مدافعت کے لئے قتال کریں، ایسی حالت میں خوارج کے ساتھ مل کر قتال کرنا اعزاز دین کے لئے ہے اور کیوں کہ وہ اس قتال کے ذریعہ اہل حرب کو مسلمانوں سے دفع کرتے ہیں، اور مسلمانوں سے اہل حرب کا دفع کرنا ہر اس شخص پر واجب ہے، جو اس مدافعت کی قوت رکھتا ہو، اسی لئے ان مسلمانوں کے لئے بجز اس کے کوئی گنجائش نہیں کہ وہ خوارج کے ساتھ مل کر کفار کا مقابلہ کریں۔

(مبسوط ص:۹۸، ج:۱۰)

روایات مذکورہ میں خوارج کی حمایت اور ان کے ساتھ شریک ہو کر کفار کا مقابلہ کرنا مشروع کیا گیا ہے، حالانکہ خوارج وہ جماعت ہے جس کے فاسق ہونے پر امت کا اجماع ہے بلکہ روایات حدیث میں ان کے متعلق ایسے الفاظ بھی موجود ہیں، جن سے بظاہر ان کا کافر ہونا معلوم ہوتا ہے، اور اسی لئے بہت سے علماء نے ان کی تکفیر بھی کی ہے، لیکن جمہور کے نزدیک وہ کافر نہیں مسلمان ہیں، اگر چہ نام کے مسلمان ہیں، ان سب باتوں کے باوجود بمقابلہ کفار ان کی حمایت و نصرت کو جائز رکھا گیا ہے،

حالانکہ خوارج سے وہ خطرات تھے جو آج لیگ کے آزاد خیالوں سے بھی کسی طرح نہیں ہو سکتے۔ بہر حال مسلمان اگر چہ نام ہی کے مسلمان ہوں، کفار کے مقابلہ میں ان کی حمایت اور بمقابلہ کفار ان کے ساتھ کسی جائز معاملہ میں اشتراک عمل بلاشبہ جائز ہے، نیل الاوطار میں علامہ شوکانی نے اس پر اجماع نقل کیا ہے ان کے الفاظ یہ ہیں:

و تجوز الاستعانة بالفساق على الكفار اجماعاً

(نیل الاوطار، ص:۲۲۴، ج:۷)

اور جائز ہے امداد لینا فساق سے بمقابلہ کفار باجماع۔

اور یہی وجہ ہے کہ موجودہ ترکی سلطنت اور اس کے ارکان کی خلافِ شرع کاروائیاں اور بدعملی جو مسلم لیگ اور اس کے ارکان کی بدعملی سے کہیں زائد اور سب کے نزدیک مسلم ہے، لیکن ہمیشہ ہندوستان کے ہر طبقہ کے علاوہ جمعیت علماء ہند اور عامہ مسلمین نے بمقابلہ کفار ان کی حمایت ونصرت کو ضروری سمجھا اور حسب استطاعت اس میں حصہ لے لیا۔

جواز کی وجہ

اور وجہ جواز کی یہ نہیں کہ شریعت سے ناواقف اور لاپرواہ مسلمانوں سے مذہبی نقصانات کا خطرہ نہیں، بلکہ وجہ یہ ہے کہ بمقابلہ کفار ان کی حمایت نہ کرنا اسلام اور جماعت مسلمین کو ضعف پہنچانا ہے اور کفار کے غلبہ کو دور کرنے کے بعد مسلمانوں کی اصلاح اور عہدہ داروں کا تغیر وتبدل مسلم جمہوریت کے ہاتھ میں ہوگا۔

حضرت تھانویؒ کا ارشاد گرامی

یہی وجہ ہے کہ امام العصر مجاہد ملت حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہٗ نے تمام موجودہ حالات کے مطالعہ اور تمام شرعی پہلوؤں پر نظر غائر فرمانے

کے بعد مسلم لیگ کی حمایت کے لئے بالفاظ ذیل ارشاد فرمایا ہے جو کہ بنام تنظیم المسلمین حضرت کی حیات میں شائع ہو چکا ہے۔

اس میں تو کوئی شبہ نہیں کہ فضاء حاضر میں مسلمانوں کو شدید استحکام کے ساتھ منظم ہونے کی سخت ضرورت ہے، اور ان کے تمام منافع ومصالح کی حفاظت اور تمام مضار ومفاسد کی صیانت اس تنظیم پر موقوف ہے، مگر اس کے ساتھ ہر مسلمان پر یہ بھی واجب التسلیم والعمل ہے، کہ وہ تنظیم حسب قدرت بالکل احکام شرعیہ کے مطابق ہو، سو اگر اس وقت اس صفت کی کوئی منظم جماعت موجود ہوتی یا اس کا ہونا متوقع قریب ہوتا، تو جواب واضح تھا، لیکن موجودہ حالت میں افسوس اور نہایت افسوس ہے کہ ایسی جماعت کا نہ تحقق ہے نہ قریب توقع اس لئے بجز اس کے چارۂ کار نہیں کہ موجودہ جماعتوں میں سے کسی جماعت میں داخل ہوں، اور اس میں قواعد شرعیہ کی رو سے جو نقص ہو، اس کی اصلاح کریں، اور اگر ان میں ایک کی اصلاح آسان اور دوسری کی دشوار ہو، تو بقاعدہ عقلیہ ونقلیہ (من ابتلی ببلیتین فلیختر اھونھما) اس میں داخل ہو جاویں جس کی اصلاح آسان ہو، سو اس کے متعلق جہاں تک تفحص بلیغ کے ساتھ تحقیق کیا گیا، مذکورہ ومسئولہ دونوں جماعتوں میں ان کی موجودہ حالت پر نظر کر کے مسلم لیگ کے نقائص کا رفع کرنا سہل ہے، اور کانگریس کی اصلاح متعسر بلکہ متعذر رہے۔ الخ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

تیسرے سوال کا جواب

مطالبۂ پاکستان کی شرعی حیثیت

تیسرا سوال مطالبۂ پاکستان سے متعلق ہے ظاہر بات ہے کہ اگر ہندوستان کا ایک مرکز رہے، تو ہندو اکثریت کے سبب پورے ہندوستان پر ہندوؤں کی حکومت ہو گی، گو اس میں بڑی جدوجہد کے بعد کسی حد تک مسلمانوں کے حقوق کا تحفظ بھی کر لیا جاوے، (جس کی حالات موجودہ وسابقہ کی بناء پر کوئی توقع نہیں) اور یہ امر مسلم ہے کہ اپنے اختیار سے اپنے اوپر غیر مسلم حکومت مسلط کرنے کا مطالبہ کرنا، یا اس کا قبول کرنا کسی طرح جائز نہیں ہوسکتا۔

اور دو مرکز مسلم و غیر مسلم ہو جانے کی صورت میں مسلم مرکز میں حکومت مسلمانوں کی ہو گی، جس کے سبب اپنی حدود میں اسلامی احکام کے موافق دستور اور نظام جاری کرنے پر قدرت حاصل ہو گی، نیز یہ با اقتدار حکومت دوسرے صوبوں میں مسلمانوں کے حقوق کی پوری حفاظت اور نگرانی کر سکے گی، جو مسلمانوں کی اقلیت زدہ منتشر قوت کے ذریعہ کسی حال متصور نہیں۔

لہٰذا مسلمانوں کے لئے دو مطالبے ضروری ہیں، ایک اپنے لئے مستقل مرکز کا جس کو پاکستان سے تعبیر کیا جاتا ہے، دوسرے مسلم اقلیتوں کے صوبے میں مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت کا غیر مبہم الفاظ میں مکمل معاہدہ جس کی نگرانی اسلامی مرکز کے فرائض واختیارات میں داخل ہو۔

اس تفصیل کے بعد پاکستان کی شرعی حیثیت بالکل واضح ہے کہ ہندوستان جو صدیوں تک دارالاسلام رہا ہے، اور اب ایک عرصہ سے اس پر غیر مسلم حکومت کا تسلط

ہے، اور بہت سے خلاف شرع قوانین نافذ ہیں، اور مسلمانوں کے حقوق پامال ہو رہے ہیں، لہٰذا مسلمانوں کے ذمہ واجب ہے کہ اس تسلط کے ازالہ یا تقلیل کی جو صورت جس حصہ ملک میں وہ کسی تدبیر سے حاصل کر سکیں، اس میں کوتاہی نہ کریں، کہ یہ بھی استخلاص دارالاسلام کی ایک فرد ہے، نیز بقیہ حصہ میں وہاں کے مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت کے لئے جدوجہد بھی جاری رہنا چاہئے، کہ وہ نصرۃ المستضعفین میں داخل ہے۔

اللھم ارنا الحق حقاً وارزقنا اتباعه و ارنا الباطل باطلاً و ارزقنا اجتنابه اللھم انا نعوذ بک من الفتن ما ظھر منھا و مابطن .

اللھم واقیة کواقیة الولید و صلی اللّٰہ تعالیٰ علی خیر خلقهٖ و صفوۃ رسله و آله و اصحابه اجمعین و بارک و سلم تسلیماً کثیراً .

ناکارۂ خلائق بندہ محمد شفیع دیوبندی

عفا اللہ عنہ و عافاہ و جعلہ کمایحب و یرضاہ

تصدیقات

بعض مشاہیر علماء کرام

میں نے اس فتوے کا بالاستیعاب مطالعہ کیا، ماشاء اللہ مسئلہ کو بالکل صاف کر دیا ہے، اہل علم ونظر کیلئے گنجائش نہیں چھوڑی سب اطراف و جوانب واضح ہو کر سامنے آ گئے ہیں، حق تعالیٰ شانہ مفتی صاحب کو جزاء خیر دے۔

شبیر احمد عثمانی

دیوبند ۱۸ ذی الحجہ ۱۳۶۴ھ

بعد الحمد و الصلوٰۃ اس احقر نے بھی فتویٰ مذکورہ کا حرفاً حرفاً مطالعہ کیا اللہ تعالیٰ مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہ کو جزاء خیر عطا فرمائیں کہ سیاست حاضرہ کا شرعی حکم اچھی طرح واضح فرما دیا اور بڑی محنت سے قرآن و حدیث وفقہ سے جزئیات احکام کو تلاش کر کے جمع فرما دیا امید ہے کہ اس کے بعد مسائل حاضرہ میں کسی اور فتوے کی حاجت باقی نہیں رہے گی۔

ھکذا تکون ھمۃ الرجال و عزیمۃ الابطال کثرا للہ فینا امثالھم۔

والسلام

ظفر احمد تھانوی عفا اللہ عنہ

۳ محرم ۱۳۶۵ھ

اعانت واستعانت بالکفار کے مراتب سہ گانہ کے متعلق حضرت مجیب دام فیضہ نے جو تفصیلات حسب تصریح فقہاء رحمہم اللہ تعالیٰ لکھی ہیں، صحیح ہیں۔

ہیچمدان سید سلیمان ندوی

احقر کے نزدیک بھی یہ مضمون بالکل صحیح ہے اور گویا حضرت اقدس حکیم الامت مجدد الملت تھانوی قدس اللہ سرہٗ کے ارشادات کی شرح وتوضیح ہے، اللہ تعالیٰ حضرت مجیب صاحب کے فیوض میں برکت عطا فرمائیں۔

جمیل احمد تھانوی خادم دارالافتاء

خانقاہ اشرفیہ تھانہ بھون ضلع مظفرنگر۔

۴/محرم ۱۳۶۵ھ

محمد شبیر علی

ناظم خانقاہ امدادیہ اشرفیہ تھانہ بھون بقلم خود

۴/محرم ۱۳۶۵ھ

علامہ مجیب مدفیوضہم کی تحقیقات علمیہ صحیح اور قابل تقلید ہیں۔

بندہ خیر محمد عفی عنہ

ناظم مدرسہ عربی خیر المدارس جالندھر پنجاب

۲۱/محرم الحرام ۱۳۶۵ھ

۷۹

ارباب اقتدار کے فرائض

(خطبۂ صدارت ڈھاکہ)

تاریخ تالیف ——— ۱۳۷۴ھ (مطابق ۱۹۵۴ء)

اشاعت اوّل ——— پیش کردہ: بہ موقع نظام اسلام کانفرنس ڈھاکہ
مشرقی پاکستان ۳۰ / اپریل ۱۹۵۴ء

یہ مضمون نظام اسلام کانفرنس منعقدہ ڈھاکہ مشرقی پاکستان کے خطبۂ صدارت کے طور پر پڑھا گیا اور اس میں حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اسلامی جمہوریہ پاکستان کے قیام کے مقصد پر روشنی ڈالتے ہوئے ارباب اقتدار کو ان کے فرائض کی جانب متوجہ کیا ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ و کفی وسلام علی عبادہ الذین اصطفٰی

میں سب سے پہلے اس رب کریم کا شکرادا کرتا ہوں جس نے ہم سب کو ایمان کی دولت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک نسبت عطاء فرمائی۔ اور جس نے محض اپنے فضل سے دین متین کے خدمتگاروں میں ہمارا نام شمار کرایا۔ اور مسلمانوں کے قلوب میں حسن ظن پیدا فرمایا اور دعاء کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ان کے حسن ظن کی برکت سے اپنے خالص مرضیات کی توفیق بخشیں اور دنیا و آخرت میں رسوائی سے محفوظ رکھیں۔ اللھم احسن عاقبتنا فی الامور کلھا واجرنا من خزی الدنیا وعذاب الاخرۃ.

اس کے بعد میں اپنے اُن بزرگانِ کرام اور برادران محترم کا شکرادا کرتا ہوں جنہوں نے مجھ جیسے ناکارہ کو اس کانفرنس کی صدارت کا اعزاز عطاء فرمایا۔ خدا کرے کہ انکی اور ہماری پوری کوشش خالص اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی اور دین اسلام کے فروغ اور مسلمانوں کی سچی بہی خواہی کے لئے ہو اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک مقبول اور کامیاب ہو۔

میں ڈھاکہ میں سب سے پہلے فروری ۴۹ھ میں اپنے استاد محترم شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کے ساتھ حاضر ہوا تھا۔ اور اب پورے پانچ سال کے بعد نظام اسلام کانفرنس کے لئے حاضر ہوا ہوں۔

ان پانچ سالوں میں پاکستان پر کتنے دور گزر گئے اس کے ہر شعبہ اور ہر نظام میں کیسے کیسے انقلاب آئے۔ اگر ایک بصیر انسان انکی فہرست سامنے رکھ کر ماضی سے

مستقبل کے لئے سبق حاصل کرنے کا ارادہ کرے تو اسے معلوم ہوگا کہ اس سے بڑا کوئی واعظ اور ناصح نہیں ہے۔ سیدی ومرشدی حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب قدس سرہٗ نے کیا خوب فرمایا ہے۔

انقلاباتِ جہاں واعظ رب ہیں دیکھو
ہر تغیر سے صدا آتی ہے فافہم فافہم

میں نے اپنی ایک عربی نظم میں اسی کا ترجمہ اس طرح کیا ہے۔

وکم دالت الدولات عندک لاھیا
وکم فی مطاویھا تجلت لک العبر

آج سے پانچ سال پہلے پورے پاکستان کی زمام اختیار جن ہاتھوں میں تھی اور جن کے نوک زبان اور نوک قلم سے قسمتوں کے فیصلے ہوا کرتے تھے وہ آج کہاں ہیں۔ ذرا سوچئے تو کسی کے متعلق یہ جواب ملے گا کہ آج وہ پیوند خاک ہیں۔ اور ان کے نام ونشان بھی صرف رسمی طور پر باقی ہیں ان کے حشم وخدم احباب واعزاء کی جگہ اگر کوئی ان کے ساتھ ہے تو وہ ان کے اچھے یا برے اعمال ہیں۔

اور کسی کے متعلق یہ ظاہر ہوگا کہ وہ اپنے تمام اوصاف کے ساتھ زندہ اور قائم ہوتے ہوئے ان کا اقتدار واختیار سایہ کی طرح ڈھل گیا۔ اور آج وہ ایک عامیانہ زندگی بسر کر رہے ہیں۔

مٹے نامیوں کے نشان کیسے کیسے
زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے

تغیرات وانقلابات اس عالم عناصر کے لئے کوئی عجیب چیز نہیں بلکہ اس کے خواص لازمہ میں سے ہیں۔ لیکن آجکل اُن کی تیز رفتاری بلاشبہ ایک عجوبۂ روزگار ہے۔ ملکی وقومی انقلابات جو صدیوں میں کہیں ہوا کرتے تھے وہ اب سالوں اور مہینوں

میں نہیں بلکہ ہفتوں اور دنوں میں سامنے آجاتے ہیں۔

انہیں ۵ سال میں پوری دنیا کی تاریخ پر نظر ڈالئے تو کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ خصوصاً ممالک اسلامیہ، حجاز، پاکستان، انڈونیشیا، مصر، شام، عراق، ترکی کے حالات کا جائزہ لیجئے تو ایک حیرت کا عالم سامنے آجاتا ہے ابھی کل کی بات ہے کہ خدا کی زمین کا یہ خطہ جس پر آج یہ جلسہ ہو رہا ہے اس زمام اختیار مسلم لیگ پارٹی اور اس کے اعضاء وارکان میں تھی۔ آج ان کا اقتدار و اختیار کن ہاتھوں میں ہے۔ حق تعالیٰ کا فرمان سچا اور صحیح ہے کہ **وان تتولوا یستبدل قوماً غیر کم ثم لا یکونوا امثالکم** (اگر تم روگردانی کرو گے تو اللہ تعالیٰ تمہارے سوا دوسری قوم بدل دیگا جو پھر تمہاری طرح نہ ہوگی) انقلابات کی یہ تیز رفتاری حیرت انگیز ہے لیکن اس سے زیادہ یہ حیرت انگیز ہے کہ آنکھوں آنکھوں میں ایک شخص کا اقتدار گرتا ہے۔ اور اسی کی خاک کے ڈھیر پر دوسرے اقتدار کی بنیاد کھڑی ہوتی ہے۔ لیکن آنے والا مڑکر یہ نہیں دیکھتا کہ مجھ سے پہلے کوئی اس اقتدار کا مالک تھا۔ اس کا کیا حشر ہوا اور کیوں ہوا۔ بلکہ یوں محسوس ہوتا ہے کہ اس کرسی میں کوئی جادو یا نشہ ہے۔ جو اس پر آتا ہے ایک طلسم میں پھنس جاتا ہے میری دلی آرزو اور اللہ تعالیٰ سے دعاء ہے کہ اس صوبہ کے نئے ارباب اختیار جن میں نظام اسلام پارٹی بھی ایک مؤثر عنصر کی حیثیت سے شامل ہے ماضی قریب کے عبرتناک واقعات سے سبق حاصل کریں۔ ان پر جو ذمہ داری عائد ہوتی ہے اس کا ہر وقت خیال رکھیں اور ان ارباب اختیار کا نمونہ اپنی نظر کے سامنے رکھیں۔ جن کی راتوں کی نیندیں حرام ہو جاتی تھیں کہ اللہ تعالیٰ کی جو مخلوق انکی نگرانی میں دی گئی ہے اس کے حقوق کیوں کر ادا ہوسکیں گے۔ اور آخرت میں اسکی مشغولیت سے کیونکر سبکدوشی حاصل ہوسکتی ہے۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے متعلق مشہور ہے کہ آپ نے ایک بار ارشاد فرمایا تھا کہ اگر عراق کی طرف جاتے ہوئے کسی گھوڑے یا خچر کے پاؤں میں راہ کی ناہمواری کے باعث ٹھوکر لگے اور وہ مجروح ہو جائے تو مجھے اندیشہ ہے کہ اللہ پاک

کے یہاں مجھے اس کی بھی جوابدہی کرنی پڑیگی۔

حضرات! آج ہمارے ملک کے خصوصاً مشرقی علاقہ کے عوام جن معاشی مصائب میں گرفتار ہیں۔ان کو دور کرنیکی پوری دلسوزی کیساتھ جدو جہد کرنا ارباب اختیار کے فرائض میں سے ہے۔اسلام سے زیادہ دنیا کا کوئی نظام عوام کے حقوق کی نگہداشت کا مطالبہ نہیں کرتا۔اسلام چاہتا ہے کہ جس خطہ پر اس کا عمل دخل ہو وہاں کوئی بھوکا ننگا یا دیگر بنیادی ضروریات زندگی سے محروم نہ رہنے پائے۔لیکن اس مقصد کے حصول کے لئے وہ انسانوں کے درمیان طبقاتی منافرت اور انتشار پھیلانے کا حربہ استعمال نہیں کرتا۔وہ ان مسائل کو حل کرنے کے لئے معتدلانہ اور عادلانہ معاشی نظام اصول پیش کرتا ہے۔ نیز اس بات پر زور دیتا ہے کہ جن ہاتھوں میں زمام اختیار ہو وہ بے لوثی اور فرض شناسی سے کام لیں۔اور عوام کے رنج وراحت میں اپنے کو برابر کا شریک سمجھیں۔افسوس کہ گزشتہ سات سال کے عرصہ میں نہ قانونی اور نہ انتظامی دائرہ میں وہ روش اختیار کی گئی جس کا اسلام متقاضی ہے۔نہ ارباب اختیار نے وہ طرز عمل اختیار کیا جو اسلام چاہتا ہے ان حالات میں ہمارے بہت سے نوجوانوں کا اس نظام فکر وعمل سے مایوس ہو کر کھوکھلے نعروں میں لگ جانا کوئی حیرت انگیز چیز نہیں ہے۔خصوصاً ایسی حالت میں کہ ایک منظم گروہ ان مواقع سے اپنے تخریبی مقاصد کیلئے پورا پورا فائدہ اٹھانے کے لئے موجود بھی ہے۔

اب جن حضرات کو اللہ نے یہ ذمہ داری منتقل فرمائی ہے اُن کا فرض ہے کہ ان دونوں جہتوں میں پوری کوشش کریں۔اور بتدریج اس معاشی نظام کو بروئے کار لائیں۔جو اسلام کے اصول پر مرتب کیا گیا ہو۔جیسا کہ ابھی عرض کر چکا ہوں۔اس کے لئے ضروری ہے کہ ایک طرف تو جلد از جلد ایسے عادلانہ قوانین بنائے جائیں جس کے ذریعہ ہر فرد یا گروہ کو اس کا صحیح حق پہنچ جائے۔اور دوسری جانب ارباب حکومت اپنی زندگیاں اس نہج پر گزاریں کہ عوام ان کو اپنا حقیقی بہی خواہ اور رنج وراحت میں شریک سمجھ سکیں۔

جس طرح افراد اور خاندان پر فراخی اور تنگی کے ادوار آتے رہتے ہیں اسی طرح قوموں اور ملکوں پر بھی معاشی نشیب و فراز کے ادوار آتے ہیں۔ لیکن یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ جب عوام اپنے حکمرانوں کو دیکھتے ہیں کہ وہ نہ صرف یہ کہ ان مصائب کو دور کرنے میں مخلصانہ طور پر منہمک ہیں۔ بلکہ خود بھی ان میں شریک ہیں۔ تو ان کے لئے ان مصائب کو سہارنا۔ اور ان کا مردانہ وار مقابلہ کرنا آسان ہو جاتا ہے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن عظیم کی یہ ہدایت کہ اپنے آپ کو مسلم عوام کے ساتھ وابستہ رکھیں۔ **واصبر نفسک مع الذین یدعون ربهم یریدون وجهه** اجتماعی زندگی کا وہ زریں اصول ہے جس نے مفلوک الحال فقراء کو قیصر و کسریٰ کے مقابلہ کے لئے والہانہ انداز میں کھڑا کر دیا تھا۔

حضرت فاروق اعظمؓ کی زندگی کا واقعہ مشعل راہ کی حیثیت رکھتا ہے کہ جس وقت ملک میں زبردست قحط واقع ہوا۔ اور مخلوق سخت تنگی میں مبتلاء ہوئی تو آپ نے بھی وہی کھانا کھانا شروع کر دیا جو عام لوگوں میں تقسیم کرنے کے لئے حکومت کے زیر اہتمام تیار کرایا جاتا تھا۔ بہر حال مدعا یہ ہے کہ عوام کی بدحالی دور کرنے کی جانب فوری اور مخلصانہ توجہ کی ضرورت ہے اور ایسے معاشی نظام کو بروئے کار لانے کی ضرورت ہے جس کے تحت ایک متوازن معاشرہ پیدا ہو سکے اور اگر کبھی معاشی بحران نمودار ہو تو اس کا جلد از جلد اور خاطر خواہ ازالہ کیا جا سکے۔

لیکن جہاں ارباب حکومت پر یہ فرض عاید ہوتا ہے وہیں عوام کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ ایسے انتہا پسندانہ اور تخریبی نعروں کے فریب میں نہ آجائیں جو محض باہمی منافرت پھیلانے ہی کے لئے وضع کئے جاتے ہیں۔ صورت حال کو بدلنے کے لئے مخلص سے مخلص اور مستعد سے مستعد حکومت کو بھی کچھ وقت ضرور درکار ہوگا اور اگر عوام اس کا لحاظ نہ کریں تو یہ ان کی طرف سے زیادتی ہوگی۔

حضرات! اس کا اعادہ کرنے کی چنداں ضرورت نہیں کہ پاکستان کا مقصد وجود کیا

ہے۔ اور اس کو قائم کرنے کے لئے کن حوصلوں اور آرزوؤں کے ساتھ دس کروڑ مسلمانوں نے جدو جہد کی تھی۔ مختصر یہ کہ یہ مملکت اسی لئے قائم ہوئی کہ مسلمان اپنے نظام فکر کے مطابق اس خطہ ارضی میں ایک ایسی عادلانہ معاشرت وحکومت قائم کرسکیں جو اسلام کے زریں اصول کے مطابق ہو۔ اس مقصد کے لئے بنیادی شرط پاکستان کی بقاء اور اس کی وحدت و سالمیت ہے۔ اس کا لحاظ ہر ہر قدم پر رکھنا انتہائی ضروری ہے۔ کیونکہ چالاک حریف طرح طرح کے نظر فریب حربوں سے اسے مجروح اور معدوم کرنے کے درپے ہے مسلمانوں کو کسی لمحہ یہ نہ بھولنا چاہئے کہ وہ اپنے مقصد حیات کے لحاظ سے ایک جامع اور ہمہ گیر نظریہ کے حامل ہیں۔ اور وہ نظریہ کسی نسلی، جغرافیائی، لونی، لسانی اور طبقاتی امتیازات سے مغلوب ہونے کو تیار نہیں۔ یہ وہ رشتہ ہے جو ہر رشتہ پر غالب رہنے کا متقاضی ہے۔ بلال حبشی اور صدیق اکبر رضی اللہ عنہم شیر وشکر ہو کر رہتے ہیں۔ اور عبدالمطلب کے دو پوتوں کے درمیان ایک وطن، ایک قبیلہ ایک خاندان ہونے کے باوجود ایک دوسرے کے لئے اس درجہ غیر ہیں کہ ایک کو دوسرے سے کوئی نسبت ہی نہیں۔

حاصل کلام یہ کہ اسلام کا رشتہ اگر واقعی دلوں میں اسلام ہے اتنا قوی ہوتا ہے کہ اور کوئی مادی رشتہ اس کے مقابلہ میں ٹھہر نہیں سکتا۔ یہ ایک ایسی بنیادی چیز ہے کہ ہم سب کو اس کا ہمہ وقت احساس رہنا چاہئے۔ اور یہی وہ احساس ہے جسے بدخواہان ملک وملت ہمارے دلوں سے محو کرنا چاہتے ہیں اور یہی وہ احساس ہے کہ اگر یہ صحیح معنوں میں بیدار ہو جائے تو صوبائی عصبیتیں اور اس سے پیدا ہونے والے تمام مفاسد کا انسداد ہوسکتا ہے۔

اب میں چند امور مشورتاً آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں اور اُمید کرتا ہوں کہ نظام اسلام پارٹی کے نمایندہ ارکان اسمبلی خصوصاً دیگر مسلم ارکان اسمبلی عموماً ادھر ضرور توجہ کریں گے۔ پہلی چیز تو یہ ہے کہ صوبائی دائرہ میں آئندہ جتنی کچھ قانون سازی ہو اس

کی حیثیت شریعت کی روشنی میں متعین کریں۔ موثر انتظام اسمبلی کو کرنا چاہئے۔ نیز موجودہ صوبائی قوانین کا بھی شریعت کی روشنی میں جائزہ لیا جانا چاہئے۔ اور جہاں جہاں خامی یا خلا نظر آئے اُسے دور کیا جانا چاہئے۔

افسوس ہے کہ اس سلسلہ میں مرکزی حکومت کی طرف سے جو انتظام لاء کمیشن کی صورت میں کیا گیا ہے وہ سخت ناقص ہے۔ اور اسے اگر صحیح خطوط پر از سرنو مرتب نہ کیا گیا تو وہ ایک بے نتیجہ چیز ثابت ہوگا۔

اگر آپ کی اسمبلی اس راہ میں کوئی مؤثر اقدام کرے تو ممکن ہے دوسرے صوبے بھی آپ کی تقلید میں کچھ قدم اُٹھائیں اور کم از کم صوبائی سطح پر یہ کام انجام پا جائے منکرات اور فواحش کا جو سیلاب ہمارے ملک میں حکمران جماعت کی بے راہ روی کے باعث آرہا ہے اُس کی موثر روک تھام کی طرف فوری توجہ کی ضرورت ہے۔

اگرچہ مشرقی پاکستان اس سیلاب سے اب تک اتنا متاثر نہیں ہوا جتنا مغربی صوبے ہو چکے ہیں تاہم اگر پوری بیداری کے ساتھ اس کے تدارک کی موثر صورتیں نہ پیدا کی گئیں تو یہ حصہ بھی زیادہ دنوں ان اثرات سے محفوظ نہیں رہ سکتا تیسری چیز یہ ہے کہ تخریب پسندی عناصر کی سرگرمیوں کے باعث اس امر کی ضرورت شدید سے شدید تر ہوگئی ہے کہ ملک کے دونوں حصوں کے درمیان سفر کی سہولتیں اس طرح فراہم کی جائیں کہ زیادہ سے زیادہ لوگ آ جا سکیں۔ اور ایک دوسرے کے جذبات وخیالات کا قریب سے اندازہ کرسکیں۔ اس کے لئے آپ مرکزی حکومت پر پورا دباؤ ڈال سکتے ہیں کہ وہ ہوائی جہاز کے کرایوں میں معتدبہ کمی اور تیز رو بحری جہازوں کا جلد از جلد انتظام کرے۔

میں آپ سے اپیل کرتا ہوں کہ اسلام کے ہمہ گیر تقاضوں اور عالمگیر مسلم برادری کے مسائل کو آپ اسی اہمیت بلکہ اس سے زیادہ اہمیت کی نظر سے دیکھیں جس سے آپ مقامی مسائل کو دیکھتے ہیں۔

آپ کو مشرقی بنگال کے مسائل تک اپنی نظر محدود نہیں رکھنی چاہئے مغربی

پاکستان کے مسائل بھی آپ ہی کے مسائل ہیں۔ یہی نہیں مصرو فلسطین اور انڈونیشیا وملایا کے مسائل بھی آپ کے مسائل ہیں۔ آج جب کہ رسل و رسائل کی فراوانی کے باعث پوری دنیا ایک ملک بنتی جارہی ہے آپ اپنی نظروں کو محدود رکھ کر اسلام کے تقاضوں کو پورا نہیں کرسکتے۔ اخیر میں نظام اسلام پارٹی اور انکی حلیف جماعتوں کے ارکان سے درخواست کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل وکرم سے آج آپ کو صوبائی اقتدار میں جس حد تک حصہ عطاء فرمایا ہے اسے خلق خدا کی مخلصانہ خدمت، دستور وقوانین اسلامی کی تدوین وتنفیذ اور اسلام کے عمومی احیاء واعلاء میں صرف کریں تاکہ اس معطی حقیقی کی خوشنودی حاصل ہو اس وقت آپ کو جتنی کچھ بھی کامیابی ہوئی ہے اس کا شکریہ ادا کرنے کی تنہا صورت یہی ہے کہ یہ طاقت اس کے احکام کی تعمیل اور اسی کے کلموں کو بول بالا کرنے میں صرف کیجائے۔ شکر گذاری کا یہی صحیح طریقہ ہے اور یہی انشاء اللہ آپ کو مزید نعمتوں کا مستحق بنائیگا۔ صوبائی حکومت کی سربراہی جناب مولوی ابوالقاسم فضل الحق صاحب جیسے جواں ہمت اور پیرانہ سال لیڈر کے سپرد ہے۔ میری دعا ہے کہ خدا ان کو اس امر کی توفیق عطاء فرمائے جو اپنی عمر کے اس حصہ میں اپنی طویل سیاسی زندگی اور دیرینہ تجربات سے حاصل شدہ تمام صلاحیتوں کو تخریبی ریشہ دوانیوں کی مقاومت، وحدت وسالمیت پاکستان کے تحفظ اور دین اسلام کے فروغ میں صرف کرکے منعم حقیقی کی خوشنودی کے مستحق بننے کی کوشش کریں۔

میں اپنے اس خطبہ کو بارگاہ الٰہی میں اس دعاء پر ختم کرتا ہوں کہ جس طرح اس نے محض اپنے فضل وکرم سے مسلمانوں کو یہ ملک عطاء فرمایا ہے وہی اسکی وحدت وسالمیت اور اسلامی خطوط پر اسکی تعمیر ترقی کا انتظام فرمائے اور ہم سب کو ان مقاصد حسنہ کیلئے مخلصانہ جدوجہد کرنے کی توفیق ارزانی فرمائے۔

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

اپریل ۱۹۵۴ء

مسلمانوں کے قائدین

اور جائز امور میں ان کی اطاعت

(خطبۂ صدارت سندھ)

تاریخ تالیف ——— ۱۳۶۶ھ (مطابق ۱۹۴۷ء)

مقامِ تالیف ——— دیوبند

یہ خطبۂ صدارت حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ نے یکم ربیع الاول ۱۳۶۶ھ مطابق ۲۴ جنوری ۱۹۴۷ء کو حیدرآباد سندھ میں کل ہند جمعیۃ علماء اسلام کے تحت منعقد ہونے والے کانفرنس میں دیا تھا جس میں حضرتؒ نے مسئلہ قیادت پر مکمل بحث اور دوسرے اہم امور کی طرف نشاندہی فرمائی ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمدللہ و کفی و سلام علی عبادہ الذین اصطفے[1]

اما بعد:

میں سب سے پہلے اپنے مالک حقیقی کا شکریہ ادا کرتا ہوں جس نے اپنے فضل سے مجھے آج اس سرزمین میں مسلمانوں کا ایک خادم ہونے کی حیثیت سے پہنچایا جو ہندوستان میں سب سے پہلا دارالسلطنت ہے جہاں آج سے بارہ سو چوہتر (۱۲۷۴) سال پیشتر صحابہ و تابعین و تبع تابعین کی ایک مقدس جماعت نے اس کفرستان ہند میں سب سے پہلے اللہ کا نام بلند کیا۔

رسول اللہ ﷺ نے ہندوستان پر جہاد کرنے والے طائفہ کے لیے امت کو ایسی عظیم الشان بشارت سنائی تھی کہ بڑے بڑے صحابہؓ اس کی تمنا کرتے تھے کہ غزوۂ ہند میں شریک ہوں۔

حضرت ابو ہریرہؓ فرمایا کرتے تھے۔

اگر ہندوستان کا جہاد میرے سامنے ہوا تو میں اس میں اپنی جان اور مال قربان کروں گا پھر اگر میں قتل ہو گیا تو افضل الشہداء ہونگا اور لوٹ آیا تو آزاد ابو ہریرہ ہونگا۔

(یعنی خوف جہنم سے آزاد) (جمع الفوائد بحوالہ اوسط طبرانی)

آنحضرت ﷺ کا ارشاد گرامی غازیان ہند کے متعلق یہ تھا۔

عصابتان من امتی احرزهما اللہ من النار عصابة تغزو

[1] !

الھند وعصابة تکن مع عیسی بن مریم (ذکر السیوطی فی الجامع الصغیر برمزحم والضیاء عن ثوبانؓ وصححه رمزاً وقال العزیزی باسناد حسن و تکلم فی بعض رواته المناوی.

میری امت میں دو جماعتیں ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے جہنم سے محفوظ (آزاد) کردیا ہے ایک وہ جماعت جو ہندوستان پر جہاد کریگی۔ دوسری وہ جو حضرت عیسیٰ بن مریم (علیہ السلام) کے ساتھ ہوگی۔

حدیث کے الفاظ بظاہر ہر غزوۂ ہند کو شامل ہیں لیکن یہ دولت عظمیٰ سب سے پہلے محمد بن قاسم ثقفی اور ان کے ساتھیوں کے حصہ میں تھی کہ ان کا بیڑا اپنی بادبانی کشتیوں کے ذریعے مقام دیبل پر اترا جو موجودہ کراچی کے قریب ایک مقام کا نام تھا اور یہاں راجہ داہر کی زبردست فوج سے شدید مقابلہ اور پھر داہر کے قتل کے بعد اس سرزمین میں اسلام کا جھنڈا اگاڑ دیا۔

اور سب سے پہلے خاص اس شہر کو جس میں آج ہم اور سب بیٹھے ہوئے ہیں اپنے قیام اور دارالامارۃ کے لئے منتخب فرمایا۔

یہ شہر اس وقت نیروان کے نام سے موسوم تھا۔ جس کو آج آپ حیدرآباد سندھ کہتے ہیں۔

اس کفرزار میں سب سے پہلے مساجد کے قیام کا شرف بھی اسی شہر کو حاصل ہے جن کی بنیادیں صحابہ وتابعین کے ہاتھوں رکھی گئی۔

پھر سال ڈیڑھ سال میں یہ مختصر سا دارالاسلام اپنے اطراف میں پھیلتا اور بڑھتا ہوا ایک طرف ملتان اور دوسری طرف کشمیر تک اور شمال ومغرب میں دریائے جہلم تک پہونچ گیا (تاریخ ہند للہاشمی)

غرض پورے ہندوستان میں یہ شرف خاص اسی سرزمین کو حاصل ہے کہ سب

سے پہلے صحابہ وتابعین کی قدم بوس ہوئی اور کفر وکفار کے جھرمٹ میں سب سے پہلے پانچ وقت خدا کا نام اسی کی مسجدوں میں پکارا گیا۔

ان حضرات کے محیر العقول کارنامے اس وقت آنکھوں کے سامنے نہیں لیکن ان کی مٹی ہوئی یادگاریں آج بھی اپنی زبان بے زبانی سے اس خط میں جابجا مسلمانوں کو پیام بیداری دے رہی ہیں ؎

کارواں رفتہ واندازہ جاہش پیداست
زاں نشانہا کہ بہر راہگذار افتاد است

آج اس سرزمین میں قدم رکھ کر اپنے عہد ماضی اور اسلاف کرام کا ایک دھندلا سا نقشہ آنکھوں کے سامنے آ گیا جس نے عالم تخیل میں ایک تلاطم برپا کر دیا ہے ؎

دل میں ٹیس اٹھی آنکھوں میں آنسو بھر آئے
بیٹھے بیٹھے ہمیں کیا جانیے کیا یاد آیا

عرب کے مشہور شاعر متنبی نے اس کیفیت کا خوب نقشہ کھینچ دیا ہے۔ ؎

واذکر ایام الحمیٰ ثم انثیی
علی کبدی من خشیتہ ان تصدعا

ہم بہار اور گڈمکھتیسر وغیرہ کے تازہ ستم رسیدہ ایک طرف اپنی حالت زار کو دیکھتے ہیں کہ ہمارا منتہائے خیال مدافعت ہے اور اس میں بھی آپنے آپ کو کمزور پاتے ہیں دوسری طرف ان بزرگوں کے جارحانہ اقدام اور فاتحانہ کارنامے ہمیں بتاتے ہیں کہ ہم وہ ہیں کہ ہماری ایک مٹھی بھر جماعت اپنے وطن سے ہزاروں میل دور پہونچکر اپنی بے سروسامانی کے باوجود سندھ کی زبردست ہندو سلطنت سے ٹکراتی ہے اور چند دنوں میں اس کو پاش پاش کر کے نہ صرف راجہ داہر کے تخت وتاج کا مالک بن جاتی ہے

۔ بلکہ فقط دو سال کے عرصہ میں ہندوستان کو سندھ و ہند کی دو سلطنتوں میں تقسیم کر کے گویا پاکستان و ہندوستان کی تقسیم کا بہترین نقشہ قائم کر دیتی ہے۔

ہمارے اعمال اگرچہ اس قابل نہیں کہ ہم اپنے آپ کو ان اسلاف کے اخلاف (قائم مقام) کہہ سکیں یا ان کی شاندار فتوحات میں سے کسی حصہ کے امیدوار بن سکیں۔

لیکن حق تعالیٰ کی رحمت وفضل کا باب نہایت وسیع ہے اسی نے اپنے فضل سے اس وقت سندھ میں جمہور مسلمین یعنی ''مسلم لیگ'' کو ایک شاندار فتح عطاء فرما کر مسلم جمہوریت کو اس صوبہ کا اقتدار عطاء فرما دیا، وللہ الحمد۔

اگر یہاں کے حکام وعمال اس نعمت عظمیٰ کی قدر پہچانیں اور حق تعالیٰ کا شکر ادا کریں یعنی ملے ہوئے اقتدار کو عدل وانصاف اور عام کی بہبود خصوصاً شعائر اسلام کے احیاء میں استعمال کریں تو وہ دن دور نہیں کہ شکر پر ازدیاد نعمت کے وعدہ الٰہی کا ظہور ہو۔ اور یہ دور اول کا پہلا اسلامی دار السلطنت اس دور آخر کا پاکستان بن جائے اور مسلمانوں کے عروج اور قوت وشوکت کی نشاۃ ثانیہ پھر اسی سرزمین سے ہو۔

و ما ذالک علی اللہ بعزیز.

اس کے بعد میں اپنے بزرگ محترم حضرت پیر غلام مجدد صاحب اور دیگر علماء و مشائخ سندھ اور عام سندھی بھائیوں کا شکر گذار ہوں جنہوں نے مجھے اس مبارک اجتماع میں شرکت کا موقع دیا اور میری نااہلیت کی پردہ پوشی فرما کر صدارت کی عزت بخشی۔

اسکے ساتھ ہی اس افسوس اور افسردگی کا اظہار بھی ناگزیر ہے جو اس وقت جمعیۃ علماء اسلام کے مستقل صدر اور اس جلسہ کے مجوزہ صدر شیخ الاسلام استاذ محترم حضرت العلامۃ مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی دامت برکاتہم کے اس وقت تشریف فرما نہ ہونے سے ہم سب خدام حضرت ممدوح اور تمام سندھی بزرگوں اور بھائیوں کو پیش آیا۔

حقیقت یہ ہے کہ حضرت ممدوح عرصہ دو سال سے ایسے امراض میں گھرے ہوئے ہیں کہ کسی وقت بھی سفر کرنا آسان نہیں، لیکن شدید اسلامی ضرورت اور مسلمانوں کی پیچیدہ حالات اور روز افزوں حوادث سے مضطر ہو کر جس وقت اور جس طرح ممکن ہوتا ہے سفر کر کے مسلمانوں کی خدمت انجام دیتے ہیں۔

اس جلسہ کی تاریخیں شائع ہو جانے کے بعد جب حضرت علامۃ سے اس جلسہ کی صدارت کی درخواست کی گئی تو اس وقت ممدوح ایسے علیل تھے کہ نماز بھی اشاروں سے پڑھتے تھے مگر ضرورت اور خاص سندھ کی اہمیت کا احساس فرما کر یہ جواب تحریر فرما دیا کہ اگر وقت پر کچھ بھی سفر کی قدرت ہوگئی تو ضرور شریک ہونگا۔ چنانچہ تاریخیں قریب آنے پر ریزرویشن کے انتظام کے لئے بھی آدمی بھیجدیا گیا اور ٹکٹ خرید لئے گئے اور باوجود شدید تکلیف کے وقت کے وقت تک چلنے کا قصد مصمم رہا۔

لیکن عین سفر کے وقت گھٹنوں کے ورم نے ایسا عاجز کر دیا کہ نقل وحرکت کی کوئی صورت نہ رہی۔

اس عدم شرکت کا جس قدر افسوس سب حاضرین جلسہ کو ہے یقیناً حضرت ممدوح کو بھی اس سے کم نہیں لیکن وکان امر الله قدر مقدورا حضرت ممدوح نے رخصت کے وقت ایک جملہ بطور پیام آپ حضرات تک پہنچانے کے لیے فرمایا تھا وہ یہ ہے۔

> ''اللہ تعالیٰ نے اس وقت مسلمانوں کو مسلم لیگ کے ذریعہ ایک مرکز پر جمع کر کے جو وحدت پیدا کر دی ہے وہ ایک بھاری نعمت ہے اس کی قدر کرنی چاہیے اور کسی قیمت پر بھی اس کو ہاتھ سے نہ جانے دینا چاہیے اصلاح وتبلیغ علماء کا دائمی فرض ہے اور اس وقت حالات نے اس کو اور بھی مؤکد کر دیا ہے لیکن ہر اصلاحی وتبلیغی کام میں اس کی رعایت پیش نظر رہنی چاہیے کہ تفرقہ اور اختلال کو راستہ نہ ملے''

یہ بندہ ناکارہ نہ کوئی خطیب ہے نہ ان پلیٹ فارموں کی رسمی ضرورت سے

واقف اور نہ پہلے سے جلسہ کی صدارت کا کوئی وہم وخیال، حضرت علامہ عثمانی کی عدم شرکت کے سبب یہاں پہنچنے کے بعد جمعہ سے دو گھنٹہ پہلے مجھے صدارت کے لیے مجبور کیا گیا اس لئے بجائے کسی خطبہ کے حضرت علامہ کے اسی جملہ کی کسی قدر تشریح نہایت عجلت کے وقت میں لکھتا ہوں حضرات سامعین کو اختیار ہے کہ اسی کا نام خطبہ رکھ لیں والامر کلہ بیداللّٰہ سبحانہ تعالیٰ۔

حضرت مولانا کا یہ ایک جملہ ہے لیکن اگر غور کیجئے تو وقت کے تمام مسائل کی روح وحدۃ قومی اور تنظیم المسلمین ہے، کوئی دانشمند اس کا انکار نہیں کرسکتا کہ مسلمانوں کا ایک مرکز پر مجتمع ہو جانا ہمیشہ سے اگر ضروری تھا تو اب فرض ہے کیونکہ مسلمانوں کی قومی بقاء اب ہندوستان میں اس کے بغیر ناممکن ہے لیکن مسلمانوں کی چند جماعتیں اور بہت سے افراد اس نظم و اجتماع میں داخل ہونے سے اب تک بھی اس لئے رکے ہوئے ہیں کہ ان کو مذہبی نقطہ نظر سے مسلم لیگ کے قائد اور ذمہ دار جماعت پر کچھ اعتراضات ہیں۔

ان جماعتوں میں بعض تو وہ ہیں کہ جو مسلم لیگ کی شرکت کو اعتراضاتِ مذکورہ کی بناء پر ناجائز تصور کرنے کے ساتھ کانگریس میں شریک اور اس کے زیر علم کام کررہے ہیں ان کی خدمت میں تو صرف اتنی گذارش کافی ہے کہ کانگریس پر ہندوؤں کا مکمل قبضہ ہے اور ان کی اسلام سے دشمنی کے قدیم تخیلات اہل بصیرت پر تو پہلے ہی واضح ہو چکے تھے مگر ہندو اپنی طرف سے محض دعویٰ اور الفاظ کی حد تک یا جس حد تک ان کے اصلی مقاصد پر کوئی اثر نہ پڑے اس جماعت کو نیشنل جماعت ثابت کرنے کے لئے مسلمانوں کے ساتھ کچھ اغماض کیا کرتے تھے لیکن حکومت و اقتدار کا ایک خواب ان کے سامنے آتے ہی وہ اپنی فطری کم حوصلگی کے سبب اسپر قادر نہ رہے کہ کانگریس کے ہندو جماعت ہونے کو چھپا سکیں۔

اور کوئی ادنیٰ بصیرت رکھنے والا اس کا بھی انکار نہیں کرسکتا کہ صدر کانگریس کا

لفظ خواہ کسی نام کے ساتھ لکھ دیا جائے لیکن کانگریس کے اصلی قائد مسٹر گاندھی پنڈت نہرو سردار پٹیل وغیرہ ہی ہیں تو جو حضرات پنڈت نہرو اور سردار پٹیل کی قیادت قبول کر سکتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ مذہبی اعتراضات کی بناء پر مسٹر محمد علی جناح اور لیگ ہائی کمانڈ کی قیادت قبول نہ کر سکیں۔

میں یقین رکھتا ہوں کہ جو حضرات کانگریس میں شریک اور گاندھی و نہرو کی قیادت میں کام کر رہے ہیں ان کو مسلم لیگ کے قائدین یا ان کی قیادت پر اعتراضات کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں اور نہ ان کے جوابات قابل تعرض ہیں ہاں میری نظر میں بعض جماعتیں اور بہت سے افراد ایسے بھی ہیں جو کانگریس سے تو بیزار ہیں لیکن مسلم لیگ کے قائدین پر مذہبی نقطہ نظر سے کچھ اعتراضات رکھتے ہیں اس لئے اس نظم میں داخل ہونا پسند نہیں کرتے، سوان اعتراضات میں بہت سے تو وہ بے بنیاد اور غلط افتراءات ہیں جو کانگریسی ورکروں نے مسلم لیگ کو دیندار طبقہ کی نظر میں گرانے کے لئے ہی چلتے کئے ہیں جن کی کوئی اصل نہیں۔ لیکن بہت سے وہ اعتراضات بھی ہیں جو اپنی جگہ پر صحیح ہیں اور دیندار طبقہ کے لئے مسلم لیگ یا اس کے ہائی کمانڈ کی قیادت تسلیم کرنے میں ایک حد تک رکاوٹ کا سبب بن سکتے ہیں۔

اس لئے میں اس مجلس میں مسئلہ قیادت اور اس کے سب پہلوؤں کو واضح کر دینا چاہتا ہوں۔ واللہ المستعان۔

مسئلہ قیادت

اس جگہ سب سے پہلے یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ کسی جماعت یا انجمن کا صدر وقائد ہونا اور چیز ہے اور امارت شرعیہ اور چیز ہے بہت سے شبہات صرف یہاں سے پیدا ہوتے ہیں کہ ایک جماعت کے قائد کو اصطلاحی شرعی امیر قرار دیکر اس کے احکام اس

پر جاری کئے جاتے ہیں اور اس کی تمام شرائط وصفات اس میں ڈھونڈی جاتی ہیں ۔

مسلمانوں نے مسٹر محمد علی جناح کو موجودہ جنگ آزادی کا ایک ماہر فن جرنیل ہونے کی حیثیت سے قائداعظم قرار دیا ہے نہ اس حیثیت سے کہ وہ کوئی مفتی ہیں ان سے حلال وحرام کے احکام میں فتویٰ لیا جائے گا، یا اس حیثیت کہ وہ کوئی شیخ مرشد ہیں ان سے اصلاح اعمال کا کام لیا جائے گا۔ میرے خیال میں شاید ایک مسلمان بھی یہ خیال لیکر ان کو قائد نہیں کہتا، ان کی قیادت ہندوستان کی مسلم جمہوریت نے صرف اس لئے تسلیم کی ہے کہ انگریز اور ہندو دونوں اسلام اور مسلمانوں کے دشمن ہیں اور انگریز اس وقت خواہ بین الاقوامی مقتضیات سے یا اندورنی چیخ وپکار سے متاثر ہو کر جس قسم کی آزادی ہندوستان کو دینا چاہتا ہے۔ ہندو اپنی عددی اکثریت مستحکم تنظیم اور بے حد وشمار سرمایہ کے بل بوتہ پر اس کا تنہا مالک بن جانا چاہتا ہے۔ اس کا کھلا ہوا منصوبہ یہ ہے کہ مسلمانوں کی مستقل قوم اور ہندوستان کی عام اقلیتوں کو اپنا غلام بنائے رکھے، اس کے لئے اس وقت جنگ جاری ہے اور ظاہر ہے کہ یہ جنگ توپ تفنگ کی نہیں محض آئین اور قانون کی ہے۔

اور ادھر باتفاق موافق ومخالف یہ امر مسلم ہے کہ اس جنگ کے لئے مسٹر محمد علی جناح سے بہتر جرنیل نہ صرف مسلمانوں میں بلکہ کسی دوسری قوم میں بھی نہیں۔

کس قدر بدنصیبی ہے اس قوم کی جو اپنے اندر ایسا جرنیل رکھتے ہوئے اس کو میدان عمل میں بڑھانے یا اس کے جھنڈے کے نیچے جنگ آزادی لڑنے میں اس لئے تامل کرے کہ وہ اپنے جرنیل میں تقویٰ وطہارت کے اوصاف نہیں پاتی ۔ ریل موٹر، جہاز، کا ڈرائیور اور کپتان مقرر کرتے وقت بڑے سے بڑا متقی دیندار اور دانشمند صرف اس کا اطمینان کر لینا ضروری سمجھتا ہے کہ وہ ڈرائیوری کے فن میں ماہر اور مکمل ہے یا نہیں اس میں اعتماد ہو جانے کے بعد اس کے ذاتی اعمال وافعال کا اچھا نہ ہونا نہ عقلاً

اس کی گاڑی میں سوار ہونے سے مانع ہوسکتا ہے نہ شرعاً۔ (۱)

اس میں شبہ نہیں کہ تقویٰ وطہارت اسلام کا مقصود اعظم ہے اور مسلمانوں کے ہر کام کو چلانے والے اگر متقی پارسا آدمی میسر آئیں تو بلاشبہ سعادت کبریٰ اور موجب برکات ہے لیکن جو کام لینا ہے اس کا ماہر اگر کوئی متقی موجود نہ ہو یا وہ کام کرنے کے لئے آمادہ نہ ہو یا اس کو اسباب میسر نہ ہوں تو غیر متقی ماہر فن سے وہ کام لے لینا آج اس شر القرون اور فسق وفجور کے زمانہ میں نہیں بلکہ خیر القرون میں بھی جرم نہیں سمجھا گیا۔

حافظ ابن تیمیہؒ نے اپنی کتاب السیاستہ الشرعیۃ میں نقل کیا ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ (جو جلیل القدر تابعی اور حضرت فاروق اعظم کے نقش قدم پر امور خلافت کو انجام دینے کے سبب عمرؓ ثانی کہلاتے تھے) آپ کے کسی صوبہ دار حاکم نے آپ سے یہ سوال کیا کہ میں ایک فوجی عہدہ کسی شخص کے سپرد کرنا چاہتا ہوں اور دو آدمی میری نظر میں ہیں۔ ایک نہایت قوی اور فنون حرب سے واقف ہے مگر متقی پابند شرع نہیں اور دوسرا نہایت متقی پارسا ہے مگر قوی اور ماہر فن نہیں۔

آپ فیصلہ فرمائیں کہ ان دونوں میں سے کس کو یہ منصب سپرد کروں آپ نے جواب دیا کہ

> ''قوی کی قوت تو مسلمانوں کی کام آویگی اور اس کے برے اعمال کی خرابی اسکی ذات کو پہنچے گی اور متقی کا تقویٰ اس کی ذات کے لئے ہے اور اس کے ضعف یا ناواقفیت سے جو نقصان ہوگا وہ سب مسلمانوں کو بھگتنا

(۱)......اس پر یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ان کاموں کے لئے تو مسلمان ہونا بھی شرط نہیں تو اس سے گاندھی اور نہرو کی قیادت کا جواز بھی نکل آیا کیونکہ ہندوؤں کی مسلم دشمنی کے مشاہدہ ہو جانے کے بعد ان کی مثال اس ڈرائیور کی سی ہے جس کے متعلق ہمیں یہ معلوم ہے کہ وہ ہمارے خون کا پیاسا ہے اور اس نے موقع پایا تو ہلاک کئے بغیر نہ چھوڑیگا، ایسی حالت میں ظاہر ہے کہ اس گاڑی میں سوار ہونا اور اپنی جان اس کے سپرد کر دینا نہ عقلاً جائز ہوسکتا ہے نہ شرعاً ۱۲ منہ

پڑیگا۔ اس لئے کام کے واسطے قوی غیر متقی کا انتخاب کرنا چاہیے۔''

حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے عقلی اور شرعی اصول کے موافق مدار کار اس کو ٹھرایا کہ جو کام لینا ہے اس کی پوری اہلیت شرط اول ہے اس کے ساتھ تقویٰ وطہارت بھی ہو تو سبحان اللہ۔ لیکن دونوں اوصاف کا جامع شخص موجود نہ ہو تو شرط اول کا لحاظ مقدم ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اول تو کسی جماعت یا انجمن کی قیادت وصدارت اصطلاحی امارت نہیں جس کے تحت میں تمام دینی اور دنیوی شعبے ہوں اور جس کے احکام تمام دینی اور دنیوی امور میں واجب العمل اور نافذ ہوں لیکن اگر بالفرض اس کو اصطلاحی امارت بھی فرض کر لیا جائے یا اس وقت نہ سہی آئندہ وہ اصطلاحی امارت کی صورت اختیار کرلے تو اس میں بھی یہ نظریہ عقلاً وشرعاً نہایت غلط ہے کہ امارت وقیادت کے لئے قوم میں صدیق اکبر یا فاروق اعظم نہ ملیں تو پھر کسی کی قیادت ہی قبول نہ کریں مسلمانوں کو ایک مرکز پر لانے اور وحدت پر جمع کرنے سے گریز کیا جائے یا جماعت کا امیر اگر متقی پابند شرع نہ ہو تو مسلمانوں کو اس کے خلاف ابھار کر ان کی بنی بنائی جمعیت و تنظیم ہی کو درہم و برہم کر دیا جائے کون نہیں جانتا کہ اسلام اور اس کی تعلیمات کا اصلی نصب العین یہ ہے کہ ہر مسلمان اپنے اعمال، اخلاق، معاشرت اور زندگی کے ہر گوشہ میں خالص اسوۂ رسول اللہ ﷺ کا پورا پورا پابند ہو۔

ان کا امیر ہو تو اسی صورت وسیرت کا، فوج ہو تو اسی کردار وعمل کی، رعیت ہو تو انہیں کے نقش قدم پر، انکی نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ سب ان آداب وشرائط کی حامل ہوں جو آنحضرت ﷺ نے قولاً وعملاً تعلیم فرمائے، مگر اس کے ساتھ آج کوئی یہ دعویٰ نہیں کرسکتا کہ ہماری نماز اور روزہ ایسا ہی روزہ ہے، اخلاق وہی ہیں جو قرآن نے ہمیں بتلائے ہیں۔

لیکن اس کے باوجود کوئی ادنیٰ فہم رکھنے والا یہ نہیں کہہ سکتا کہ جب ہم ایسی نماز نہیں پڑھتے یا نہیں پڑھ سکتے جیسی اسلام کا مطلوب اصلی ہے تو پھر یہ نماز ہی فضول یا

گناہ ہے اور روزہ وزکوٰۃ وحج جو ہم ادا کرتے ہیں لغو ہیں ہے کیونکہ ہماری عبادات کیسی ہی ناقص ہوں کم از کم ہمیں نافرمانوں کی فہرست سے نکالدیتی ہیں۔ بہر حال جہاد اور اس کی امارت وقیادت کا مسئلہ بھی اس اصل کلی سے جدا نہیں ہوسکتا کہ قیادت کے پورے شرائط وآداب میسر نہ ہوں تو سرے سے جمعیۃ مسلمین اور نظم ہی کو ختم کردیا جائے۔

امراء جور کی اطاعت وقیادت کا حکم

اس بارہ میں کھلا ہوا فیصلہ خود آنحضرت ﷺ کی زبان رسالت ترجمان سے سنئیے ارشاد فرمایا۔

الجهاد واجب عليكم مع كل أمير براً كان اوفاجراً (إلى قوله) وان عمل الكبائر (ابو داؤد)

جہاد تم پر واجب ہے ہر ایک امیر کے ساتھ خواہ وہ نیک ہو یا فاسق فاجر اگر چہ وہ کبیرہ گناہوں میں مبتلا ہو۔

اور صحیح مسلم میں حضرت عوف بن مالکؓ کی روایت ہے کہ صحابہ کرام نے اسی قسم کے ظالم وجابر غیر متشرع حکام کے بارہ میں آنحضرت ﷺ سے اس کی اجازت طلب کی کہ وہ ان کی قیادت واطاعت سے باہر ہوجاویں تو آپ نے ارشاد فرمایا۔

ألا من ولى عليه والٍ فرآه يأتى شيئًامن معصية الله فليكره مايأتى ولا ينزعن يداً عن طاعة (مسلم)

خبردار جس پر کوئی والی (یعنی امیر مسلم) مقرر ہو جاوے پھر وہ اس کو دیکھے کہ کسی گناہ کا مرتکب ہے تو چاہیے کہ اس گناہ کو تو برا سمجھے مگر امیر کی اطاعت سے ہاتھ نہ کھینچے۔

خالق کی نافرمانی میں کسی مخلوق کی اطاعت جائز نہیں

اس حدیث نے ایک صاف دستور العمل بتادیا کہ مسلمانوں کا امیر بعد اس کے کہ وہ مسلمان ہے اپنے ذاتی اعمال و افعال میں کیسا بھی ہو مسلمان اس کی قیادت و امارت سے باہر نہ ہوں۔ ہاں اگر وہ کسی گناہ میں مبتلا ہے تو اس کے اس فعل کو برا سمجھیں خود اس گناہ کے پاس نہ جائیں بلکہ اگر یہ امیر مسلمانوں کو کسی ناجائز فعل کا حکم کرے تو اس حکم میں اس کی اطاعت نہ کریں۔ جیسا کہ ایک دوسری حدیث میں ارشاد ہے کہ خالق کی نافرمانی میں کسی مخلوق کی اطاعت جائز نہیں (صحیح بخاری)

خلیفہ راشد حضرت ذی النورین عثمان غنیؓ نے اس مسئلہ کو اور بھی زیادہ صاف کر دیا جبکہ باغیوں نے آپ کو ایک مکان میں محصور کر کے امارت و خلافت کے کل کاروبار امامت نماز وغیرہ پر قبضہ کر لیا۔ تو حضرت عثمانؓ کے فرمانبردار اور رفقاء نے آپ سے دریافت کیا کہ آپ تو محصور ہیں باغی لوگ نماز کی امامت اور دوسرے امور خلافت پر قابض ہیں ہم ان کے ساتھ کیا معاملہ کریں۔ ان کی اقتداء میں نماز وغیرہ ادا کریں یا نہیں آپ نے فرمایا:

اذا احسنو فاحسن معهم و اذا اسأوا فاجتنب اساء تهم .

جب وہ لوگ کوئی نیک کام کریں مثلاً اقامت نماز وغیرہ تو تم بھی ان کے ساتھ نیک کام میں شریک ہو جاؤ اور جب وہ کوئی برا کام کریں تو تم اس برے کام سے دور رہو۔

حضرت عثمان غنیؓ کا فیصلہ آج کل ہر خادم ملت اور ہر مسلمان کو ہر وقت پیش نظر رہنا چاہیے کہ وہ سیاست و دیانت کا ایک جامع دستور العمل ہے۔

جس میں ایک طرف تو ملت کی شیرازہ بندی اور قیام نظم کی اس درجہ تاکید ہے کہ اپنے باغیوں اور قاتلوں کی قیادت میں کام کرنے کی اجازت دی جاتی ہے اور دوسری

طرف اس کی سخت تاکید ہے کہ خلاف شرع امور میں ان کی تقلید یا اطاعت ہر گز نہ کرو مسلم لیگ یا کسی جماعت کی قیادت قبول کرنے کے یہ معنی ہر گز نہ ہونے چاہئیں کہ اندھا دھند ہر جائز و ناجائز کام میں اسکی تقلید کی جائے بلکہ مسلمان کی نظر ہر وقت احکام خداوندی پر رہنا ضروری ہے۔ اس کی ہمیشہ وہ شان ہونی چاہیے جو حضرت فاروق اعظمؓ کے بارہ میں منقول ہے کہ

كان وقافاً عند حدود الله وہ اللہ کی قائم کردہ حدود پر ٹھہر جاتے تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کا جماعتی نظم اور ان کی شیرازہ بندی اسلام میں وہ مقصد اعظم ہے کہ اس کے لئے غیر متشرع امراء جور کی اطاعت پر بھی شریعت غراء نے مسلمانوں کو اسلئے مجبور کیا ہے کہ تفرقہ اور اختلال نظم کی صورت میں جو قومی بربادی اور انفرادی معاصی کے ہزاروں دروازے کھلتے ہیں وہ اس سے کہیں زیادہ مضر ہیں کہ کسی امیر غیر متشرع کی اطاعت قبول کر لی جائے۔

عہد صحابہؓ میں جب ولید بن عقبہ امیر جماعت بن گیا اور اس کے عادات و اخلاق اور اعمال و افعال صحابہ کی نظر میں اچھے نہ تھے تو لوگوں کو اس پر اعتراض ہوا تو اس وقت حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے یہی نکتہ مسلمانوں کے سامنے پیش کیا اور فرمایا۔

اصبروا فان جورا مامكم خمسين عاماً خير من مرج شهر (جمع الفوائد)

امیر کے ناشائستہ افعال پر صبر کرو کیونکہ تمہارے امیر کا پچاس سال تک ظلم و جور ایک مہینہ کے فتنہ اور اختلال نظم سے بہتر ہے۔

یہی وہ چیز تھی جس نے بڑے بڑے صحابہ کرام کو ایسے ایسے امراء جور کی اطاعت و قیادت تسلیم کرنے پر مجبور کر دیا جو اگر اس تنزل کے زمانہ میں ہوتے تو لوگ ان کو سخت اعتراض کی نظر سے دیکھتے۔

فاروق اعظمؓ کے بڑے صاحبزادے فقیہ مدینہ حضرت عبداللہ بن عمر جیسے بزرگ حجاج بن یوسف جیسے جبار ظالم امیر کی قیادت قبول کرتے ہیں جس کی تلوار اس وقت بھی ہزارہا علماء وصحابہ وتابعین کے خون ناحق سے رنگین تھی، دور کیوں جایئے قصہ زمین برسر زمین۔ یہیں دیکھ لیجئے کہ ہندوستان پر جو سب سے پہلا اسلامی لشکر محمد بن قاسم ثقفی کی کمان میں صحابہ وتابعین پر مشتمل جہاد کے لئے پہونچا۔ آپ کو معلوم ہے کہ وہ کس امیر کے حکم سے آیا۔

وہ امیر یہی حجاج بن یوسف ہے جس کو ''ظالم امت'' کا خطاب تھا۔ یہ حضرات صحابہ وتابعین اور تبع تابعین کی مقدس جمعیۃ جو ہندوستان پر حملہ آور ہوئی اور فاتحانہ داخل ہو کر جس نے سابق نیروان حال حیدرآباد سندھ میں دارالسلطنت قائم کیا۔

اپنی تمام داخلی اور خارجی سیاست میں حجاج بن یوسف کے زیر حکم کام کرتی رہی، حجاج بن یوسف کے وہ فرامین جو بنام محمد بن قاسم ثقفی ہندستان پر آئے اس پر شاہد ہیں۔

ظاہر ہے کہ حجاج بن یوسف کے ظالمانہ وجابرانہ افعال ان میں سے کسی کو پسند نہ تھے لیکن اس کی قیادت وامارت کی مخالفت کو نظم اسلامی کے لئے مضر سمجھ کر عین تعلیمات حدیث کے موافق اس پر سکوت سے کام لیا جاتا تھا۔

آج مسلمانوں کا جو نظم واجتماع محض حق تعالیٰ کے فضل ورحمت سے حاصل ہو گیا ہے وہ بلاشبہ اسکی ایک بھاری نعمت اور ہندی مسلمانوں کی قومی حیات کا واحد ذریعہ ہے بعض قائدین مسلم لیگ کے ذاتی اعمال وافعال کو بہانہ بنا کر اس حاصل شدہ جمعیت کو درہم برہم کر دینا سراسر عقل وشرع کے خلاف ہے۔

علماء امت اس پر متفق ہیں کہ جب مسلم جمہوریت کسی شخص کی قیادت پر مجتمع ہو جائے تو پھر اس کی مخالفت جائز نہیں اس کے ذاتی اعمال وافعال اگر خلاف شرع بھی ہوں تو ان کی اصلاح کی مناسب تدبیریں کی جاویں اور جب تک صریح کفر اس کا ثابت

نہ ہو اس کے خلاف مسلمانوں کو ابھار کر حاصل شدہ نظم جمیعت کو مختل کرنا کسی کے نزدیک روا نہیں۔ حجتہ الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہ ازالتہ الخفاء میں فرماتے ہیں

''حرام است خروج بر سلطان بعد از انکہ مسلمین بروے مجتمع شدند مگر آنکہ کفر بواح از وے دیدہ شود اگر چہ سلطان مستجمع شروط نباشد''

(ازالتہ الخفاء ج ا ص ۷)

سب مسلمان اگر چاہیں تو قیادت بآسانی موافق شرع ہو سکتی ہے

جس طرح مسلمانوں کی تنظیم اور وحدتِ کلمہ کی حفاظت ضروری ہے اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ اپنی قیادت اور اس کے نظام کو موافق شرع بنانے میں امکانی سعی اور مناسب تدابیر سے کسی وقت غافل نہ ہوں اور خوب سمجھ لیں کہ جس طرح قائد امیر کے اعمال و اخلاق کا اثر عام قوم پر پڑنا ایک فطری قانون ہے اسی طرح جمہور قوم کے رجحانات سے قائد و امیر کا متاثر ہونا بھی ناگریز امر ہے خصوصاً جبکہ قیادت و امارت کسی عسکری قوت سے نہیں بلکہ محض مسلم جمہوریت اور ان کی رائے عامہ پر موقوف ہے، مسلم لیگ کی ہائی کمانڈ اور عام عہدہ داران کا انتخاب رائے عامہ سے ہوتا ہے۔ اگر مسلم عوام دین پر پختہ ہوں تو کوئی وجہ نہیں کہ قیادت کے انتخاب میں غیر متشرع لوگوں کا غلبہ ہو۔

اس وقت ایک سوال عام طور سے زبانوں پر ہے کہ پاکستان حاصل ہو گیا تو اس کا نظام قرآنی نظام ہوگا یا کیسا۔

کہنے کو اس کا جواب جو چاہے دے دیا جائے لیکن حقیقت اس کے خلاف نہیں کہ جیسے عام مسلمان ہونگے ویسا ہی نظام ہوگا وہ اگر دیندار ہیں تو نظام قرآنی اور عین شریعت ہوگا اور خدانخواستہ اگر عام مسلمان ہی دین سے غافل یا اس کے خلاف ہوئے تو نظام شرعی کی امید رکھنا اپنے کو دھوکہ دینا ہے۔

عام اہل اسلام کے دو فرض

الغرض اس وقت عام مسلمانوں پر دو کام لازم و واجب ہیں، اول حاصل شدہ نظم و جمعیت کو ہر تفرقہ اور خلل سے محفوظ رکھنا اور اس کے اتمام و استحکام کی کوشش کرنا، دوسرے دین اور احکام دین سے جو مجرمانہ غفلت مسلمانوں کے عوام و خواص پر چھائی ہوئی ہے اس کے دور کرنے اور اپنی زندگی کو صحیح اسلامی زندگی بنانے اور اپنے عوام اور قائدین کو برادرانہ ناصحانہ طریق پر اس کی طرف لانے کی پیہم کوشش کرتے رہنا کہ درحقیقت مسلمانوں کی ہر کامیابی اسی کے ساتھ وابستہ ہے۔ واللہ الموفق والمعین ۔

حضرات علماء سے خطاب

حق تعالیٰ نے اپنے فضل سے امانت علم اور وراثۃ انبیاء کی جو نعمت عظمیٰ آپ حضرات کو سپرد فرمائی ہے اس کی کچھ ذمہ داریاں بھی آپ پر عائد ہیں۔ جن سے آپ حضرات بخوبی واقف ہیں۔

آپ کا صرف یہ کام نہیں کہ مسلم عوام اور سیاسی قائدین پر نکتہ چینی کیا کریں اور بس، بلکہ اگر ہم اپنے گریبان میں منہ ڈالیں اور ذرا انصاف سے کام لیں تو مسلم عوام اور نو تعلیم یافتہ طبقہ جن غفلتوں اور خلاف شرع امور میں گرفتار ہے ہم خود اپنے آپ کو بھی ان کے جرم کا شریک پائیں گے کہ ہم نے اصلاح و تبلیغ میں اپنا فرض ادا نہیں کیا ۔

تا کے ملامت نگہ اشکبار من　　　یکبار ہم ملامت چشم سیاہ خویش

ہم میں ہر شخص اگر اس پر نظر ڈالے کہ اس نے اپنی عمر کے سنین میں کتنے سال اور ہر سال میں کتنے مہینے اور ہر مہینہ میں کتنے دن اس کام کے لئے وقف کئے یا مدارس و مجالس کے چندوں اور الیکشنی ضرورت سے بالکل یکسو ہو کر محض مسلمانوں کی خیر خواہی

اور ان کی اصلاح کے لئے کوئی قدم اٹھایا اور جس اہتمام اور درد کے ساتھ بے غرض تبلیغ کرنا انبیاء علیہم السلام کا شعار تھا اس کا کوئی حصہ ہم نے حاصل کیا ہو تو مجھ جیسے بہت سے لوگ ایسے نکلیں گے کہ ان کے نامہ اعمال کا یہ خانہ بالکل خالی ہوگا۔

یہ صحیح ہے کہ دہریت و آزادی کے عالمگیر طوفان اور زمانہ کی مسموم فضا اصلاح و تبلیغ کا جذبہ رکھنے والوں کی راہ میں ایک سخت پہاڑ کی طرح حائل ہے لیکن اب بھی وہ وقت نہیں آیا کہ اصلاح و تبلیغ موثر نہ ہو۔ تبلیغ کے صحیح اصول نرمی و خیر خواہی کو پیش نظر رکھ کر اور بالکل بے غرض ہو کر جب مسلمان کو دین کا کوئی حکم پہنچایا جاتا ہے تو تجربہ شاہد ہے کہ اثر سے خالی نہیں رہتا، ابھی ہمارے محترم صاحبزادے قاری محمد زاہر صاحب قاسمی نے جو بہترین نظم سنائی ہے اور اس کے دو شعر حقیقت میں آپ کے حسب حال میں۔

گو زمانہ کر رہا ہے غیر حق سے ساز باز　　مختلف ہے تیری تے سے گردش گردوں کا ساز

تیری ہستی میں مگر تکوین کا پنہاں ہے راز　　گر نسازد باتو عالم عالمے دیگر بساز

بلکہ اس وقت جس طرح حق تعالیٰ نے محض اپنے فضل سے مسلمانوں کو اپنی تنظیم اور مرکز واحد پر اجتماع کی توفیق بخشی اسی طرح آج ان کے دلوں میں کسی نہ کسی درجہ میں دین کی طلب بھی پیدا فرمادی، وقت ہے کہ حضرات علماء متوجہ ہوں اور اپنی زندگی کا نصب العین تبلیغ و اصلاح قرار دیکر نہ فقط جلسوں اور کانفرنسوں میں بلکہ اس سے زیادہ نجی مجالس اور مذاکرات میں یہ بات مسلمانوں کے ذہن نشین کرادیں کہ ان کی ہر صلاح و فلاح محض نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کے اتباع میں مضمر ہے خصوصاً جب علماء مسلمانوں کو یہ مشورہ دے رہے ہیں کہ وحدت قومی کے تحفظ کے لئے مسلم زعماء کی قیادت تسلیم کریں تو ان کا یہ فرض اور بھی مؤکد ہو جاتا ہے کہ وہ ان زعماء میں اسلامی روح پیدا کرنے اور ان کی زندگی کو صحیح اسلامی زندگی بنانے میں اپنی تبلیغی سرگرمیوں کو

تیز تر کر دیں اور اس سلسلہ میں اجتماعی اور انفرادی موثر تدبیریں عمل میں لاویں، واللہ المستعان۔

زعماء سے خطاب

مسلم عوام کو موجودہ قیادت تسلیم کرنے اور اس کے زیر حکم چلنے کی جو شرعی ہدایات قرآن وحدیث اور تعامل سلف سے اوپر پیش کی گئی ہیں ان میں بتلایا گیا ہے کہ وہ قائدین کے ذاتی اعمال وافعال پر نظر نہ کریں قومی اور اجتماعی مفاد کو پیش نظر رکھیں۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ قائدین اپنی ذمہ داری کو محسوس نہ کریں۔

حق تعالیٰ نے مسلمانوں کی قیادت کی جو بیش بہا نعمت ان کے سپرد فرمائی ہے اس کا واجب شکر یہ ہے کہ وہ اپنے ہر حال اور ہر کام میں حق تعالیٰ کی رضا اور اس کے رسول ﷺ کی تعلیمات کو تمام مصالح اور فوائد پر مقدم رکھیں۔

جو کام خدا تعالیٰ اور اس کے رسول کی مرضی کے خلاف ہو اس میں خواہ کتنے ہی ذاتی یا قومی مفاد نظر آتے ہوں خوب سمجھ لیا جائے کہ وہ ایک نظر فریب سراب ہے مسلمان قوم کسی وقت اور کسی حال خلاف شرع امور کا ارتکاب کر کے کامیابی کی صورت نہیں دیکھ سکتی اس لئے کہ خدا کی بندگی اور دوستی کا دعویٰ کرنے والوں کو ڈھیل نہیں دی جاتی خدا کے دشمنوں پر ان کا قیاس درست نہیں کہ ان کو نافرمانیوں کے ساتھ ہی چند روزہ زندگی میں پھولنے پھلنے کا موقعہ دیا جاتا ہے۔

اس سے مسلمانوں کو دھوکہ نہیں کھانا چاہیے قرآن نے صاف لفظوں میں اس کا اعلان کر دیا ہے کہ۔

من کان یریدالحیاۃ الدنیا و زینتھا نوف الیھم اعمالھم فیھا وھم فیھا لا یبخسون ۔

جو کوئی دنیا ہی کی زندگی اور اس کی رونق کو مد نظر رکھتا ہے تو ہم ان لوگوں

کے اعمال (کی جزا) اسی (دنیا) میں پوری طرح دیدیتے ہیں اور ان
کے لئے اسمیں ذرا کمی نہیں ہوتی۔

قرآن وحدیث کی نصوص اور پھر تاریخ اسلام کا تجربہ شاہد ہے کہ مسلمان قوم دنیا میں بھی اگر کامیاب ہوسکتی ہے تو صرف اسی طریق سے ہوسکتی ہے جس کو اس کے اسلاف نے اسلام کے دور اول میں اختیار کیا تھا۔ یعنی دیانت وتقویٰ اور صبر تحمل، امام مالک بن انس رحمۃ اللہ علیہ کا یہ ارشاد خادم ملت کو اپنے لوح قلب پر لکھ لینا چاہیے۔

لن یصلح آخر ھذا الامة الاما صلح به اولھا

اس امت کے آخری دور کی اصلاح بغیر اس طریق کار کے نہیں ہوسکتی
جس کو اس کے دور اول میں اختیار کیا گیا۔

اسلامی ریاست کے مدون اول حضرت فاروق اعظمؓ نے شام کے عامل (گورنر) حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کے نام ایک فرمان بھیجا جو درحقیقت اسلامی سیاست کی روح ہے، پس جس شخص کو حق تعالیٰ نے مسلمانوں کی سیاست وقیادت سپرد فرمائی ہو اس کو یہ فرمان ہمیشہ اور ہر وقت پیش نظر رہنا چاہیئے۔

"ایھاالناس کنتم اقل الناس و اذل الناس و احقر
الناس فا عز کم اللہ بالاسلام فمھما تطلبوا العزة
بغیر اللہ یذلکم اللہ"

یعنی اے مسلمانو! تم عدد میں سب سے کم اور سب زیادہ ذلیل وحقیر تھے اللہ
تعالیٰ نے تمہیں اسلام کے ذریعہ عزت بخشی یاد رکھو کہ جب کبھی تم غیر اللہ سے
عزت کے طالب ہوگے تو اللہ تعالیٰ تمہیں ذلیل کردینگے۔

زعماء قوم! یہ کسی عام مولوی ملا کا وعظ نہیں اسلام کے اس صاحب شوکت و جلالت تاجدار کا فرمان ہے جس کا لوہا تمام دنیا مان چکی ہے جس نے کسریٰ وقیصر کے

تخت الٹ دیئے، جس نے دنیا کا جغرافیہ بدل دیا، افسوس ہے کہ حوادث و آفات کے تھپیڑوں سے کسی وقت ہماری آنکھ کھلتی بھی ہے تو ہم ساری تدبیریں کرتے ہیں لیکن نہیں کرتے وہ جو ہماری ہر تدبیر کی روح تھی یعنی تعلق مع اللہ اور تقویٰ۔

بہار و بنگال اور گڈھ مکٹیسر وغیرہ کے المناک خونیں حوادث نے مسلمانوں کو چونکا دیا، ان کے لیڈروں کو حفاظتی تدبیروں کی طرف متوجہ کیا۔ لیکن نہایت افسوس ہے کہ اس روح تدابیر کی طرف اب تک کوئی متوجہ نہیں ہوا اور ان کی مسجدیں اسی طرح ویران ہیں اور ان کے سینما گھر اسی طرح آباد، ہر لغویت اور ہر معصیت کے لئے ان کے اوقات وسیع اور سرمایہ غیر محدود نظر آتا ہے لیکن شرعی اور قومی ضرورتوں کے لئے وہ سب سے زیادہ عدیم الفرصت اور مفلس نکلتے ہیں وہ اسلام کے نام پر قربانیاں پیش کرنے کے دعویدار ضرور ہیں اور بہت سے کرتے بھی ہیں لیکن سیرت وصورت میں خدا ورسول کے دشمنوں سے ان کا کوئی امتیاز نظر نہیں آتا۔ پھر ان کو وہ غیبی تائید اور الٰہی نصرت اور فرشتوں کی امداد کہاں سے حاصل ہو جو ہمیشہ ان کی فتوحات کا اصلی سبب رہی ہے۔

خوب سمجھ لیجئے کہ فرشتوں کی امداد صرف غزوہ بدر کے ساتھ ہی مخصوص نہیں تھی یہ خدائی لشکر اب بھی موجود اور مسلمانوں کی امداد کے لئے تیار ہے مگر افسوس ہے کہ ہم ان کی امداد حاصل کرنے کے لئے تیار نہیں قرآن کریم نے جہاں بدر میں فرشتوں کی امداد کا تذکرہ فرمایا ہے وہیں یہ شرط بھی ذکر فرمائی ہے کہ تم صبر وتقویٰ اختیار کرو۔

> بلىٰ ان تصبروا وتتقوا ويأتوكم من فورهم هذا يمددكم ربكم بخمسة الاف من الملائكة الأية.
>
> بیشک اگر تم نے صبر وتقویٰ اختیار کیا اور کفار تم پر یک بارگی ٹوٹ پڑے تو خدا تعالیٰ پانچ ہزار فرشتوں سے تمہاری امداد کرینگے۔

آج پھر اگر ہم صبر وتقویٰ کے دو گر یاد کرلیں اور ان پر عمل پیرا ہوں تو زمین و آسمان سے امداد خداوندی ہماری محیط ہو جاوے۔ کسی نے خوب کہا ہے ۔

فضاء بدر پیدا کر فرشتے تیری نصرت کو
اتر سکتے ہیں گردوں سے قطار اندر قطار اب بھی

مانا کہ کچھ زمانہ کی معصیت نواز فضاء کی مجبوریوں سے اور کچھ غیر شرعی امور کے خوگر ہو جانے سے بیک وقت زندگی کے سب شعبوں میں تبدیلی دشوار ضرور ہے مگر جن آفات وحوادث میں ہم مبتلاء ہیں ان سے زیادہ تلخ نہیں۔

حق تعالیٰ کی وسیع رحمت سے یہ بھی امید ہے کہ اگر ہم آہستہ آہستہ اس میں تبدیلی شروع کردیں اور جس معصیت کا ترک آسان ہے وہ فوری ترک کردیں جس میں دشواریاں حائل ہیں ان کے رفع کرنے کی کوشش میں لگ جائیں تو انشاء اللہ تعالیٰ تائید غیبی ہمارے ساتھ ہو جاوے گی۔

بالخصوص نماز کا اہتمام ان سب کاموں میں مقدم اور دوسرے امور دینیہ کے لئے معین اور بالخاصۃ مسلمانوں کی اجتماعی اور سیاسی زندگی کے لئے انتہائی قوت بخش ہے اور اگر ذرا ہمت سے کام لیا جائے تو کچھ دشوار بھی نہیں۔

حضرت فاروق اعظمؓ نے اپنے صوبہ دار حکام کے نام ایک فرمان بھیجا تھا جس کو امام مالکؒ نے مؤطا میں نقل فرمایا ہے اس کے الفاظ یہ ہیں

ان اهم امركم عندى الصلوٰة فمن ضيعها فهو لما سواها اضيع . (مؤطا)

یعنی میرے نزدیک مسلمانوں کے سب کاموں میں اہم چیز نماز ہے جس نے اس کو ضائع کردیا اس نے دوسرے کاموں کو بدرجہ اولیٰ ضائع کردیا۔'' یہ فرمان صوبہ کے گورنروں اور حکام وعمال کے نام بھیجنے میں ایک خاص راز ہے کہ حکام وعمال اگر نماز

کے پابند ہوں تو عوام خود بخود پابند ہو جاتے ہیں۔ ہمارے سیاسی قائد اور زعماء قوم اگر اس پر توجہ دیں اور نماز کے پابند ہو جائیں تو یقین ہے کہ ان کی ایک نماز ہزاروں مسلمانوں کو نمازی بنا دے گی اور ان سب کا اجر و ثواب ان کے نامہ اعمال میں بھی لکھا جاویگا۔

علماء و صلحاء کی نماز کا عوام پر وہ اثر نہیں ہو سکتا جو ان حضرات کی نماز کا ہوگا ہم اگر اس مجلس سے اتنا ہی سبق لیکر اٹھیں کہ جو لوگ نماز نہیں پڑھتے وہ پڑھنے لگیں، جو پابند نہیں وہ پابندی کرنے لگیں۔ جو پابند ہیں مگر ناواقفیت یا غفلت سے اس کے آداب و شرائط کا لحاظ نہیں کرتے وہ اس کی تکمیل کی فکر کریں اور ساتھ ہی اپنے اہل و عیال اور اعزاء و احباب کو اس کی تاکید کریں تو انشاء اللہ تعالیٰ آنکھوں سے دیکھ لیں گے کہ توفیق ایزدی اور تائید ربانی ہر قدم پر آپ کے ساتھ ہے۔

وآخر دعوانا ان الحمدللہ رب العالمین .

بندہ ضعیف محمد شفیع دیوبندی عفا اللہ عنہ وعافاہ

روز جمعہ یکم ربیع الاول ۱۳۶۶ھ

دستور قرآنی

تاریخ تالیف ——— ۲۷ / ذیقعدہ ۱۳۷۲ھ (مطابق ۱۹۵۲ء)
مقامِ تالیف ——— کراچی

حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ مسجد باب الاسلام آرام باغ کراچی میں بعد نماز فجر درس قرآن دیا کرتے تھے، ان دروس کے دوران جن آیات میں اسلامی دستور مملکت کی اہم دفعات مجتمعاً مذکور ہیں نیز ان کے ساتھ دوسری آیات جن میں دستوری مسائل ذکر کئے گئے ہیں ان کو ضبط تحریر میں لایا گیا پھر حضرت والا کی نظر ثانی اور اصلاح کے بعد ''دستورِ قرآنی'' کے نام سے اسے شائع کیا گیا۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

حرفِ آغاز

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَکَفٰی وَسَلَامٌ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی

زیرِ نظر اوراق کوئی مدوّن دستور نہیں، بلکہ درسِ قرآن کی ایک تقریر ہے جو افادۂ اہلِ علم کے لیے ضبطِ تحریر میں لائی گئی، مسجد باب الاسلام متصل آرام باغ کراچی میں روزانہ بعد نماز فجر مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دامت فیوضہم رکن مجلس تعلیمات اسلام دستوریہ پاکستان و صدر مجلس منتظمہ دارالعلوم کراچی درسِ قرآن دیتے ہیں، چند آیات وہ آئیں جن میں اسلامی دستورِ مملکت کی اہم دفعات مجتمعاً مذکور ہیں۔ حاضرین درس کا تقاضا ہوا کہ ان آیات کے ساتھ دوسری آیات بھی جن میں دستوری مسائل مذکور ہیں شامل کر دی جائیں اور اس تقریر کو شائع کیا جائے، تاکہ پاکستانی مسلمانوں پر یہ واضح ہو جائے کہ اسلامی دستور جس کا مطالبہ تمام پاکستان کے مسلمانوں کی طرف سے جاری ہے وہ صرف ماہرین شریعت علماء و فقہاء کے اجتہادات و قیاسات نہیں، بلکہ اس کی اہم دفعات براہِ راست قرآن مجید سے ثابت ہیں، اس لیے

احقر نے اس کی اشاعت کا اہتمام کیا، تقریر کو ضبط تحریر میں لانے کے بعد حضرت والا کے سامنے پیش کر کے آپ کے ملاحظہ اور اصلاح کے بعد شائع کیا گیا۔ اللہ تعالیٰ ہمارے ارکان اسمبلی اور حکومت کے ذمہ داروں کو توفیق بخشیں کہ وہ قرآن کے ان کھلے ہوئے ارشادات کو دستور سازی کی بنیاد قرار دے کر اپنا اسلامی فرض ادا کریں، اور مسلمانوں سے کئے ہوئے مسلسل وعدوں کو پورا کریں، اور اس پر غور کریں کہ کسی ملک کا دستور روز روز نہیں بنتا، پاکستان کا دستور بنے گا اور آئندہ نسلوں تک چلے گا، ہماری ہڈیوں کا نشان بھی باقی نہ ہوگا، مگر اس دستور کی ذمہ داری اور اس کا ثواب یا عذاب ہمیشہ کے لیے ہماری گردنوں پر ہوگا۔ افسوس ہے کہ ہماری دستور ساز اسمبلی کے ارکان ملک کے دستور کو صرف اپنے گرد و پیش کے حالات اور ان کے متعلقہ نفع و ضرر کے درمیان دائر کر کے دیکھتے ہیں، حالانکہ یہ مناظر ان کے سامنے ہیں کہ دستور پاکستان کی تدوین کے زمانہ ہی میں کتنے ذمہ دار افراد ہیں جو اسی طرح سوچا کرتے تھے اور ابھی دستور بنا بھی نہیں کہ وہ قبروں میں پہونچ چکے یا اقتدار کی کرسیاں ان سے واپس لے لی گئیں۔ فَاعْتَبِرُوْا یٰٓاُولِی الْاَبْصَارِ

بندہ نور احمد

۲۷ ذیقعدہ ۱۳۷۲ھ

ناظم دار العلوم کراچی (نانکواڑہ)

تقریر درسِ قرآن

(متعلقہ دستورِ مملکت)

یوم یکشنبہ ۳۰؍شوال ۱۳۷۲ھ، ۱۲ جولائی ۱۹۵۳ء

از حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رکن مجلس تعلیماتِ اسلام دستوریہ پاکستان مفتیٔ اعظم پاکستان

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

درسِ قرآن کے سلسلے میں آج سورۂ نساء کی ان دو آیتوں کا نمبر ہے جو "اِنَّ اللّٰهَ یَاۡمُرُكُمۡ" سے شروع ہوتی ہیں، ان میں حکومت اور عوام کے فرائض کا بیان اور اسلامی دستورِ مملکت کے چند اہم دفعات مذکور ہیں، اس وقت سلسلہ کے لحاظ سے انہیں دو آیتوں کی تفسیر بیان کرنا تھا، لیکن دستور کا مسئلہ آج کل ہمارے پاکستان میں بلکہ تمام اسلامی ممالک میں وقت کی ایک اہم بحث بنا ہوا ہے، اس لئے بعض شرکاءِ درس کی یہ خواہش ہوئی کہ اور بھی ان آیات کی تفسیر اسی سلسلے میں شامل کر دی جائے جن سے دستوری مسائل نکلتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ یہ وقت اتنا نہیں کہ پورے قرآن میں پورا غور کر کے جہاں جہاں دستوری مسائل مذکور ہیں ان سب آیات کو جمع کیا جا سکے، صرف اپنی یادداشت کے مطابق جو آیات دستوری مسائل پر مشتمل ہیں ان کی تفسیر اور ان سے دستوری دفعات کا

ثبوت پیش کرتا ہوں، وَاللّٰهُ الْمُوَفِّقُ، میں اس تمام بیان میں اپنی دانست کے موافق دو باتوں کا التزام کروں گا، ایک یہ کہ کسی مضمون کو قرآن کی طرف اس وقت تک منسوب نہ کروں جب تک قرآنی الفاظ کی واضح دلالت اس پر نہ ہو، دوسرے یہ کہ آیات کی تفسیر سلف صالحین کی تفسیر سے اور دوسرے اصولِ تفسیر سے مختلف نہ ہو، ممکن ہے کہ اس التزام میں مجھ سے کسی جگہ لغزش ہو جائے تو حاضرین میں اہلِ علم حضرات بھی موجود ہیں ان سے درخواست ہے کہ مجھے متنبہ فرمادیں۔

دستور اور قانون میں فرق

قبل اس سے کہ آیات متعلقہ دستور کی تفسیر پیش کی جائے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ''دستور'' اور ''قانون'' میں فرق واضح کر دیا جائے کیونکہ عموماً لوگ اس سے واقف نہیں، بلکہ دونوں کو ایک چیز سمجھتے ہیں اور اس کی وجہ سے طرح طرح کے اشکالات میں الجھ جاتے ہیں۔

دستور: نام ہے نظام حکمرانی اور حکومت کے بنیادی اصولوں کا کہ کسی سلطنت کو کس طرح چلایا جائے، اس کی دفعات اس طرح کی ہوتی ہیں مثلاً اقتدارِ اعلیٰ کس کا ہے، صدرِ مملکت کا عزل ونصب کس کے اختیار میں، اس کا تقرر کن اصول پر کیا جائے، صدر کے اوصاف کیا ہوں، اس کے فرائض کیا ہوں، طرزِ حکومت پارلیمانی ہو یا صدارتی شخصی ہو یا جمہوری، قانون سازی کا اختیار کس کو ہو اور کن اصول وشرائط پر، وغیر ذلک، اور قانون ملک کے شعبہ جاتی نظام اور اس کی تفصیلات سے متعلق ہوتا ہے۔ اس سے معلوم ہو گیا کہ دستور، قانون سے بالکل مختلف ایک چیز ہے۔ دوسری ایک بات اور سمجھ لینا ضروری ہے وہ یہ کہ قرآن مجید تمام اقوامِ عالم کے لیے، تمام شعبہائے زندگی کے واسطے ایک مکمل ہدایت نامہ ہے، اسمیں دستورِ مملکت کے اصول بھی ہیں قانون کے تمام انواع واصناف بھی، اصلاحِ اعمال واخلاق کے لیے ہدایتیں بھی ہیں، عبادت گزاری

کے طریقے بھی، تمدن و معاشرت کے بہترین اصولوں کی تعلیم بھی ہے، خلوت وجلوت کے آداب بھی، عالم ارواح، عالم عناصر کی پیدائش، اجرامِ فلکیہ اور نجوم ثوابت و سیارات اور اصول طب کے متعلق اہم معلومات بھی ہیں اور تاریخ اقوام وملل بھی۔ لیکن اس کا حکیمانہ اسلوب انسانی تصانیف سے بہت بلند و بالا ہے، نہ اس کو فن تاریخ کی کتاب یا کوئی قصہ و ناول کہا جاسکتا ہے۔ نہ فنِ طب کا قرابادین، نہ فنِ نجوم یا فلسفہ و ریاضی کا مجموعہ کہہ سکتے ہیں، نہ کوئی مرتب دستور و قانون، وہ ایک عجیب وغریب نظامِ حیات اور نسخۂ شفاء ہے جس کا ایک ایک لفظ دل کی گہرائی میں اترتا اور اپنا اثر دکھاتا ہے۔

وہ یاد کرنے اور تلاوت کرنے کے لئے اتنا آسان ہے کہ پانچ برس کا بچہ پورا حفظ کرسکتا ہے، اور اس کے احکام ومواعظ اتنے سادہ پیرایہ میں ہیں کہ معمولی سمجھ کا آدمی بھی ادنیٰ کوشش کر کے سمجھ سکتا ہے، ساتھ ہی اسکے مضمرات اور غوامض اتنے عمیق ہیں کہ چودہ سو سال کی طویل مدت میں لاکھوں علمائے امت نے اپنی پوری عمریں اس کے تھاہ معلوم کرنے میں گزار دی مگر نہ پاسکے۔ بلکہ اپنی اپنی فہم وفراست اور غور وتدبر کے موافق ہر شخص نے حصہ پایا اور قیامت تک پاتے رہیں گے، یہی وہ میدان ہے جس میں ماہر کتاب اللہ دوسروں سے ممتاز ہوتے ہیں، یہ کہنا جہالت کے سوا کچھ نہیں کہ ''قرآن صرف ملاؤں کی جاگیر نہیں، ہر مسلمان کا حق اس میں مساوی ہے'' کیوں کہ یہاں جاگیر کا سوال نہ کبھی ہوا نہ ہوسکتا ہے، بلاشبہ حق تو سب کا ہے مگر ایسا ہی جیسے وزارتِ عظمیٰ اور صدارتِ مملکت ایک جمہوری ملک میں ہر باشندۂ ملک کا حق ہے، مگر اس حق کو حاصل وہی کرتا ہے جو اس کے شرائط کو پورا کریں، ایک گدھا گاڑی ہانکنے والا جاہل بغیر کسی تعلیم وصلاحیت حاصل کئے ہوئے یہ نہیں کہہ سکتا کہ مجھے وزیر اعظم کیوں نہ بنایا گیا، ایسے ہی وہ لوگ جنہوں نے قرآن کو سمجھنے کے لئے عمر کے پچاس سال میں سے پچاس دن بھی نہ خرچ کئے ہوں یہ نہیں کہہ سکتے کہ ہم بھی قرآن کو ایسا ہی سمجھتے ہیں جیسے

ماہرین قرآن وسنت، جن کی عمریں اسی میدان کی سیاحت میں گزری ہیں۔ قرآن مجید کی ترتیب بھی عام انسانی تصانیف کی ترتیب سے بالکل مختلف ہے۔ ایک قصہ لیا جاتا ہے اس کے ٹکڑے ٹکڑے پورے۔ قرآن میں بکھرے ہوئے ملتے ہیں۔ مکرر سہ کرر آتے ہیں، بلاشبہ اس کلام ربانی کی سورتوں اور آیتوں میں کوئی گہرا ربط ہے اور اسی وجہ سے وہ دلوں پر قبضہ جماتا ہے۔ اس کو جتنا پڑھئے طبیعت اکتانے کی بجائے ذوق وشوق اور بڑھتا ہے۔ گو اس ربط وترتیب کا ہماری فہم احاطہ نہ کر سکے، اس کی مثال چمن بندی سے پیدا شدہ سینری اور پہاڑی اور بحری مناظر کی سینریوں سے دی جاسکتی ہے کہ آخر الذکر میں بظاہر کوئی ربط نہیں ہوتا، ایک طرف پہاڑ کی اونچی چٹان کھڑی ہے وہ بھی کسی خاص سانچہ میں ڈھلی ہوئی نہیں اور دوسری طرف گہرا غار ہے لیکن اس کی یہ ظاہری بے ربطی اپنے اندر وہ دل ربا ربط رکھتی ہے کہ اعلیٰ سے اعلیٰ چمن بندی اس کو نہیں پا سکتی۔ اس تمہید سے آپ نے سمجھ لیا ہوگا کہ قرآن کریم اس زمانے کے مروّجہ دساتیر کی طرح کوئی دفعات پر مشتمل مرتب دستور کی کتاب نہیں۔ اس میں دستوری مسائل بھی مختلف سورتوں کی مختلف آیتوں میں بکھرے ہوئے ہیں، میں اس وقت دستوری مسائل سے متعلقہ آیات کو بلا لحاظ ترتیبِ قرآنی اس طرح بیان کر رہا ہوں کہ وہ کسی قدر دستوری ترتیب سے قریب ہو جائے اور یہ ظاہر ہے کہ اس وقت پیشِ نظر کسی مکمل دستور کی تدوین نہیں بلکہ صرف ان دفعات دستور کا بیان ہے جو براہِ راست قرآن مجید سے ثابت ہیں، مکمل دستور اسلامی اور اس کی پوری دفعات مدوّن کرنا ہوں تو ان آیات کے ساتھ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی قولی وعملی تشریحات وتعلیمات کو ساتھ ملا کر بآسانی کیا جا سکتا ہے کیونکہ دین کے تمام مسائل کا ماخذِ اصلی کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہیں۔ واللہ الموفق و المعین۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

قرآنی دستورِ مملکت حکومت کے اغراض و مقاصد

دفعہ (۱)

(الف)......تمام باشندگانِ مملکت کو عدل و اعتدال پر قائم کرنا۔

(ب)......مملکت سے داخلی اور خارجی فتنہ و فساد کو دفع کرنا۔

(ج)......مسلمانوں کے لیے اقامتِ نماز اور ادائے زکوٰۃ کا انتظام۔

(د)......لوگوں کو بھلائیوں پر آمادہ کرنے اور برائیوں سے روکنے کا انتظام۔

آیت ۱: لَقَدۡ اَرۡسَلۡنَا رُسُلَنَا بِالۡبَیِّنٰتِ وَاَنۡزَلۡنَا مَعَهُمُ الۡكِتٰبَ وَالۡمِیۡزَانَ لِیَقُوۡمَ النَّاسُ بِالۡقِسۡطِ ۔ (۵۷:۲۵)

ترجمہ:۔ ''ہم نے اپنے رسولوں کو معجزات دے کر بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان اتاری تاکہ لوگ عدل و اعتدال پر قائم ہو جائیں۔''

اس آیت میں انبیاء علیہم السلام جو زمین پر اللہ تعالیٰ کی خلافت کے حامل، اور نظم و سیاستِ ملک کے ذمے دار ہیں ان کو دو چیزیں عطا فرمانے کا ذکر ہے، ایک کتاب جو معاش و معاد کے اصولِ صحیحہ کی رہنمائی کرنے والی ہے۔ دوسرے میزان جو ان اصول کو عملی جامہ پہنانے والے ذرائع و وسائل کا نام ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مادی ترازو بھی اتاری جس میں اجسام تلتے ہیں اور عملی ترازو بھی جسے عقل سلیم کہتے ہیں اور اخلاقی ترازو بھی جسے صفت عدل و انصاف کہا جاتا ہے۔ اور سب سے بڑی ترازو دین حق ہے جو خالق و مخلوق کے حقوق کا ٹھیک ٹھیک تصفیہ کرتا ہے اور جس میں بات پوری تلتی ہے نہ کم

نہ زیادہ (حواشی شیخ الاسلامؒ) اور پھر دونوں چیزوں کے عطا فرمانے کی حکمت وغرض یہ بتلائی گئی ہے کہ لوگ عدل واعتدال پر قائم ہو جائیں۔

آیت ۲: وَ قَتَلَ دَاوُدُ جَالُوْتَ وَ اٰتٰهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ وَ الْحِكْمَةَ وَعَلَّمَهٗ مِمَّا يَشَآءُ وَ لَوْ لَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ۔ (۲:۲۵۱)

ترجمہ: ''داؤد نے جالوت (لشکرِ کفار کے سردار) کو قتل کر دیا اور ہم نے داؤد کو حکومت اور حکمت (نبوت) عطا کر دی اور اس کو جو کچھ اللہ نے چاہا سکھا دیا اور اگر (اس طرح) سلطنت قائم کر کے اللہ تعالیٰ بعض لوگوں کو دوسروں پر ظلم کرنے سے نہ روکتے تو زمین میں فساد ہو جاتا، مگر اللہ تعالیٰ جہان والوں پر احسان وانعام کرنے والے ہیں۔'' (اس لئے حکومت و سلطنت قائم کر دی کہ فساد نہ ہو)۔

روح المعانی میں ہے:۔

وفی هذا تنبيه على فضيلة الملک و انه لو لاه ما استلب امن العالم و لهذا قيل الدين و الملک تو أمان .

(ص ۱۷۴، ج ۲)

ترجمہ: ''اس آیت میں ملک وسلطنت کی فضیلت پر تنبیہ ہے کہ اگر دنیا میں نظام حکومت وسلطنت قائم ہونے کا دستور نہ ہوتا تو نظامِ عالم درہم برہم ہو جاتا، اسی لئے کہا گیا ہے کہ دین اور حکومت دو جڑواں بچے ہیں۔'' اور چونکہ حکومت وسلطنت کا اہم مقصد فتنہ وفساد کو روکنا ہے اس لئے عادۃ اللہ یہ جاری ہے کہ حکومت وسلطنت بعض اوقات کفر کے ساتھ تو جمع ہو جاتی ہے لیکن ظلم وفساد کے ساتھ جمع ہو کر نہیں رہ سکتی۔ اسی لئے فرشتوں نے

انسان کی خلافت وحکومت کے خلاف جو وجہ بارگاہ حق تعالیٰ میں پیش کی وہ یہ نہ تھی کہ انسان کفر و بت پرستی کرے گا بلکہ یہ کہا گیا کہ وہ فساد و خونریزی کرے گا، کیونکہ کفر و شرک اپنی ذات میں اگر چہ فساد و خونریزی سے بڑا جرم ہے لیکن نظم مملکت کے لحاظ سے فساد و خونریزی اشد ہے۔

آیت ۳: اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِى الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ (۲۲:۴۱)

ترجمہ: ”یہ لوگ ایسے ہیں کہ اگر ہم ان کو دنیا میں حکومت دیدیں تو یہ لوگ قائم کریں نماز اور ادا کریں زکوۃ اور نیک کاموں کے کرنے کو کہیں اور برے کاموں سے منع کریں“

اس آیت میں واضح طور پر دنیا کی سلطنت دینے کی غرض مذکورہ چار کام بتلائے ہیں، نماز کی اقامت، زکوٰۃ کا انتظام، اچھے کاموں کا حکم، بُرے کاموں سے روکنا۔

طرزِ حکومت

دفعہ (۲)

حاکم حقیقی صرف اللہ رب العالمین ہے، زمین کی حکومت بنی آدم کو بطور امانت و نیابت سپرد کی جاتی ہے۔

قرآن کریم کی آیاتِ ذیل اس پر شاہد ہیں:۔

آیت ۴ : لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَ مَا فِيْهِنَّ وَ

هُوَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ، (۵:۱۲۰)

ترجمہ: ''اسی کا ہے ملک آسمانوں کا اور زمین کا اور تمام چیزوں کا جو آسمان اور زمین میں ہیں، اور وہی ہے ہر چیز پر قادر''

اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ . (۶:۵۷)

ترجمہ: ''حکم کسی کا نہیں سوائے اللہ کے''

آیت ۵: فَسُبْحَانَ الَّذِىْ بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ وَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ . (۸۳:۳۶)

ترجمہ: پاک ہے وہ ذات جس کے ہاتھ میں ملک کی ہر چیز ہے اور تم سب اسی کی طرف لوٹ کر جاؤ گے''

آیت ۶: قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِى الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَ تَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ . (۳:۲۶)

ترجمہ: آپ یہ کہئے کہ اے اللہ! ملک وسلطنت کے مالک تو جس کو چاہتا ہے مملکت عطا کرتا ہے اور جس سے چاہتا ہے چھین لیتا ہے۔''

آیت ۷: اِنِّىْ جَاعِلٌ فِي الْاَرْضِ خَلِيْفَةً . (۲: ۳۰)

ترجمہ: (اللہ تعالیٰ نے آدمؑ کو پیدا کرنے کے وقت فرمایا): ''میں زمین میں اپنا نائب بنانے والا ہوں۔''

ان مضامین کی آیات قرآن کریم میں بے شمار ہیں، صرف چند پر اکتفاء کیا گیا،

دفعہ (۳)

اسلامی مملکت میں کتاب وسنت کے خلاف کوئی قانون نہ پاس ہوسکتا ہے نہ باقی رکھا جاسکتا ہے نہ کتاب وسنت کے خلاف کوئی انتظامی حکم دیا جاسکتا ہے۔ سورۂ مائدہ

پارہ ۶ میں تین آیات قریب قریب ہیں۔

آیت ۸ : وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ (۵: ۴۴)

ترجمہ: ''اور جو کوئی حکم نہ کرے اس کے موافق جو کہ اللہ نے اتارا سو وہی لوگ کافر ہیں۔''

آیت ۹ : وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ (۵: ۴۵)

ترجمہ: ''اور جو کوئی حکم نہ کرے اس کے موافق جو کہ اللہ نے اتارا، سو وہی لوگ ظالم ہیں''

آیت ۱۰ : وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ (۵: ۴۷)

ترجمہ: ''اور جو کوئی حکم نہ کرے اس کے موافق جو کہ نازل کیا اللہ نے سو وہی لوگ ہیں نافرمان''

معنی یہ ہیں کہ اللہ کے نازل کئے ہوئے احکام سے جو شخص اعتقادی طور پر مخالفت کرے کہ ان کو حق و صحیح نہ مانے وہ کافر ہے اور جو اعتقادی طور پر حق ماننے کے باوجود عملاً فیصلہ اس کے خلاف دیں وہ ظالم اور نافرمان ہیں۔

ان تینوں آیتوں میں عنوانِ بیان یہ اختیار کیا گیا ہے کہ جو شخص خدا کے نازل کردہ احکام کے خلاف حکم کرے وہ کافر فاسق ظالم ہے، مثبت طور پر یہ نہیں فرمایا کہ ایسا قانون جو اللہ نے نازل نہیں کیا اس کے موافق فیصلہ کرنے والے کافر فاسق ہیں، اس میں حکمت یہ ہے کہ جن امور میں اللہ تعالیٰ نے بلا واسطہ یا بواسطۂ رسول کوئی حکم نہیں فرمایا ان سے ایسے معاملات میں انسانی قانون سازی کی گنجائش دیدی، یعنی جس

معاملہ میں اللہ تعالیٰ نے کوئی قانون نازل فرما دیا اس کے خلاف کوئی قانون نہیں بنایا جا سکتا، لیکن جس معاملات میں اللہ تعالیٰ نے بلا واسطہ یا بالواسطہ رسول کوئی قانون نازل ہی نہیں فرمایا وہاں انسان کو اختیار ہے کہ اپنے ملک، زمانہ اور ماحول کے مقتضیات پر نظر کر کے باہمی مشورہ سے جیسا چاہیں قانون بنالیں، اس خاص عنوان کے ذریعہ جمہور کو دائرہ مباحات کا ایک وسیع میدان دیدیا گیا، جس میں وہ اپنی مرضی کے موافق قانون سازی کر سکتے ہیں۔

نیز سورۂ حشر کی آیت :۔

وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا (۵۹:۷)

ترجمہ: ''جو دے تم کو رسول سو لے لو اور جس سے منع کرے سو چھوڑ دو۔''
اس سے معلوم ہوا کہ بواسطہء رسول جو احکام بھیجے جائیں وہ بھی ما انزل اللہ کے حکم میں ہیں، اس لئے کتاب یا سنتِ رسول کے خلاف قانون سازی ممنوع ہے۔

آیت ۱۱ : اَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُوْنَ وَ مَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ حُكْمًا لِقَوْمٍ يُوْقِنُوْنَ (۵: ۵۰)

ترجمہ: ''اب کیا حکم چاہتے ہیں کفر کے وقت کا، اور اللہ سے بہتر کون ہے حکم کرنے والا یقین کرنے والوں کے واسطے۔'' قرآن کریم میں اس مضمون کی اور بھی بہت سی آیات ہیں، سب کے نقل کرنے کی ضرورت نہیں۔

دفعہ (۴)

اگر کسی قانون کے متعلق عوام اور حکام میں اختلاف ہو کہ وہ موافق شریعت ہے یا خلاف شرع تو اس کا فیصلہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کی طرف رجوع کر کے کیا

جائے گا جس کی عملی صورت ماہرین کتاب وسنت کے فیصلہ کو آخری فیصلہ قرار دینا ہے، خواہ ماہرین شریعت کا کوئی مستقل بورڈ بنایا جائے یا ایسے حضرات کو اسمبلی میں یا عدالت میں لیا جائے، ان میں سے جو صورت خطرات سے پاک سمجھی جائے اس کو اختیار کیا جائے۔

آیت ۱۲: یَآ اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْہُ اِلَی اللّٰہِ وَ الرَّسُوْلِ اِنْ کُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَ الْیَوْمِ الْاٰخِرِ (۴: ۵۹)

ترجمہ: ''اے ایمان والو! کہا مانو اللہ کا اور کہا مانو رسول اللہ کا اور اپنے حاکموں کا بھی جو تم میں سے (یعنی مسلمان) ہوں، پھر اگر تمہارے آپس میں کسی حکم کے متعلق اختلاف ہو جائے تو اس کو حوالہ کرو اللہ اور رسول کے اگر تم اللہ پر اور روز قیامت پر ایمان رکھتے ہو''

آیت میں اولی الامر کا لفظ اپنے مفہوم لغوی کے اعتبار سے ہر اس جماعت کو شامل ہے جس کے ہاتھ میں قوم کی باگ اور اجتماعی نظام ہو وہ علماء بھی ہو سکتے ہیں اور حکام وامراء بھی، صحابہ وتابعین کی ایک جماعت نے اس جگہ اولی الامر سے حکام ہی کا مراد ہونا بیان فرمایا ہے اسی کے موافق ترجمہ حاکموں سے کیا گیا ہے۔

اللہ ورسول کے حوالہ کرنے کا مطلب اس کے سوا نہیں ہو سکتا کہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ کو اپنے تمام نزاعات کے فیصلے کا معیار قرار دیا جائے اور اس کی عملی صورت تمام فنی (ٹیکنیکل) مسائل کی طرح یہی ہو سکتی ہے کہ ماہرین کتاب وسنت کے فیصلہ کو آخری فیصلہ مانا جائے۔

دفعہ (۵)

(الف)......طرزِ حکومت جمہوری شورائی ہوگا۔

(ب)......امیر مملکت کا عزل و نصب جمہور کے اختیار میں ہوگا جس کو وہ اپنے نمائندوں (اہل حل وعقد) کے ذریعہ استعمال کریں گ۔

آیت ۱۳ : وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ (۴۲:۳۸)

ترجمہ: ''اور کام کرتے ہیں مشورہ سے آپس کے۔''

آیت ۱۴ : وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ (۳ : ۱۵۹)

ترجمہ: (آنحضرت ﷺ کو ارشاد ہے کہ) ان سے (یعنی صحابہ سے) مشورہ لے کام میں، پھر جب قصد کر چکا تو اس کام کا تو پھر بھروسہ کر اللہ پر ،اللہ کو محبت ہے توکل والوں سے''۔

پہلی آیت میں بتلایا گیا ہے کہ مسلمانوں کے کام مشورے سے ہونے چاہئیں، نبی کریم ﷺ کی عملی تشریح سے ظاہر ہے کہ اس سے مراد مہمات امور ہیں، معمولی کاموں کو مشورہ پر موقوف رکھنا فضول بھی ہے اور موجبِ تکلیف بھی، اور مہماتِ امور میں سب سے اہم وہ کام ہیں جن پر ملت کی اجتماعی زندگی کا مدار ہے یعنی امورِ سلطنت جن میں اہم الامور امیر المملکت کا عزل و نصب ہے۔

دوسری آیت میں آنحضرت ﷺ کو صحابہ کرام سے مشورہ لینے کا حکم ہے، آپ ﷺ بوجہ وحی الٰہی اگر چہ اس کے محتاج نہ تھے مگر تعلیم امت کے لئے آپ کو بھی اس کا امر فرمایا گیا، چنانچہ آپ کا عمل ہمیشہ اس پر رہا اور آپ کے بعد یہ سنت جاری ہوئی اور خلافت راشدہ کی تو بنیاد ہی شوریٰ پر قائم تھی، باقی رہی شوریٰ کی تفصیلات کہ مجلس شوریٰ (اسمبلی) کس طرح مرتب کی جائے، ارکانِ شوریٰ میں اختلاف ہو تو فیصلہ کثرتِ رائے

سے کیا جائے یا امیر کی صوابدید پر؟ یہ تفصیلات رسول کریم ﷺ کے ارشادات و تعامل سے ثابت ہیں جو اس وقت موضوع بیان سے خارج ہیں۔ مکمل دستور مرتب کرنا ہو تو ان روایات حدیث کو شامل کرنا ضروری ہوگا۔

دفعہ ۶

حکومت کے مروجہ طریقوں میں سے صدارتی طرز حکومت اسلام کے مزاج اور اصول سے قریب تر ہے۔

آیت ۱۵ : یٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰکَ خَلِیْفَةً فِی الْاَرْضِ فَاحْکُمْ بَیْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ (۳۸:۲۶)

ترجمہ: ''اے داؤد ہم نے آپ کو زمین کا خلیفہ بنادیا، سو آپ لوگوں کے جھگڑوں کا فیصلہ اللہ کے نازل کئے ہوئے قانون کے مطابق کیا کریں۔''

اس آیت کے مطابق حکم و فیصلہ کی ذمہ داری خلیفۂ وقت (امیر المومنین) پر ڈالی گئی ہے اور ظاہر ہے کہ پارلیمانی طرز میں امیر مملکت پر کوئی ایسی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی، یہ صرف صدارتی طرز میں ہوسکتی ہے۔

علاوہ ازیں مذکورالصدر آیت ۱۲ سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی ریاست کے اولوالامر کا مسلم ہونا شرط ہے اور موجودہ دنیا میں اس شرط پر عمل صدارتی طرزِ حکومت میں بآسانی ہوسکتا ہے جس میں ولایت امر اور اقتدار اصلی صدرِ مملکت کا ہوتا ہے اس کے لئے مسلمان ہونے کی شرط عملاً سہل ہے بخلاف پارلیمانی نظام کے کہ اس میں صدرِ مملکت محض ایک نمائشی چیز ہے، اصل اقتدار صرف پارلیمان کا ہوتا ہے اور پوری پارلیمان میں کسی غیر مسلم کو شامل نہ کرنا عملاً دشوار ہے اس لئے بھی صدارتی طرز حکومت اصولِ اسلام سے قریب تر ہے۔

حکومت کے فرائض

دفعہ ۷

ہر گاہ کہ مملکت کے تمام عہدے، تمام اموال وخزائن حکام کے ہاتھ میں بطور امانت ہیں، وہ ان کے مالک ومختار نہیں، اور ان امانتوں کے اہل و مستحق جمہور عوام (باشندگانِ مملکت) ہیں، اس لئے حکومت کی ذمہ داری ہے:۔

(الف)...... ان امانتوں کے مستحقین کو تحقیق وتلاش کر کے پہنچائے،

(ب)...... ہر امانت اس کے مستحق کو پہنچائے، غیر مستحق کے قبضہ سے بچائے،

دفعہ ۸

مقدمات کا فیصلہ بلا امتیاز مذہب ونسل ورنگ ووطن پورے انصاف کے ساتھ کرے،

دفعہ ۹

انصاف مفت ہونا چاہئے، اصحاب معاملہ سے کسی قسم کا معاوضہ کورٹ فیس وغیرہ وصول نہ کرے۔

آیت ۱۶: اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُکُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمَانَاتِ اِلٰٓی اَھْلِھَا وَ اِذَا حَکَمْتُمْ بَیْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْکُمُوْا بِالْعَدْلِ اِنَّ اللّٰہَ نِعِمَّا یَعِظُکُمْ بِہٖ اِنَّ اللّٰہَ کَانَ سَمِیْعاً بَصِیْرًا (۴: ۵۸)

ترجمہ: ''بیشک اللہ تعالیٰ تم کو اس کا حکم دیتے ہیں کہ اہل حقوق کو ان کے حقوق پہنچایا کرو اور یہ کہ جب لوگوں کا تصفیہ کیا کرو تو عدل وانصاف کے

ساتھ کیا کرو بیشک اللہ تعالیٰ تم کو جس بات کی نصیحت کرتے ہیں وہ بات
بہت اچھی ہے، بلا شک اللہ تعالیٰ خوب سنتے ہیں خوب دیکھتے ہیں۔''

دفعہ ۷ سے دفعہ ۹ تک کے تمام مضامین اس آیت سے ثابت ہیں اور عنوان بیان میں اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُکُمْ کے اختیار کرنے سے اس کی طرف بھی اشارہ ہے کہ امر و حکم اصل میں صرف اللہ کا ہے، دنیا کے امیر و رئیس سب مامور ہیں، اس سے دفعہ ۲ مذکور الصدر کا مضمون بھی ثابت ہو گیا۔

اس میں پہلے یہ سمجھنا ہے کہ لفظ اَمَانَات جو بصیغہ جمع لایا گیا ہے اس سے کس کس قسم کی امانتیں مراد ہیں؟ ہماری زبان میں عموماً امانت اس مال کو کہتے ہیں جو کسی معتمد کے پاس حفاظت کے لئے رکھا جائے لیکن عربی زبان میں امانت کا مفہوم اس سے بہت عام ہے کسی شخص نے کسی کو راز دار بنا کر کوئی راز کہہ دیا اس کو بھی حدیث میں امانت فرمایا گیا ہے۔ ارشاد ہے: المجالس بالامانة، اسی طرح مشورہ لینے والے کو مشورہ دینا بھی حدیث میں امانت قرار دیا ہے کہ اپنے نزدیک جو بات صحیح و مفید ہو اس کے خلاف مشورہ دینا خیانت ہے، حدیث میں ہے المستشار موء تمن یعنی جس سے کوئی مشورہ لیا جائے وہ امین ہے، اس کو صحیح مشورہ دینا چاہئے، اسی مفہوم عام کے اعتبار سے حدیث میں فرمایا گیا ہے لا ایمان لمن لا امانة لہ یعنی جس میں امانت داری نہیں اس کا ایمان نہیں، اور صحیح مسلم کی حدیث میں ہے ان الا مانة نزلت فی جدر قلوب المؤ منین یعنی صفت امانت اللہ تعالیٰ نے مومن کے دل میں اتار دی ہے، ان تمام ارشادات سے معلوم ہوا کہ جس طرح مالی امانت ایک امانت ہے اسی طرح جس چیز کی ذمہ داری کسی شخص پر عائد ہو وہ بھی امانت ہے، انہیں مختلف اقسام امانات کی طرف اشارہ کرنے کے لئے امانات بصیغہ جمع لایا گیا ہے، اور اسی لئے آیتِ مذکورہ میں امانات کی تفسیر یہ کی گئی ہے،

ان الامانات جمع امانة یعم الحقوق المتعلقة بذمهم من

حقوق الله تعالیٰ و حقوق العباد و قدروی مایدل علی العموم عن ابن عباس و اُبیّ و ابن مسعود و البراء بن عازب و ابّی جعفروابی عبدالله (روح المعانی)

یعنی امانات امانت کی جمع ہے جو تمام حقوق واجبہ کو عام اور شامل ہے خواہ حقوق اللہ ہوں یا حقوق العباد اور امانت کے یہ عام معنی حضرات صحابہ کی ایک عظیم جماعت سے منقول ہیں مثلاً ابن عباس، ابی بن کعب، ابن مسعود، براء بن عازب، ابوجعفر، ابوعبداللہ وغیرہ۔

دوسری بات اس آیت میں یہ سمجھنا ہے کہ یامرکم کا خطاب کس کو ہے، اس میں بعض حضرات صحابہ نے تمام مسلمانوں کو خواہ حکام ہوں یا عوام اس خطاب میں شامل قرار دیا ہے، اور بعض حضرات نے اس کا مخاطب خاص حکام اور سلطنت کے ذمہ داروں کو قرار دیا ہے حضرت زید بن اسلمؓ وغیرہ نے خاص حکام کے مخاطب ہونے کو ترجیح دی ہے، جس کا قرینہ یہ ہے کہ اسی آیت کا دوسرا جز مقدمات کے فیصلہ سے متعلق ہے، اور یہ ظاہر ہے کہ مقدمات کا فیصلہ عوام کا کام نہیں، نیز اس کے بالمقابل دوسری آیت یَـآ اَیُّهـَا الَّـذِیـْنَ ا مَنُوْ ا سے شروع ہوتی ہے، جس کا مخاطب عام مومنین کا ہونا ظاہر ہے، تو مقابلہ کا مقتضا یہ ہے کہ پہلی آیت کا مخاطب خاص حکام ہوں اور دوسری کا عوام، اسی لئے حضرت زید بن اسلمؓ نے فرمایا

ان هذ االخطاب لو لا ة الا مران یقو موا بر عا یة الر عیة و حملهم علی موجب الدین و الشریعة و عد وا من ذالک تو لیة المناصب مستحقیها . (روح ص۶۴ ج۵)

''یہ خطاب خاص اولوالامر (حکام) کو ہے کہ وہ حفاظتِ رعیت کا مکمل انتظام کریں اور ان کو مقتضیات دین اسلام کا پابند بنائیں، امانات میں اس کو بھی شمار کیا ہے کہ عہدے صرف ان کے مستحقین کو دیئے جائیں''

علاوہ ازیں یہ خطاب خواہ حکام کے لئے مخصوص ہو یا عوام و حکام دونوں کو عام و شامل ہو، بہر حال حکام و امراء کا اس خطاب میں شامل ہونا سب کے نزدیک مسلم و متفق علیہ ہے۔

خلاصہء کلام یہ ہے کہ آیت میں امانات سے مراد تمام ذمہ داریاں اور جملہ حقوق واجبہ ہیں جن میں حسب تصریح حضرت زید بن اسلمؒ حکومت کے عہدے بھی داخل ہیں۔

آیت کا شانِ نزول بھی اسی کا مؤید ہے، کیونکہ یہ آیت اس وقت نازل ہوئی جب کہ فتح مکہ کے بعد آنحضرت ﷺ نے بیت اللہ کے قدیم دربان عثمان بن طلحہؓ سے بیت اللہ کی کنجی طلب فرمائی اور دروازہ کھول کر اندر تشریف لے جانے کا ارادہ کیا اس وقت چند حضرات صحابہ حضرت عباسؓ و حضرت علیؓ نے یہ درخواست کی کہ جس طرح حرم کعبہ کا عہدۂ سقایہ (یعنی آب زمزم کا انتظام) پہلے سے ان کے سپرد تھا، اسی طرح یہ عہدہ حجابت (دربانی) بھی ان کے حوالہ کر دیا جائے اور بیت اللہ کی کنجی ان کے سپرد کر دی جائے، اس پر آیت مذکورہ نازل ہوئی جس میں عہدۂ حجابت (دربانی) کو ایک امانت قرار دے کر صاحب امانت یعنی عثمان بن طلحہؓ کو واپس کرنے کا حکم آنحضرت ﷺ کو دیا گیا اور جب بیت اللہ شریف کے اندر سے فارغ ہو کر نکلے تو یہ آیت آپ کی زبان پر تھی اور اس ارشاد کے مطابق آپ نے کنجی عثمان بن طلحہؓ کو واپس فرمائی اور انہیں کو عہدہ حجابت پر برقرار رکھا، ظاہر ہے کہ حضرت عباسؓ و حضرت علیؓ کی درخواست چار پیسے قیمت کی کنجی کے لئے نہ تھی، بلکہ عہدہ حجابت کے واسطے تھی، اسی عہدے کو قرآن میں امانت سے تعبیر کر کے صاحب امانت کو واپس دینے کی تلقین کی گئی، معلوم ہوا کہ حکومت کے عہدے بھی امانات میں داخل ہیں، آیت مذکورہ کی تفسیر اور صحیح مفہوم معلوم کرنے کے بعد اس کے مضامین کا تجزیہ کیا جائے تو نظام مملکت کے متعلق امور ذیل مستفاد ہوتے ہیں:۔

(الف) حکومت کے تمام اموال و خزائن اور عہدے اور منصب حکام و امراء کے

ہاتھ میں بطور امانت ہیں وہ ان کے مالک ومختار نہیں۔

(ب) یہ امانتیں اگرچہ حکام کے قبضہ میں ہیں لیکن ان امانتوں کا اہل اور مستحق کچھ اور لوگ یعنی جمہور وعوام ہیں، جیسا کہ لفظ اِلیٰٓ اَھْلِھَا سے واضح ہے۔

(ج) لفظ اِلیٰٓ اَھْلِھَا سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ہر شخص ہر امانت کا اہل نہیں، لوگوں کی صلاحیتیں مختلف ہیں، حاملین امانت کا فرض ہے کہ ہر امانت کے اہل کو پہچانیں اور اس کو پہنچائیں۔

(د) اَنْ تُؤَدُّوا کے لفظ سے امانتوں کے پہنچانے کی ذمہ داری حاملین امانت (حکام) پر ڈالی گئی ہے، یہ نہیں کہ کوئی مستحق درخواست یا مطالبہ لے کر آئے تو دیدو، یعنی لوگوں کو اپنی امانت وصول کرنے کے بجائے امینوں کو ایصال امانت کی تلقین کی گئی ہے۔

(ہ) اور جب کہ امانت کا اس کے مستحق اہل کو پہنچانا فرائض حکومت میں داخل ہوا تو غیر مستحق نا اہل کو دیدینا خیانت ہوئی، اس تجزیہ کے بعد یہ سمجھنا سہل ہو گیا کہ آیت مذکورہ کے ابتدائی ایک جملہ سے دستور مملکت کی دفعات ذیل ثابت ہو گئیں۔

(۱) مملکت کا اقتدار اعلیٰ صرف اللہ تعالیٰ کا ہے، جیسا کہ اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُکُمْ کے الفاظ سے ثابت ہے۔

(۲) اسلامی ریاست کے امیر یا صدر کی حیثیت ایک نائب امین کی حیثیت ہے، اس کے ہاتھ میں جو کچھ سلطنت کے خزائن یا عہدے اور منصب ہیں وہ بطور امانت اس کے قبضہ میں ہیں، وہ ان کا مالک ومختار نہیں، یہ وہی مضمون ہے جو دفعہ نمبر ۷ کے شروع میں لکھا گیا ہے۔

(۳) جو امانتیں حکومت کے سپرد کی گئی ہیں ان کے اہل (یعنی بعطائے الٰہی مالک و

مستحق) جمہور عوام ہیں۔

(۴) حکام کی ذمہ داری ہے کہ تقسیم میں ہر عہدہ کے اہل و مستحق کو خود تلاش کرے، کوئی عہدہ کسی نااہل غیر مستحق کو سپرد نہ کرے۔

(۵) عوام کے حقوق عوام کو پہنچانا خود حکومت کی ذمہ داری ہے، درخواست و مطالبہ پر ادائے حقوق کا مدار رکھنا اپنے فرض میں کوتاہی اور بہت سی انتظامی خرابیوں کا موجب ہے، آیت میں اِلٰیٓ اَھْلِھَا سے یہ مفہوم ثابت ہے، اس کی مزید توضیح تشریحات میں ملاحظہ کی جائے۔

یہاں تک آیت مذکورہ کے پہلے جملے کی تشریح تھی، دوسرے جملے وَ اِذَا حَکَمْتُمْ بَیْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْکُمُوْا بِالْعَدْلِ میں لفظ بَیْنَ النَّاسِ فرمایا گیا ہے بَیْنَ الْمُسْلِمِیْنَ نہیں، اس سے ثابت ہوا کہ عدل و انصاف میں کسی مذہب و ملت یا نسل و رنگ یا خطہ و صوبہ کا امتیاز روا نہیں، سب کے ساتھ یکساں معاملہ کرنا فرض ہے، پھر عدل و انصاف کے خلاف کسی انسان کو آمادہ کرنے کے عموماً تین سبب ہوا کرتے ہیں، ایک کسی فریق کی دشمنی، دوسرے اپنی کوئی ذاتی غرض، تیسرے کسی فریق کی دوستی، قرآن کریم نے ان تینوں اسبابِ ظلم کو رفع کرنے کیلئے دو مستقل آیتیں نازل فرمائیں، ایک سورۂ مائدہ میں

وَلَا یَجْرِ مَنَّکُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰیٓ اَنْ لَّا تَعْدِلُوْا (۵:۸)

یعنی "تمہیں کسی قوم کی دشمنی و بغض انصاف کے خلاف کرنے پر آمادہ نہ کر دے۔" اور دوسری نساء میں

کُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ بِالْقِسْطِ شُھَدَآءَ لِلّٰہِ وَ لَوْ عَلٰیٓ اَنْفُسِکُمْ اَوِ الْوَالِدَیْنِ وَالْاَقْرَبِیْنَ (۴:۱۳۵)

یعنی "تم انصاف پر خوب قائم رہنے والے اللہ کے لئے گواہی دینے

والے رہو، اگر چہ اپنی ہی ذات کے خلاف ہو یا والدین اور دوسرے رشتہ داروں کے خلاف ہو۔''

اور جب کہ عدل وانصاف۔ وحکومت کے فرائض میں داخل کیا گیا تو اہل معاملہ سے اس پر کوئی معاوضہ (کورٹ فیس وغیرہ) لینا رشوت وحرام ٹھہرا، جیسے کوئی سرکاری ملازم اپنی ڈیوٹی ادا کرنے کے لئے اہل معاملہ سے معاوضہ طلب کرے۔آیت کی مذکور الصدر تفصیل سے واضح ہو گیا کہ دستور مملکت کی دفعہ (۲، ۷، ۸، ۹،) اسی ایک آیت سے بوضاحت ثابت ہو گئیں۔

دفعہ (۱۰)

حکومت کا فرض ہے کہ کسی باشندۂ ملک کی جائز آزادی کو سلب نہ کرے جب تک اس پر کوئی جرم ثابت نہ ہو اور اس کو صفائی کا موقع نہ دیا جائے ،اس لئے مروجہ سیفٹی ایکٹ اصول اسلام کے خلاف ہے۔

ظاہر ہے کہ بلا اثبات جرم کسی شخص کو سزا دینا یا قید کرنا عدل وانصاف کے خلاف ہے ،اور قرآن مجید کی بیشمار آیات عدل وانصاف کی تاکید کے لئے نازل ہوئی ہیں، مذکور الصدر آیات میں سب سے پہلی آیت میں نیز سورۂ نساء کی آیت ۱۶ میں بھی یہ مضمون گذر چکا ہے، نیز ارشاد ہے:۔

آیت ۱۷ : يَـآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْ ا كُوْ نُوْا قَوّٰ امِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ وَ لَا يَجْرِ مَنَّكُمْ شَنَاٰ نُ قَوْ مٍ عَلٰىٓ اَنْ لَّا تَعْدِ لُوْ ا اِعْدِ لُوْ ا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى، (۵ : ۸)

ترجمہ: ''اے ایمان والو! اللہ کے لئے پوری پابندی کرنے والے ،انصاف کے ساتھ شہادت ادا کرنے والے رہو اور کسی خاص گروہ کی عداوت تمہیں اس پر باعث نہ ہو جاوے کہ تم عدل نہ کرو عدل ہی کیا کرو

کہ وہ تقویٰ کے زیادہ قریب ہے۔"

اس آیت میں واضح کر دیا گیا ہے کہ کوئی آدمی جو تمہاری پارٹی یا تمہاری قوم کا بھی نہ ہو اس کے ساتھ بھی انصاف لازم ہے۔

آیت:۱۸ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ بِالْقِسْطِ شُھَدَآءَ لِلّٰہِ وَ لَوْ عَلٰٓی اَنْفُسِکُمْ اَوِ الْوَالِدَیْنِ وَ الْاَقْرَبِیْنَ (۱۳۵:۴)

ترجمہ: "اے ایمان والو! انصاف پر خوب قائم رہنے والے اللہ کے لئے گواہی دینے والے رہو اگرچہ اپنی ہی ذات کے خلاف ہو یا کہ والدین اور دوسری رشتہ داروں کے خلاف ہو"

تنبیہ: خلاف انصاف فیصلہ کرنے پر تین چیزیں کسی انسان کو آمادہ کر سکتی ہیں، ایک کسی فریق کی دشمنی و بغض، دوسرے اپنی ذاتی غرض، تیسرے کسی فریق کی دوستی و محبت، آیت ۱۷ میں پہلے سبب کی جڑ کاٹ دی گئی، اور آیت ۱۸ میں دوسرے اور تیسری سبب کی۔

آیت۱۹ : وَ اِنْ حَکَمْتَ فَاحْکُمْ بَیْنَھُمْ بِالْقِسْطِ ط اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُقْسِطِیْنَ (۵: ۴۲)

ترجمہ: "اور اگر آپ غیر مسلموں کے معاملہ میں فیصلہ کریں تو انصاف سے کریں، بیشک اللہ دوست رکھتا ہے انصاف کرنے والوں کو"

قرآن کریم نے بار بار اس پر زور دیا ہے کہ کوئی شخص کتنا ہی شریر، ظالم، بدمعاش کیوں نہ ہو مگر اس کے حق میں بھی تمہارا دامن عدالت ناانصافی کی چھینٹوں سے داغدار نہ ہونے پائے۔ اسی وجہ سے حضرت فاروق اعظمؓ نے ارشاد فرمایا۔

واللہ لا یو سر رجل فی الاسلام الا با لعدول (مو لا امام

مالک کتاب الشهادة ص ۳۰۰)

یعنی ''بخدا اسلام میں کسی آدمی کو قید نہ کیا جائے گا جب تک اس کے خلاف عدولی یعنی ثقہ لوگوں کی شہادت سے جرم ثابت نہ ہو جائے'' (کذافی شرح الزرقانی ص ۳۸۸۔ ج ۳)

اس سے ثابت ہوا کہ محض پولیس کی رپورٹ پر کسی کو قید نہیں کیا جا سکتا جب تک اس پر باقاعدہ عدالت میں ثقہ اور قابل اعتماد شہادتوں سے جرم ثابت نہ کر دیا جائے، اس کے یہ معنی نہیں کہ متہم، ملزم کو حراست میں نہ لیا جائے اور اس کو بھاگ جانے کا موقع دیا جائے، بلکہ حاصل یہ ہے کہ حراست میں لینے کے بعد اس کے جرم کی تحقیقات کر کے کسی باقاعدہ عدالت کے سامنے اس کا جرم ثابت کرنے سے پہلے اس کو کسی معینہ مدت کے لئے قید نہیں کیا جا سکتا ہے، تاتحقیقات حراست میں رکھنا اس کے منافی نہیں، اسی طرح اگر کوئی ایسا مجرم ہے کہ اس کے جرم کے افشاء سے ملک وملت کے لئے کوئی خطرہ ہے تو اس کا بیان عدالت کے بند کمرے میں لیا جا سکتا ہے اور مقدمہ کی کاروائی کو بصیغہ راز رکھا جا سکتا ہے۔

دفعہ (۱۱)

اسلامی حکومت کا فرض ہے کہ ہر مسلمان باشندہ ملک کو ضروریات دین سے واقف کرنے کا انتظام کرے،

آیت نمبر ۱ میں اسلامی حکومت کی غرض یہ بتلائی گئی ہے کہ لوگ عدل واعتدال پر قائم ہو جائیں اور ظاہر ہے کہ احکام شریعہ سے واقفیت کے بغیر لوگوں کا عدل واعتدال پر قائم رہنا ممکن نہیں، اس لئے اس غرض کو پورا کرنے کے لیے ضروریات دین کی جبری تعلیم دینے کا فریضہ حکومت پر عائد ہوتا ہے، رسول کریم ﷺ نے خود بہ نفس نفیس اس خدمت کو انجام دیا اور ارشاد فرمایا انما بعثت معلما (میں معلّم بنا کر بھیجا گیا ہوں)

دوسری مسلم بستیوں میں معلمین بھیجنے کا یہی معمول رہا ہے، ہجرت سے پہلے بھی جب مدینہ طیبہ میں کچھ لوگ مسلمان ہو گئے تو آنحضرت ﷺ نے مصعب بن عمیرؓ کو ان کی تعلیم کے لئے بھیج کر اسلام کا سب سے پہلا مدرسہ مدینہ میں قائم فرمادیا، خلفائے راشدین اپنے اپنے زمانوں میں جن حضرات کو صوبوں کا عامل بنا کر بھیجتے تھے ان پر مسلمانوں کو ضروریات دین کی تعلیم کی ذمہ داری بھی ہوتی تھی۔

دفعہ (۱۲)

مملکت کے لئے لازم ہونا چاہئے کہ مسلمانوں میں سے جغرافیائی، قبائلی، نسلی اور لسانی اور اسی قسم کے دوسرے غیر اسلامی تعصبات کو دور کرنے اور ملت اسلامیہ کی وحدت واستحکام کے لئے کوشش کرے۔

آیت ۱۹ : هُوَ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَّ مِنْكُمْ مُّؤْمِنٌ (۶۴ : ۲)

ترجمہ: ''اللہ ہی وہ ذات ہے جس نے تم سب کو پیدا کیا پھر تم میں دو گروہ ہو گئے ایک مومن اور ایک کافر۔''

آیت ۲۰ : اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ (۴۹ : ۱۰)

ترجمہ: ''بیشک سب مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔''

آیت ۲۱ : وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقَاكُمْ. (۴۹ : ۱۳)

آیت ۱۹ میں بتلادیا گیا کہ قوموں کی تقسیم ایمان وکفر سے ہوتی ہے، آیت ۲۰ میں بتلادیا گیا کہ مسلمان خواہ کسی ملک ووطن کا باشندہ ہو کوئی زبان بولتا ہو وہ سب آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ آیت ۲۱ میں واضح کر دیا گیا کہ

جغرافیائی اور قبائلی امتیازات حق تعالیٰ نے صرف تعارف کے لئے رکھے ہیں، حقوق اور درجات کی تقسیم ان بنیادوں پر نہیں ہوگی اور نہ ان بناوں پر قومیت کی وحدت وجدائی موقوف ہے۔

دفعہ ۱۳:

اسلامی حکومت کا فرض ہے کہ غیر مسلم باشندگان ملک کی جان، مال، آبرو کی اسی طرح حفاظت کریں جس طرح مسلمان کی کی جاتی ہے۔

آیت ۲۲ : يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ. (۵:۱)

ترجمہ: اے ایمان والو! اپنے عہد و پیمان کو پورا کرو۔"

آیت ۲۳ : وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رَاعُوْنَ

(۷۰:۳۲)

ترجمہ : اور وہ لوگ اپنی امانتوں اور وعدوں کی رعایت کرتے ہیں۔

ان دونوں آیتوں میں کئے ہوئے معاہدات کی پابندی سب مسلمانوں پر فرض کی گئی ہے اور یہ ظاہر ہے کہ جو غیر مسلم کسی اسلامی حکومت کے شہر میں ہیں ان سے قولی یا عملی طور پر اس کا معاہدہ ہوتا ہے کہ ان کی جان، مال، آبرو کی حفاظت کی جائے گی۔

رسول اللہ ﷺ کے ارشادات اس معاملہ میں نہایت واضح اور مؤکد ہیں، حدیث میں ہے۔

من قتل معاهدا لم يرح رائحة الجنة وان ريحهايو جد من مسيرة اربعين عاماً،

ترجمہ: جو شخص کسی معاہد کو قتل کردے اس کو جنت کی خوشبو تک نصیب نہیں ہوگی، حالانکہ اس کی خوشبو چالیس سال کی مسافت تک پہنچتی ہے۔ اور

ایک حدیث میں آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے کہ ''جو شخص کسی معاہد پر ظلم کرے قیامت کے روز میں اس کی طرف سے ظالم کے خلاف پیروی کروں گا۔

دفعہ ۱۴:

جو معاہدہ کسی قوم یا ملک یا جماعت سے کر لیا جائے اس کی پوری پابندی حکومت پر لازم ہے، ظاہراً یا باطناً اس کی کسی شرط کے خلاف کرنا جرم ہے جب تک کہ معاہدہ کی میعاد پوری نہ ہو جائے یا اس معاہدے کو باقاعدہ ختم نہ کر دیا جائے۔ آیات مندرجہ ۱۹ اور ۲۰ اس پر شاہد ہیں اور رسول کریم ﷺ نے اس کے متعلق سخت تاکیدی احکام دیئے ہیں، ترمذی اور ابو داؤد میں سلیم بن عامرؒ کی روایت ہے کہ حضرت امیر معاویہؓ اور رومی غیر مسلموں میں ایک معین معیاد تک جنگ نہ کرنے کا معاہدہ تھا، حضرت معاویہؓ نے یہ صورت کی کہ اندرون میعاد اپنا لشکر سرحد روم پر پہنچا دیا اور میعاد صلح ختم ہوتے ہی دشمن پر حملہ کر دیا، عین اس وقت جب کہ اسلامی لشکر حضرت معاویہؓ کی سرکردگی میں فاتحانہ بڑھ رہا تھا پیچھے سے ایک آواز آتی ہے الله اکبر الله اکبر وفاء لا غدر یعنی ''الله اکبر الله اکبر مسلمانوں کو عہد پورا کرنا چاہیئے، عہد شکنی جائز نہیں۔

حضرت معاویہؓ نے پھر کر دیکھا تو عمر بن حبسہؓ صحابی ہیں، ان سے دریافت کیا تو فرمایا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے

من کان بینه و بین قوم عهد فلا یحلن عهد او لا یشد نه حتی یمضی امده او ینبذ الیهم علی سوا ء قال فر جع معاو یة با لنا س (مشکوة باب الامان) ترجمه :

''جس شخص کا کسی دوسری قوم سے معاہدہ صلح کا ہو تو معاہدہ کی معیاد گذرنے سے پہلے کسی سامان کو باندھے نہ کھولے یا یہ کہ اس معاہدہ کو

با قاعدہ واپس کر دیا جائے"

مطلب یہ تھا کہ میعادِ صلح کے اندر لشکر کشی کر کے سرحد روم تک لے آنا یہ بھی ایک گونہ معاہدہ کی خلاف ورزی ہے، حضرت معاویہؓ نے یہ سن کر لشکر کو واپسی کا حکم دیدیا، اور سب واپس آ گئے۔

دفعہ ۱۵ :

کسی غیر مسلم کو اسلام قبول کرنے پر مجبور نہ کیا جائیگا بلکہ اس کو اپنی مذہبی رسوم کی ادائیگی میں مکمل آزادی ہوگی

آیت ۲۴ : لَآ اِکْرَاهَ فِی الدِّیْنِ قَدْ تَبَیَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَیِّ (۲:۲۵۶)

ترجمہ: "دین میں زبردستی نہیں، ہدایت یقیناً گمراہی سے ممتاز ہو چکی ہے"

دفعہ ۱۶ :

حکومت کی ذمہ داری ہے کہ ملک کی وہ دولت جس میں سب کے حقوق مساوی ہیں ان کی تقسیم اس طرح کرے کہ تمام اہل ملک اور ان کی آئندہ نسلیں اس سے فائدہ اٹھا سکیں، ایسا نہ ہو کہ اس دولت پر صرف سرمایہ دار قبضہ کر لیں، یا اس طرح تقسیم ہو کہ کچھ لوگ سرمایہ دار بن جائیں اور دوسرے محروم رہ جائیں۔

آیت ۲۵ : مَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰی رَسُوْلِهٖ مِنْ اَهْلِ الْقُرٰی فَلِلّٰهِ وَ لِلرَّسُوْلِ وَلِذِی الْقُرْبٰی وَ الْیَتٰمٰی وَ الْمَسَاکِیْنِ وَابْنِ السَّبِیْلِ کَیْ لَا یَکُوْنَ دُوْلَةًۢ بَیْنَ الْاَغْنِیَآءِ مِنْکُمْ (۵۹:۷)

ترجمہ: "جو کچھ اللہ اپنے رسول کو دوسری بستیوں کے لوگوں سے دلوا دے

وہ اللہ کا حق ہے اور رسول کا اور قرابت داروں کا اور یتیموں کا اور غریبوں کا اور مسافروں کا تا کہ وہ تمہارے سرمایہ داروں کے قبضہ میں نہ آجائے''

اس آیت میں مال و دولت کا ذکر ہے جو بغیر جنگ و جہاد کے مسلمانوں کو ہاتھ آجائے جس کو اصطلاح میں ''فئی'' کہا جاتا ہے، اس میں چونکہ فوج یا مجاہدین کو کوئی محنت اٹھانی نہیں پڑی، اس لئے یہ اموال ان میں تقسیم نہ کئے جائیں گے، بلکہ تمام مسلمانوں کے حقوق ان میں مساوی ہوں گے۔ (احکام القرآن للجصاص وہدایہ) اسی طرح جنگ و جہاد کے ذریعہ حاصل شدہ غیر منقولہ جائداد و آراضی کا بھی حسب فرمان فاروق اعظم واتفاق رائے جمہور صحابہ کا یہی حکم ہے کہ وہ صرف مجاہدین کا حق نہیں، ان میں تمام موجود و آئندہ آنے والے مسلمانوں کے حقوق ہیں (احکام القرآن للجصاص) پھر ان اموال میں جو تفصیل آیت میں مذکور ہے اس میں اللہ تعالیٰ کا حق ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ جس طرح چاہے ان میں حکم دے، اس کو اختیار ہے جیسا کہ اور سب چیزوں میں بھی اس کو اسی طرح حق حاصل ہے اور رسول کا حق ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اموال عہد رسالت میں خالص رسول ﷺ کے اختیار و تصرف میں رہیں گے، پھر ممکن ہے کہ یہ اختیار مالکانہ ہو اور احتمال ہے کہ محض حاکمانہ ہو، بہر حال اللہ تعالیٰ نے ان اموال کے متعلق آپ کو اگلی آیت میں ہدایت فرمادی کہ وجوباً یا ندباً فلاں فلاں مصارف میں صرف کئے جائیں، آپ کی وفات کے بعد یہ اموال امام اور امیر المومنین کے اختیار و تصرف میں جائیں گے جو کہ آنحضرت ﷺ کا نائب و خلیفہ ہے، لیکن اس کا تصرف مالکانہ نہیں ہوگا محض حاکمانہ ہوگا، وہ ان اموال کو مسلمانوں کے مصالح عامہ اور عام ضروریات میں صرف کرے گا۔ (بیان القرآن وغیرہ)

دفعہ ۱۷ :

انفرادی ملکیتیں جو جائز طریقوں سے حاصل کی گئی ہوں وہ کسی سے ناحق سلب

نہ کی جائیں گی۔

آیت ۲۶ : یٰۤاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَیْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ
(۲۹:۴)

ترجمہ ''اے ایمان والو! نہ کھاؤ مال ایک دوسرے کے آپس میں ناحق مگر یہ کہ تجارت ہو آپس کی خوشی سے''۔ قرآن کی بے شمار آیات ہیں جو شخصی ملکیت کے احترام کو واجب قرار دیتی ہیں مثلاً

لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَھُمْ اِلٰٓى اَمْوَالِكُمْ (۲:۴)

وَلَا تُؤْتُوا السُّفَھَآءَ اَمْوَالَكُمُ الَّتِیْ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِیٰمًا
(۵:۴)

اِنَّ الَّذِیْنَ یَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْیَتٰمٰى ظُلْمًا (۱۰:۴)

وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَیْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوْا بِھَآ اِلَى الْحُكَّامِ لِتَاْكُلُوْا فَرِیْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ.
(۱۸۸:۲)

اسی مضمون کو حدیث میں فرمایا ہے:

الا لا تظلموا الا لایحل مال امرء مسلم الا بطیب نفس منه . (مشکوٰۃ)

ترجمہ : خبردار! کسی مسلمان کا مال بغیر اس کی رضامندی کے حلال نہیں ہوسکتا۔

اسی وجہ سے جمہور فقہائے امت کا ضابطہ اس معاملہ میں وہ ہے جو قاضی ابو یوسفؒ نے کتاب الخراج میں لکھا ہے کہ:۔

لیس للامام ان یخرج شیئا من ید احد الا بحق ثابت معروف (شامی ص ۳۵۴، ج ۳)

ترجمہ: ''امیر المومنین کے لئے جائز نہیں کہ کسی کے قبضہ سے کوئی چیز نکال لے بجز اس کے کہ اس کے خلاف کوئی حق ثابت و معروف ہو۔''

ایک مرتبہ سلطان مصر ملک الظاہر بیبرس نے مصر کی زمینوں کے متعلق یہ قانون جاری کرنا چاہا تھا کہ '' جولوگ ان زمینوں پر قابض ہیں وہ اپنی ملکیت کا ثبوت پیش کریں، اگر ایسا ثبوت پیش نہ کریں گے تو یہ زمین بحق حکومت ضبط کر لی جائے گی'' اس زمانہ کے عام علماء اور شیخ الاسلام محی الدین نوویؒ نے ان کے اس تصرف کو ناجائز قرار دیا اور ان کو یہ قانون واپس لینا پڑا۔ (شامی)

صدرِ مملکت کے اوصاف

دفعہ ۱۸:

(الف)...... مسلمان ہو کافر نہ ہو

(ب)...... نیک عمل ہو، فاسق معلن نہ ہو،

(ج)...... علمی اور عملی قابلیتوں میں ممتاز سمجھا جاتا ہو۔

(د)...... اپنے زمانہ کی سیاست سے اتنا واقف ہو کہ داخلی اور خارجی فتنہ وفساد کی روک تھام کر سکے۔

مذکورہ سابق آیت سورۂ نساء ۱۲ میں جہاں عوام کو اولوالامر کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے، وہ اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ اولوالامر مسلمان ہوں (اولی الامر منکم) یعنی وہ امیر جو مسلمانوں میں سے ہوں۔

آیت ۲۷ : قَالَ اِنِّیْ جَاعِلُکَ لِلنَّاسِ اِمَامًا قَالَ وَ مِنْ ذُرِّیَّتِیْ قَالَ لَا یَنَالُ عَهْدِی الظّٰلِمِیْنَ. (۲: ۱۲۴)

ترجمہ: "اللہ تعالیٰ نے (ابرہیمؑ سے) فرمایا کہ میں آپ کو لوگوں کا مقتدا بناؤں گا، انہوں نے عرض کیا کہ میری اولاد میں سے بھی (یہ درجہ عنایت کیجئے) اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میرا عہدہ خلاف ورزی کرنیوالوں کو نہ ملے گا"

خلاف کرنے کا انتہائی درجہ کفر ہے، دوسرا فسق و فجور، اس سے معلوم ہوا کہ کافر یا فاسق معلن کو مقتدا اور امیر مملکت نہیں بنایا جا سکتا ان دونوں آیتوں سے امیر مملکت کا وصف (الف) و (ب) بوضاحت ثابت ہو گیا۔

اور یہ بات جیسے مذکور الصدر آیات قرآنی سے ثابت ہے، خود عقلی اور فطری بھی ہے کہ جو سلطنت کسی خاص نظریہ اور اصول پر بنائی گئی ہو اس کا سربراہِ کار اس شخص کو نہیں بنایا جاسکتا جو اس نظریہ اور اصول ہی سے اتفاق نہ رکھتا ہو۔

آج کی جمہوریت نواز دنیا اور جمہوریت کے بڑے سے بڑے علمبردار بھی اس اصول سے دست بردار ہونے کے لئے کبھی تیار نہیں ہوسکتے، اگر امریکہ کی جمہوریت کا صدر کسی اشتراکی عقیدہ رکھنے والے کو اور روسی جمہوریت کا صدر کسی امریکی نظام پر اعتقاد رکھنے والے کو نہیں بنایا جاسکتا، تو اسلامی حکومت میں خدا اور رسول کے منکر کو صدر مملکت بنانے کے کوئی معنی نہیں ہوسکتے، پاکستان کی بنیاد چونکہ مسلم اور غیر مسلم دو قومی نظریہ پر رکھی گئی ہے، اس لئے کوئی پاکستانی اس کے لئے تیار نہیں ہوسکتا کہ اس بنیاد کے منکر متحدہ قومیت کے دعویدار کو پاکستان کا صدر تسلیم کریں، یہ ساری چیزیں جمہوریت کے خلاف نہیں سمجھی جاتیں تو اسلامی مملکت میں صدر مملکت کے لئے مسلم ہونے کی شرط کو کیسے کوئی خلاف جمہوریت کہہ سکتا ہے۔

الغرض آیات مذکورہ سے وصف (الف) و (ب) کا ضروری ہونا ثابت ہوگیا۔

آیت ۲۸: قَالُوْآ اَنّٰی یَکُوْنُ لَهُ الْمُلْکُ عَلَیْنَا وَ نَحْنُ اَحَقُّ بِالْمُلْکِ مِنْهُ وَ لَمْ یُؤْتَ سَعَةً مِّنَ الْمَالِ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰهُ عَلَیْکُمْ وَزَادَهٗ بَسْطَةً فِی الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ وَاللّٰهُ یُؤْتِیْ مُلْکَهٗ مَنْ یَّشَآءُ (۲: ۲۴۷)

ترجمہ: ”(جب بنی اسرائیل کے کسی نبی نے ان کو خبر دی کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے طالوت کو بادشاہ بنادیا ہے تاکہ تم اس کے زیر علم اپنے مخالفین سے جہاد کرو، تو) وہ کہنے لگے کہ طالوت کو ہم پر حکمرانی کا کیسے حق حاصل ہوسکتا ہے، حالانکہ بہ نسبت ان کے ہم حکمرانی کے زیادہ مستحق ہیں اور ان کو تو کچھ مالی وسعت بھی نہیں دی گئی، ان پیغمبر نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ

نے تمہارے مقابلہ میں ان کو منتخب فرمایا ہے اور علم اور جسامت میں ان کو زیادتی دی ہے اور اللہ تعالیٰ اپنا ملک جس کو چاہیں دیں، اور وہی علیم وخبیر ہیں۔"

اس آیت میں طالوت کے حکمران ہونے کی اہلیت میں سب سے پہلی بات تو یہ فرمائی تھی کہ اللہ تعالیٰ نے ان کا انتخاب فرمایا ہے، دوسری بات یہ بتلائی کہ ان کے دو وصف بھی ایسے ہیں جن کی وجہ سے وہ مستحق حکمرانی سمجھے گئے، اور وہ دو یہ ہیں (۱) علم میں ان کا دوسروں سے ممتاز ہونا (۲) جسمانی طاقت وقوت میں ممتاز ہونا جس کا نتیجہ عملی امتیاز ہوتا ہے اس لئے آیت مذکورہ سے وصف (ج) واضح طور پر ثابت ہو گیا اور یہی مضمون آیت ذیل سے بھی ثابت ہے۔

آیت ۲۹ : وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوْا وَكَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يُوْقِنُوْنَ (۳۲:۲۴)

ترجمہ: اور ہم نے ان (بنی اسرائیل) میں سے بہت سے مقتداء بنادیئے جو ہمارے حکم سے ہدایت کرتے تھے، جب کہ وہ لوگ صبر کئے رہے اور ہماری آیتوں کا یقین رکھتے تھے۔

حضرت علیؓ کا ارشاد ہے کہ ایمان میں صبر کا وہ درجہ ہے جو درجہ سر کا باقی بدن کے مقابلے میں ہے اور اس پر استدلال میں یہ آیت پڑھی، پھر فرمایا

لما اخذو ا براس الا مر صارو ارؤ سا قال بعض العلماء بالصبرو اليقين تنال الا مامة فى الدين .

ترجمہ: ان لوگوں نے جب راس الامر (صبر) کو اختیار کرلیا تو رؤسا اور مقتدا بن گئے اور بعض علماء نے فرمایا کہ صبر ویقین ہی کے ذریعہ دین کی امامت ہوسکتی ہے۔ (ابن کثیر ص۴۶۳ ج۳)

صبر عملی قوت کا اعلیٰ مقام ہے اور یقین علمی قوت کا اعلیٰ درجہ ہے، اس لئے معلوم ہوا کہ قوم کا مقتدا اور پیشوا بننے کے لئے یہ دو وصف ہونے چاہئیں۔ اس لئے آیت مذکورہ سے وصف (ج) واضح طور پر ثابت ہوگیا۔

آیات ۲ مذکور الصدر میں حکومت کا مقصد دفعِ فتنہ وفساد قرار دیا گیا ہے، ظاہر ہے کہ جس شخص میں اس کی اہلیت وصلاحیت نہ ہو اس کو صدرِ مملکت بنانا بیکار ہے اس لئے اس سے اوصافِ امیر میں سے وصف (د) ثابت ہوگیا۔ یہ قرآن کریم کی چند آیات ہیں جو مختصر وقت اور معمولی غور وفکر سے دستوری مسائل پر مشتمل نظر آئیں، ان میں بھی دستورِ مملکت کی اہم دفعات تقریباً آگئی ہیں، پورا غور اور مکمل تحقیق کی جائے بہت ممکن ہے کہ باقی دستوری مسائل بھی قرآن کریم سے ثابت ہوں۔

اور اصل یہ ہے کہ تمام اسلامی احکام، دستور، قانون میں قرآنِ کریم ایک اشارہ کرتا ہے اور اس کی تشریح وتبیین رسول کریم ﷺ اپنے قول وفعل سے فرماتے ہیں، اس لئے مکمل دستور اسلامی وہی ہوسکتا ہے جو قرآن کریم کی آیات اور رسولِ کریم ﷺ اور خلفائے راشدین کے تعامل سے ثابت شدہ اصول پر مبنی ہو۔ مگر اس وقت پیش نظر تدوین دستور نہیں بلکہ درس قرآن کے سلسلہ میں ایک خاص مضمون کی آیات کی یک جا تفسیر کرنا ہے تاکہ قرآن کو سرسری طور پر پڑھنے والے مسلمان دیکھ لیں کہ براہِ راست قرآن مجید سے کس قدر اہم دفعات دستور ثابت ہیں اور دستور ساز اسمبلی کے وہ ممبران جو علماء کی دستوری تجاویز کو محض ملاؤں کی قیاسات سمجھ کر نظر انداز کرنا چاہتے ہیں قرآن کریم کے ارشادات پر مطلع ہوکر دنیا وآخرت کی ذمہ داری محسوس کریں،

واللہ الموفق والمعین

تشریحات

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

مختصر وقت، ہجوم مشاغل سے پریشان دماغ اور نا تمام غور و فکر کے ساتھ جو آیات قرآنی دستوری مسائل پر مشتمل نظر آئیں، ان کا ایک اجمالی خاکہ اور ان سے نکلنے والی دفعات دستور مملکت آپ کے سامنے آچکی ہیں، ان دفعات میں کچھ دفعات تو ایسی ہیں جو عموماً ہر ملک کے دستور میں ہوا کرتی ہیں، ان میں تو نظام اسلام کا امتیاز صرف دستوری دفعات سے نہیں بلکہ عمل کے میدان میں نظر آتا ہے کہ اسلام اپنی دستور میں جو ذمہ داری لیتا ہے اس کو عملی طور پر پورا کرنے کا انتظام کیسا کرتا ہے اور کچھ دفعات ایسی ہیں جو دستوری حیثیت سے نظام اسلامی کا طغرائی امتیاز ہیں اور ذرا غور کرنیوالے کو اس کا اقرار کرنے سے چارہ نہیں رہ سکتا کہ دنیا کے امن و امان اور انسانیت کی فلاح و بہبود کے لئے صرف وہی پناہ گاہ ہوسکتی ہیں اور آج کی دنیا اور ان کے مختلف نظاموں میں جو شر و فساد اور کمی و کوتاہی ہے وہ انہیں اصول اسلامی کے نظر انداز کر دینے سے ہے، ان کو آج بھی جو مملکت اپنا لے گی وہ دنیا کے موجودہ نظاموں میں اپنی برتری کا جھنڈا گاڑ دے گی۔

پھر ان اصول کو اختیار کرنا عملی طور پر کچھ مشکل نہیں، ضرورت صرف اس کی ہے کہ کرنے والے کا ذہن چلے ہوئے رسم و رواج کا قیدی اور ان کے زہریلے اثرات سے مسموم نہ ہو، اس میں ذرا عزم و ہمت اور حوصلہ بلند ہو، کسی قوم کی نقالی کا خوگر نہ ہو،

مذکور الصدر (۱۸) دفعات میں دفعہ ۱، ۲، ۳، ۷، ۹، ۱۰، ۱۲، ۱۶، ۱۷ انہیں دفعات سے ہیں جو نظام اسلامی کی خصوصیات اور امتیازی کارناموں میں داخل ہیں اور ان پر عمل کیا جائے تو دنیا کے نظام میں ایک بہترین انقلاب آسکتا ہے اس لئے ان کی کچھ تھوڑی سی مزید تشریح ضروری ہے۔ دفعہ ۱، ۲، ۳، میں اس کا اقرار کیا گیا ہے کہ اقتدار اعلیٰ کا مالک صرف اللہ سبحانہ وتعالیٰ ہے قانون سازی کا اصلی حق اسی کا ہے، انسان صرف اس کا نائب امین ہونے ہی کی حیثیت سے حکمرانی کرسکتا ہے، انسانی قانون سازی کا دائرہ عمل صرف وہ مباحات ہوں گے جن میں اللہ تعالیٰ نے بلا واسطہ یا بواسطہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم خود کوئی قانون نہیں بنا دیا۔

دستور اسلامی کی یہ ہر دو دفعات اہم انقلابی دفعات ہیں جو دنیا کو دین، سلطنت کو عبادت، سارے دفتری کاموں کو حسنات بنا دینے والی ہیں، یہ مادی حکومت کو روحانی، سلطنت بشریہ کو حکومت الٰہیہ کا پیکر دیدیتی ہیں، ایسی حکومت کے زیر سایہ پرورش پانے والا معاشرہ صرف قانون حکومت کے خوف سے نہیں، بلکہ خدا کے خوف سے کام کرتا ہے، اس کی خلوت وجلوت یکساں ہوتی ہے، اس کے اخلاق پاکیزہ اور حوصلہ بلند ہوتا ہے، اس کا دستور وقانون ان کمزوریوں سے پاک ہوتا ہے جو ہر انسان میں قومی، نسلی، لونی، جغرافیائی بنیادوں پر کچھ نہ کچھ ہوا کرتی ہیں وہ پارٹیوں کی حکومت کی طرح روز روز کے انقلاب اور اس کی وجہ سے مملکت کی ترقیاتی اسکیموں کی ابتری سے محفوظ ہوتی ہے، کیونکہ اس کا دستور نا قابل تغیر اور اصول قانون جو قرآن وحدیث سے ثابت ہوں نا قابل ترمیم ہوتے ہیں۔

دفعہ (۷) میں امورِ ذیل قابل غور ہیں۔

(الف) حکومت کے تمام اموال وخزائن اور عہدے اور مناصب سب کو امانتیں قرار دیا گیا ہے اور عوام کو ان کا مالک و مستحق۔

(ب) پھر حکومت پر یہ ذمہ داری ڈالی گئی ہے کہ ہر امانت کے مستحق کو کام کی قابلیت اور دیانت کے معیار سے پہچانے، قرآن کی آیت ان خیر من استأ جرت القوی الامین میں اس معیار اہلیت کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے۔

(ج) اور پھر ہر مستحق کو اس کا حق (امانت) خود پہنچائے۔

آجکل عہدوں کے حصول میں جو ریس کا میدان گرم ہوتا ہے، زور وزر کی نمائش، ناجائز کا دباؤ، جھوٹ فریب کے جو جو کھیل کھیلے جاتے ہیں وہ کسی اہل بصیرت پر مخفی نہیں، ایک خالی عہدے کا اعلان ہوتا ہے تو ہزاروں درخواستیں دفتر میں پہنچتی ہیں اور ان کے ساتھ ہزاروں سفارشیں چلتی ہیں، دور دور کے تعلق سے رشوتوں کے دروازے کھلتے ہیں، جسکا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ قابل اور شریف آدمی کیلئے اس میدان میں قدم رکھنا ناممکن بن جاتا ہے۔

پورے ملک میں سے عہدوں پر عموماً وہ خود غرض نفس پرست لوگ پہنچتے ہیں جو علمی، عملی اور خصوصاً اخلاقی صلاحیتوں سے قطعاً محروم ہوں، اپنی ذلیل اغراض کے لئے پورے ملک وملت کو قربان کر دینا ان کا پیشہ ہو، خلق خدا کی پریشانی ان کے دلوں پر مطلق اثر انداز نہ ہو، وہ چھاؤں میں پنکھے کے نیچے بیٹھے ہوتے ہیں اور اہل معاملہ دھوپ میں کھڑے نظر التفات کے منتظر رہتے ہیں اور ذرا سے کام کیلئے مہینوں دفتروں کے چکر لگانا ان کا معمول ہو جاتا ہے اور جس کشتی کے ناخدا ایسے ہوں اس کا انجام معلوم اور یہ سب اسکا نتیجہ ہے کہ نہ ان چیزوں کو افسران حکومت کوئی امانت سمجھتے ہیں، نہ اداءِ امانت کو اپنا فرض سمجھتے ہیں بلکہ ہزار جدوجہد کے بعد جس کو کوئی چیز دیدیں تو ایک بخشش اور احسان سمجھا جاتا ہے، یہ سارا عذاب اسی اسلامی اصول کے نظر انداز کر دینے کا نتیجہ ہے۔

اگر حکومت اسلامی اصول کے مطابق قابلیت اور دیانت کے معیار سے عہدوں

کے اہل کی تلاش وتفتیش اور اہل کو عہدہ سپرد کرنے کا اہتمام خود کرے، عہدوں کی طلب کو ممنوع قرار دے، اسی طرح فقراء و مہاجرین میں تقسیم زمین و اموال کیلئے درخواستوں اور مطالبوں کی راہ بند کر کے متعلقہ افسروں کو ہدایت ہو کہ مہاجرین کی ہر بستی میں پہنچ کر ان کے حالات کا معائنہ کر کے حسب حال ان کی امداد کی جائے تو مظلوم انسانیت ان بلاؤں سے یکسر نجات پاسکتی ہے جن سے ہزار کوششوں کے باوجود آج نجات مشکل ہو رہی ہے۔

رسول اللہ ﷺ اور خلفائے راشدین کی حکومت میں یہی طرز رائج تھا، یہی وجہ ہے کہ فاروق اعظمؓ راتوں کو مدینہ کی گلیوں میں پھرنے اور لوگوں کے حالات و حاجات کا بچشم خود معائنہ فرما کر اہل حاجات کی حاجت برداری کی خود فکر فرماتے تھے اور جہاں کہیں کسی حاجت مند کی حاجت برآری میں دیر ہوئی تو اس کو اپنا قصور و گناہ تصور کرتے اور اس کے تدارک کی فکر کرتے تھے۔

منجملہ بہت سے وقائع کے ایک واقعہ آپ کا مشہور ہے کہ رات کے گشت میں ایک عورت اور اس کے بچوں کو بھوکا پایا، ماں نے بچوں کو بہلانے کے لئے چولھے پر پانی رکھ دیا تھا کہ کھانا پک رہا ہے، فاروق اعظمؓ نے یہ حال دیکھا تو اسی وقت بیت المال میں واپس آئے اور اشیاء خوردنی کی ایک گٹھری باندھ کر اپنے کاندھے پر رکھی ،خادم نے لینا چاہا تو فرمایا کہ غفلت عمر کی ہے، عمر ہی اس کا بوجھ اٹھائیگا اور عورت کے مکان پر پہنچ کر دیدینے پر قناعت نہیں کی، خود کھانا پکا کر جب بچوں کو کھلا دیا اور وہ ہنسنے کھیلنے لگے اس وقت واپس آئے۔

بلادِ فارس فتح ہونے کے وقت ایک مرتبہ مالِ غنیمت لایا گیا اور مسجدِ نبوی میں سونے چاندی اور جواہرات کا ڈھیر لگ گیا، فاروق اعظمؓ نے حاضرین کو خطاب کر کے فرمایا کہ یہ اللہ کا مال ہے اور آپ ہی لوگوں کے لئے ہے جس کو جتنی ضرورت ہو بتلا کر

لے لے۔ آپ غور فرمائیں کہ سونے چاندی کے خزانے سامنے پڑے ہیں، کسی دفتر میں درخواست لیجانے اور منظور کرانے کا سوال نہیں، کسی بنک سے نقد کرانے کا بھی انتظار نہیں، آخری اختیار رکھنے والا امیر اعلان عام کر رہا ہے اور جن کو خطاب ہے وہ کوئی مالدار اغنیاء نہیں، عموماً تنگ حال لوگوں کا مجمع ہے مگر اسلامی اصول اور ان پر عمل نے ایسا پاکباز، باعزت وخوددار معاشرہ پیدا کر دیا تھا کہ پورے مجمع میں سے کوئی لینے کے لئے نہ اٹھا، فاروق اعظمؓ نے دوبارہ اعلان کیا، پھر بھی سناٹا رہا، تیسری مرتبہ کے اعلان پر ایک نوجوان کھڑا ہوا اور عرض کی کہ اے امیر المومنین! کیا آپ ہمیں رسوا کر دینا چاہتے ہیں کہ ہم اپنے حالات و حاجات مجمع کے سامنے پیش کریں، اگر یہ ہمارا حق ہے تو اصحاب حقوق کا حق ان کو پہنچانا، ان کی حاجات وضروریات کا اندازہ کرنا خود آپ کا فرض ہے، فاروق اعظمؓ نے اس کو تسلیم فرمایا اور تمام مہاجرین وانصار کی فہرست تیار کرا کے ہر ایک خاندان کو اس کی حاجات اور مسلمانوں کی قومی وملی خدمات میں ان کی کارگذاری کے معیار سے اس کے گھر حصہ پہنچانے کا معمول بنالیا۔ (کنز العمال)

یہی وہ اکسیر تھی جس نے انسان کو فرشتوں کی صف میں بٹھا دیا تھا اور معاشرہ کو ایسا پاکباز بنا دیا تھا کہ باہمی نزاعات اور غصب حقوق کی جگہ ایثار وہمدردی نے لے لی تھی اور آج بھی اگر دنیا کی قسمت میں امن وچین پھر مقدر ہے تو اسی امانت شناسی اور ادائے امانت ہی کے اصول کے تحت میں ہو سکتی ہے، حضرت امام مالکؒ نے خوب فرمایا ہے لن یصلح اخر ھذہ الامۃ الا ما صلح بہ اولھا، یعنی اس امت کے آخری دور کی اصلاح صرف وہی اصول کر سکیں گے جن سے امت کے ابتدائی دور کی اصلاح ہوئی تھی۔ آج حقوق طلبی کے دور میں کوئی ذمہ دار افسر کسی مہذب سے مہذب اغنیاء کے مجمع میں ایسا اعلان کر کے تو دیکھے، کتنے آدمیوں کا خون ہو جائے گا اور کس طرح سارا خزانہ لٹ جائے گا۔ یہ برکت اسی اسلامی اصول کی تھی کہ عوام میں عزت نفس کی حوصلہ افزائی کی جاتی تھی، ان کی درخواستیں لے کر دفتروں میں یا ووٹ حاصل کرنے

کیلئے گلی کوچوں میں مارے مارے پھرنے کی ذلت میں مبتلا نہیں کیا جاتا تھا۔ آج حقوق طلبی کی ماری ہوئی مظلوم انسانیت تو عزت و ذلت کا مفہوم بھی بھول گئی، ان کا یہ احساس بھی باطل ہو گیا کہ درخواستیں لئے پھرنا کوئی ذلت ہے یا ووٹ حاصل کرنے کے لئے لوگوں کی خوشامد عزت نفس کے خلاف ہے وہ اس ذلت ہی کو عزت سمجھنے پر مجبور کر دیئے گئے۔

منتشر رہنے میں پانے لگی آرام حواس شوق مجموعہ ہوش خرد افزا نہ رہا

جب یہ اسلامی اصول دنیا میں رائج تھا کہ عہدوں کے خواہشمندوں اور طلبگاروں کو عہدہ نہ دیا جائے بلکہ خود حکومت مستحقین کو عہدے پیش کرے تو عہدے اور منصب خود ان کے دروازوں پر جاتے تھے اور ان میں جو لوگ زیادہ تقویٰ اور شعار زاہدانہ زندگی کے عادی تھے وہ ان سے بھاگتے تھے۔

امام اعظم ابوحنیفہؒ کے زمانہ میں ایک عہدہ قضا خالی ہوا، امیر وقت نے بجا طور پر تین بزرگوں کا اس کے لئے انتخاب کیا امام اعظم، سفیان ثوری، شریک، امام اعظم نے قسم کھالی کہ میں اس عہدہ کا اہل نہیں، ان سے کہا گیا کہ آپ آدھی دنیا کے امام مانے جاتے ہیں، یہ کیسے قبول کیا جا سکتا ہے کہ آپ اس کے اہل نہیں، تو فرمایا کہ میری اس قسم کو اگر آپ جھوٹی قسم سمجھتے ہیں تو آپ کے ہی معیار کے مطابق جھوٹا آدمی قاضی بننے کا اہل نہیں، وہ عاجز ہوئے تو امام صاحب کو قید کر دیا، کوڑے لگائے گئے، امام صاحب نے ان مصائب کو برداشت فرمایا مگر عہدہ قضا کی دنیوی و اخروی ذمہ داری کو اپنے سر لینا گوارا نہ کیا، سفیان ثوریؒ سے کہا گیا تو وہ روپوش ہو کر بھاگے اور دریائے دجلہ کے کنارہ پر ایک کشتی والے سے کہا کہ لوگ مجھے ذبح کرنا چاہتے ہیں مجھے اپنی کشتی میں بٹھا کر دریا پار کرا دو ذبح کرنے سے اشارہ اس حدیث کی طرف تھا جس میں فرمایا گیا کہ جو شخص قاضی بن گیا ہو گویا بلا چھری (ذبح کر دیا گیا) اب شریک رہ گئے وہ اس عہدہ کو

قبول کرنے پر مجبور کر دیئے گئے، اس پر اس زمانہ کے لوگوں نے انہیں مطعون کیا۔ اور حقیقت یہی ہے کہ اگر ان عہدوں اور ممبریوں کی حقیقت کو سمجھ لیا جائے کہ وہ کوئی پھولوں کی سیج، عیش وعشرت کا سامان نہیں، ایک بھاری ذمہ داری، خالق اور خلق کے سامنے مسئولیت کا بار اور محنت طلب امانت ہے تو طبعی اور عقلی طور پر ان عہدوں، ممبریوں کی تقسیم میں یہ صورت پیش آنا ناگزیر ہے کہ عہدے لوگوں کے دروازے پر آئیں اور وہ ان سے بھاگتے پھریں۔ یہاں یہ شبہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ صورت ان قرونِ خیر اور پاکباز حضرات کے زمانہ میں چل گئی، آج چودھویں صدی میں جب کہ انسانی ہمدردی، ایثار، مروت، اخلاق فاضلہ کا گویا دنیا سے بیج ہی سوخت ہو گیا، ہر طرف خویش پروری، پارٹی نوازی، خودغرضی کا دور دورہ ہے، اس وقت اگر ان تمام چیزوں کا مکمل اختیار صرف حکام اور متعلقہ افسروں کے سپرد کر دیا جائے تو وہ سارے عہدے اور دوسری امانتیں اپنے اقرباء واحباب میں بانٹ دیں گے، عوام محروم رہ جائیں گے، اسی لئے آج کل عہدوں کے پر کرنے کے لئے صرف حکام کو مختار کل نہیں بناتے بلکہ اس کے لئے ایک پبلک سروس کمیشن بٹھایا جاتا ہے، وہ تمام درخواست دہندگان کی تعلیمی ڈگریاں دیکھ کر اور ان سے ملاقات کر کے مختلف سوالات کے ذریعہ ان کی قابلیت کو جانچنے کے بعد اپنی رپورٹ حکام کو پیش کرتا ہے، حکام اس پر عمل کرنے کے پابند ہیں، اس طرح عہدے نااہلوں کے تسلط سے بچ سکتے ہیں، لیکن جو لوگ دنیا کو محض کاغذات اور رجسٹروں میں نہیں بلکہ عمل کے میدان میں دیکھتے ہیں ان پر یہ بات مخفی نہیں کہ معاشرہ کی خودغرضی، بداخلاقی کا ان تمام ہتھکنڈوں سے کوئی مداوا نہیں ہوتا، ضابطہ قانون دفتروں اور رجسٹروں کے ان چکروں سے خلق خدا پر مشقت تو بڑھ جاتی ہے مگر خویش پرور اقربا نواز افسروں کی ناجائز تصرفات پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوتا، جاننے والے جانتے ہیں کہ بہت سے عہدے خالی ہونے سے پہلے ذہنوں میں پُر ہو چکے ہوتے ہیں، بعض اوقات ان کو خالی ہی کسی منظورِ نظر کے لئے کرایا جاتا ہے، اخباروں

کے اعلانات، پبلک سروس کمیشن کا انٹرویو سب نمائشی ضابطہ پری کے لئے کئے جاتے ہیں۔ مصیبت زدہ طلبگارانِ عہدہ دور دور سے سفر کر کے آتے ہیں اور انٹرویو سے امید یں لگا کر دفتروں کے چکر کھاتے ہیں، ان غریبوں کو خبر نہیں ہوتی کہ وہاں عہدہ پر نامزدگی بھی ہو چکی ہے۔

علاوہ ازیں جہاں حکام اور افسروں پر یہ ذمہ داری ڈالی گئی ہے کہ وہ خود مستحقین کو تلاش کر کے عہدے ان کے سپرد کریں، وہیں ان افسروں کا تقرر دیانت وامانت کی شرط سے کیا جائے گا اور پھر بھی ان کو آزاد نہیں چھوڑا جائے گا کہ جو چاہیں کریں، بلکہ ان کو یہ ہدایت دی جائے گی کہ اپنی ولایت میں کسی اہل کے ہوتے ہوئے کسی نااہل کو عہدہ سپرد کیا گیا تو وہ خائن سمجھے جائیں گے، حدیث میں ہے کہ جس شخص نے کسی کو کوئی عہدہ سپرد کیا حالانکہ اسے معلوم ہے کہ اس کی ولایت میں اس سے زیادہ اہل و مستحق افراد موجود ہیں تو اس نے اللہ و رسول کی بھی خیانت کی اور تمام مسلمانوں کی بھی (ہدایہ) اور ظاہر ہے کہ خائن افسر معزول کرنے کا مستحق ہے، ایسے افسر پر افسرانِ بالا کی نگرانی بھی ہوگی اور عوام کے لئے بھی شکایات کے دروازے کھلے ہوں گے، خصوصاً نظامِ اسلامی کے رواج کی صورت میں جس میں حکام کے دروازہ پر پہرہ کی چوکی کا اصول نہیں۔

اصل چیز یہ ہے جب تک معاشرے کی اخلاقی اصلاح نہ ہو اور عہدوں، منصبوں پر تقرر اور ترقیات کے لئے مدار کا قابلیت کے ساتھ دیانت داری کو نہ بنایا جائے اور تعلیم گاہوں سے لے کر وزارتی اداروں تک ہر شخص کے اخلاق، کیریکٹر، دیانت داری ،خدا ترسی کو ہر قدم پر قابلیتوں سے زیادہ بنیادی اساس قبولیت و ترقیات نہ ٹھیرایا جائے ان بیماریوں کا علاج نہ کسی دستور سے ہوسکتا ہے نہ کسی قانون سے۔ آج انٹرویو کے وقت امیدواروں سے طرح طرح کے بے تعلق سوالات کئے جاتے ہیں اور بعض جگہ یہ سوال بھی کئے جاتے ہیں کہ اس کی بیوی حسین بھی ہے یا نہیں اور وہ بے پردہ ہے یا نہیں

؟ لیکن کوئی یہ نہیں دیکھتا کہ جس کو ہم بڑے سے بڑا عہدہ سپرد کر رہے ہیں اس کے اخلاق کیسے ہیں، خلق خدا کے ساتھ اس کا برتاؤ کیا ہے، اس کی دیانت داری کا کیا حال ہے، خدا اور آخرت کا کچھ خوف بھی اس کے دل میں ہے یا نہیں؟ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج حکومت رشوت ستانی کے انسداد کے لئے قانون بناتی ہے، کمیشن مقرر کرتی ہے مگر ان سب عہدوں پر بھی اسی ٹھپہ کے لوگ آتے ہیں اور پہلے اگر رشوت کھانیوالے دس تھے تو اب پندرہ ہوجاتے ہیں، رشوت دینے والوں کی جیبوں پر اور نیا بار پڑجاتا ہے، مہاجرین کی آبادکاری کے لئے باقاعدہ وزارت بنتی ہے، اس کے ماتحت ہزاروں آدمیوں کے عملے کام کرتے ہیں، مگر پانچ یا چھ سال گزرنے کے بعد بھی غریب مہاجرین بجز تعداد قلیل کے وہیں نظر آتے ہیں جہاں تھے۔

اس کے خلاف نظام اسلام کا طغرائی امتیاز یہی ہے کہ کام کی قابلیت کے برابر ہے یا اس سے بھی زیادہ عہدہ دار کی دیانت وامانت وخداترسی کو دیکھا جاتا ہے، قرآن کریم نے عہدوں اور ممبریوں اور تمام کاموں کو کسی کے سپرد کرنے کے وقت اہلیت معلوم کرنے کے لئے صرف دو لفظوں میں ایسا پاکیزہ ضابطہ بیان فرمادیا ہے جو نظام عالم کی صلاح کا کفیل ہے اِنَّ خَیْرَ مَنِ اسْتَأْجَرْتَ الْقَوِیُّ الْاَمِیْنُ لفظ قوی سے کام کی قابلیت اور امین سے امانت داری کا وصف مراد ہے اور ان دونوں وصفوں کی تحقیق ہر شخص کی زندگی کے سابقہ حالات سے بآسانی ہوسکتی ہے اور ظاہر ہے کہ جب دیانتدار افسر ہوں تو ذمہ داری ان کو سپرد کرنا موجب برکات وخیرات ہی ہوگا، شبہ کرنے والوں کے سامنے اپنے موجودہ افسر ہیں جن کو بے دینی و ناخداترسی گھٹی میں پلائی گئی ہے۔

فاروق اعظمؓ نے ایک صاحب کو کسی صوبہ کا عامل (گورنر) بناکر روانہ کرنے کا فیصلہ کیا، اور فرمان لکھ کر ان کے سپرد کیا، روانگی کے وقت تعظیماً کچھ دور تک پہنچانے کے لئے ساتھ چلے، راستہ میں کسی غریب مسلمان کا میلا کچیلا بچہ کھیل رہا تھا، فاروق اعظمؓ

نے اس کو گود میں اٹھا کر اس کے ساتھ بچوں کی زبان میں باتیں شروع کیں، تو یہ صاحب جن کو گورنری پر بھیجا جا رہا تھا ایک حیرت و استعجاب کی نظر سے دیکھنے لگے، فاروق اعظمؓ نے بھانپ لیا پوچھا کہ تم اس طرح کیوں دیکھتے ہو انہوں نے کہا کہ آپ کا یہ عمل تو ایک امیر المومنین کے شایان شان نہیں، میں تو بخدا اپنے بچہ کیساتھ بھی یہ برتاؤ نہیں کرتا۔

فاروق اعظمؓ نے محسوس کیا کہ ان میں خلق خدا پر رحمت و شفقت کا مادہ نہیں، فوراً گورنری کا فرمان ان کے ہاتھ سے لے کر چاک کر دیا اور فرمایا کہ "جس شخص کو اس معصوم مخلوق پر بھی شفقت کا جذبہ نہیں تو ساری مخلوق خدا کی گردنوں پر اس کو کیسے مسلط کر دوں۔"

شمس الائمہ سرخسیؒ نے مبسوط کتاب القضاء میں حضرت معاذؓ کی مشہور حدیث نقل کرنے کے بعد لکھا ہے

فیہ دلیل علی ان الا مام اذا ارادان یقلد الا نسان القضاء ینبغی له ان یجربه فان رسول الله ﷺ لما فعل ذلک بمعا ذمع انه کان معصوماً فغیر ہ بذلک اولی فکان هذا منه علی وجه التعلیم لامته (مبسوط ص ۷۰ ج ۱۶)

اس جگہ یہ شبہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ سب چیزیں اس زمانہ میں اس لئے چل گئیں کہ معاشرہ ہی تربیت یافتہ، امانت و دیانت کا پیکر تھا، آج ایسے آدمی کہاں سے لائیں۔

لیکن دیکھنا یہ ہے کہ اسلام کے ابتدائی دور میں تو عام معاشرہ کا حال اب سے زیادہ گندا اور خراب تھا، ظلم و جور، قتل و غارت گری، بے حیائی اور فحاشی عام تھی، نظام اسلام کے اختیار کرنے ہی کی یہ برکات تھیں کہ معاشرہ کی اصلاح اس درجہ میں پہنچ گئی، اگر رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام اس بگڑی ہوئی حالت کو دیکھ کر ہماری طرح یہی سوچتے

کہ اس فضاء میں یہ نظام اسلامی جاری نہیں ہوسکتا تو نظام سلطنت تو کیا صرف کلمہء اسلام کا پھیلانا بھی ممکن نہ ہوتا۔

آج بھی انہی خطوط پر نظام حکمرانی کا مدار رکھا جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ معاشرہ کی اصلاح نہ ہو اور دیانت دار آدمی نہ ملیں، نظام اسلامی خود ایک کیمیاء ہے جو بروں کو بھلا، غنڈوں کو متقی بنا دیتا ہے، ہاں یہ کس طرح ممکن نہیں کہ حکومت کے تمام کاروبار تو عریانی، فحاشی، بدمعاشی، رشوت، جھوٹ کی حوصلہ افزائی کرتے رہیں اور بڑے سے بڑا عہدہ اور اعزاز بڑے سے بڑے بدمعاش، فحاش کو ملتا رہے اور پھر بھی معاشرہ میں غلبہ دیانت وامانت کا رہے،

نظام اور طریقۂ کار کا رخ ذرا اسلام کی طرف بدل کر دیکھئے کہ لوگ کس طرح جوق در جوق اسلامی اخلاق وکردار کی طرف آتے ہیں اور نصرت خداوندی کس طرح معاشرہ کا رخ اصلاح کی طرف پھیر دیتی ہے، اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتوں کی امداد کچھ رسول اللہ ﷺ اور میدان بدر وحنین ہی کے ساتھ مخصوص نہ تھی بلکہ قرآنی اعلان کے مطابق وہ صرف صبر وتقویٰ کے دو اصولوں پر مبنی تھی، آج بھی کسی قوم میں یہ وصف پائے جائیں تو خدا تعالیٰ اور اس کے فرشتوں کی امداد ہر وقت موجود نظر آئے گی ؂

فضائے بدر پیدا کر فرشتے تیری نصرت کو
اتر سکتے ہیں گردوں سے قطار اندر قطار اب بھی

مصیبت یہ ہے کہ جو رسوم کسی ملک یا قوم میں رائج ہو جاتی ہیں ان کی خرابیاں واضح ہوتے ہوئے اور اس کے مقابل دوسرے طریقوں کا نافع ومفید ہونا معلوم ہوتے ہوئے رسوم مروجہ کی قیود سے نکلنا بڑی مردانگی کا کام ہے، ہر شخص کے بس کا نہیں، آنحضرت ﷺ سے پہلے بھی جس طرح مذہبی رسوم میں شرک وکفر داخل ہوگیا تھا، اسی طرح اجتماعی نظموں اور ہر سیاسی کاروبار میں ظلم وجور، خودغرضی وناحق شناسی کا دور دورہ

تھا، یہی ان کی مروجہ رسوم تھیں جن کو اپنا آبائی دین سمجھ کر قرآن کے مقابلہ میں آتے اور کہتے تھے کہ اپنے آبائی رسوم کو نہیں چھوڑ سکتے،

مَا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِي الْمِلَّةِ الْاٰخِرَةِ ۖ إِنْ هٰذَا إِلَّا اخْتِلَاقٌ (۳۸: ۷).

اس لئے رسول اللہ ﷺ نے حجۃ الوداع کے خطبہ میں جہاں دین و دنیا کے اہم اصول اور ابواب کو بیان فرمایا وہیں یہ بھی ارشاد ہوا کہ

رسوم الجاهلية موضوعة تحت قدمي هاتين "زمانہ جاہلیت کی سب رسوم مروجہ آج میرے قدموں کے نیچے روندی گئی ہیں"، اس طرح مخلوق خدا کو جاہلانہ رسوم سے نجات دلا کر صحیح راستہ پر ڈالا۔

آج بھی ہمارے روشن خیال حضرات یورپ کی مروّجہ رسوم سے بے طرح اور بلا وجہ مرعوب ہیں، انہوں نے ایسے رسوم و اصول اختیار کئے جو خلق خدا کے لئے نہایت مضر اور خدا کی زمین پر فساد پھیلانے والے ہیں لیکن وہ چونکہ آج ایک فاتح قوم کی حیثیت رکھتے ہیں، اپنی بری سے بری چیز کو بڑے حوصلہ اور عزم سے دنیا کے سامنے پیش کرتے اور منوا لیتے ہیں، اس کے خلاف ہمارے یہ بھائی احساس کمتری کا شکار اور ان سے اتنے مرعوب و مغلوب ہیں کہ اپنی بہتر سے بہتر اور اعلیٰ سے اعلیٰ چیز کو ان کے سامنے پیش کرتے ہوئے گھبراتے ہیں کہ کہیں یہ لوگ دقیانوسی یا رجعت پسند نہ کہدیں، لیکن ایک صاحب عزم کے لئے ایسے مواقع پر اکبر مرحوم کی یہ نصیحت کافی ہے۔

بیوفا سمجھیں تمہیں اہل حرم اس سے بچو
دیر والے کج ادا کہدیں یہ بدنامی بھلی

دفعہ (۹) متعلقہ کورٹ فیس

دفعہ (۹) میں انصاف کا مفت بلافیس ہونا ضروری قرار دیا گیا ہے، افسوس ہے

کہ آج کی ترقی یافتہ دنیا میں انصاف کی بھی تجارت ہوتی ہے، انصاف پر کورٹ فیس اور اسٹامپ اور طرح طرح کے خرچے ڈال کر فروخت کیا جاتا ہے اور وہ بھی اتنا گراں کہ غریب آدمی کو ظلم پر صبر کر لینا اتنا مشکل نہیں جتنا اس انصاف کا حاصل کرنا دشوار ہے، حکومت عوام سے جو زمینوں کے ٹیکس وغیرہ وصولی کرتی ہے ان کا سب سے پہلا مصرف عدل وانصاف کا قائم کرنا ہے، انصاف اس کے فرائض منصبی میں داخل ہے، اس پر کوئی مزید معاوضہ طلب کرنا ظلم وستم اور ایک ذلیل قسم کی تجارت ہے جس کو کوئی سلیم الطبع انسان گوارا نہیں کرسکتا، مگر یورپ کے بنیوں نے جو رسم جاری کر دی، یورپ کی چمک دمک سے مرعوب دماغوں کو اس کی برائی کا کوئی احساس نہیں ہوتا، انا للّٰہ۔

دفعہ (۱۰) متعلقہ سیفٹی ایکٹ

دفعہ (۱۰) میں اسلام کا یہ اصول واضح کر دیا گیا ہے کہ بدون ثبوت جرم کسی شخص کو سزا نہیں دی جاسکتی تاکہ ارباب اقتدار بھی قانون کے پابند رہیں، اپنی اغراض و مصالح کی بنا پر کسی کو قید نہ کرسکیں، آج کی جمہوریت نواز دنیا میں ایک طرف عدل و انصاف اور مساوات کا ڈھنڈورا پیٹا جاتا ہے، بڑی کوشش سے قانون مدون کیے جاتے ہیں، دوسری طرف اس سارے قانون کے نیچے سیفٹی ایکٹ کی سرنگ بچھا دی جاتی ہے اور اختیار ارباب اقتدار کے ہاتھ میں دیدیا جاتا ہے کہ جب چاہیں اس سارے قوانین کے جال کو ختم کر دیں، نام ملکی مصالح کا لیا جاتا ہے اور اسکے اندر ارباب انتظام کی ذاتی اغراض اور پارٹی سسٹم کام کرتا ہے، اسلامی جمہوریت میں ایک ہاتھ سے دے کر دوسرے ہاتھ سے واپس لینے کی کوئی گنجائش نہیں، اسلئے سیفٹی ایکٹ کو عدل عمرانی کے منافی قرار دیا گیا ہے۔

دفعہ (۱۲) قومیتوں کی تقسیم وامتیاز

دفعہ (۱۲) معاشرت وسیاست کی ایک اہم اصول کی تعلیم ہے جس کو آج کی مادہ

پرست دنیا نے یکسر بھلا دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو دوسرے حیوانات سے اور پھر ایک انسان کو دوسرے انسان سے ممتاز کرنے کے لئے خود اس کی ذات میں پھر اس کے ماحول میں بہت سی چیزیں پیدا فرما دی ہیں تاکہ ایک انسان کے حقوق پر دوسرا قابض نہ ہو سکے، انسان کے اپنے بدن میں ہزاروں اشتراکات کے باوجود ایسے امتیازات ہیں جن کی بنا پر عربی رومی سے، رومی حبشی سے، حبشی ہندی سے ممتاز ہے اور پھر ہندی میں پنجابی بنگالی سے، بنگالی یوپی سے، سی پی والوں سے یوپی والے افغانی اور بلوچی سے خاص خاص امتیاز رکھتے اور علیٰحدہ پہچانے جاتے ہیں ..... مگر یہ سارے امتیازات ایسے ہیں جو انسانوں کی طرح حیوانات میں بھی موجود ہیں، افریقہ کا گدھا ہندی گدھے سے ممتاز، عربی گھوڑا دوسرے گھوڑوں سے ممتاز، ایک خطہ کا بندر دوسرے خطہ کے بندروں سے جدا نظر آتا ہے، اس قسم کے امتیازات میں انسان کی کوئی خصوصیت نہیں بلکہ وہ امتیاز جو انسان کے ساتھ مخصوص ہے وہ صرف نظریات واعتقاد کا امتیاز ہے، کوئی خدا پرست ہے، کوئی بت پرست یا مادہ پرست ...... اسلام نے پہلی قسم کے حیوانی صوبائی امتیازات کا رہن سہن اور معاشرت کے ابواب میں تو بقدر ضرورت اعتبار کیا ہے لیکن قومیتوں کی تفریق اور سیاسیات میں حقوق وفرائض اور عہدوں کی تقسیم میں اس کا قطعاً کوئی اعتبار نہیں کیا، بلکہ قرآن وحدیث کے کھلے کھلے ارشادات ان امتیازات کو مٹانے کے لئے آئے، سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کی عملی سیاست نے عربی وزنگی، ہندی، ورومی، کالے اور گورے کو ایک کر کے دکھا دیا، ہاں فرق کیا تو اس امتیاز کی بنا پر کیا جو انسان کے لئے مخصوص ہے یعنی نظریات واعتقادات کا امتیاز، ساری دنیا کے مسلمانوں کو ایک قوم قرار دیا اور غیر مسلموں کو دوسری قوم، قرآن نے اس کا اعلان ان الفاظ میں فرما دیا ھُوَ الَّذِی خَلَقَکُمْ فَمِنکُمْ کَافِرٌ وَّ مِنکُمْ مُّؤْمِنٌ، یعنی اللہ نے تم سب کو پیدا فرمایا، پھر تم میں کچھ لوگ مومن ہو گئے کچھ کافر، کہیں ارشاد فرمایا اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَۃٌ، مسلمان سب آپس میں بھائی بھائی ہیں.........

اسلام میں حیوانی (یعنی صوبائی، لونی، لسانی) امتیازات کو سیاسی حقوق وفرائض میں نظر انداز کرنا اور نظریاتی امتیازات کا اعتبار کرنا ایک بڑی حکمت پر مبنی ہے کہ پہلی قسم کے امتیازات میں انسان کے اپنے اختیار کو کوئی دخل نہیں، ایک شخص کالا پیدا ہو گیا تو اس کا کوئی قصور نہیں، کوئی گورا پیدا ہو گیا تو اس کا کوئی اختیاری کمال نہیں، اسی طرح کوئی بنگال میں پیدا ہو گیا کوئی پنجاب میں اس میں پیدا ہونے والے کے عمل کا کوئی دخل نہیں، ان غیر اختیاری اوصاف پر اگر انسان کے حقوق وفرائض دائر کر دیئے جائیں تو انسانیت پر ظلم عظیم ہے، ان چیزوں کی بناء پر جانوروں کے حقوق وفرائض میں تو امتیاز کیا جا سکتا ہے کہ افریقہ کے گدھے کی خوراک زیادہ ہے اس کو زیادہ دو یا فلاں خطہ کا بیل پانی زیادہ پیتا ہے اس کو پانی زیادہ پلاؤ، یا فلاں خطہ کا جانور بوجھ زیادہ اٹھالیتا ہے اس پر زیادہ بوجھ لادو، لیکن انسان کا امتیاز ان غیر اختیاری اوصاف کی بنیاد پر نہیں کیا جا سکتا، انسان کے حقوق وفرائض میں کمی بیشی اور امتیاز صرف انہیں اوصاف کی بناء پر ہو سکتا ہے جو انسان کے ساتھ مخصوص ہیں اور جن کے حاصل کرنے میں انسان کی سعی و عمل کو دخل ہے، اب جو شخص سعی و عمل میں کوتاہی کرتا ہے کرے وہ اپنے حقوق کی کمی کا خود ذمہ دار ہے، آج کی مہذب کہلانے والی قوموں نے اس واضح حکمت کو نظر انداز کر کے انسان کو جانوروں کے ساتھ ملا دیا ان کی قومیت کی تقسیم وطنی اور لسانی یا رنگ وشکل کی بنیادوں پر کر ڈالی جو ان کے اختیار وعمل سے بالاتر ہے، اور جو سراسر ظلم ہے اقبال مرحوم نے خوب فرمایا ؎

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ ملت کا کفن ہے

اور صرف یہی نہیں بلکہ جو امتیاز انسانی یعنی نظریاتی اور اختیاری امتیاز حقوق و فرائض کی کمی بیشی کا محور ہونا چاہئے تھا اسی کو سب سے بڑا ظلم قرار دیدیا، آج اپنی نفسانی

اور حیوانی خواہشات اور پارٹی بندی کے جذبات کے ماتحت کتنے ہی جھگڑے فتنے اٹھائے جائیں اور امتیازات رکھے جائیں وہ سب روا ہیں، ان کو نہ رواداری کیخلاف سمجھا جاتا ہے نہ جمہوریت کے، گناہ عظیم صرف یہ ہے کہ اللہ اور رسول کی وجہ سے کسی سے اختلاف کیا جائے اور کفر واسلام میں امتیاز کیا جائے، انا للہ ۔

خرد کا نام جنوں رکھدیا جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

دفعہ (۱۶)، (۱۷) متعلقہ معاشی نظام

آج کل دساتیر عالم کا سب سے اہم باب معاشی نظام سے متعلق سمجھا جاتا ہے اور اس میں ہر ملک، ہر خطہ، ہر سلطنت کا الگ الگ نظام ہے، اسلامی نظام اس معاملہ میں بھی افراط وتفریط کے درمیان معتدل فطری اصول پر مبنی ہے۔

ایک زمانہ میں بلا امتیاز حلال وحرام جس طرح ممکن ہو مال ودولت کا جمع کر لینا اور سرمایہ داری ہی سب سے بڑا ہنر تھا، لیکن کچھ عرصہ کے بعد جب عوام کو یہ نظر آیا کہ ملک کا ایک مخصوص طبقہ تمام حقوق عامہ اور دولت کے اڈوں پر قابض ہو گیا اور عوام کے لئے ذرائع معاش بجز ان کی غلامی کے نہ رہے تو اس کا ردِ عمل شروع ہوا۔

اب وہ سرمایہ داری سے بھاگے تو اشتراکیت کے دامن میں پناہ لی جس نے سرے سے انفرادی ملکیت ہی کو ختم کرنے کا بیڑا اٹھالیا ''اگر غفلت سے باز آیا جفا کی'' عرب کی مشہور مثال ہے ''الجاھل اما مفرط او مفرط'' جاہل ہر کام میں یا کوتاہی کا شکار رہتا ہے یا حدود سے آگے نکل جائے گا، درمیان میں نہیں رہتا۔

آج انسانی فطرت ان دونوں افراط وتفریط کی باہمی آویزش سے کچلی جارہی ہے، اسلام کا عادلانہ نظام محکم جس طرح پہلے دن سے امریکی طرز کی سرمایہ داری، سود

خوری کے خلاف اعلان جنگ کر رہا تھا اسی طرح اس اشترا کی نظریہ کو انسانی فطرت اور عدل عمرانی کے خلاف قرار دیتا ہے، اس نے دولت کے دو حصے کر دیئے ہیں، ایک حصہ کو تمام انسانوں کا مساوی حقوق قرار دے کر اس پر کسی کا مالکانہ قبضہ ناجائز قرار دیدیا اور وہ حکومت کی ذمہ داری میں دے دیا گیا تاکہ وہ اس کا ایسا نظم قائم کرے کہ ہر باشندۂ ملک اس سے فائدہ اٹھا سکے اور باشندگان ملک کی موجودہ اور آئندہ نسلوں کے لئے وہ باقی رہ سکے، مثلاً دریا اور اس میں پیدا ہونے والی تمام چیزیں، پہاڑ اور ان میں پیدا ہونے والی تمام چیزیں، معادن، کانیں، قدرتی چشمے اور حکومت کے قبضہ میں آنے والی وہ تمام دولت جو بدون لشکر کشی حاصل ہوئی ہو، جس میں فوج کی کوئی محنت وسعی کو دخل نہ ہو اور دنیا کے جغرافیہ پر نظر ڈالی جائے تو دنیا کی سب سے بڑی دولت یہی ہے جو اللہ نے وقف عام اور مشترک قرار دیدی ہے، دفعہ ۱۶ کا تعلق اسی قسم کے مال و دولت سے ہے، اس کو شخصی ملکیتوں اور ناجائز قبضوں سے بچانا حکومت کا فرض ہے۔

دوسرا حصہ وہ ہے جس میں انسانی سعی وعمل کو دخل ہے اور اس کے ذریعہ وہ اس کی مخصوص ملکیت سمجھی جاتی ہے بشرطیکہ جائز طریقوں سے حاصل کی گئی ہو، اس میں تمام انسان مساوی نہیں ہوتے، بلکہ اپنے اپنے کسب وعمل کے تفاوت سے متفاوت مراتب پر غنی وفقیر ہوتے ہیں اور یہ تفاوت ہی انسان کو باہمی مسابقت پر آمادہ کرتا ہے، اور دماغی اور عملی قوتوں کو بیدار کرتا ہے، اگر اس میں تفاوت کو مٹا کر یکسانیت پیدا کردی جائے تو کام کرنیوالوں کا عزم وہمت مردہ اور حوصلہ پست ہو کر نظام عالم کی بربادی کا سامان ہوگا۔ جس حصے کو انفرادی ملکیت قرار دیا ہے اس کے متعلق اسلامی شریعت کا نہایت موکد حکم ہے کہ اس ملکیت کا احترام کیا جائے، کسی کی مخصوص ملکیت بغیر شرعی حق کے اس کے قبضہ سے نکالنا یا اس کی اجازت کے بغیر اس میں تصرف کرنا گناہ عظیم قرار دیدیا گیا ہے، نہ عوام کو آپس میں اس کی اجازت ہوسکتی ہے کہ ایک دوسرے کی ملکیت پر قبضہ کرلیں یا بلا اجازت تصرف کریں نہ کسی حکومت کو اس کا حق ہے۔

دفعہ ۱۷ اس قسم کے اموال سے متعلق ہے جس میں شخصی اور انفرادی جائز ملکیتوں کی حفاظت حکومت کے فرائض میں داخل کی گئی ہے، البتہ حکومت کے فرائض میں سے ہے کہ

(الف) معاملات کی ایسی صورتوں کے رواج کو بند کرے جن کے ذریعہ دولت سمٹ کر خاص اغنیاء اور مالداروں کے قبضہ و ملک میں نہ آ جائے اور عوام محروم ہو جائیں۔

(ب) شخصی جائداد کو اگر مالک معطل کر کے ڈال دے نہ خود اس سے آمدنی حاصل کرے، نہ دوسروں کو کرنے دے، تو حکومت کو یہ بھی حق ہے کہ اس کو سرکاری نگرانی میں لے کر اس سے آمدنی پیدا کرنے کا انتظام کرے اور انتظامات کے اخراجات جائیداد کی آمدنی سے وصول کر کے باقی آمدنی مالک کو ادا کرے تا کہ عوام کے حقوق جو اس کی پیداوار سے متعلق ہیں وہ بھی ضائع نہ ہوں اور مالک کا حق ملکیت بھی ادا ہوتا رہے۔

حقوق و فرائض

دنیا کے رائج الوقت دساتیر میں عموماً ایک باب بنیادی حقوق کا رکھا جاتا ہے، قرآن کریم نے سورۂ نساء کی دو آیات نمبر (۱۵، ۱۱) میں اس طرز کو بدل کر پہلی آیت میں حکام اور ارباب اقتدار کو اور دوسری میں عوام کو خطاب کر کے دونوں فریقوں کو اپنے اپنے فرائض بتلائے ہیں یعنی فریقین کے حقوق بیان کرنے کے بجائے دونوں کے فرائض بیان کر کے گویا بنیادی حقوق کے بجائے بنیادی فرائض کا باب قائم کر دیا، جس حکومت کے لئے ایک اہم ہدایت نامہ حاصل ہوا کہ ہر فریق کو حقوق طلبی کے بجائے فرائض شناسی کی تلقین کی جائے کہ عام حقوق کی ادائیگی کا اس سے بہتر کوئی ضامن نہیں ہوسکتا، کیوں کہ عموماً ایک فریق کے حقوق دوسرے فریق کے فرائض ہوتے ہیں، اگر ہر

فریق اپنے اپنے فرائض کی فکر میں لگ جائے تو سب کے حقوق خود بخود ادا ہو جائیں، مثلاً والدین کا فرض ہے کہ نابالغ اولاد کی تربیت کریں، ان کے نفقہ، تعلیم، صحت، تہذیب اعمال و اخلاق کا مقدور بھر پورا انتظام کریں، ان کے یہ فرائض ہی اولاد کے حقوق ہیں، اسی طرح اولاد کے فرائض ماں باپ کی اطاعت، خدمت وغیرہ ہیں، یہی ماں باپ کے حقوق ہیں اسی طرح شوہر کے فرائض بیوی کے حقوق اور بیوی کے فرائض شوہر کے حقوق ہوتے ہیں، اسی طرح عوام کے فرائض حکومت کے حقوق اور حکومت کے فرائض عوام کے حقوق ہوتے ہیں اگر ان میں سے ہر فریق اپنے اپنے فرائض کو پہچانے اور ان کو ادا کرنے کی فکر کرے تو حقوق طلبی کے وہ شور و ہنگامے جو خانگی زندگی سے لے کر عالمی زندگی تک دنیا کو جنگ و جدال بلکہ قتل و قتال کا جہنم بنائے ہوئے ہیں یکسر ختم ہو جائیں اور ظلم و جور کے پنجہ میں پھنسی ہوئی مظلوم انسانیت آرام و اطمینان کا سانس لے سکے۔

رسول کریم ﷺ کی حکومت اسی ہدایت نامہ کے ماتحت ہر جھگڑے کا ابتدائی فیصلہ اسی راہ سے کرنے پر غور کرتی تھی، کہ لوگوں کو اپنی حق تلفی کی فکر میں پڑنے کے بجائے فرض شناسی کی فکر میں لگا دیا جائے۔ ایک بیٹے نے باپ کی شکایت کی تو فرمایا اطع اباک و ان ظلمک یعنی باپ اگر تم پر ظلم بھی کرے تو تم اپنے فرض اطاعت و خدمت کو نہ چھوڑو، کسی بیوی نے شوہر کی شکایت کی تو فرمایا کہ مجھے یہ پسند نہیں کہ عورتیں اپنے شوہروں کی شکایات لئے پھرا کریں، ایک شوہر نے بیوی کی شکایت کی تو فرمایا کہ عورت کے مزاج میں ایک گونہ کجی ضرور ہے، اس سے کام لینا ہے تو اس پر صبر کرنا پڑے گا اور اسی حالت میں اس کو فرائض ادا کرنے ہوں گے۔"

مسلمانوں سے صدقات، زکوٰۃ وغیرہ وصول کرنے والے عاملین کو جب اپنے اپنے علاقہ میں زکوٰۃ وصول کرنے کے لئے بھیجا جاتا تھا تو رسول کریم ﷺ کی طرف سے بڑی تاکیدی ہدایات دی جاتی تھیں کہ وہ کسی کو پریشان نہ کریں، کسی سے حق سے

زائد وصول نہ کریں، خود ایک جگہ بیٹھ کر اصحاب اموال کو اپنی جگہ آنے کی تکلیف نہ دیں، بلکہ خود ان کے گھروں پر جا کر حساب کے موافق ان سے صدقات وصول کریں، حدیث میں " لا جلب و لا جنب اور ایا کم و کرائم اموالهم" وغیرہ کے الفاظ انہی ہدایات پر مشتمل ہیں، ان کی خلاف ورزی کرنے والوں پر کڑی نظر رکھی جاتی تھی۔

لیکن دوسری طرف ایک مرتبہ کچھ لوگ آتے ہیں اور صدقات وصول کرنے والوں کی شکایات کرتے ہیں کہ وہ ہم پر ظلم کرتے ہیں تو ان کو یہ ہدایت دی جاتی ہے "ارضوا مصدقیکم و لید عوالکم" یعنی اپنے عاملین صدقہ کو راضی کر کے واپس کردو کہ وہ تمہیں دعائیں دیتے ہوئے واپس ہوں، اس طرز عمل کا مبارک نتیجہ تھوڑے ہی عرصہ میں سامنے آ گیا کہ بجائے باہمی شکوہ شکایت کے یہ نوبت آنے لگی کہ ایک صاحب بکریوں کی زکوٰۃ میں ایک اعلیٰ درجہ کا بکرا پیش کرتے ہیں، وصول کنندۂ زکوٰۃ کہتا ہے کہ یہ تمہارے ذمہ واجب شدہ حق سے زیادہ مالیت کا ہے، اس سے کم درجہ کا بکرا دو، وہ اصرار کرتا ہے کہ یہی دوں گا، عامل صدقہ کہتا ہے کہ میں یہ نہیں لے سکتا، اب دربار رسالت صلی اللہ علیہ وسلم میں جھگڑا اس صورت میں آتا ہے کہ دینے والا زیادہ قیمتی مال دینا چاہتا ہے اور عامل کم لینا چاہتا ہے، یہ برکت اسی اسلامی اصول کی تھی کہ ہر شخص حق طلبی کے بجائے فرض شناسی کی فکر میں تھا اور اس میں احتیاط و تقویٰ سے کام لینا چاہتا تھا۔

اور ظاہر ہے کہ دربار رسالت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس قسم کی ہدایات کا یہ مطلب نہیں ہو سکتا کہ کسی فریق کے ظلم کو روا رکھا گیا اور دوسرے فریق کو محض صبر کی تلقین کی گئی، بلکہ دوطرفہ ہدایتوں کا حاصل یہ تھا کہ ہر فریق حق طلبی کی فکر چھوڑ کر فرض شناسی کی فکر میں لگے اور پورے معاشرہ کے اخلاق اور حوصلے بلند ہوں اور حق طلبی کے جھگڑوں کے بجائے فکریں یہ ہوں کہ ایک طرف سے حق رسانی میں احتیاط پر نظر ہو، دوسری طرف سے وصولی حق میں احتیاط پر نظر رہے۔

پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ فیصلے قاضیانہ اور حاکمانہ نہ تھے، بلکہ مربیانہ ہدایات تھیں اور

جہاں کہیں ان ہدایات سے کام نہ چلا اور مقدمہ، مقدمہ کی صورت میں دائر ہوا تو بال کی کھال نکالی جاتی اور جتنا جس کا حق ہوتا اس کو پہنچایا جاتا تھا۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ ان دونوں آیتوں میں حکام اور عوام کو اپنے اپنے فرائض بتلا کر حکومت کو ایک خالص پالیسی کی ہدایت کر دی گئی کہ ہر فریق کو اپنے اپنے فرائض کی فکر میں لگانے کی تدبیریں کی جائیں تاکہ حق طلبی اور حق تلفی کے جھگڑے جس راہ سے پیدا ہوتے ہیں وہیں بند لگا دیا جائے اور جب تک ان اسلامی ہدایات پر عمل کیا گیا عدالتوں میں مقدمات کے واقعات انتہائی کم خال خال نظر آتے ہیں اور جوں جوں یہ اصول نظر انداز ہوتا گیا مقدمات کی کثرت ہوتی گئی، جھگڑے بڑھتے گئے، جو کسی اہل تجربہ پر مخفی نہیں۔

نظام اسلام میں معاشرہ کی اخلاقی تربیت کا مقام

نظام اسلام کی عالمگیر خوبی اور بہبودی اور اس کے زیر سایہ پورے باشندگان ملک کے امن و اطمینان کی روح یہی تھی کہ اس نے جیسے ایک طرف حکام اور عوام دونوں کو آئین و قانون کا پابند بنایا تھا تو دوسری طرف ہر قدم پر ان کے اخلاق کی تربیت کا انتظام تقویٰ و دیانت اور خدا ترسی کے اصول سے کیا جاتا تھا، فرض شناسی کے جذبات کو بڑھایا جاتا اور حق طلبی کے جذبات کو عفو و درگذر کے فضائل سے دبایا جاتا تھا، قرآن کے اسلوب حکیم میں ہر جگہ اس کا مشاہدہ ہوتا ہے کہ جہاں کوئی حکم اور قانون بیان کیا جاتا ہے تو آگے ''وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ م بَصِيْرٌ'' وغیرہ کے الفاظ سے اللہ اور حساب آخرت کا خوف دلا کر قانون کے پابند ہونے کا جذبہ پیدا کیا جاتا ہے، کیونکہ تجربہ شاہد ہے کہ محض قانون کسی قوم کی اصلاح اور جرائم سے اس کی حفاظت کا ضامن نہیں ہو سکتا جب تک اس کے ساتھ تقویٰ، دیانت، اور خدا ترسی کے جذبات اس کو اپنی خلوتوں میں اس قانون کی خلاف ورزی سے نہ روکیں۔

آج دنیا میں جتنے جھگڑے فساد ہیں ان کی بڑی وجہ یہی ہیکہ ارباب انتظام برے قانون کے پیچھے پڑ گئے، دیانت اور اخلاقی برتری کی طرف کسی کی توجہ نہیں۔

پاکستان میں مہاجرین کی آبادکاری، غلہ کی فراہمی، ضروری اشیاء میں بلیک مارکیٹ، رشوت وغیرہ کی روک تھام میں ہماری حکومت روز نئے قانون بناتی ہے، عملے بدلتی ہے، کروڑوں روپیہ خرچ کرتی ہے، مگر نتیجہ صفر کے برابر نظر آتا ہے اور جب کبھی پھر اس ناکامی پر نظر کی جاتی ہے تو پھر کوئی نئی اسکیم بنالی جاتی ہے، مرض کے اصلی سبب پر اس وقت بھی نظر نہیں جاتی۔ اور وہ صرف یہی ہے کہ نرا قانون حکومت کبھی ان مشکلات پر قابو نہیں پا سکتا، جب تک قوم کی اخلاقی اصلاح نہ ہو اور تجربہ شاہد ہے کہ اخلاقی اصلاح کے لئے مذہب اور فکر آخرت سے بڑھ کر کوئی چیز موثر نہیں ہوسکتی، یہی وہ عصائے موسیٰ ہے جو ظلم و جور، فسق و فجور کے جذبات کو بھسم کر دینے والا ہے مگر افسوس ہے کہ ہمارے اربابِ اقتدار اسی بنیاد کو ڈھانے کی فکر میں لگے ہوئے ہیں، اول تو زمانہ کی ہوا، فضا خود ہی دیانت وامانت کے خلاف ہے، کچھ مذہبی اداروں، کچھ علماء وصلحاء کی صحبت سے جو رہا سہا مذہبی اور اسلامی رنگ لوگوں میں تھا پاکستان بننے کے بعد وہ بھی ختم ہو رہا ہے، حکومت کے ذمہ دار بجائے اس کے کہ اس رنگ کی حفاظت بلکہ بڑھانے کی سعی کرتے اس کو مٹانے پر تلے ہوئے نظر آتے ہیں، پھر یہ شکایت ہے کہ عوام کسی قانون کو چلنے نہیں دیتے، ایک چالاک مہاجر جھوٹ فریب کر کے دس دس جگہ الاٹ کرا لیتا ہے، دوسرے غریب و بےکس مہاجر مصیبت میں مبتلا رہتے ہیں، پانی کے پائپ کا انتظام کیا جاتا ہے تو اس کی ٹونٹیاں نکال کر بیچ دی جاتی ہیں، اس کی پرواہ نہیں ہوتی کہ یہ پانی سارا ضائع ہو جائے گا اور سب لوگ اس سے محروم ہو جائیں گے۔

بلاشبہ جس طرح حکومت پر مہاجرین کی ذمہ داری عائد ہے، خود مہاجرین پر بھی تو دوسرے مہاجرین کی ہمدردی فرض ہے، لیکن یہ فرض کون بتلائے، تعلیم، نشر واشاعت، سرکاری عہدوں میں مذہب اور اہل مذہب سے بغاوت کی عملی تلقین کی جاتی ہے، فکر

آخرت کو رجعت بسندی سمجھا جاتا ہے اور محض اسکیموں اور قانون کی دفعات پولیس اور پلٹن سے یہ امید رکھی جاتی ہے کہ وہ قوم کا مزاج بدل دے، اس کو خود فریبی کے سوا کیا کہا جاسکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمارے ارباب حل وعقد کی آنکھیں کھول دے کہ امریکہ انگلینڈ کی دریوزہ گری چھوڑ کر اپنے گھر کی دولت کو دیکھیں، اسلام کے اصول صحیحہ پر عمل کریں، خدا تعالیٰ پر اعتماد کریں، پھر دیکھیں کہ دنیا سے ان کا گیا ہوا اقتدار کس طرح واپس آتا ہے، "وَ ما ذٰلِکَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ" ۔

یہ مختصر خاکہ ان دستوری مسائل کا جو قرآن کریم کی آیات سے نکلتے ہیں اور میں شروع میں کہہ چکا ہوں کہ نہ تمام ایسی آیات کا استیعاب ممکن تھا اور نہ اس بیان کا مقصد پورا دستور بیان کرنا ہے، بلکہ درسِ قرآن کے ذیل میں آئی ہوئی چند آیات کا بیان ہے۔ پوری اسلامی دستور آیاتِ قرآنی اور ارشاداتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور تعاملِ خلفائے راشدین ہی سے حاصل ہوسکتا ہے، جس کے بیان کا یہ موقع نہیں، تاہم اس بیان سے اتنا واضح ہوگیا کہ دستورِ مملکت کی اہم بنیادی دفعات خود قرآن میں بصراحت ووضاحت موجود ہیں، ان کو ملاؤں کے خیالات وقیاسات کہہ کر نہیں ٹالا جاسکتا۔

وَ اٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ

اکابرِ ملت کی آراء

دستور قرانی کے متعلق حضرت مولانا سیّد سلیمان صاحبؒ ندوی

صدر بورڈ تعلیمات اسلام، دستور ساز اسمبلی پاکستان کی رائے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دستورِ اسلامی اور قرآن پاک

اسلام اور دیگر مذاہب اور خصوصاً عیسائیت کے درمیان دین کی حقیقت کے باب میں ایک عظیم الشان فرق ہے، موجودہ انجیل نے یہ کہہ کر ''جو خدا کا ہے وہ خدا کو دو اور جو قیصر کا ہے وہ قیصر کو دو'' دو بادشاہ مان لئے۔ ایک دنیا کا اور دوسرا آخرت کا ایک قصر وایوان میں رہتا ہے اور دوسرا کلیسا میں لیکن اسلام خدا کے سوا کسی قیصر کو نہیں مانتا اور کہتا ہے کہ شہنشاہی صرف اسی ایک خدا کی ہے۔

''لَهُ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ'' (۵۷:۲) اور ''وَهُوَ الَّذِیْ فِی السَّمَآءِ اِلٰهٌ وَّفِی الْاَرْضِ اِلٰهٌ'' (۴۳:۸۴)

(آسمان اور زمین کی بادشاہی اسی کی ہے اور وہی آسمان میں خدا ہے اور وہی زمین میں خدا ہے)

"وَلَا يُشْرِكُ فِيْ حُكْمِهٖٓ اَحَدًا" (۱۸:۲۶)

(اور اسکی حکومت میں کوئی دوسرا شریک نہیں)۔

اسلام نے دنیا کی باتوں کو صدق و دیانت اور حکم الٰہی کے موافق بجالانے ہی کا نام آخرت کا کام رکھا ہے، مسجد کا عبادت گزار اور میدان غزا کا سپاہی اور حاکم عادل سب دین کی خدمت انجام دے رہے ہیں ...... سلطنت وحکومت کے فرائض عدل و انصاف اور حسب حکم الٰہی انجام دینے کا بھی وہی ثواب ہے جو رات بھر عبادت الٰہی میں قیام وسجود کرنے والے کے لئے ہے۔ اسلام نے جہاں عبادت واخلاق ومعاملات کی تفصیلات بیان کی ہیں وہیں حکومت وسلطنت کے حکام وآداب بھی بیان کئے ہیں، جن میں سے اہم دفعات موروثی سلطنت کی نفی، انتخاب رئیس، فضائل رئیس، مساوات حقوق، بیت المال کا شخصی تصرف میں نہ ہونا، حکام کا عادل ومنصف ہونا اور بندگانِ الٰہی کا راعی ونگران وخادم ہونا وغیرہ اوصاف ہیں۔ یورپ نے اپنی نشاۃ ثانیہ میں اسلام سے جہاں علوم وحکمت کے مسائل سیکھے، آداب سلطنت کے مسائل بھی اختیار کئے اور جمہوریت اور ڈیموکریسی کے نام سے ذاتی تجربوں اور قومی خصائص کے اضافوں کے ساتھ اپنی اپنی حکومت کے دستور مقرر کئے اور ان کے مطابق سلطنت کے اصولِ نظم ونسق ترتیب دیئے۔

ادھر اسلامی حکومتوں نے بجائے اس کے کہ اپنے مذہبی وقومی خزانہ پر نظر رکھتے جس طرح دوسری چیزوں میں یورپ کی نقالی ترقی کے لئے ضروری قرار دی، اسی طرح انہوں نے یورپ کی سلطنتوں کے دستوروں کی نقالی بھی ضروری قرار دی اور اپنے لئے ایک ایک دستور بنالیا اور سمجھا کہ سرمایہ صرف یورپ کے پاس ہے۔ قیام پاکستان نے جہاں مسلمانوں کی دوسری چیزوں میں رہنمائی کی اس کی طرف بھی رہنمائی کی کہ اسلامی دستور مرتب کیا جائے اور محققین علوم اسلامیہ کے ذہن ادھر متوجہ ہوئے کہ اسلامی دستور

کی ترتیب قرآن وسنت سے دی جائے اور اسی غرض کے لئے اس نے اپنی دستور ساز مجلس میں شعبہ تعلیمات اسلامی کے نام سے ایک شعبہ قائم کیا تا کہ اسلامی دستور کے مسائل میں اس سے رہنمائی چاہی جائے، اس رسالہ کے مؤلف حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب شروع سے اس شعبہ کے رکن ہیں اور اس سلسلہ میں تمام دستور مسائل میں غور وفکر کرتے رہے ہیں، انہوں نے اس زمانہ میں جب کہ بعض کم فہم اہل اقتدار نے قرآن پاک سے کسی اسلامی دستور کے انخراج پر معارضہ کیا تو مفتی صاحب موصوف نے اہل ذوق کے اصرار سے اپنے درسِ قرآن کے سلسلہ میں ان مسائل پر قرآن پاک کی روشنی میں ایک دو تقریریں فرمائیں جن کو سامعین نے پسند کیا اور ان کے اصرار سے وہ قلمبند ہو کر رسالہ کی شکل میں شائع ہو رہی ہیں، مؤلف نے ان تقریروں میں گو استقصاء کا قصد نہیں کیا ورنہ اور بہت سی آیتیں اور رول کے استنباطات کا اضافہ کیا جاسکتا تھا، بہر حال جو کچھ ہو گیا ہے وہ کافی ہے، امید ہے کہ اس رسالہ کو عام مسلمان اور خصوصاً مجلس دستور ساز کے ارکان اور وزراءِ عظام پڑھ کر فائدہ حاصل کریں گے، اور اسی لئے تصحیح وتکمیل فائدہ کی غرض سے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کا انگریزی ترجمہ بھی شائع کیا جائے۔

والسلام

سیّد سلیمان ندوی

صدرِ مجلس تعلیماتِ اسلام، اسمبلی پاکستان

یکم محرم الحرام ۱۳۷۳ھ

رائے گرامی از: حضرت مولانا محمد ادریس صاحبؒ

شیخ الحدیث جامعہ اشرفیہ لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ الذی لا حاکم سواہ ۔ و الصلاۃ و السلام علی رسولہ سیدنا و مولانا محمد مصطفاہ ۔

امابعد۔

بندۂ ناچیز نے اسلامی دستور کی دفعات کے متعلق دستور قرآن از افادات حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دامت فیوضہم سابق مفتی دارالعلوم دیوبند کو دیکھا موجب صد نور و سرور ہوا، یہ رسالہ اپنی نوعیت میں پہلا رسالہ ہے جس میں اسلامی دستور کی چند اہم دفعات کو نہایت عمدگی سے قرآن کریم کی آیات سے مستنبط فرمایا ہے۔حق تعالیٰ شانہ جناب مؤلف کو تمام مسلمانوں کیطرف سے جزاءِ خیر عطا فرمائے اور اس مبارک رسالہ کو دستور اسلامی کے افتتاح اور آغاز کا ذریعہ بنائے اور اس پاک دستور کو گزشتہ ناپاک دستور کیلئے آبِ طہور بنائے۔آمین یارب العالمین۔

العبد محمد ادریس کان اللہ لہ

۲۵/ذی الحجہ ۱۳۷۲ھ

از رائے گرامی: حضرت مولانا مفتی محمد حسن صاحبؒ

خلیفہ خاص حکیم الامۃ حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہ مہتمم جامعہ اشرفیہ لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

احقر نے باوجود شدید علالت کے دستورِ قرآنی کے تیس صفحات بڑے شوق و دلچسپی سے پڑھے۔ مفتی صاحب نے مسلمانوں پر بڑا احسان کیا کہ دستور مملکت کے اہم دفعات قرآن کریم کی آیات سے ثابت فرمائی، الفاظ کی صولت و ہیبت خاص مصنف ہی کا حصہ ہے جو ان کی تمام تصانیف میں مشاہد ہے۔ میں مولانا سید محمد ادریس صاحب کی تحریر سے حرف بحرف متفق ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ مفتی صاحب کی دوسری تصانیف کی طرح یہ رسالہ بھی مقبول ہو اور مفید نتائج کا حامل ہو۔

محمد حسن

مہتمم جامعہ اشرفیہ لاہور

انتخابات میں ووٹ

ووٹر اور امیدوار کی شرعی حیثیت

تاریخ تالیف ——— ۲۰ر شعبان ۱۳۸۰ھ (مطابق ۱۹۶۰ء)

مقامِ تالیف ——— دارالعلوم کراچی

اشاعت اول دارالعلوم کراچی

اسمبلی، کونسل یا کسی دوسرے ادارے کے انتخابات میں کسی شخص کو کس صورت میں امیدوار ہونا چاہئے۔ نیز کسی امیدوار کے حق میں ووٹر کو اپنا ووٹ کس طرح استعمال کرنا چاہئے؟ عام طور پر لوگ اس کو ذاتی اور نجی معاملہ سمجھتے ہیں حالانکہ یہ خاص دینی معاملہ ہے۔ پیش نظر مضمون میں ان دونوں طبقوں کے شرعی فرائض کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

آج کی دنیا میں اسمبلیوں، کونسلوں، میونسپل وارڈوں اور دوسری مجالس اور جماعتوں کے انتخابات میں جمہوریت کے نام پر جو کھیل کھیلا جا رہا ہے، کہ زور و زر اور غنڈہ گردی کے سارے طاغوتی وسائل کا استعمال کر کے یہ چندروزہ موہوم اعزاز حاصل کیا جاتا ہے، اور اس کے عالم سوز نتائج ہر وقت آنکھوں کے سامنے ہیں اور ملک وملت کے ہمدرد و سمجھدار انسان اپنے مقدور بھر اس کی اصلاح کی فکر میں بھی ہیں، لیکن عام طور پر اس کو ایک ہار جیت کا کھیل اور خالص دنیاوی دھندہ سمجھ کر ووٹ لئے، اور دیئے جاتے ہیں، لکھے پڑھے دیندار مسلمانوں کو بھی اس طرف توجہ نہیں ہوتی کہ یہ کھیل صرف ہماری دنیا کی نفع نقصان اور آبادی یا بربادی تک نہیں رہتا، بلکہ اس کے پیچھے کچھ طاعت ومعصیت اور گناہ وثواب بھی ہے، جس کے اثرات اس دنیا کے بعد بھی یا ہمارے گلے کا ہار عذاب جہنم بنیں گے، یا پھر درجات جنت اور نجاتِ آخرت کا سبب بنیں گے، اور اگرچہ آج کل اس اکھاڑہ کے پہلوان اور اس میدان کے مرد، عام طور پر وہی لوگ ہیں، جو فکر آخرت اور خدا و رسول کی طاعت ومعصیت سے مطلقاً آزاد ہیں، اور اس حالت میں ان کے سامنے قرآن وحدیث کے احکام پیش کرنا ایک بے معنی وعبث فعل معلوم ہوتا ہے، لیکن اسلام کا ایک یہ بھی معجزہ ہے کہ مسلمانوں کی پوری جماعت کبھی گمراہی پر جمع نہیں ہوتی، ہر زمانہ اور ہر جگہ کچھ لوگ حق پرست بھی قائم رہتے ہیں، جن کو اپنے ہر کام میں حلال وحرام کی فکر اور خدا اور رسول کی رضا جوئی پیش نظر رہتی ہے، نیز قرآن کریم کا یہ بھی ارشاد ہے:

و ذکر فان الذکریٰ تنفع المؤمنین

یعنی آپ نصیحت کی بات کہتے رہیں کیونکہ نصیحت مسلمانوں کو نفع دیتی ہے، اس لئے

مناسب معلوم ہوا، کہ انتخابات میں امیدواری اور ووٹ کی شرعی حیثیت اور ان کی اہمیت کو قرآن اور سنت کی رو سے واضح کر دیا جائے، شاید کچھ بندگان خدا کو تنبیہ ہو، اور کسی وقت یہ غلط کھیل صحیح بن جائے۔

اُمیدواری

کسی مجلس کی ممبری کے انتخابات کے لئے جو امیدوار کی حیثیت سے کھڑا ہو، وہ گویا پوری ملت کے سامنے دو چیزوں کا مدعی ہے، ایک یہ کہ وہ اس کام کی قابلیت رکھتا ہے، جس کا امیدوار ہے، دوسرے یہ کہ وہ دیانت و امانت داری سے اس کام کو انجام دے گا، اب اگر واقع میں، وہ اپنے اس دعویٰ میں سچا ہے، یعنی قابلیت بھی رکھتا ہے، اور امانت و دیانت کے ساتھ قوم کی خدمت کے جذبہ سے اس میدان میں آیا، تو اس کا یہ عمل کسی حد تک درست ہے، اور بہتر طریق اس کا یہ ہے کہ کوئی شخص خود مدعی بن کر کھڑا نہ ہو بلکہ مسلمانوں کی کوئی جماعت اس کو اس کام کا اہل سمجھ کر نامزد کر دے، اور جس شخص میں اس کام کی صلاحیت ہی نہیں وہ اگر امیدوار ہو کر کھڑا ہو، تو قوم کا غدار اور خائن ہے، اس کا ممبری میں کامیاب ہونا ملک و ملت کے لئے خرابی کا سبب تو بعد میں بنے گا، پہلے تو وہ خود غدر و خیانت کا مجرم ہو کر عذاب جہنم کا مستحق بن جائے گا، اب ہر وہ شخص جو کسی مجلس کی ممبری کیلئے کھڑا ہوتا ہے، اگر اس کو کچھ آخرت کی بھی فکر ہے، تو اس میدان میں آنے سے پہلے خود اپنا جائزہ لے لے، اور یہ سمجھ لے کہ اس ممبری سے پہلے تو اس کی ذمہ داری صرف اپنی ذات اور اپنے اہل و عیال ہی تک محدود تھی، کیونکہ بنص حدیث ہر شخص اپنے اہل و عیال کا بھی ذمہ دار ہے، اور اب کسی مجلس کی ممبری کے بعد جتنی خلق خدا کا تعلق اس مجلس سے وابستہ ہے، ان سب کی ذمہ داری کا بوجھ اس کی گردن پر آتا ہے، اور وہ دنیا و آخرت میں اس ذمہ داری کا مسئول اور جواب دہ ہے۔

ووٹ اور ووٹر

کسی امیدوار ممبری کو ووٹ دینے کی از روئے قرآن و حدیث چند حیثیتیں ہیں،

ایک حیثیت شہادت کی ہے کہ ووٹر جس شخص کو اپنا ووٹ دے رہا ہے، اس کے متعلق اس کی شہادت دے رہا ہے، کہ یہ شخص اس کام کی قابلیت بھی رکھتا ہے، اور دیانت اور امانت بھی اور اگر واقع میں اس شخص کے اندر یہ صفات نہیں ہیں، اور ووٹر یہ جانتے ہوئے، اس کو ووٹ دیتا ہے، تو وہ ایک جھوٹی شہادت ہے، جو سخت کبیرہ گناہ اور وبال دنیا و آخرت ہے، صحیح بخاری کی حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے شہادت کا ذبہ کو شرک کے ساتھ کبائر میں شمار فرمایا ہے، (مشکوٰۃ) اور ایک دوسری حدیث میں جھوٹی شہادت کو اکبر کبائر فرمایا ہے، (بخاری ومسلم) جس حلقہ میں چند امیدوار کھڑے ہوں، اور ووٹر کو یہ معلوم ہے کہ قابلیت اور دیانت کے اعتبار سے فلاں آدمی قابل ترجیح ہے، تو اس کو چھوڑ کر کسی دوسرے کو ووٹ دینا اس اکبر کبائر میں اپنے آپ کو مبتلاء کرنا ہے۔

اب ووٹ دینے والا اپنی آخرت اور انجام کو دیکھ کو ووٹ دے، محض رسمی مروت یا کسی طمع وخوف کی وجہ سے اپنے آپ کو اس وبال میں مبتلاء نہ کرے، دوسری حیثیت ووٹ کی شفاعت یعنی سفارش کی ہے کہ ووٹر اس کی نمائندگی کی سفارش کرتا ہے، اس سفارش کے بارہ میں قرآن کریم کا یہ ارشاد ہر ووٹر کو اپنے سامنے رکھنا چاہئے۔ و من یشفع شفاعة حسنة یکن له نصیب منها و من یشفع شفاعة سیئة یکن له کفل منها۔ یعنی جو شخص اچھی سفارش کرتا ہے، اس میں اس کو بھی حصہ ملتا ہے، اور بری سفارش کرتا ہے، تو اس کی برائی میں اس کا بھی حصہ لگتا ہے، اچھی سفارش یہی ہے کہ قابل اور دیانتدار آدمی کی سفارش کرے، جو خلق خدا کے حقوق صحیح طور پر ادا کرے، اور بری سفارش یہ ہے کہ نا اہل نالائق، فاسق ظالم کی سفارش کر کے اس کو خلق خدا پر مسلط کرے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ہمارے ووٹوں سے کامیاب ہونے والا امیدوار اپنے پنج سالہ دور میں جو نیک یا بدعمل کرے گا، ہم بھی اس کے شریک سمجھے جائیں گے۔

ووٹ کی ایک تیسری شرعی حیثیت وکالت کی ہے کہ ووٹ دینے والا اس امیدوار کو اپنا نمائندہ اور وکیل بناتا ہے، لیکن اگر یہ وکالت اس کے کسی شخصی حق کے متعلق ہوتی، اور

اس کا نفع نقصان صرف اس کی ذات کو پہنچتا تو اس کا یہ خود ذمہ دار ہوتا، مگر یہاں ایسا نہیں کیونکہ یہ وکالت ایسے حقوق کے متعلق ہے، جن میں اس کے ساتھ پوری قوم شریک ہے، اس لئے اگر کسی نااہل کو اپنی نمائندگی کے لئے ووٹ دے کر کامیاب بنایا تو پوری قوم کے حقوق کو پامال کرنے کا گناہ بھی اس کی گردن پر رہا۔

خلاصہ یہ ہے کہ ہمارا ووٹ تین حیثیتیں رکھتا ہے، ایک شہادت دوسرے سفارش تیسرے حقوق مشترکہ میں وکالت، تینوں حیثیتوں میں جس طرح نیک، صالح، قابل آدمی کو ووٹ دینا موجب ثواب عظیم ہے، اور اس کے ثمرات اس کو ملنے والے ہیں، اس طرح نااہل یا غیر متدین شخص کو ووٹ دینا جھوٹی شہادت بھی ہے، اور بری سفارش بھی اور ناجائز وکالت بھی اور اس کے تباہ کن ثمرات بھی اس کے نامہ اعمال میں لکھے جائیں گے۔

ضروری تنبیہ

مذکورالصدر بیان میں جس طرح قرآن وسنت کی رو سے یہ واضح ہوا کہ نااہل، ظالم، فاسق اور غلط آدمی کو ووٹ دینا گناہ عظیم ہے اسی طرح ایک اچھے نیک اور قابل آدمی کو ووٹ دینا ثواب عظیم ہے بلکہ ایک فریضہ شرعی ہے، قرآن کریم نے جیسے جھوٹی شہادت کو حرام قرار دیا ہے، اسی طرح سچی شہادت کو واجب ولازم بھی فرمایا ہے۔ ارشاد باری ہے: کونوا قوامین للّٰہ شہداء بالقسط اور دوسری جگہ ارشاد ہے: کونوا قوامین بالقسط شہداء للّٰہ، ان دونوں آیتوں میں مسلمانوں پر فرض کیا ہے کہ سچی شہادت سے جان نہ چرائیں، اللہ کے لئے ادائیگی شہادت کے واسطے کھڑے ہو جائیں۔ تیسری جگہ سورۃ طلاق میں ارشاد ہے: و اقیموا الشہادۃ للّٰہ یعنی اللہ کے لئے سچی شہادت کو قائم کرو، ایک آیت میں یہ ارشاد فرمایا کہ سچی شہادت کا چھپانا حرام اور گناہ ہے، ارشاد ہے: و لاتکتموا الشہادۃ و من یکتمہا فانہ اٰثم قلبہ یعنی شہادت کو نہ چھپاؤ اور جو چھپائے گا، اس کا دل گناہ گار ہے۔

ان تمام آیات نے مسلمانوں پر یہ فریضہ عائد کر دیا ہے کہ سچی گواہی سے جان نہ چرائیں، ضرور ادا کریں، آج یہ خرابیاں انتخابات میں پیش آ رہی ہیں، ان کی بڑی وجہ یہ بھی ہے، کہ نیک صالح حضرات عموماً ووٹ دینے ہی سے گریز کرنے لگے جس کا لازمی نتیجہ وہ ہوا جو مشاہدہ میں آ رہا ہے، کہ ووٹ عموماً ان لوگوں کے آتے ہیں جو چند ٹکوں میں خرید لئے جاتے ہیں، اور ان لوگوں کے ووٹوں سے جو نمائندے پوری قوم پر مسلط ہوتے ہیں، وہ ظاہر ہے، کہ کس قماش اور کس کردار کے لوگ ہوں گے، اس لئے جس حلقہ میں کوئی بھی امیدوار قابل اور نیک معلوم ہو، اسے ووٹ دینے سے گریز کرنا بھی شرعی جرم اور پوری قوم وملت پر ظلم کا مرادف ہے، اور اگر کسی حلقہ میں کوئی بھی امیدوار صحیح معنی میں قابل اور دیانت دار نہ معلوم ہو، مگر ان میں سے کوئی ایک صلاحیت کار اور خدا ترسی کے اصول پر دوسروں کی نسبت سے غنیمت ہو، تو تقلیل شر اور تقلیل ظلم کی نیت سے اس کو بھی ووٹ دے دینا جائز بلکہ مستحسن ہے، جیسا کہ نجاست کے پورے ازالہ پر قدرت نہ ہونے کی صورت میں تقلیل نجاست کو اور پورے ظلم کو دفع کرنے کا اختیار نہ ہونے کی صورت میں تقلیل ظلم کو فقہاء رحمہم اللہ نے تجویز فرمایا ہے۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

خلاصہ یہ ہے کہ

انتخابات میں ووٹ کی شرعی حیثیت کم از کم ایک شہادت کی ہے جس کا چھپانا بھی حرام ہے، اور اس میں جھوٹ بولنا بھی حرام، اس پر کوئی معاوضہ لینا بھی حرام، اس میں محض ایک سیاسی ہار جیت اور دنیا کا کھیل سمجھنا بڑی بھاری غلطی ہے، آپ جس امیدوار کو ووٹ دیتے ہیں، شرعاً آپ اس کی گواہی دیتے ہیں کہ یہ شخص اپنے نظریے اور علم وعمل اور دیانت داری کی رو سے اس کام کا اہل اور دوسرے امیدواروں سے بہتر ہے، جس کام کے لئے یہ انتخابات ہو رہے ہیں، اس حقیقت کو سامنے رکھیں تو اس سے مندرجہ ذیل نتائج برآمد ہوتے ہیں:

۱:......آپ کے ووٹ اور شہادت کے ذریعہ جو نمائندہ کسی اسمبلی میں پہنچے گا، وہ اس سلسلے میں جتنے اچھے یا برے اقدامات کرے گا، ان کی ذمہ داری آپ پر بھی عائد ہوگی، آپ بھی اس کے ثواب یا عذاب میں شریک ہوں گے۔

۲:......اس معاملہ میں یہ بات خاص طور پر یاد رکھنے کی ہے کہ شخصی معاملات میں کوئی غلطی بھی ہو جائے، تو اس کا اثر بھی شخصی اور محدود ہوتا ہے، ثواب وعذاب بھی محدود، قومی اور ملکی معاملات سے پوری قوم متاثر ہوتی ہے اس کا ادنیٰ نقصان بھی بعض اوقات پوری قوم کی تباہی کا سبب بن جاتا ہے، اسلئے اس کا ثواب وعذاب بھی بہت بڑا ہے۔

۳:......سچی شہادت کا چھپانا از روئے قرآن حرام ہے، اس لئے آپ کے حلقہ انتخاب میں اگر کوئی صحیح نظریہ کا حامل و دیانت دار نمائندہ کھڑا ہے، تو اس کو ووٹ دینے میں، کوتاہی کرنا گناہ کبیرہ ہے۔

۴:......جو امیدوار نظام اسلامی کے خلاف کوئی نظریہ رکھتا ہے، اس کو ووٹ دینا ایک جھوٹی شہادت ہے، جو گناہ کبیرہ ہے۔

۵:......ووٹ کو پیسوں کے معاوضہ میں دینا بدترین قسم کی رشوت ہے، اور چند ٹکوں کی خاطر اسلام اور ملک سے بغاوت ہے، دوسروں کی دنیا سنوارنے کے لئے اپنا دین قربان کر دینا کتنے ہی مال و دولت کے بدلے میں ہو، کوئی دانشمندی نہیں ہوسکتی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے، کہ وہ شخص سب سے زیادہ خسارے میں ہے، جو دوسرے کی دنیا کے لئے اپنا دین کھو بیٹھے۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
مفتی وصدر دار العلوم کراچی ۱۴
۲۰/ شعبان ۱۳۸۰ھ